صفحات 290
قیمت 100 روپے

سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

ماہنامہ سرگزشت کراچی

نومبر 2018

نگران اعلیٰ
معراج رسول

جوش ایمانی: اس نے ہنستے ہوئے پھانسی کا پھندا قبول کیا تھا

کڑوا سچ: بیٹیوں پر بیٹوں کو فوقیت دینے والوں کا انجام اثر انگیز سچ بیانی

ان کے علاوہ بھی ڈھیر ساری سچ بیانیاں، سچے قصّے، سچے واقعات اور سچی داستانیں

تاریخی واقعات	معاشرت	پہلی سچ بیانی
فاتح	ناسور	کڑوا سچ
طارق عزیز خان 169	ڈاکٹر عبدالرب بھٹی 172	فائزہ 204
انگلستان کی بنیاد رکھنے والا انگریز نہ تھا	ایک معصوم نوجوان کی خون رنگ لہو گرما دینے والی داستان	بیٹے پر بیٹیوں کو فوقیت دینے کا انجام
دوسری سچ بیانی	تیسری سچ بیانی	چوتھی سچ بیانی
دو کوڑی کے لوگ	ہمدرد دشمن	بے نشاں
رؤف اسلم آرائیں 219	ناصر اچکزئی 227	ماہ رخ ارباب 235
وہ ایک سنکی کے جال میں پھنس گیا ہے	اس نے زندگی دے کر دوستی نبھادی	زندگی برباد ہوگئی لیکن عاقبت سنور گئی
پانچویں سچ بیانی	چھٹی سچ بیانی	ساتویں سچ بیانی
نادان	کام کا بندہ	انجام
فضہ عادل 241	خورشید احمد 251	محمد سجاول خان 257
نادانی میں ہی لڑکیاں دھوکا کھا جاتی ہیں	ہر دفتر میں کام کے بندے کا حشر کیا ہوتا ہے؟	کالا علم سیکھنے کا انجام یہی ہوتا ہے
آٹھویں سچ بیانی	نویں سچ بیانی	سوغات
عظمت کے نشاں	وچولن	پارچے
محمد سلیم اختر 261	نورین 277	قارئین / ادارہ *
وہ ماں نہیں تھی پھر بھی قربانی میں پیچھے نہیں رہی	احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے وہ وچولن بن گئی	دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر معلومات انکشافاتی پارچے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جلد 28 ❖ شمارہ 10 ❖ نومبر 2018ء

ماہنامہ

سرگزشت

کراچی

مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیر : پرویز بلگرامی

نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر



منیجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789



سرکولیشن منیجر

سید منیر حسین

0333-3285269



قیمت فی پرچہ 100 روپے ❖ زرِ سالانہ 1200 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200

E-mail: jdpgroup@hotmail.com



قارئین کرام!

السلام علیکم!

چین کے معروف فوجی جنرل **Sun-Tzu** کی کتاب، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دنیا کا شاید ہی ایسا کوئی فوجی جنرل ہو جس نے یہ کتاب نہ پڑھی ہو۔ نپولین کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اسے سرہانے میں رکھ کر سوتا تھا۔ سن زو لکھتا ہے ''بہترین فتح یہ ہے کہ دشمن سے لڑے بغیر اس کی قوت مدافعت ختم کردی جائے۔'' اس وقت ایک دنیا مسلمانوں میں نفاق پیدا کر کے اسی موڑ پر پہنچانے پر کمر بستہ ہے۔ افغانستان، عراق، شام، لیبیا، یمن کے علاوہ کئی اور ممالک میں بھی یہی دیکھنے میں آیا ہے۔ عالم اسلام میں پاکستان واحد ایٹمی قوت ہے۔ اس کی فوج دنیا کی بہترین افواج میں سرفہرست ہے۔ پاکستان کے عوام کی بھی ذمے داری ہے کہ وہ نفاق پھیلانے والوں کے خلاف کمر بستہ ہو کر اتحاد کا بھرپور مظاہرہ کرے اور جو لوگ نفاق پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں ان کو بھرپور جواب دے کیونکہ قرآن میں بھی حکم ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور پارہ پارہ نہ ہو جانا۔''

معراج رسول

محسن معیشت

36 کیمپڈن اسٹریٹ۔ کینسنگٹن، انگلینڈ میں ایک خانسامہ رہتا تھا۔ اس کے گھر 1889ء میں ایک بچے نے جنم لیا۔ یہ اس کا پہلا بچہ نہیں تھا۔ اس سے بڑے بھی بچے تھے لیکن وہ اپنے دونوں بھائیوں سے زیادہ من موہنا تھا۔ اسے دیکھتے ہی سب پیار کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ کچھ اور بڑا ہوا تو اسے تعلیم کی خاطر سینٹ میری ایبٹس ہائر گریڈ اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ باپ کی آمدنی اتنی زیادہ نہیں تھی پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائے۔ بچے ذہین تھے وہ آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ خاص کر چھوٹا تو حد سے زیادہ ذہین ثابت ہو رہا تھا۔ وہ مسلسل اپ گریڈ لاتا۔ اس اسکول میں اس نے 1896ء سے 1904ء تک تعلیم حاصل کی پھر اسے لیٹیمر اپر اسکول بھیج دیا گیا۔ وہاں اس نے 1905ء سے 1911ء تک گزارا اور پھر 1911ء کے موسم خزاں میں وہ ایمونیل کالج، کیمبرج چلا گیا۔ وہاں سے اس نے اوپن اسکالرشپ پر علم الحساب کی تعلیم کے لیے درخواست جمع کرا دی۔ اس نے انتھک کوشش کے بعد اس کالج سے 1912ء میں درجہ اول سے پارٹ ون مکمل کیا اور پھر 1914 میں بی اے کیا۔ اس کی یہ کامیابی ثابت کر رہی تھی کہ وہ مستقبل میں بہت آگے جائے گا۔ اسی دوران پہلی جنگ عظیم کا بگل بج اٹھا اور نوجوان محاذ پر جانے لگے۔ اس نے بھی فوجی نوکری کو ترجیح دی اور محاذ پر جانے والوں کی فہرست میں اپنا نام درج کرا دیا۔ ہلکی سی ٹریننگ کے بعد اسے رائل فیزیلرز میں بطور لیفٹیننٹ فوج کا حصہ بنا دیا گیا۔ اس نے فرانس میں جنگ لڑی اور کامیاب ٹھہرا۔ اس کی بہادری کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت انگلیشیہ نے اسے کئی اہم ایوارڈ دیے۔ 1919ء میں اس نے انڈین سول سروس کے لیے درخواست دی جسے منظور کر لیا گیا۔ اسے اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے لکھنو بھیج دیا گیا۔ وہ پورے یونائیٹڈ پروینس (یوپی) کو سنبھالے ہوئے تھا۔ 1926 تا 1929ء اس کی کوشش سے رائے بریلی کو ضلع کا درجہ دیا گیا۔ اس دوران ہندو جاگیرداروں نے اس پر الزام بھی لگایا کہ یہ مسلمانوں کا ساتھ دے رہا ہے۔ 1931ء میں اس کی نگرانی میں مردم شماری ہوئی اور ایک بار پھر اس پر مسلمانوں کا ساتھ دینے کا الزام لگا۔ 1935ء میں اسے ریونیو سیکریٹری نامزد کیا گیا۔ اس نے نہایت احسن طریقے پر صوبہ یوپی کے اس اہم عہدے کو سنبھالے رکھا۔ 1936ء میں اسے صوبہ یوپی کا فنانشل سیکریٹری نامزد کر دیا گیا۔ 1941ء میں اسے دہلی بلا لیا گیا اور اسے ایڈیشنل سیکریٹری مرکزی حکومت کا عہدہ دے دیا گیا۔ 1945ء میں اسے ریلوے کا فنانشل سیکریٹری کا عہدہ پھر 1941ء میں اسے پرنسپل سیکریٹری کا عہدہ دیا گیا۔ ہندو انتہا پسند اس پر مسلمانوں کی طرفداری کا مسلسل الزام لگاتے رہے اور وہ اپنا کام کرتا رہا۔ اسی درمیان قیام پاکستان کا عمل تکمیل کو پہنچ گیا۔ ایک نئی مملکت، جسے دشمنان پاکستان نے لہو میں رنگ دیا تھا، اب اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا تھا اور تجربے کار افراد کی سخت کمی تھی۔ ہر ملک کے لیے تجربے کار معیشت داں کی ضرورت پڑتی ہے۔ گنتی کے معیشت داں پاکستان پہنچے تھے۔ ملک چلانے کے لیے چھوٹے چھوٹے نکتوں پر بھی نگاہ رکھنا ضروری ہے۔ قائداعظم نے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور اسے پاکستان منتقل ہو جانے کی ہدایت کی۔ تمام افراد نے قائد کی دوررس نگاہوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تائید کی۔ سب کے مشورے سے اسے پاکستان کا پہلا فنانس سیکریٹری نامزد کر دیا گیا۔ قیام پاکستان کی راہ میں اس کی قربانیاں تھیں اس لیے ہی اسے اتنا اہم محکمہ دیا گیا تھا۔ اس نے بھی جی جان سے پاکستان کو مستحکم کرنے کے لیے کوششیں تیز کر دیں۔ اس نے وزیراعظم نواب زادہ لیاقت علی خان سے مشورہ کیا کہ ہمیں ملک کے مفاد میں ایک بڑا قدم اٹھانا پڑے گا۔ ابھی تمام سرکاری اداروں کا حال یہ ہے کہ دفتر ہے لیکن افسر نہیں۔ افسران ہندو ہونے کی وجہ سے بھارت منتقل ہو گئے ہیں۔ اس لیے تمام دفاتر میں نئے افسران لیے جائیں۔ انڈیا سے ہجرت کر کے آنے والوں میں تجربے کار افراد کی تعداد زیادہ ہے اس لیے انہیں حکومت میں شامل کیا جائے۔ جو وہاں جونیئر افسر تھا اسے پاکستانی حکومت میں سینئر بنا دیا جائے۔ اس کے مشورے نے حکومت کو استحکام بخشا۔ اس کے اس مشورے نے بہت کام دکھایا تھا اس لیے اسے فیڈرل بیورو آف اسٹیٹکس کا ہیڈ بنا دیا گیا۔ اس نے حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے ایک پریس کا انتظام کرنا چاہا۔ اس کے لیے اس نے خان بہادر لیاقت علی خان سے مشورہ کیا اور De la Rue جیسی مشہور کمپنی کی مدد سے پہلا سرکاری پرنٹنگ پریس لگایا جس میں کاغذ کے روپے چھاپنے کا انتظام ہوا۔ کرنسی نوٹ پر اس کے دستخط تھے۔ اس نے ایسے کئی اقدام کیے جس نے نوزائدہ مملکت کی معاشی استحکام میں بہت مدد دی پھر وہ واپس لندن چلا گیا اور وہاں بنی پاکستانی سوسائٹی کے خزانچی کی حیثیت سے اس نے 1969ء تک عہدہ سنبھالے رکھا۔ یہاں سے جانے کے بعد عرصہ تک وہ پاکستان آتا جاتا رہا۔ معیشت کے سلسلے میں مفید مشوروں سے نوازتا رہا۔ اس کی خدمت کے اعتراف میں اسے ستارۂ امتیاز سے نوازا گیا۔ سولہ اکتوبر 1974ء میں اس کا انتقال لندن میں ہوا۔ پاکستان کے اس محسن معیشت کا نام سر وکٹر ٹرنر تھا۔

شہرِ خیال

مدیرِ اعلیٰ



☆ **کوثر اسلام**، صوابی کی خوشہ چینی۔ ”سرگزشت ایک نشہ ہے جب تک نہیں ملتا طبیعت بے چین رہتی ہے۔ عصرِ حاضر میں واحد علمی و ادبی پرچہ ہے کہ دہائیوں کے بعد بھی اس کا معیار ویسا ہی ہے بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا جارہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنجیدہ لوگوں اور علمی و ادبی حلقوں میں سرگزشت کو کافی پذیرائی حاصل ہے۔ اس کامیابی کے پیچھے ان تھک محنت، مسلسل جدوجہد، سچے جذبے، لگن اور خلوص کارفرما ہے۔ خوبصورت سرورق سے آراستہ و پیراستہ سرگزشت کافی تاخیر سے ملا۔ اداریہ میں معراج رسول صاحب نے معاشرے کی اصلاح کا زرین فارمولا بتایا۔ معاشرے کا فرد اگر صراطِ مستقیم پر قائم رہے اور مسجد میں کیے گئے وعدے پر ڈٹا رہے تو بحیثیت مجموعی معاشرہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ شہرِ خیال میں صدرِ مجلس، سرگزشت کے سب سے پرانے قاری حکیم محمد رضا کا جامع تبصرہ پڑھا۔ اعجاز حسین لدھیانہ کافی عرصے بعد نظر آئے غالباً خاص نمبر کے بعد۔ اعجاز حسین سٹھار، سدرہ بانو اور سید امتیاز حسین کے تبصرے بہت دلچسپ تھے۔ ناصر حسین رند لمبے عرصے سے غائب ہیں پرانے ہم محفلوں کے بغیر محفل کا رنگ نہیں جمتا حاضری لگاتے رہا کریں۔ یک صفحی سرگزشت میں ”فرام پردہ ٹو پارلیمنٹ“ کی مصنفہ شائستہ اکرام کے حالات پڑھ کر اچھا لگا۔ مرگ برگ، باعثِ افتخار، آل راؤنڈر اور موسیقار اچھے اور معلومات افزا مضامین تھے۔ عصائے موسیٰ ایمان افروز واقعہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے مضمون کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ ایک دوست بتا رہے تھے کہ وہ بیمار ہیں اللہ انہیں صحت و عافیت عطا فرمائے۔ (آمین)۔ شکار و شکاری، شکاریات کے موضوع پر اچھا واقعہ تھا اسی طرح اگر ہر مہینے شکاریات پر ایک مضمون یا کہانی شامل ہو تو اچھا رہے گا۔ افریقا کے جنگلوں میں آج بھی جنگلی آباد ہیں اور شاید آدم خور قبائل بھی۔ ان کے عجیب و غریب رسوم باعثِ تعجب ہیں۔ بنن خان کی موت کا افسوس ہوا کہ شکاری خود شکار ہو گیا۔ ”تصویر“ سجاول خان کی اچھی کاوش تھی۔ پروفیسر ولیم نے اسپسٹن کو چوری شدہ تصویر دوبارہ پینٹ کرنے کا کیوں کہا اس کی وجہ آخر تک نہیں بتائی گئی۔ پروفیسر کو جب پتا چلا کہ اسپسٹن رات کو دفتر میں گھسا تھا تو صبح اس نے چوری شدہ تصویر وہاں سے کیوں نہیں ہٹائی (آپ نے غور نہیں کیا، چوری شدہ تصویر کی نقل تیار کرا کر نقل کو پولیس کے حوالے کر کے اصل تصویر کی قیمت بڑھانے کی خاطر اس نے گھڑاگ پھیلایا تھا)۔ ندیم صاحب کا سفرنامہ ”شمشال سے ٹورنٹو“ پوری آب و تاب دلچسپیوں اور رنگینیوں کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ ندیم صاحب کی سچائی نے حیران کر دیا۔ اکثر لوگ اس صورتِ حال میں چھپاتے ہیں کہ وہ شادی شدہ ہیں۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے ندیم صاحب نے سفرنامے کو کہانی کا رنگ دے کے منفرد تجربہ کیا ہے (افسوس کہ دو ایک ماہ میں سفرنامے کا اختتام ہے)۔ شوق پرواز اصغر عباس کی معلوماتی تحریر تھی۔ واقعی بچپن سے یہی پڑھایا سکھایا جارہا ہے کہ جہاز کے موجد رائٹ برادرز ہیں جب کہ ابن فرناس کے متعلق کوئی جانتا بھی نہیں۔ ”ناسور“ بہت زبردست جارہی ہے۔ بھٹی صاحب نے پچھلے ماہ کی طرح اس بار بھی سنسنی خیز موقع پر قسط ختم کر دی اب ایک مہینے تک بے چینی رہے گی۔ سچ بیانیاں اس بار لاجواب تھیں۔ رؤف اسلم بہت اچھا ”ٹوٹکا“ لے کر آئے۔ یہ کہانی انور کی نہیں معاشرے کے ہر گھرانے کی ہے۔ مادہ پرستی نے نئی نسل کو اندھا کر دیا۔ اسی وجہ سے معاشرے میں امن خلوص اور محبت مفقود ہے۔ عاقب اشعر کی ”خلش“ نے کافی دیر تک دل گرفتہ کیے رکھا۔ انسان انجام سے بے خبر برائیاں کرتا جاتا ہے مگر جب برائیوں کا انجام آتا ہے تو اس میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ خودکشی کرنے کی بجائے اگر منور حسین اپنی بیوی کو چھڑانے کی خاطر جان دیتا تو ساری عمر ذلت کے ساتھ ضمیر کی عدالت میں شرمندہ نہ ہوتا۔ ”خالی ہاتھ“ اچھی کاوش تھی۔ مجید اتنی دوڑ دھوپ اور کوششوں کے بعد بھی خالی ہاتھ رہا۔ اس کی بجائے اگر وہ کام پر توجہ دیتا، مثبت سرگرمی اپنا لیتا تو بہت کچھ بن سکتا تھا۔ ”بے وفا“ نے بہت اداس کر دیا۔ ماں باپ اور نوجوانوں کے لیے چشم کشا

تحریر ہے۔ جاوید کی بات ٹھیک تھی جس کے لیے باپ نے اپنا خون، اپنا گردہ تک بیچا وہ کسی غیر کی خاطر ماں باپ کو یوں تنہا چھوڑ کر چلی گئی وہ اس قابل بھی نہیں کہ اسے یاد رکھا جائے چہ جائے کہ نثار صاحب اس کے لیے روتے رہے۔ ''حق'' میں اعتزاز سلیم نے معاشرے کے ایک المیے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس معاشرے میں جو بھولا بھالا اور شریف ہو لوگ اسے ہی دباتے ہیں۔ شہزاد کی قسمت اچھی تھی کہ اسے سکینہ جیسی بیوی اور شہباز ملے جس کی وجہ سے اس نے اپنا حق وصول کیا ورنہ ہر کسی کو سکینہ جیسی زیرک بیوی نہیں ملتی۔ نسرین اختر نے ''خواب عذاب'' میں اچھی کہانی بیان کی۔ نائمہ کی عصمت دری کے بعد بھی وہ درندہ سوچ رہا تھا کہ اس نے اسے قتل کیوں نہیں کیا ایسے لوگوں کو نشان عبرت بنانا چاہیے۔ مجموعی طور پر اس ماہ کا شمارہ بے حد شاندار تھا اللہ مزید ترقی عطا فرمائے۔''

☆ ایف افتخار کا مختصر نامہ اسلام آباد سے۔ ''ہمیں فخر ہے کہ اعلیٰ پائے کے مضامین سرگزشت کی زینت بنے۔ محسن نقوی کا اتنا پُرمغز تعارف ان کی پُراسرار شخصیت کا پرت پرت دکھائی دیا۔ میرے پسندیدہ شاعر، خوب صورت غزلوں کے شاعر مگر افسوس کہ دست قضا نے اس نایاب ہیرے کو بے وقت رول دیا۔ پروردگار اس بے مثال شاعر کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے (آمین)۔ مطمئن ہوں کہ مجھے یاد رکھے گی دنیا۔ جب بھی اس شہر کی تاریخ وفا لکھے گی ''خدا رحمت کند آں عاشقان پاک طینت را'' ایسے نایاب ہیرے صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ رسالے کی قیمت بڑھا دیں، صفحات کم نہ کریں۔''

☆ رضا احمد خان نے دریا خان بھکر سے لکھا ہے۔ ''سب سے پہلے زویا اعجاز کی تحریر ''مرگِ برگ'' پڑھی۔ محسن نقوی رومانوی شاعری کے بہترین شاعر تھے۔ محسن نقوی جب ہمارے شہر دریا خان میں دو تین بار تشریف لائے تو میری ان سے کافی ملاقاتیں رہیں۔ وہ بہت سی اوصاف کے مالک تھے جن کا ذکر کرنے سے قلم قاصر ہے۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے (آمین) انور فرہاد کی تحریر ''آل راؤنڈر'' ہمارے فیورٹ اداکار غلام محی الدین کے متعلق تھی لیکن بعض جگہوں پر غیر ضروری باتوں کا ذکر کر کے تحریر کو طوالت دی گئی۔ ''باعث افتخار'' میں افتخار مجاز جنگ ستمبر کی یادوں کو تازہ کر رہے تھے۔ موسیقار، تصویر اور آگ کا دریا خاصی معلوماتی تحریریں تھیں۔ اس بار ''شمال سے ٹورنٹو'' اوّل سے آخر تک محبت کی کہانی ثابت ہوئی۔ بالآخر ندیم اور نسرین نے ایک دوسرے سے کھل کر اظہار محبت کر دیا اور شادی پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اب اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے اور کیا وہ شادی کر پاتے ہیں یا......؟ یہ اگلی قسط میں پتا چلے گا (سفرنامہ آخری مراحل میں ہے) پہلی سچ بیانی ''داغ ندامت'' اچھی کہانی تھی۔ ڈاکٹری ایک مقدس پیشہ ہے لیکن ڈاکٹر مبشر نے اپنے پیشے سے بد دیانتی کی اور جو حرکت پشیمنے سے کی اس نے انسانیت کو بھی شرما دیا۔ ایسے بدکردار لوگ انسانیت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا ہیں۔ جاوید الحسن کی سچ بیانی ''بے وفا'' بہت پسند آئی۔ حکیم سید محمد رضا شاہ، آفتاب احمد نصیر اشرفی، اعجاز حسین ستار، سدرہ بانو نا گوری، اعجاز حسین لدھیانہ، سید امتیاز حسین بخاری، قیصر خان، رانا محمد شاہد اور دیگر بہن بھائیوں کا بے حد شکریہ جنہوں نے میری تحریر کو پسند کیا اور مبارک باد دی۔''

معزز قارئین کے لیے

ادارے کی روح رواں محترمہ عذرا رسول سے علم ہوا کہ بہت سے قارئین پرانے مصنفین اور ان کی کہانیوں کو آج بھی یاد کرتے ہیں۔ کوئی سدا نہیں رہتا۔ الیاس سیتاپوری، محی الدین نواب، اقبال کاظمی، افسر آذر، علیم الحق حقی، علی سفیان آفاقی، کاشف زبیر، مختار آزاد، احمد صغیر صدیقی، سلیم فاروقی، ایم اے راحت یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان سب مرحومین کو غریق رحمت فرمائے۔ یہ ایک بحرانی صورتِ حال تھی جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نئے مصنفین کی تلاش، تربیت اور حوصلہ افزائی ناگزیر تھی۔ ادارے نے ہر قسم کے تحفظات سے بالاتر ہو کر ہر اچھی کہانی کو پذیرائی دی۔ جن لکھنے والوں کی کہانیاں انتخاب کے معیار پر پوری نہیں اتر سکیں ان کی ناراضی قابل فہم ہے مگر ادارے کا طریقہ کار قطعی غیر جانب داری پر مبنی رہا اور مبنی ہے۔

احمد اقبال صاحب ڈائجسٹوں کے ایک مقبول مصنف ہیں لیکن ایک مدت سے وہ اپنی ادبی معروفیات کے سبب کہانیاں نہیں لکھ رہے۔ ادارہ ان سے مسلسل رابطے میں ہے۔ محمود احمد مودی صاحب ایک اور ادارے سے مستقل بنیاد پر وابستہ ہیں اس لیے ہمارے پرچوں میں لکھنے سے قاصر ہیں۔ دیگر معروف قلم کاروں سے بھی نیاز مندانہ رابطہ رہتا ہے لیکن ان کی اپنی معروفیات وعدوں اور وفا کی راہ میں حائل رہتی ہیں۔ رہا راقم الحروف......تو جون 2006ء تک محترم قارئین سے قلم کے ذریعے رابطہ رہا۔ اب عذرا رسول صاحبہ کی ہدایت پر پہلی بار قارئین سے براہ راست مخاطب ہوں۔ بعض ناگزیر اور ناگفتنی ذاتی وجوہ کی بنا پر ایک عشرے سے لکھنے کا سلسلہ موقوف ہے۔ ادارے سے گہری وابستگی اور ملازمت جاری ہے۔ اس دورانیے میں قلم نے جب بھی ذہن میں بنتی بگڑتی کہانیوں کا ساتھ دیا، تحریر قارئین کی نذر ہوں گی۔ (اقلیم علیم)

☆ صوبی شاہ کا تجزیہ ہری پور ہزارہ سے۔ ''سب سے پہلے اداریہ پھر خلوط پڑھے۔ اداریہ فکر انگیز اور یقیناً قابل عمل ہے اللہ کریم ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین) فضہ عادل کی سچ بیانی پڑھی، میرے اپنے ہی علاقے یعنی کہ ہری پور سے ان کا بھی تعلق ہے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی مگر جب ان کی سچ بیانی ''داغ ندامت'' پڑھی تو مت پوچھیے کہ صدمے کا کیا عالم تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے تو جو کیا سو کیا مگر اس بچی بلوشہ کے ساتھ جو انسانیت سوز سلوک میڈیکل کے پڑھے لکھے طالب علموں نے کیا وہ تو پڑھ کر میرے آنسو نہیں رکے، سوچتی رہی کہ کیا تعلیم بھی ان جاہل لوگوں کو نہیں بدل سکی؟ کیا اتنا زیادہ پیسا خرچ کر کے محض وہ اس لیے اس کالج میں اس بچی تک پہنچے کہ وہ اس کی زندگی برباد کر سکیں، اپنا بدلہ چکا سکیں؟ پاکستانی گورنمنٹ ہر جگہ اپنا قانون نافذ کر سکتی ہے مگر ان علاقوں میں نہیں۔ ان لوگوں کے رسم و رواج کوئی بدل سکا ہے نہ کبھی بدل سکے گا۔ ونی، کاری، پنچایت کا سلسلہ اور فیصلے صدیوں سے جاری ہیں اور جاری رہیں گے۔ افسوس صد افسوس۔ جاوید احسن صاحب کی سچ بیانی ''بے وفا'' بھی بہت اچھی تھی۔ باقی سچ بیانیاں بھی اپنی مثال آپ تھیں۔ ''آگ کا دریا'' ابھی زیر مطالعہ ہے۔ مجھے ضیاء تسنیم صاحبہ کا انداز تحریر بے حد پسند ہے۔ قلم کے سحر میں جکڑ لینا ان کا کمال ہے۔''

☆ پروفیسر کیو اے قاسمی کی آمد نور پور تھل سے۔ ''معبر خیال'' میں حکیم سید محمد رضا شاہ کا تبصرہ بڑھا پسند آیا۔ حکیم سید محمد رضا شاہ اور حاجی اعجاز حسین ستار آپ لوگوں نے میرے تبصرے کو پسندیدگی کی سند عطا کی اس حوصلہ افزائی پر شکریہ۔ قیصر خان کا تبصرہ بھی پسند آیا۔ بھرپور تبصرہ اور تجزیہ کیا۔ ''مرگ برگ'' میں زویا اعجاز صاحبہ نے محسن نقوی کے حالات اور شاعری پر تفصیل سے لکھا۔ بلاشبہ محسن نقوی نے اپنی صلاحیت و محنت سے فکری اور شعوری منزلیں بخوبی طے کیں اور بہت کم وقت میں ایک نامور شاعر بن کر ابھرے۔ ان کے خدوخال کی طرح ان کی شاعری بھی خوب صورت الفاظ کے پیرہن سے مزین تھی۔ ''فلم نگری'' میں اداکار شاہد، اکمل کے بعد محی الدین کے حالات سے آگاہی ملی۔ انور فرہاد نے اس بار بھی ''آل راؤنڈر'' میں اپنا کمال دکھایا۔ ''داغ ندامت'' حساس موضوع پر ایک خبر کو جھنجوڑنے والی تحریر تھی۔ ڈاکٹر مبشر نے جذبات میں کی گئی غلطی کا ازالہ آخر دم تک کرنے کی کوشش کی لیکن تقدیر میں کچھ اور لکھا تھا۔ کہانی کا انجام کافی المیہ تھا شاید اسی کو مکافات عمل کہتے ہیں۔ ''ٹوٹکا'' میں ہمارے معاشرے کی ایک حقیقت کو بہت خوب صورت انداز میں پیش کیا گیا۔ منفی رویے اور مادی سوچ اب اپنے ہی خون اور رشتوں میں دن بدن سرائیت کرتی جا رہی ہیں۔ ہمارے مذہب اسلام نے جو بزرگوں اور بالخصوص والدین کا مقام اور مرتبہ اپنی تعلیمات میں دیا ہے وہ ناپید ہوتا جا رہا ہے۔''

☆ قیصر خان کا کچی کلاں سے مژداں۔ ''دوستوں کو عاجزانہ سلام۔ اداریہ نے حقیقی مسئلہ جسے روحانی کہہ لیں پر توجہ دلوائی ہے، خود کو ٹھیک کر و باقی اللہ تعالیٰ کرم کرے گا لیکن ہمیں دوسروں کے عیب یاد ہیں اور خود کی اصلاح مشکل ہے۔ بیگم شائستہ اکرام سہروردی کے بارے میں پڑھنے کو ملا۔ محترمہ پاکستان کی بانیوں میں سے تھیں اور ان کی بہت خدمات ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے (آمین)۔ ''معبر خیال'' میں میانوالی سے پیارے دوست کرسی صدارت پر تھے۔ تبصرہ جاندار تھا۔ سرکار اور خلیفہ اشرفی صاحب نے اچھے لفظوں سے یاد کیا۔ تجاویز بھی ساری قابل قبول تھیں۔ انیلا طالب پہلوانوں کے شہر سے پہلی بار حاضر تھیں، پڑھ کر اچھا لگا۔ انیلا آپی اب آتی رہا کریں۔ محمد ایاز راہی صاحب نے تو سب کو دھو دیا۔ افسوس کے ساتھ مضمون واقعی خشک تھا لیکن معلوماتی بھی تھا۔ گلاب خان، نصر اللہ خان، عرفان فاروق، وکیل الرحمٰن صاحب نئے لوگ تھے۔ تبصرے اچھے لگے۔ ان کے ساتھ تمام دوست سید امتیاز حسین بخاری، حاجی اعجاز ستار صاحب، محمد عامر ساحل تنولی، اعجاز حسین لدھیانہ اور نازک سی پیاری سی سدرہ بانو ناگوری کے تبصرے اچھے لگے۔ ''معبر خیال'' کے تمام دوست بھی سرگزشت کی طرح بہت پیارے ہیں اللہ تعالیٰ سدا خوش رکھے (آمین)۔ شکار پر کہانی کا اختتام خوف ناک اور دکھی تھا۔ انکل ندیم کا سفرنامہ کی یہ قسط بہت اعلیٰ تھی اس سفرنامہ کی قسط کو آپ بیتی سمجھ لیں۔ کوئی ناول بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور اس میں جو محبت انسانیت کی نئی شاخ متعارف ہوئی کہ محبت جس سے ہو تو پانا لازم نہیں، اس کی یادیں بہت ہیں۔ وہ خوش رہے بہت ہے۔ اس قسط کے واسطے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں تعریف لکھنے کو۔ باعث افتخار، آل راؤنڈر، موسیقار، تصویر، آگ کا دریا، شوق پرواز، ناسور سب بہترین تھے۔ پڑھ کر لطف آیا۔ پہلی سچ بیانی ڈاکٹر صاحب اس کو مکافات عمل کہیں یا انا پرست انتقام۔ ٹوٹکا یہ مغرب کی تقلید کی وجہ سے ماں باپ بوجھ بنتے جا رہے ہیں۔ خلش وہ نفسیاتی تھا کمال کا ڈھیٹ تھا۔ ''بے وفا'' یہ کون سا عشق ہے جس میں بندہ ماں باپ کو بھول جائے، خواب عذاب اس کی وجہ سے ایک لڑکی نے حرام موت کو چنا تو اس کو بھی ایسی موت مرنا تھی لوگ بدلے کی آگ میں اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں کچھ مرد حضرات اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ مجھے ان درندوں کو انسان کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ سراب، عورت ہاؤس وائف کے علاوہ کہیں بھی فٹ نہیں ہو سکتی۔ وہ کچھ سے کچھ بن جائے اس کی منزل گھر داری ہے۔ ایک بات اور ہمارے معاشرے میں عورت کا گھر بھی نہیں ہوتا پہلے ماں باپ بھائی پھر شوہر نامدار اور آخر میں بچوں کا۔''

☆ عبدالجبار رومی انصاری نے بورے والا سے لکھا ہے۔ ''ڈاکٹر مبشر اپنی محبوبہ کو سنگلاخ پہاڑوں میں چھوڑ آیا اور پھر اسے پانے کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔ عجیب آدمی تھا جب وہ پاس تھی اور ساتھ چلنا چاہتی تھی تب ہمت نہ ہوئی۔ بہرحال مکافات نے اپنا عمل

پورا کیا۔ پشیمنے تو حاصل نہ ہوئی، اپنی بیٹی گنوا بیٹھا۔ "شمشال سے ٹورنٹو" میں تو کمال ہو گیا، شکر ہے ندیم انکل نے نسرین سے شادی کا وعدہ تو کیا۔ باقی سرجی کی جمپنگ اور رولر رائیڈ نے بہت ہنسایا، بہت عمدہ۔ "عصائے موسیٰ" عمدہ تحریر تھی۔ "مرگ برگ" محسن نقوی کی داستانِ حیات زبردست رہی، واقعی وہ ایک بلند پائے کے شاعر تھے لیکن ان کے وقت آخر پر رونا آیا۔ ہم ایک اچھے شاعر سے محروم ہو گئے۔ ہر چیز کے بارے میں سنا جاتا ہے کہ انگریزوں نے ایجاد کی مگر یہ تحقیق کوئی نہیں کرتا کہ اس تکنیک کو سب سے پہلے مسلمانوں نے شروع کیا، اسی تناظر میں لکھی تحریر "شوقِ پرواز" پسند آئی۔ اے بے لے جگر...... یہ کالیا بھی عرب کے صحراؤں میں پہنچ گیا، اُدھر جاسوسی کا شہزی بھی صحرا گشتی میں مصروف تھا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ دونوں ہیرو آپس میں گپ شپ کر کے جدا ہو جائیں۔ جیسے بالی ووڈ ڈرامے ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ دو بزرگوں نے مل کر اپنی عزت نفس کا خیال کیا اور ایک دوسرے کو ٹوکا تا کہ ہنسی خوشی جینے کا ہنر پا لیا، عمدہ۔ واہ جی واہ سکینہ نے شوہر کو اپنا حق لینے پر مجبور کر ہی دیا۔ زبردست ڈراما کیا تھا۔ حق اچھی لگی، ایک آگ کا دریا عبور کر کے نادر شاہ کی قربت حاصل کی تھی مگر نادر شاہ کے ظلم و ستم اس کے سامنے آئے تو وہ خود بھی قتل ہو گیا، عمدہ کہانی تھی۔ آفتاب اور ہدایت جس راستے پر چل رہے تھے اس پر کانٹے ہی کانٹے تھے۔ لوٹ مار کی کمائی سے قربانی کا جانور خریدنے چلے تھے اور خود لٹ کر آ گئے جوابی تھپڑ بھی انہیں کرارا ہی پڑا تھا۔ عجز و انکساری کا پیکر اور خوش اخلاق ہیرو غلام محی الدین پُرکشش آواز کے ساتھ دبنگ شخصیت رکھتے ہیں۔ قلم نگری سے غلام محی الدین پر باتیں اچھی لگیں۔ "شکار و شکاری" نے تو رونگٹے کھڑے کر دیے ایسی وحشت انگیز کہ بے چارے محمد علی خان تو آدم خوروں سے بال بال بچے اور بشن خان کو جنگلی بلی نے ہی ادھیڑ کر رکھ دیا۔ شکاریات پہ تحریر اچھی لگی، ماحول جداگانہ تھا۔ نثار نے اپنی بیٹی کو کامیاب بنانے کے لیے اپنا خون بیچا، گردہ بیچا اور دن رات ایک کر دیا اور شاداب نے ایک بے وفا کی خاطر جان دے دی۔ کاش اسے پتا ہوتا کہ والدین اس کے لیے کیا کچھ کر چکے تھے تو شاید وہ خودکشی نہ کرتی۔ "معبرِ خیال" کے سب باسیوں کو اور تمام سرگزشت پڑھنے والوں کو سلام۔ حکیم سید محمد رضا شاہ کو مبارک ہو عمدہ تبصرہ کیا۔ دوسرے نمبر پر آفتاب احمد نصیر اشرفی کا تجزیہ تھا۔ پہلی دفعہ تشریف لانے والوں میں انیلا طالب اور گلاب خان سولنگی کو خوش آمدید۔ محمد ایاز راہی کا شکوے کے ساتھ عمدہ تبصرہ۔ اعجاز حسین ستار کا تبصرہ بھی زبردست رہا۔ ساتھ میں سدرہ بانو ناگوری نے بھی بھرپور تبصرہ کیا اور اپنی آراء سے بھی نوازا۔ محمد عامر ساحل، محمد ہمایوں تنولی، اعجاز حسین لدھیانوی، سید امتیاز حسین بخاری، نزاہت انشال، قیصر خان اور رانا محمد شاہ اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ سب میں نمایاں رہے، ویلڈن۔ "بیت بازی" میں اطیب سعید، نادر شاہ اور اشرف علی کے اشعار اچھے لگے۔

☆ محمد مبارک خان کا خلوص نامہ لیہ سے۔ "جنگ ستمبر 1965ء کی روح پرور یاد! کا ذکر کہیں بھی چھڑ جائے تو ایک عجب سا سرور کیف و انبساط۔ اور ذہن خیز مسرت و طمانیت کا احساس، میری یادوں کی محرابوں پر طلوع ہونے لگتا ہے۔ ستمبر 1965ء میرے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ میں نے ان تابناک دنوں میں گھروں کے آنگنوں، بازاروں اور تاریک مگر ذہنی افروز راتوں میں جو تاثرات چنے تھے۔ وہ ہنوز آج بھی تر و تازہ ہیں اور مجھے سرشار کیے رکھتے ہیں۔ محترمہ زویا اعجاز صاحبہ کا مضمون بعنوان "لازوال نغمے" نظر سے گزرا۔ عرض یہ ہے کہ آپ کا یہ ماہنامہ کوئی عام سا رسالہ تو ہے نہیں، اس میں چھپی ہوئی تاریخی معلومات کل آنے والے ادوار میں تاریخ کا حصہ بن جائے گی۔ اس لیے مجھ پر لازم ہوا ہے کہ درستی کے لیے نشاندہی کر دوں۔ صدر پاکستان کی ولولہ انگیز تقریر جیسا کہ لکھا گیا ہے۔ اچانک شروع نہیں ہوئی تھی بلکہ بات کچھ یوں ہے کہ ریڈیو پاکستان نے کشمیر میں چھڑی ہوئی جنگ سے باخبر رکھنے کے لیے خبروں کے دو نئے بلیٹن نشر کرنے کا چند روز قیام اعلان کیا تھا۔ گیارہ بجے کی خبریں سننے کے لیے جونہی ریڈیو کھولا تو اس پر معمول سے ہٹ کر قومی نغمے نشر ہو رہے تھے۔ حالانکہ صبح کی پہلی مجلس معمول کے عین مطابق ساڑھے آٹھ بجے ختم ہو جایا کرتی تھی اور دوسری مجلس کا آغاز ساڑھے گیارہ بجے ہوا کرتا لیکن آج خبروں کے نئے بلیٹن نشر کرنے کے لیے گیارہ بجے سے دوسری مجلس شروع ہونا تھی۔ ٹھیک گیارہ بجے نیوز کاسٹر شکیل احمد نے اپنی پاٹ دار آواز میں خبریں پڑھنا شروع کیں اور لاہور پر بزدلانہ حملے کی خبر کے بعد ہنگامی حالت کے نفاذ کا اعلان پڑھا اور آخر میں یہ مژدہ سنایا کہ صدر محترم محمد ایوب خان ساڑھے بارہ بجے قوم سے خطاب کریں گے۔ ٹھیک ساڑھے بارہ بجے صدر محترم نے اپنی تقریر جو بعد کی اطلاع کے مطابق سیکریٹری الطاف گوہر نے تحریر کی تھی۔ پہلے انگریزی پھر اردو میں پڑھی۔ اس کے اختتام پر سینوں میں رکے نعرے بم کی طرح پھٹے اور جاگ اٹھا سارا وطن۔ یاد رہے کہ ان دنوں ریڈیو پر خبریں سنانا، خود ایک فن تھا۔ تین براڈ کاسٹر شکیل احمد، انور بہزاد اور شمیم اعجاز کا ملک بھر میں طوطی بولتا تھا۔ تلفظ کی صحت، لہجے کی گھن گرج اور کمال درجہ خود اعتمادی سے خبریں نشر کی جاتی تھیں۔ تاریخی خطاب کے دس منٹ بعد اردو خبریں نشر ہوئیں۔ شکیل احمد نے جنگی صورت حال سے آگہی دینے کے بعد صدر محترم کے خطاب کے اہم نکات اس گھن گرج اور تاثیر کی حلاوت کے ساتھ پڑھے کہ سماں بندھ گیا۔ مضمون نگار سے یہاں سہو واقع ہوا۔ پنجابی جنگی ترانوں کا تذکرہ ہے ترجمہ نظر افروز ضرور تھا لیکن نسیم بیگم، سلیم رضا، مہدی حسن کے گائے اثر انگیز لمحوں کا ذکر بھی ہو جاتا۔ یاد رہے کہ جمیل الدین عالی کا لکھا ہوا ترانہ۔ اے وطن کے سجیلے جوانو، میرے نغمے تمہارے لیے ہیں۔ اپریل 1965ء میں لڑی جانے والی رن کچھ کی مختصر لیکن اثر پذیر لڑائی کے موقع پر لکھا گیا اور ریکارڈ بھی ہوا مگر لڑائی تھم جانے کی وجہ سے نشر نہ ہو سکا اور جنگ ستمبر کی تاریک راتوں میں روشنی کی کرنیں بکھیرتا رہا۔ قلم چنگیز خان

کا یادرہ جانے والا نغمہ اے مردِ مجاہد جاگ ذرا اب وقتِ شہادت...... ان دنوں تروتازہ تھا اور آٹھ اگست 1965ء سے یہ صدائے کشمیر ریڈیو کے لیے وقف ہو چکا تھا۔ عنایت حسین بھٹی کی کوندتی آواز پر یہ نغمہ امر ہو گیا اور آج راہِ عسکریت کا ایک شہ نشان ہے۔ جو دوریوں کے باوجود ہمیشہ نظر آتا رہے گا۔ بہت کچھ لکھتا لیکن قلم زیادہ دیر تھاما نہیں جاسکتا۔''

☆ رانا محمد شاہد کی آمد بورے والا سے۔ ''سرورق بھرپور رومانویت لیے ہوئے تھا۔ معراج رسول صاحب نے منافقت میں لپیٹے ہمارے انفرادی رویوں کو بہت اچھے انداز میں بیان کیا۔ المیہ تو یہ ہے کہ ہم ہمیشہ دوسروں کی بات کرتے ہیں اور اپنے کردار و عمل کو نہیں دیکھتے۔ ایک عام ریڑھی والا سبزی فروش یا فروٹ بیچنے والا جو کر سکتا ہے۔ کرتا ہے مگر وہ کرپشن میں نام صرف حکمرانوں کا لیتا ہے گویا یہ بتانا چاہتا ہے کہ اگر مجھے بھی اختیار و اقتدار ملے تو میں بھی وہی کروں۔ ہر شخص کو انفرادی طور پر اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ جبھی ملک ترقی کرتے ہیں۔ تحریک پاکستان کی نامور خاتون کارکن بیگم شائستہ اکرام اللہ کی زندگی پہ یک ملکی سرگزشت نہایت معلوماتی رہی۔ ''مشہرِ خیال'' میں حکیم سید محمد رضا سرفہرست تھے، تبصرہ اچھا لگا۔ آفتاب احمد نصیر کی شہرِ خیال کے ساتھیوں کے تعارف والی تجویز بہت اچھی ہے (تجویز زیرِ غور ہے) اس پر جلد عمل ہونا چاہیے کہ اب تو صفحات بھی بڑھ گئے ہیں، سدرہ بانو ناگوری آپ نے تو سرگزشت کی کھچڑی بنا دی یعنی اس سے بھی باریک لکھائی اور ہر صفحے کے اوپر اور نیچے بچنے والی جگہ کو بھی استعمال میں لائیے۔ اخبار ہو یا میگزین اپنے مواد کے ساتھ ساتھ پرنٹنگ، ڈیزائننگ اور لے آؤٹ وغیرہ کی وجہ سے بھی بکتا ہے۔ انفرادیت سے قاری کو راغب کرنا پڑتا ہے۔ سید امتیاز حسین بخاری نے بھی اچھا تبصرہ لکھا۔ حنیف ادیب کی شاعر کا نام بوجھیں والی تجویز اچھی ہے۔ نزاہت افشاں نے ہمیشہ کی طرح بھرپور تبصرہ کیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ گزشتہ ماہ سرگزشت بہاولپور سے خریدا تھا۔ اس دفعہ بہاولپور بھائی کے گھر بیٹھ کر تبصرہ لکھ رہا ہوں۔ زویا اعجاز نے اردو شاعری کے معروف نام محسن نقوی کی زندگی و حالات پر زبردست مضمون تحریر کیا۔ محسن نقوی حقیقی معنوں میں منفرد لب و لہجے کے شاعر تھے۔ شاعری ان کے نام و کام کو زندہ رکھے گی۔ ڈاکٹر ساجد امجد اس دفعہ مختصر تحریر کے ساتھ آئے۔ صحافت کے درخشاں ستارے اور معروف کالم نگار الیاس شاکر اور آپ کے ادارے سے وابستہ معروف آرٹسٹ ذاکر حسین کو اللہ اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے (آمین)۔ دلچسپ مکالموں کی صورت ندیم اقبال کا سفرنامہ زبردست جارہا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پہ حالاتِ حاضرہ کے پروگراموں کے معروف نام افتخار مجاز جنگِ ستمبر کی یادوں کو تازہ کر رہے تھے۔ انور فرہاد نے پاکستان فلم انڈسٹری کے معروف ناموں وحید مراد، محمد علی اور ندیم کے بعد ایک اور بہترین فلم ایکٹر غلام محی الدین کی زندگی کے بہت سے گوشوں سے آگاہ کیا۔ کچھ مہینوں کے بعد سرگزشت صفحات اور سائز بڑھنے کی وجہ سے دیکھنے، پڑھنے اور محسوس کرنے میں بہت بھلا لگا۔ مواد کو بہتر سے بہترین بنانے کی کوشش جاری رکھیے کہ بہتری کی گنجائش تو بہرحال موجود رہتی ہے (ہم اپنے تئیں کوشاں ہیں، قارئین کے مشورے ہی ہمارے راہنما ہیں)۔''

☆ اعجاز حسین سٹھار کا تجزیہ نور پور تھل سے۔ ''نئے اسٹائل اور قیمت کے ساتھ پرچہ مل گیا، محسن نقوی کے حالات ''مرگِ برگ'' میں پڑھ کر گلے شکوے دور ہو گئے۔ وہ شاعری کی ہر صنف پر مکمل دسترس رکھتا تھا لیکن جب فن عروج پر تھا تو نفرتوں کی بھینٹ چڑھ کر ابدی نیند سو گیا۔ میں نے اپنے قریبی گاؤں جمالی بلوچاں میں 1992ء میں ایک محفل میں انہیں سنا تھا۔ واقعی ان کے کلام، اندازِ تخاطب اور شخصیت نے ہزاروں کے مجمع پر جادو کر دیا تھا بس اچھے لوگ دنیا سے جلد چلے جاتے ہیں لیکن یادوں کی کسک چھوڑ جاتے ہیں۔ محسن نقوی ایسی ہی صفحات کے مالک تھے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' تجسس کو ہوا دیتی، ہمارے تخیل اور اندازوں سے اٹکھیلیاں کرتی درمیانی رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے۔ ندیم اقبال اور نسرین کا تعلق غیر فطری لگتا ہے یہ کبھی شادی کے بندھن میں نہ بندھ پائیں گے۔ نسرین زمانہ شناس اور ہمدرد ہستی ہے۔ اس نے بیوی بچوں کے ساتھ دو ماہ رہنے کی شرط اسی لیے رکھی ہے کہ ندیم شادی کا خیال دل سے نکال کر اپنے مسائل میں الجھ جائے اور سارا مسئلہ خوب صورتی سے نکل جائے گا (بس یہ سفرنامہ اختتام پر ہے۔ ہوا کیا یہ ایک دو ماہ میں پتا لگ جائے گا) ''ناسور'' کے واقعات میں اتنی تیزی آگئی ہے کہ چلنے کی بجائے بھاگنے پر مجبور ہیں۔ مجھے لائیلا کی چالاکی پر حیرت ہے جیسے ہی موافق حالات دیکھے مکار لومڑی بن گئی۔ اس کا اصل میں کیا انجام ہوا، ابھی راز ہی ہے لیکن اوبرائے گرانٹ کا نظریں پھیرنا، شکی طبیعت اور جلد بازی ہے جو بھی کہہ لیں اس نے ساری محنت پر پانی پھیر کر خطرہ پیدا کر کے پورے محل کے مکینوں کو چوکنا کر دیا ہے۔ سچ بیانیوں میں پہلی کہانی ''داغِ ندامت'' نے لرزا دیا ہے۔ مبشر تو چشمینے کا قصوروار تھا لیکن پلوشہ کو کس جرم کی سزا ملی ہے؟ ڈاکٹر مبشر نیک خصلت، انسانیت کا درد رکھنے والے اور دنیاوی لالچ نہ رکھنے والے بے ضرر انسان تھے۔ طبیعت میں لچا پن تھا، نہ عورتوں کے شکاری تھے بس انسانی فطرت اور ایک کمزور لمحہ سے مار کھا گئے۔ انہوں نے جو جرم غیر ارادی کیا دشمن نے ارادتاً کر کے زندگی کی ساری خوشیاں اور منصوبے چھین لیے۔ بس دعا ہے اللہ ہمیں ایسی نازک صورتِ حال سے بچائے جس میں کئی وجود بربریت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ''ٹوٹکا'' پڑھ کر اولاد کی بے حسی شرمناک فعل معلوم ہوا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ساٹھ سال کی عمر میں باپ کما کر بہو بیٹے کی خوشنودی حاصل کرے، عزت بھرم قائم رہے بھلا یہ کون سا کامیاب ٹوٹکا ہے، یوں تو ہر بیٹا یہ اُمید رکھے گا کہ جب تک باپ کی ہڈیوں میں دم خم اور جسم میں خون کا

آخری قطرہ موجود ہے اسے کولہو کے بیل کی طرح ہشکارتے رہو اور سرسوں کے ساتھ خود اس کا بھی تیل نکال لو، کوئی حالات کا مارا ایک آدھ تو اس تجربے سے گزر رہا ہے تو خیر ہے لیکن اسے قابل تقلید جان کر بوڑھوں سے اُمید باندھ لینا سراسر زیادتی ہوگی یوں ہم روایات بدلنے کے مرتکب بھی ٹھہریں گے۔ ''خلش'' ہمارے معاشرے کا عکس اور ہمارے گناہوں، کوتاہیوں اور غیر ذمہ دارانہ رویوں کی کہانی ہے۔ ''خالی ہاتھ'' میں نوید دولت کے حصول کے لیے کیسا منصوبہ بنائے بیٹھا تھا یہ تو اس کی کوئی نیکی کام آئی یا والدین کی دعائیں تھیں کہ جرم کے راستے پر قدم نہ بڑھا سکا۔ قانون کی گرفت میں آجاتا تو ثمینہ کسی دوسرے کا ہاتھ پکڑنے کے لیے آزاد ہوتی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وعدے کسی اور سے کیے ہوتے اور نوید محض قربانی کا بکرا ہوتا اور زندگی جیل کی کوٹھڑیوں میں سڑ گل جاتی۔ ''بے وفا'' ایسے والدین جن کی اولاد میں بیٹی ہے اور وسائل نہ ہونے کے باوجود بھی خوابوں کو تعبیر دیتے ہیں، ایک نیزہ ہے جو سینے میں پیوست ہو گیا ہے کیا انہیں پیدا کرنے، پالنے، مہنگی تعلیم دلوانے اور ہر فرمائش پوری کرنے کا یہ صلہ ہے کہ زندہ بھی رہیں لیکن زندگی چھین لی جائے۔ بھلا موت کو گلے لگانے سے مسائل حل ہو جاتے ہیں پھر لواحقین کو رونے، سسکنے اور رتجگوں کی سزا کس جرم میں بھگتنا پڑتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ جاوید کے خیالات اور قبر پر نہ جانے کا فیصلہ درست ہے بلکہ خودکشی کا فیصلہ خودغرضی کی انتہا ہے جس کی مذمت کرنا چاہیے۔''

☆ اظہر اسلام خان نے فتح پور افغاناں، نارووال سے لکھا ہے۔ ''میں سرگزشت ڈائجسٹ کا پرانا قاری ہوں بہت دفعہ خط لکھنے کا خیال بھی آیا لیکن پھر کسی نہ کسی مجبوری کی وجہ سے خیال عمل کی صورت میں نہ ڈھل سکا۔ پچھلے ماہ ڈائجسٹ کی قیمتوں میں اضافہ اور اشاعت معطل کی بات نظروں سے گزری تو دل بہت دکھا، سرگزشت سے محبت بہت پرانی ہے، اس لیے یقین کیجیے کہ ان سے جدائی بہت مشکل ہے۔ آپ ہمیں بتائے بغیر بھی اچانک قیمت بڑھا دیتے تو ہم خوشی خوشی خریداری کرتے۔ اس مہنگائی کے دور میں جہاں ایک بچہ سو روپے آرام سے خرچ کر لیتا ہے، ایسے میں معیاری رسالہ کی اشاعت ممکن بنانا یقینی طور پر آپ ہی کی محنت ہے۔ شہر خیال کے سبھی تبصرے میں بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ نزابت افشال اور سدرہ بانو ناگوری کے جاندار تبصرے ہمیشہ ہی بہت پسند آتے ہیں۔ اس ماہ سدرہ بانو کی تجاویز نے تو دل موہ لیا اور خوشی بھی ہوئی کہ وہ سرگزشت سے اتنی محبت کرتی ہیں۔ ابتدائی صفحات پر زویا اعجاز کے نام نے چونکا دیا محسن نقوی جیسے قدر آور ادیب صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ اس قدر عظیم شاعر کی ذات بہت سے تنازعات میں گھری رہی۔ کچھ سچے لیکن اکثر جھوٹے، مصنفہ نے بہت نفاست سے ان کے کردار اور فنی خوبیوں کو واضح کیا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ بے شک ایک دل موہ لینے والی تحریر ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے ایک ایمان تازہ کر دینے والا قصہ قلمبند کیا ہے۔ ''آل راؤنڈر'' نے کچھ بوریت میں مبتلا کر دیا ہے۔ موسیقار میں جارج کا بچپن نامہ پڑھ کر مزہ آیا لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس کی کامیابیوں اور فنی قدر پر بھی تھوڑی روشنی ڈال دی جاتی۔ ''تصویر'' ایک اچھی تحریر تھی۔ ''شوق پرواز'' میں مسلم بھائیوں کے کارنامے پڑھ کر فخر محسوس ہوا۔ باعث افتخار نے بھی رگوں میں لہو گرما دیا۔ آگ کا دریا سلیس، رواں اور خوب صورت مضمون رہا۔ انداز بیان خوب تھا۔ ''ناسور'' میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو سکی۔ سچ بیانیوں کا انتخاب خوب صورت تھا۔ فضہ عادل کی ''داغ ندامت'' اچھی تو تھی لیکن اٹھارہ بیس سال قبل پہاڑی علاقوں میں موبائل فون کا استعمال کچھ سمجھ میں نہ آسکا (بقول مصنفہ کہانی پرانی نہیں ہے صرف رنگ آمیزی کی ہے اور بچی کو میڈیکل اسٹوڈنٹ بنا دیا) ''ٹوٹکا'' اور ''خلش'' ہمارے معاشرے کے ایسے ''ناسور'' ہیں جن سے بہت سے گھر متاثر ہوئے ہیں۔ ''خالی ہاتھ'' میں نوید کی بے حسی پر بہت غصہ آتا رہا لیکن بے وفا گڑیا پر تو غصے کی حد ہی ہو گئی۔ یہ لڑکیاں چار دن کی چاندنی سے متاثر ہو کر اپنے والدین کی قربانیاں بھول جاتی ہیں۔ اعتراز دسکی کی حق میں شوہر کو راہ راست پر لانے میں بیوی کو کامیابی ملی۔ ہیپی اینڈ اچھا لگا۔ جوائی چھیٹر میں دونوں دوستوں کا یوٹرن اچانک تھا لیکن دیر آید درست آید۔ ''خواب عذاب'' اور ''سراب'' بھی اچھی تحریریں تھیں۔ زندگی رہی تو ''شہر خیال'' میں پھر حاضری دوں گا۔''

☆ سدرہ بانو ناگوری نے ملیر کراچی سے لکھا ہے۔ ''دیدہ زیب سرورق پر خوب صورت مرد و زن کے عین اوپر سے جھانکتے محسن نقوی اور سو روپے کے جگمگاتے ہندسوں کے ساتھ 290 صفحات پر برقرار رکھنے کا عندیہ سرگزشت کی بڑھی ہوئی قیمت کا بار لمحے بھر میں زائل کر گیا۔ معراج انکل، اداریہ پڑھتے ہوئے ہمیشہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ دکھی دل کے ساتھ لفظوں کو صفحات پر بکھیرتے ہیں۔ آس، اُمید، یقین اور سب کچھ اچھا ہو جانے کی خواہش آپ کے لفظوں سے جھلک جاتی ہے لیکن انکل ہر شخص کا دل آپ کے دل کی طرح خوب صورت اور حساس نہیں ہوتا، یہاں کسی کو کسی کی پروا نہیں ہے تو پھر آپ بھی اپنا دل جلا کر خود کو تکلیف مت دیا کریں۔ حکیم سید رضا صدارت کی کرسی پر، مبارک باد قبول کیجیے۔ یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ آپ دو روپے سے سو روپے تک کا سفر طے کر چکے ہیں۔ آپ پرانے قارئین میں سے ہیں اس سفر میں کبھی تلخ و شیریں لمحات بھی آپ کے ہمسفر ضرور رہے ہوں گے، کبھی اس بارے میں بھی کچھ بتائیے۔ ڈیئر انیلا طالب! شہر خیال میں خوش آمدید۔ نزابت افشال آپ نے تو خون عطیہ کرنے والی بات مذاقاً کہی ہے لیکن میری بڑی خواہش ہے کہ کبھی پاکستانی فوج کے کسی غازی کو اپنا خون عطیہ کروں۔ ابتدائی صفحات پر زویا اعجاز کو اپنے من پسند شاعر کے ساتھ

دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ کراچی کی ایک مشہور شاہراہ بھی غالباً محسن نقوی کے نام پر ہے (جی ہاں) خوب صورت جذبات اور احساسات سے گندھا دہ شخص اس قدر بے رحم موت سے ہمکنار ہوا کہ پوری سینتالیس گولیاں اف، روح تک لرز گئی پڑھ کر۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی کامیابی بے ضمیر لوگوں سے ہضم ہی نہیں ہوئی تھی۔ کتنے بے حس اور کم ظرف لوگ تھے جنہوں نے حسد اور جلن کی آگ میں اس بے مثال شاعر کو جھونک ڈالا۔ ڈاکٹر ساجد امجد اس دفعہ کچھ خاص متاثر نہ کر سکے۔ ''ناسور'' بہت تیزی سے آگے بڑھائی گئی ہے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' اس بار بھی نسرین کی روٹھتی مناتی محبتوں کی نذر ہوگئی۔ ندیم بھائی ہمیشہ کی طرح اس خوبی سے سفرنامے کو لے کر چلے کہ آخر تک تسلسل قائم رہا، محویت اس وقت ٹوٹتی جب سعد کوئی معصوم سی شرارت کر جاتا یا سرجی سے کوئی اوٹ پٹانگ حرکت سرزد ہو جاتی۔ ''تصویر'' اور ''موسیقار'' سسپنس سے عاری اور عام سی تحریریں تھیں۔ پہلی سچ بیانی پڑھ کر ڈاکٹر ہشر پر شدت سے لعنت ملامت کرنے کا جی چاہا اگر مشتاق کی بروقت کال نہ آجاتی تو اچھا ہوتا۔ گناہ گار بروقت اپنے انجام کو پہنچ جاتا۔ معصوم اور بے گناہ لڑکی تو یوں انتقام کی بھینٹ نہ چڑھتی۔ لوگ اچھائی کے بدلے اچھائی کی امید رکھتے ہیں تو برائی کرتے وقت یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ برائی کا بدلہ برائی کے سوا کچھ نہیں۔''

☆ زونیرہ شبیر کا مختصر اظہاریہ۔ ''سرگزشت کے لیے ایک کہانی بھیجی ہے کیا وہ اس ماہ شاملِ اشاعت ہے؟ (عشق مجازی سے عشق حقیقی کا سفر موصول ہوگئی۔ نمبر آنے پر پڑھ لی جائے گی۔ ہر ماہ ہمیں ایک بڑی تعداد میں کہانیاں موصول ہوتی ہیں۔ وہ تمام کہانیاں ایک آدمی پڑھے یہ بس سے باہر ہے۔ اس کام کے لیے مختص لوگوں کے پاس پہنچتی ہیں۔ پہلے وہ پڑھ کر ایسی کہانیاں الگ کرتے ہیں جو بچی ہوں، عمدہ انداز میں لکھی گئی ہوں۔ وہی کہانیاں ہمارے پاس بھیجتے ہیں باقی رد ہو جاتی ہیں۔ آپ کی کہانی ہمارے پاس آجائے بھی ہم کچھ بتا سکیں گے)''

☆ نذیر احمد راجپوت نے شہداد پور سے لکھا ہے۔ ''بعد سلام عرض احوال ہے کہ ماہ ستمبر کے شمارے سرگزشت میں انور فرہاد کی تحریر کردہ مضمون بعنوان ''سپر پرفارمر'' پڑھا۔ یہ مضمون اداکار اکمل مرحوم اور فلم ساز، ہدایت کار، نغمہ نگار، اداکار (چند ایک فلموں) مصنف حزیں قادری پر تھا۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اکمل مرحوم پر تو معلومات تھیں لیکن بشیر احمد حزیں قادری پر انتہائی دلچسپ اور معلوماتی مضمون پہلی مرتبہ پڑھا۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب غالباً دسمبر 2015ء کے شمارے میں بابا عالم سیاہ پوش پر آپ کا تحریر کردہ انتہائی دلچسپ و معلوماتی مضمون پڑھا جو کہ مجھے بہت پسند آیا تھا میں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا جو کہ غالباً جنوری 2016ء سرگزشت کے شمارے میں چھپا تھا۔ اس خط میں، میں نے آپ سے فرمائش کی تھی جو کہ اب جا کے پوری ہوئی ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ آئندہ کسی شمارے میں وارث لدھیانوی، منظہر شاہ، علاؤالدین، گلوکارہ نذیر بیگم اور شیریں پر بھی تفصیلی مضامین لکھیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔ میں ماہنامہ سرگزشت صرف فنکاروں پر مضمون پڑھنے کے لیے خریدتا ہوں۔''

☆ جلیل احمد جعفری نے کراچی سے لکھا ہے۔ ''بعد ادب و احترام عرض ہے کہ میں اپنی ضعیف العمری کے باوجود رسالہ سرگزشت کا عرصہ دراز سے قاری ہوں۔ میرا ذوق وشوق اور دلچسپی ہنوز برقرار ہے۔ ابھی حال ہی میں دوران مطالعہ آپ کا التماس میری نظر سے گزرا جس میں آپ نے اپنی مجبوریوں کا تذکرہ کیا ہے جسے پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ آپ نے اس میں تین راستے تجویز کیے ہیں مجھ ناچیز کی رائے میں رسالے کی قیمت میں اضافہ کر دیا جائے تاکہ قارئین کی جیب پر زیادہ بوجھ نہ پڑے اور کسی حد تک آپ کے مسائل بھی کم ہو جائیں۔ دوسری بات آپ کے لیے زیادہ غور طلب ہے کہ آپ نے چند افراد کے اصرار پر علمی آزمائش کا صفحہ ختم کر دیا جو یقیناً اہل علم کے لیے انتہائی تکلیف کا باعث ہے۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ آپ اپنے فیصلے پر نظرثانی فرمائیں گے اور قیمت میں معقول اضافے کے ساتھ معلوماتی سلسلہ بھی دوبارہ شروع کر دیں گے۔''

☆ اویس شیخ کا مختصر خط ٹوبہ ٹیک سنگھ سے۔ ''سرگزشت تقریباً پڑھ چکا تھا کہ تایا جان کی طبیعت خراب ہوگئی۔ تین چار دن اسپتالوں میں گزر گئے لیکن افسوس ہم انہیں بچا نہیں سکے۔ آج کا دن میرے لیے بہت المناک گزرا۔ میرے ہم خیال دوست، بزرگ تایا جان اس دنیا سے منہ موڑ گئے۔ تمام احباب سے مغفرت کی درخواست ہے۔ جن کا ایک جملہ زاروقطار رونے پر مجبور کر دیتا ہے اور زندگی بھر کرتا رہے گا۔ بیٹا جب بھی تمہیں لگے آج تمام اخبارات پڑھ لیے ہیں اور میرے جانی نے بہت سارا مطالعہ بھی کر لیا ہے، مجھے کہہ دینا ہے، بس افسردہ مت ہونا، یہ مت سوچنا کہ وہ کتاب خریدنی ہے بعد میں لے لوں گا یا ابھی پیسے نہیں ہیں، مجھے صرف ون منٹ میں بتا دینا۔''

☆ فریدہ افتخار کا تجزیہ اسلام آباد سے۔ ''میں سرگزشت کی خاموش قاری ہوں۔ گزرتے وقت کے ساتھ دلچسپ کہانیوں اور معلومات کا خزانہ لیے، یہ خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اکتوبر کے شمارے میں آگ کا دریا پڑھا۔ دہلی کے بازار ہوں یا دوسرے علاقے، یہ بات زبان زد عام تھی اور نادر شاہی کو بطور ظلم وسفا کی بیان کیا جانے لگا تھا۔ ابدالی سدوزئی کے بارے میں پڑھ کر حیرت و

خوشی ہوئی کہ میری معلومات میں مزید اضافہ ہوا۔ اتفاق دیکھیے کہ میری رگوں میں احمد شاہ ابدالی کا خون دوڑ رہا ہے اور مجھے اپنے سدوزئی ہونے پر فخر ہے۔ باقی قصہ کہانی اپنی جگہ ہمارے پاس جو تاریخ افغانستان، احمد شاہ کا ایک سپاہی سے بادشاہ بننا، اپنی جگہ دلچسپ ہے، نادر شاہ کے قتل کے بعد اس جوان دلیر نڈر سپہ سالار کے پاس جواز تھا کہ ایران کا بادشاہ بن جاتا مگر ان کے اپنے الفاظ کہ میرے وطن کے پہاڑ مجھے بلا رہے ہیں۔ اتنی بڑی سلطنت ایران کو ایرانیوں کے پاس چھوڑ کر جانا بھی بہادری اور سیر چشمی ہے۔ نادر شاہ کے دربار تک رسائی ان کی محنت کا نتیجہ تھا۔ نادر شاہ نے ان کے کان کو سوراخ کر کے سچے موتی کی ایک بالی ڈال دی تھی اور خطاب یا لقب دیا ڈر دوراں کا، جس کے معنی ہیں زمانے کا موتی یہ نام بگڑتے بگڑتے درانی یا دورانی بن گیا۔ آج بھی ان کی نسلی درانی سدوزئی کہلاتی ہے۔ افغانستان ایران کے زیرنگیں رہا اس طرح نادر شاہ کو یہ ناتراشیدہ ہیرا ملا جو بعد میں مملکت افغانستان کا بانی بنا۔ افغانستان کے قبیلے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک پیر بزرگ بنام ابدال نے حالات کو دیکھتے ہوئے قبائل اکٹھے کیے اور پھولوں پتوں سے ایک تاج بنا کر احمد حسان کے سر پر رکھ دیا ابدالی کا لقب دیا کہ آج سے یہ آپ کا بادشاہ ہے۔ اس طرح نادر شاہ کی یہ بات سچ ثابت ہوئی کہ اب تم احمد خان ہو۔ پھر احمد شاہ بن جاؤ گے۔ بزرگوں سے جو شجرہ نسب ملا ہے اس میں یہ واقعات تفصیل سے درج ہیں۔ افغانستان کی تاریخ انگریزوں نے لکھی۔ اس وقت بریگیڈیئر ہارون الرشید کی کتاب ''دی پٹھان'' قابل مطالعہ ہے۔ احمد شاہ ابدالی درانی کی سلطنت آج کے ملتان، اٹک، لاہور وغیرہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کی بنائی ہوئی لکیروں دیواروں نے ڈیورنڈ لائن کا مستقل جھگڑا بنایا ہوا ہے ورنہ تاریخ کے تناظر میں تو ایران کے زیر تسلط موجودہ افغانستان، سندھ، بلوچستان بھی تھے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔''

☆ نزاہت افشاں نے فتح جنگ ضلع اٹک سے لکھا ہے۔ ''معراج رسول صاحب ہمیشہ کی طرح اداریے میں سوئے ہوئے ضمیروں کو جھنجوڑ رہے تھے۔ کاش کہ ہم لوگ اردگرد کے حالات سے عبرت حاصل کریں اور سدھر جائیں تو یہی ہمارا معاشرہ جنت بن جائے گا۔ شائستہ اکرام اللہ کا تذکرہ اچھا رہا۔ زویا اعجاز اس بار معروف شاعر سید محسن نقوی کے حالات زندگی کے ساتھ حاضر تھیں۔ محسن نقوی جدید اردو شعراء میں ایک نمایاں مقام و مرتبے کے مالک ہیں۔ افسوس کہ 49 سال کی مختصری عمر میں دہشت گردی کے ناسور نے ان کی جان لے لی مگر ان کا نام ان کی تخلیقات کی بدولت ہمیشہ قائم رہے گا۔ ''عصائے موسیٰ'' ڈاکٹر صاحب کی بہترین کاوش تھی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' واہ کیا بات ہے، تحریر جوں جوں اختتام کی جانب بڑھ رہی ہے مزید پُر لطف ہو رہی ہے۔ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے، ندیم صاحب کی شادی نسرین سے ہوتی ہے کہ نہیں۔ (بس اختتامی قسط پڑھنے کے لیے تیاری کرلیں) ''آل راؤنڈر'' محی الدین کی داستانِ حیات بہت دلچسپ تھی۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ جو کردار ادا کریں خود کو اس میں اس حد تک ڈبو لیتے ہیں کہ ذرا بھی اجنبی محسوس نہیں ہوتے۔ ''آگ کا دریا'' بہت عمدہ تحریر تھی۔ ''شوقِ پرواز'' اس حقیقت کو عیاں کر رہی تھی کہ مسلمان ابتدا علم میں کسی درجہ فائق تھے۔ ''ناسور'' ذرا بھی پسند نہیں آئی، کرداروں کا جمعہ بازار لگ رہا ہے۔ ''داغِ ندامت'' زبردست اور سبق آموز تحریر تھی۔ ''خلش'' اور ''خالی ہاتھ'' بھی سبق آموز تحریریں تھیں۔ ''بے وفا'' دوسرے نمبر پر رہی۔ خصوصاً اس کا اختتام بہت زبردست اور سبق آموز تھا۔ ایسی سچ بیانیوں ہی کی وجہ سے تو سرگزشت پسند کیا جاتا ہے۔ ''حق'' بھی خوب رہی۔ شہزاد کی بیوی اور سالے نے حیران کن طریقے سے کام لے کر شہزاد کو مجبور کیا کہ وہ اپنا حق وصول کرے۔ جوابی تھپڑ، خواب تھی۔ عذاب اور سراب بھی عمدہ تحریریں تھیں۔ ''باعث افتخار'' افتخار مجاز کی تحریر کے متعلق یہ تلخ حقیقت بتانا چاہوں گا کہ مجاز صاحب کی یہ تحریر سرگزشت میں شائع ہونے سے قبل ایک دوسرے ڈائجسٹ کے ماہ ستمبر 2018ء میں شائع ہو چکی ہے۔ فوٹو کاپی بھیج رہا ہوں (سرگزشت مارکیٹ میں آتے ہی کئی لوگوں نے اس کی نشاندہی کردی۔ ریکارڈ چیک کرنے پر پتا چلا کہ یہ 2017ء کے مارچ میں ہمارے ہاں آئی تھی اور ڈھیر میں دب گئی تھی۔ انہوں نے مسترد سمجھ کر دوسری جگہ بھیج دیا۔ یہی وجہ ہے کہ کہتا ہوں کہ فون پر پتا کرلیا کریں) ''مظہر خیال'' میں اس بار ہمارے درد دل کے چارہ گر جناب حکیم رضا شاہ صدارت پر تھے۔ یاد کرنے کا شکریہ۔ آفتاب نصیر اشرفی کی تجویز زبردست ہے۔ معراج رسول صاحب کو اپنے حالات زندگی لکھنا چاہئیں ہم شدت سے منتظر ہیں کہ معراج رسول صاحب کب یہ قدم اٹھاتے ہیں۔ محمد ایاز راہی صاحب دل برداشتہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں آپ اپنا سفر جاری رکھیں اور مزید بہتری کی طرف جائیں۔ ایاز راہی صاحب آپ کا علمی ذوق لائق تحسین ہے۔ انیلا طالب مجھے اچھے الفاظ میں یاد کرنے کا شکریہ۔ باقاعدگی سے تبصرہ لکھا کریں۔ اعجاز حسین سنھار، اعجاز حسین لدھیانہ، رانا محمد شاہد اور قیصر خان سب کے تبصرے بہترین تھے۔ سدرہ بانو ناگوری سسٹر بھی زبردست تبصرے کے ساتھ حاضر تھیں۔ یاد کرنے کا شکریہ۔ انور عباس شاہ، احمد خان توحیدی، فقیر غلام حسن ضیاء، منشی محمد عزیز مےؤ اور اویس شیخ غیر حاضر ہیں۔ بشریٰ افضل میری پیاری سسٹر ایک سال بعد آئیں اور اب پھر ایک سال بعد آئیں گی۔ پری زاد جہاں اور روبینہ نفیس انصاری، سمیرا ساجد یہ تمام لوگ کیوں غیر حاضر ہیں؟ آخر میں یہی کہوں گا کہ سرگزشت کا موجودہ معیار زبردست ہے۔ معیار پر سمجھوتا نہ کریں قیمت میں افسانہ کوئی بات نہیں۔ ہم ہر حال میں سرگزشت کا ساتھ نبھائیں گے۔''

دیر سے موصول خطوط: غلام محمد، ریحان عباسی، لاہور۔ شہواز سلیم، ملتان۔ اسحاق خان، کوئٹہ۔ راشد علی خان، پشاور۔ ریاض تبسم، حیدرآباد۔ نعمان اشرف، سیالکوٹ۔ امتیاز احمد، گجرات۔ منیر حسن، قصور۔ امداد علی شاہ، خیرپور۔ مظہر حسین، لیہ۔

جوشِ ایمانی

زویا اعجاز

وہ نہ عالم دین تھا، نہ قدآور شخصیت، ایک معمولی سا خرادی تھا، لکڑی کے تختوں کو حسن بخشنے والا۔ غربت بھری زندگی تھی مگر جب اس نے سنا کہ کسی نے حضورؐ کی شان میں گستاخی کی ہے تو بے قابو ہو گیا۔ راتوں کی نیند اور دن کا چین کھو بیٹھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ کچھ کر دکھائے گا لیکن کچھ کر دکھانے کے لیے وسائل کی ضرورت ہے جو اس کے اختیار سے باہر کی بات تھی۔ صرف دل میں جوش تھا، جذبے مہمیز کررہے تھے، بس اس نے دل میں جگمگاتے ایمان کے نور کو سب کچھ جانا اور کچھ کر دکھانے کو لاہور کی سڑکوں پر اتر آیا۔ اس کتب خانے کا چکر لگانے لگا جہاں وہ کریہہ فطرت شخص بیٹھتا تھا اور پھر اس نے وہ کر دکھایا کہ علامہ اقبالؒ تک کہہ اٹھے ''ترکھان کا بیٹا بازی لے گیا''۔

حرمتِ رسولؐ کی خاطر اس نے پھانسی کا پھندا پسند کرلیا

سوز و گداز میں ڈوبی نعت کی آواز محلہ 'چابک سواراں' میں گونج کر ہر ایک کے دل کو گرما رہی تھی۔ یہ صدا ایک عمر رسیدہ فقیر کی تھی جس کی آمد ہمیشہ جمعرات کو ہی ہوا کرتی تھی۔ وہ نہایت ادب اور دل کی گہرائیوں سے یہ نعت پڑھتا، اپنی مرضی سے کسی نہ کسی دروازے پر رک جاتا بصورت دیگر کسی کو بھی خاطر میں لائے بغیر آگے بڑھ جاتا تھا۔

اس روز وہ جس چوبی دروازے کے سامنے کھڑا ہوا وہ گھر ایک 'زنجار' طالع مند کا تھا جو اس وقت غم روزگار کے باعث وہاں موجود نہ تھا۔ خاتون خانہ نے جلدی سے ایک پلیٹ میں خشکہ نکالا اور اپنی اوڑھنی اچھی طرح سنبھالے دروازے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ ایک باریک سی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔

''اوہو! اسے کیا ہوگیا؟ ابھی تو دودھ پلا کر سلایا تھا۔'' ماں تھی اس لیے اولاد کی پکار پر ہر بات بھول جانا فطری امر تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہوا۔ خشکہ کی پلیٹ طاقچے پر رکھنے کے بعد وہ چارپائی کی جانب لپکی۔ دو ماہ کے بیٹے کو گود میں لیا اور دوسرے ہاتھ سے پلیٹ تھامے دروازہ پر چلی آئی۔

''معاف کرنا بزرگو! مجھے تھوڑی دیر ہوگئی۔ آپ کو اڈیکنا (انتظار) پڑا۔''



''کوئی گل (بات) نہیں! اولاد کا دکھ اور تکلیف تو ہر بات ہی بھلا دیا کرتی ہے۔'' فقیر نے ملائمت سے جواب دیا۔

''اللہ نے بڑا کرم کیا ہے بزرگو! میرے بیٹوں کی جوڑی پوری کردی۔ اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔'' وہ انکساری سے گویا ہوئی۔ مخصوص طبقاتی اور معاشرتی سوچ کے مطابق دو بیٹوں کی پیدائش خوش قسمتی گردانا جاتی تھی۔

''انسان بڑا ہی کم عقل ہے۔ اسے پتا ہی کہاں ہوتا ہے کہ اصل خوش قسمتی کب اور کیسے ملتی ہے؟ اور اس کے بھاگوں میں کیا لکھا جاچکا ہے؟'' اس نے اپنے مخصوص ٹھیٹ پنجابی تلفظ میں جواب دیا۔

''ہائے ہائے سائیں جی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا میں خوش نصیب نہیں ہوں؟'' عورت فوراً دہل گئی۔

''بہت بھولی ہے تو!'' اس نے تحمل سے کہا۔ ''صرف اسی بات پر خوش ہونا چھوڑ دے کہ اللہ نے جوڑی ملادی ہے۔ تو بہت جلد جان لے گی کہ تیری اصل خوش قسمتی کیا تھی۔''

''آج بجھارتیں کیوں ڈال رہے ہیں بزرگو؟'' وہ الجھ گئی۔

''زندگی ایک بہت بڑی بجھارت (پہیلی) ہی تو ہے۔'' اس نے بچے کو پیار بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''تیرا 'علم الدین' بڑا ہی بھاگوں والا بچہ ہے۔'' فقیر کی بات پر اس کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ وہ بچے کے نام سے کیسے واقف تھا بھلا؟ قبل ازیں کہ وہ اپنے اس سوال کو الفاظ کا جامہ پہناتی 'فقیر نے سلسلہ کلام بحال کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بڑا ہی وکھرا (منفرد) بچہ ہوگا۔ ہاں! یہ بہت تنگ کرے گا۔ اس کی طبیعت کوئی بھی نہ سمجھ سکے گا۔ ہر کسی کو اس کا مستقبل تاریک لگے گا لیکن کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس کا نام کس طرح رہتی دنیا تک ایک مثال بن جائے گا۔'' اس نے آگے بڑھ کر بچے کی پیشانی پر محبت وعقیدت سے بوسہ ثبت کیا اور گم صم کھڑی خاتون سے خشکہ لے کر بے نیازی سے آگے بڑھ گیا۔

اس کی آواز اب دور ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

☆......☆

شب کا اندھیرا کائنات پر غالب تھا۔

دن بھر کے تھکے ہارے افراد اب نیند کی آغوش میں پناہ لے چکے تھے لیکن وہیں ایک فرد ایسا بھی تھا جس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ ننھے علم الدین کو بے دھیانی سے تھپکتے ہاتھوں کی حرکت کبھی تیز ہو جاتی تو کبھی کچھ لمحوں بعد ہی مدھم ہونے لگتی تھی۔ رضائی میں گم صم لیٹی یہ علم الدین کی ماں تھی جو شام ہی سے فقیر کی باتیں سن کر بے حد الجھن کے عالم میں تھی۔ جمعرات والے بابا نے اس کے دل و دماغ میں کھلبلی مچا رکھی تھی کہ وہ بچے کا نام کیسے جانتے تھے؟

''ارے! میں بھی خوامخواہ الجھ رہی ہوں۔ ہوسکتا ہے انہیں محلے سے کسی کی زبانی علم ہو گیا ہو۔ سارا محلہ ہی تو مبارکباد دینے آیا تھا۔ بس وہیں سے انہیں بھی پتا چل گیا ہو گا۔'' مسلسل ایک ہی کروٹ پر لیٹنے سے اس کا دایاں بازو شل ہونے لگا تھا۔ وہ اذیت برداشت کرتی چت لیٹ گئی۔

علم الدین سے قبل دو دو سال کے وقفہ سے اس کے ہاں بیٹا (محمد الدین) اور بیٹی (معراج) کی پیدائش ہوئی تھی اور وہ کسی بھی بچے کی طرف پیٹھ کیے آج تک نہ سوئی تھی۔ سرزمین پنجاب کی مخصوص روایات کے مطابق اگر کوئی ماں اپنی اولاد سے چہرہ موڑ کر سوئے تو اس کی ذہنی نشوونما میں بہت مسائل پیدا ہونے لگتے ہیں۔ سینہ بہ سینہ چلتی اس روایت میں کوئی بھی سائنسی یا منطقی توجیہہ بھلے ہی نہ ہو، تاہم روایات سے جڑے وہ لوگ اس بات کو سنجیدگی سے تسلیم کرتے اور سختی سے عمل پیرا بھی رہتے تھے۔

تجسس اور پریشانی میں قدرے کمی ہوئی تو آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل ہونے لگیں۔ اس لاحاصل سوچ میں کھوئے رہنے کی بدولت وہ جمعرات والے بابا کی اصل پیشگوئی فراموش کر بیٹھی تھی کہ علم الدین کی طبیعت سمجھنا ہر کس و ناکس کے اختیار میں نہ ہوگا۔

علم الدین کا یہ گھرانا بیسویں صدی کے پہلے عشرے کا روایتی لاہوری خاندان تھا۔ آٹھ ذیقعدہ 1326 بمطابق چار دسمبر 1908 بروز جمعرات پیدا ہونے والے اس بچے نے بہت محبت سمیٹی تھی۔ تاریخی وتہذیبی لحاظ سے اس عظیم الشان شہر کے قدیم بازار رنگ محل کے علاقہ 'سریانوالہ او جھریاں والا' کے محلّہ 'چابک سواراں' میں طالع مند کا چھوٹا سا گھر واقع تھا۔ طالع بلحاظ پیشہ بڑھئی تھا۔ اس کے کام کی مہارت مسلمہ تھی۔ متحدہ ہندوستان میں اسے دور دراز علاقوں کا سفر بھی درپیش رہتا۔ اس کے ہنر کی شہرت نے ہر سو اپنے جھنڈے گاڑ رکھے تھے۔ نظام دکن 'میر عثمان علی خاں' کے محل میں کام کے بعد تو اسے ایک خصوصی سند بھی ملی تھی۔ طالع مند کو بھی ہر باپ کی طرح اپنی اولاد سے بے

حد محبت تھی۔ علم الدین کی من موہنی صورت اور خیرہ کن مسکراہٹ تو یوں بھی ہر ایک کو متاثر کرتی تھی۔ وہ ان بچوں میں سے تھا جو مقابل کی توجہ خود کار انداز میں اپنی طرف کھینچ لیا کرتے ہیں۔ پاؤں پاؤں چلنا شروع ہوا تو گھر کی کوئی بھی شے اس کی دسترس سے محفوظ نہ رہ سکی۔ اس چھوٹے سے گھر میں سامان تھا ہی کتنا؟ ماں صفائی ستھرائی کر کے سب کچھ سمیٹ کر اپنے ٹھکانے پر رکھتی، کسی دوسرے کام کی طرف متوجہ ہوتی تو علم الدین کسی بگولے کی طرح سب کچھ تلپٹ کر دیتا۔ کبھی باورچی خانہ میں پہنچ کر برتنوں کو گرائے انوکھے ساز سے لطف اندوز ہوتا تو کبھی خشکہ اپنے اوپر گرا کر سفید بھوت بنا خوشی سے تالیاں بجانے لگتا۔ والدہ تلملا جاتیں لیکن پھر اس کی معصوم صورت دیکھ کر ان کا دل فوری پسیج جاتا اور وہ اپنے دل کو تسلی دیتے ہوئے سوچتیں۔

”کوئی بات نہیں! ابھی بچہ ہی تو ہے۔ آہستہ آہستہ خود ہی سمجھ جائے گا۔“

کچھ عرصہ مزید گذرا تو اس کی شرارتوں نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔ والدہ اسے نہلا دھلا کر صاف ستھرے کپڑے زیب تن کرواتیں اور آنکھوں میں ڈھیروں سرمہ لگا کر ایک ٹیکہ کان کے پیچھے لگا دیتیں تاکہ وہ نظر بد سے محفوظ رہے۔ علم الدین اچھلتا کودتا محلّہ میں کھیلنے نکل جاتا اور اس کے بعد ہم عمر بچوں کی جانب سے شکوے شکایتوں کا ایک بازار گرم ہو جاتا۔

”چاچی! علم الدین نے میرا کان مروڑا تھا۔“

”ماسی! علم الدین نے مجھے دھکا دے کر گرا دیا۔ میرے گوڈے (گھٹنا) پر چوٹ لگ کے خون نکل آیا ہے۔“

وہ شکایتوں کا یہ انبار دیکھ کر اکثر پریشان ہو جایا کرتی۔ ”علم الدین! تو کیوں اتنا شیطان کا ٹوٹا (نہایت شرارتی بچے کے لیے ایک مخصوص پنجابی اصطلاح) ہو گیا ہے۔“

”خبردار نیک بخت! تو نے کبھی علمو یا کسی بھی بچے کو اس لفظ سے نہیں پکارنا۔“ طالع مند نے ایک روز اسے ٹوکا۔

”وہ کیوں بھلیا لوکا؟“ سیدھی سادی سی اس عورت کی حیرت بجا تھی۔ یہ لفظ تو زبان زد عام تھا اور عورتیں بڑے فخر سے اپنی اولاد کی شرارتوں کا تناسب اسی مناسبت سے بیان کرتی تھیں۔

”جمعہ کو خطبہ میں مولانا صاحب نے بتایا تھا کہ اس لفظ کا مطلب ہوتا ہے اللہ کی رحمت سے دھتکارا گیا۔ ہمیں

سید کرار مرزا 30 جولائی 1916 کو دہلی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ 30 برس تک تعلیم و تربیت کے بعد نشریاتی ادارے سے وابستہ ہوئے اور راولپنڈی آ کے ریڈیو پاکستان میں ملازم ہوئے پھر کراچی آ گئے۔ کئی اخبارات اور رسائل کی ادارت کی۔ شعری مجموعہ ”میری غزل“ 1980 کی دہائی میں جب کہ نعتیہ مجموعہ ”میزان حق“ (بعد وفات 1993) میں شائع ہوا۔ نذرالاسلام کی بنگلہ نظموں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ 8 اگست 1990 کو وفات پائی عزیز آباد قبرستان میں دفن ہوئے۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم

علم بھی نہیں ہوتا اور ہم انجانے میں اپنے بچوں کو ایک راندہ درگاہ سے منسوب کر دیتے ہیں۔“

”ہائے ہائے بھلیا لوکا! یہ تو بڑی ماڑی گل (نامناسب بات) ہے۔ ہم تو گناہ کماتے ہیں۔“ وہ دہل گئی۔

”ہاں! اور فکر نہ کر! خیر سے اپنا علمو پانچ سال کا ہو گیا ہے۔ اسے مسجد میں بٹھانے کا وقت آگیا ہے۔ اب آہستہ آہستہ خود ہی ذمہ داری اور سنجیدگی بھی سیکھ لے گا۔“ وہ روٹی کا لقمہ سالن میں ڈبوتے ہوئے بولا۔

اگلے ہی روز اسے محلّہ کی مسجد میں پڑھنے کے لیے بھیج دیا گیا جہاں مولانا صاحب نے دیگر بیسیوں بچوں کے ساتھ اسے بھی قرآن ناظرہ کی تعلیم دینے کا آغاز کر دیا۔ طالع مند بیٹے کو ذمہ دار اور باشعور ہاتھوں میں سونپ کر خوش اور مطمئن تھا لیکن یہ اطمینان بھی عارضی ثابت ہوا۔ اسے شرارتوں کے لیے ایک نیا اور وسیع تر پلیٹ فارم میسر آگیا تھا۔ آغاز میں خاموشی اور تابعداری سے وقت گزارنے کے بعد وہ ایک نئے سرے سے شرارتوں میں مگن ہو گیا۔ اس کی ذہانت میں کوئی دو رائے نہ تھی۔ ہاں وہ بات الگ تھی کہ اس قدرتی صلاحیت کو مثبت رنگ نہیں دے پا رہا تھا۔ مولانا صاحب پہلے پہل تو اس کی یہ تخریب کاریاں طوعاً و کرہاً برداشت کرتے رہے لیکن بالآخر ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ مسجد کے منظم و سخت گیر ماحول میں نقص امن کے بڑھتے واقعات نے انہیں طالع مند سے بات کرنے پر مجبور کر دیا۔

”اس کو کیا کھلاتے ہو طالع مند؟ نچلا بیٹھنا تو اس لڑکے نے سیکھا ہی نہیں۔“

”میں تو خود اس کی حرکتوں سے بڑا عاجز ہوں مولوی

جی! گھر میں بھی سب کے ناک میں دم کیے رکھتا ہے۔'' وہ گہری سانس بھر کے رہ گیا۔ ''پڑھائی میں تو ٹھیک ہے ناں ویسے یہ؟''

''ارے! پڑھائی میں اس کا دل لگتا ہی کہاں ہے؟ ادھر سبق دیا جائے تو ادھر یہ کسی کو چٹکی کاٹنے لگتا ہے۔ کبھی کسی کے ساتھ درختوں پر چڑھ کر پھل اتارنے کے منصوبے بنانے لگتا ہے۔ خود سکون سے بیٹھتا ہے نہ کسی کو چین سے رہنے دیتا ہے۔ اب تو اس کی دیکھا دیکھی دیگر لڑکے بھی میرے قابو سے باہر ہونے لگے ہیں۔'' مولانا صاحب خاصے بھرے بیٹھے تھے۔

''بچہ ہے جی معاف کر دیجیے۔ میں سمجھاؤں گا اسے گھر میں بھی۔''

''بچہ! یہ بچہ نہیں ہے طالع مند، آفت کا پرکالا ہے۔ تمہارے بڑے بیٹے کو بھی پڑھایا تھا لیکن اس کے اندر تو جانے کون سی بے چین روح سمائی ہے۔ میں اپنی کوتاہی بھی تسلیم کرتا ہوں۔ یہ لڑکا میرے قابو سے باہر ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اسے کہیں اور پڑھنے بٹھا دو ورنہ گھر میں ہی پڑھا لیا کرو۔'' مولانا کے حتمی انداز پر طالع مند بے بسی سے انہیں دیکھ کر رہ گیا۔ وہ انہیں اپنا فیصلہ تبدیل کرنے کے لیے قائل تو نہ کر سکا البتہ گھر آنے کے بعد اس نے بیوی اور بیٹے کی خوب کلاس لی جس کا لب لباب یہی تھا کہ علم الدین نے آج اس کی ناک کٹوا دی ہے۔ آباؤ اجداد کی عزت پر اس کی شرارتوں کے باعث بٹہ لگ گیا ہے اور اس کی ذمہ دار بھی علم الدین کی والدہ ہی ہے جو بیٹے کی تربیت میں مطلوبہ رنگ نہیں بھر پائی۔ شوہر کو گرجتے برستے دیکھ کر روہانسا ہوتی بیوی اپنی صفائی میں یہ بھی نہ کہہ سکی کہ وہ بیٹے کی بہترین تربیت کے لیے ہر ممکن کوشش کیا کرتی ہے لیکن یہ مشرقی معاشرے کا ازلی دستور ہے کہ جب بچہ مثبت و تعمیری کردار کا مظاہرہ کرے تو ہر والد اپنا سینہ فخر سے چوڑا کیے 'مونچھوں کو تاؤ دے کر کہتا ہے کہ 'آخر بیٹا کس کا ہے بھئی؟' اور اگر وہی اولاد کسی منفی سرگرمی میں ملوث پائی جائے تو اس کا ملبا نہایت اہتمام و اطمینان سے والدہ کے سر ڈال دیا جاتا ہے۔ طالع مند نے بھی یہی کیا اور خوب گرجنے برسنے کے بعد اعلان کیا۔

''میں اسے بالکل شتر بے مہار بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ خیر سے سات سال کا ہو گیا ہے۔ اس پر نماز فرض ہو چکی ہے۔ یہ میرے ساتھ ہی نماز پڑھنے مسجد جایا کرے گا۔ دیکھتا ہوں اس فریضہ میں کیسے کوتاہی کرتا ہے؟ مار مار کر چمڑی نہ ادھیڑ دی تو میرا بھی نام نہیں۔''

علم الدین دم سادھے باپ کا نیا روپ دیکھ رہا تھا۔ آگہی کے اس لمحہ میں اسے احساس ہو گیا کہ اب اپنی طوفانی طبیعت پر تھوڑا بند باندھنے کا وقت آ گیا ہے۔

☆......☆

فریضہ نماز کی ادائیگی اور درس حاصل کرنے کے لیے طالع مند 'چھیانوالی مسجد' جایا کرتا تھا۔

یہ اہل توحید کی مسجد تھی۔ 'مولانا سید عبدالواحد غزنوی' یہاں کے منتظم تھے۔ درس قرآن میں ان کی شہرت بے مثل تھی۔ طالع مند نے بہت سوچ بچار کے بعد علم الدین کو بھی اس درس میں اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مطمع نظر یہی تھا کہ عزیز از جان بیٹا 'پیغام الٰہی' سے بہرہ مند ہوتا رہے۔ کچھ ہی روز میں علم الدین نے کائنات کے اعلیٰ و ارفع جذبے پر محیط درس حیات حاصل کر لیا۔ اس روز مولانا صاحب نہایت دلگداز انداز میں 'سورۃ آل عمران' کی آیت 31 کی تلاوت کے بعد ترجمہ بیان کر رہے تھے۔

''اے نبیؐ! کہہ دیجیے! اگر تم لوگوں سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا رحیم ہے۔'' انہوں نے لحاتی توقف کیا اور آنکھوں میں گہری چمک لیے گویا ہوئے۔ ''عزیزان من! آج کا یہ درس بے پناہ اہمیت کا حامل ہے۔ نبی آخرالزماں حضرت محمدؐ کا مقام و مرتبہ۔''

''سبحان اللہ...... سبحان اللہ'' حاضرین وجد کے عالم میں جھوم سے اٹھے۔ اپنی شہادت کی انگلی اور انگوٹھوں کو ہونٹوں سے چوم کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے وہ بے حد عاجز نظر آ رہے تھے۔ علم الدین کے لیے یہ کیفیت بالکل انوکھی تھی۔ اس نے طالع مند کو بھی جب یہی عمل دہراتے دیکھا تو بے اختیار خود بھی یہی کرنے لگا۔

''اللہ تبارک و تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو اپنے آخری پیغام 'قرآن مجید' میں جا بجا رسولؐ کی اطاعت و محبت کا حکم دیا ہے۔ صرف یہی نہیں، ہمارے ایمان کی اساس 'کلمہ طیبہ' بھی دو ہی باتوں پر مشتمل ہے۔ توحید و رسالت۔ ہمارے عقیدے میں یہ بات شامل کر دی گئی ہے کہ نبیؐ سے محبت کی جائے۔ یہ محبت صرف زبانی کلامی دعووں پر قائم نہیں ہونی چاہیے بلکہ ہر صورت میں اتباع و اطاعت کی متقاضی

ہے۔نبی کی عزت وتوقیر میں کوئی کمی نہ رکھی جائے۔یاد رکھیں میرے ساتھیو! حضرت محمدؐ کی اتباع میں ہی رب کی خوشنودی اور آخرت میں نجات ہے۔سب کچھ بھول جانا دوستو! لیکن یہ مت بھولنا کہ ہمارے پیغمبرؐ خاتم النبیین ہیں۔ رحمۃ اللعالمین ہیں۔بشیرونذیر ہیں۔سراج منیر ہیں۔شافع روزمحشر ہیں۔جس مسلمان کے دل میں رسول اللہؐ کی اطاعت ومحبت کا جذبہ نہیں اُسے توحید کا اقرار بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔'' ان کی آواز کا زیروبم علم الدین کو سحرزدہ کر چکا تھا۔وہ تجسس' حیرانی اور فخر کے ملے جلے جذبات سے ایک منفرد ہستی سے متعارف ہورہا تھا۔دل میں ایک میٹھا میٹھا سا جذبہ ابھر رہا تھا جسے فی الوقت وہ کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھا۔

''حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا'تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اسے اس کے والدین' اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔'' مولانا صاحب کی آواز دوبارہ سماعت میں پڑی تو دھڑکنیں ایک لمحہ کے لیے ساکت ہوگئیں۔اسے ہستی اقدسؐ سے پل بھر میں ہی الفت وانسیت محسوس ہونے لگی تھی۔

''پروردگار ہمیں عشق کی یہ منزلیں طے کرنے کے قابل کیسے بنائے گا مولانا جی؟'' اس نے طالع مند کی گلوگیر آواز سنی۔

''اس منزل تک رسائی کے لیے سب کچھ فراموش کرنا پڑتا ہے میرے عزیز! اس عشق کا سبق سیکھنا ہے تو حضرت اویس قرنیؓ سے سیکھو جنھوں نے محبوبؐ کے دندان مبارک شہید ہونے کی خبر سن کر یکے بعد دیگرے اپنے سبھی دانت توڑ لیے تھے۔یا اس صحابیہؓ سے سیکھو جنہیں غزوہ احد میں شوہر اور بھائی کی لاشیں ملیں تو وہ ان پر غمگین ہونے کی بجائے اس بات پر بے حد خوش تھیں کہ نبی کریمؐ بخیریت ہیں۔کہنے لگیں رسول اللہؐ پر میں اور میری باقی آل اولاد بھی قربان۔ان صحابہ کرامؓ کی محبت وعشق کا یہ عالم ہوتا تھا کہ آپؐ کے وضو کا پانی بھی زمین پر گرنے نہ دیتے تھے۔'' مولانا صاحب کی باتیں اس کے دل ودماغ کو معطر کررہی تھیں۔وہ ایک تبدیلی خاص کا لمحہ تھا۔چنیانوالی کی مسجد میں ہونے والے اس درس نے علم الدین کی فکروسوچ کے زاویے ہی تبدیل کردیئے۔اب وہ باقاعدگی سے والد کے ساتھ یہاں آتا اور دین کے مختلف پہلوؤں سے آشنائی حاصل کرنے لگا لیکن عجیب تر امر تو یہ تھا کہ حصول تعلیم سے وہ اب بھی کوسوں دور بھاگتا تھا۔ان دنوں انگریزی تعلیم کے لیے دوسرے مدرسے تھے۔پرائمری تک مفت تعلیم دی جاتی تھی۔اس کے بعد سرکاری وغیرسرکاری درسگاہیں بھی موجود تھیں لیکن علم الدین کا کیا کیا جاتا کہ وہ کسی طور پڑھنے کی جانب آتا ہی نہ تھا۔والدین کے سمجھانے اور دباؤ کے باوجود اس میں کوئی تبدیلی نہ آسکی۔والدین کی قوت برداشت اب ختم ہونے لگی تھی۔

☆......☆

اولاد جب پڑھائی میں دلچسپی نہ لے' دینی تعلیم سے بھی راہ فرار حاصل کرے تو والدین کا سب سے پہلا نشانہ اس کے دوست ہی بنا کرتے ہیں۔طالع مند بھی علم الدین کو سمجھا بجھا کے عاجز آگیا تو اس کے واحد دوست 'عبدالرشید' کو موردالزام ٹھہرانے لگا جس کے والد کی بابت شنید یہی تھی کہ وہ قمار باز ہے۔

''آج کے بعد یہ مجھے اس شیدے کے ساتھ پھرتا نظر آیا تو میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔'' اس نے غصہ سے

علم الدین کا شجرہ نسب:

''علم الدین ولد طالع مند ولد عبدالرحیم ولد اللہ جوایا ولد فضل دین ولد عبداللہ ولد محمد عیسیٰ ولد بابالسنا''

بابالسنا سکھ برادری سے تعلق رکھتے تھے۔حلقہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد ان کا نام 'برخوردار' رکھ دیا گیا۔

☆☆☆

غازی علم الدین کا جنازہ تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔تاریخی کتب سے علم ہوتا ہے آج تک دنیا میں سب سے بڑا جنازہ 'حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ' کا ہوا ہے۔ان کی وفات دس رجب 150ھ میں ہوئی تھی۔اسی روز ان کا جنازہ چار مرتبہ پڑھایا گیا اور ہر دفعہ کم وبیش پچاس ہزار انسانوں نے شرکت کی جبکہ غائبانہ جنازہ چوبیس دن تک پڑھایا جاتا رہا جس کی تعداد کا شمار ممکن ہی نہیں۔

دوسرا عظیم جنازہ 'مولانا محمد جلال الدین رومیؒ' کا تھا۔ان کی وفات پانچ جمادی الآخر 672ھ میں ہوئی اور صبح سے شام تک جنازہ پڑھایا جاتا رہا۔

بیوی اور بڑے بیٹے محمد الدین سے کہا۔ ''آوارہ لڑکوں کے ساتھ پھر کر خود بھی آوارہ ہوتا جا رہا ہے۔ بس بہت لاڈ پیار ہو گئے۔ اب اسے تیر کی طرح سیدھا کر لوں گا میں۔''

''لیکن ابا جی! شیدا الوفریا آوارہ نہیں ہے۔ وہ تو بہت اچھا لڑکا ہے۔'' علم الدین اپنے اکلوتے دوست کے کردار پر یہ بہتان برداشت نہ کر پایا۔

''خاموش ہو جا علمو! باپ سے زبان لڑاتا ہے۔ میں اس معاملہ میں تیرا کوئی لحاظ نہیں کروں گی۔'' ماں نے بھی تیور دکھائے۔ ''چل اندر جا کے سو جا۔'' وہ اس وقت شوہر کا غصہ سرد کرنے کے لیے بیٹے کو نظروں سے اوجھل کرنا ہی مناسب سمجھ رہی تھی۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا اندر چلا گیا۔ بڑا بھائی بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔

''بڑا ہی ستار کھا ہے اس نے۔ محمد الدین پڑھائی لکھائی میں سنجیدہ ہے مگر اسے تو کسی ذمہ داری کا احساس ہی نہیں۔ خدا جانے کیا بنے گا اس کا؟'' طالع مند نے بیوی سے کہا۔

''مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اس پر کسی نے کچھ کروا دیا ہوا ہے۔'' بیوی نے پریشانی سے جواب دیا۔

''مجھے بھی کبھی کبھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ سوچ رہا تھا کہ اسے کسی بزرگ سے دم کروا کر تعویذ لکھوا لاؤں۔'' اس کی تجویز پر اہلیہ نے بھی شد و مد سے تائید کر دی۔ طالع مند اگلے ہی روز علم الدین کو ساتھ لیے خواجہ حسن ولیؒ کے پاس چلا آیا۔

''حضرت! میرے بیٹے کے لیے دعا کیجیے کہ اللہ اسے ہدایت کی راہ دکھا دے۔'' اس نے پریشانی سے کہا۔ خواجہ صاحب نے علم الدین کی پیشانی دیکھی تو بے اختیار چونک گئے اور سنبھلتے ہوئے گویا ہوئے۔ ''انسان بہت بے صبرا اور جلد باز ہے۔''

''یہ کوئی کام نہیں کرتا پیر صاحب! بہت نکمی اولاد ہے یہ۔'' طالع مند ان کی بات سمجھ ہی نہ پایا تھا۔

''فکر نہ کرو۔ اس کی قسمت میں ایسا کام لکھا ہے کہ دنیا یاد رکھے گی۔ تمہیں بھی اس کے حوالے سے تا قیامت یاد رکھا جائے گا۔'' انہوں نے علم الدین کی پیشانی پر بوسہ ثبت کیا اور آنکھیں موند کر اپنے وظیفہ میں مشغول ہو گئے۔ طالع مند نا سمجھی اور مایوسی کے عالم میں بیٹے کو لیے گھر لوٹ آیا۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ علم الدین کو اب آبائی پیشہ کے بنیادی اسرار و رموز سکھانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔

اس روز کے بعد طالع مند نے اسے اپنے ساتھ ہی نتھی کر لیا۔ علم الدین والد کا ہاتھ بٹاتا اور کام بھی سیکھتا رہا۔ اہل خانہ نے بھی اگلے کچھ سالوں میں یہ حقیقت تسلیم کر لی کہ وہ نجاری ہی کو اپنا ذریعہ معاش بنائے گا۔ تیز دھار اوزاروں کو جنبش دست سے رقص کرواتا علم الدین والد کی صحبت میں رہ کر ایثار، احسان، خلوص، دیانتداری، شرافت اور دلیری سیکھتا ہوا عہد بلوغت تک آن پہنچا۔ اب وہ دونوں مختلف شہروں میں ملنے والے کام کے لیے اکثر لاہور سے غیر حاضر رہتے۔ غم روزگار و معاش میں الجھے رہنے کے باعث وہ ان سازشوں سے بے خبر تھے جو دھیرے دھیرے کسی بدترین سونامی کی طرح لاہور میں تباہی و بربادی کی ایک نئی داستان رقم کرنے والی تھیں۔

☆......☆

علم الدین کا عہد بلوغت وہ دور تھا جب برصغیر کے مسلمانوں میں اپنے بنیادی سیاسی حقوق کا شعور گہرا ہونے لگا تھا۔ وہ سیاسی بیداری کے بعد برطانوی سامراج کو ناکوں چنے چبوا رہے تھے۔ سدا کی سازشی اور مکار انگریز قوم کے لیے یہ صورت حال کیونکر قابل برداشت ہو سکتی تھی؟ وہ اپنی اس غلام قوم کو کسی بھی طور سر اٹھانے کے قابل نہیں رکھنا چاہتے تھے اور اس کے لیے ان کے پاس ایک بہترین حکمت عملی 'تقسیم کرو اور راج کرو' پہلے سے ہی موجود تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اسے گاہے بگاہے مختلف زاویوں سے دہرایا جاتا رہے۔ تحریک خلافت میں مسلمانوں کے جوش و جذبہ اور ایک الگ سیاسی جماعت مسلم لیگ کے قیام نے انگریزوں کو انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا لہٰذا ایک مرتبہ پھر برطانوی سامراج کے بہترین دماغوں نے فیصلہ کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو مذہبی معاملات میں الجھا دیا جائے تاکہ وہ سیاسی طور پر آگے بڑھنے کے قابل ہی نہ رہ سکیں۔ ان کی معاونت کے لیے ہندو ہمیشہ ہی ان کے ہاتھوں کھلونا بن جاتے تھے۔ اپنے کردار کی کم ظرفی اور کینہ و حسد کے باعث وہ مسلمانوں کو زک پہنچانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ اس ضمن میں ان کی نگاہ انتخاب 'راجپال' پر جا ٹھہری۔ وہ ایک اعزازی پروفیسر اور ناشر تھا۔ اسپتال روڈ پر اس کی ایک کتابوں کی دکان تھی۔ راجپال 'آریہ سماج' کا ایک متعصب اور فعال ترین رکن تھا۔ مسلم دشمنی اور مذہبی جارحیت میں 'آریہ سماج' کا کردار ناقابل

فراموش تھا جو اسلام کے خلاف ایک انتہا پسند تحریک تھی۔ اس کی بنیاد 'سوامی دیانند سرسوتی' نے 10 اپریل 1875 کو بمبئی میں رکھی تھی۔ اپنی ذاتی تعلیمات میں تو وہ دیوی دیوتاؤں اور مورتیوں کی پوجا کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ ستی کی رسم، بچپن میں کی جانے والی شادیوں اور ذات پات کے نظام کا مخالف تھا لیکن اسلام دشمنی میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اس نے پیغمبر اسلامؐ کے خلاف 1875 میں 'ستیارتھ پرکاش' شائع کی اور اپنی تنظیم کے توسط ہندوستان میں لامتناہی فسادات کی بنیاد رکھ دی۔ راجپال بھی اسی مشن کو آگے بڑھانے میں پیش پیش تھا۔ انگریز افسران نے خوب مکاری، چاپلوسی اور منافقت سے اپنا مطمع نظر اس کے سامنے رکھ دیا۔

''صاحب بہادر! یہ کام بڑا خطرناک ہے۔'' وہ مسلمانوں کی مذہبی عقیدت اور جوش جنون سے کہیں نہ کہیں خائف بھی تھا۔

''ہم ہر طرح سے تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ڈونٹ وری! کسی بھی طرح یہ کتاب لکھواؤ اور اسے خود شائع کرو۔''

''وہ تو ٹھیک ہے صاحب بہادر! لیکن مسلے کبھی بھی اپنے نبیؐ کے متعلق ایک لفظ بھی برداشت نہیں کرتے۔ یہ مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں۔''

''اس کی فکر نہ کرو! قانون، آئین اور پولیس مکمل طور پر تمہارے ہاتھ مضبوط کرے گی، اگر پھر بھی تمہیں کچھ تحفظات ہیں تو ہم یہ کام کسی اور کے سپرد کر دیتے ہیں۔ ہمیں افرادی قوت کی کمی تو نہیں ہے۔'' انہوں نے بے نیازی جتائی تو لالچی، جاہ طلب اور کینہ پرور راجپال اس مذموم سازش کا عملی حصہ بننے کے لیے تیار ہو گیا۔ آریہ سماج کا ہیڈ کوارٹر لاہور میں قائم ہونے سے اسے یوں بھی بہت سہولیات میسر آچکی تھیں۔ بے حد سوچ بچار کے بعد اس نے پرتاپ کے مہاشہ کرشن سے رابطہ کیا۔ متنازعہ اسلامی کتب سے مختلف واقعات اور ضعیف احادیث جمع کیں، ان میں اضافہ اور کمی کے بعد اصل پس منظر سے الگ کیا اور کتابی شکل میں شائع کرنے کے لیے مسودہ تیار کروا کر مصنف کا نام گمنام رکھتے ہوئے 1923 میں ایک ایسی کتاب منظر عام پر لے آیا جس کا نام ہی مسلمانوں کے جذبات مجروح کرنے کے لیے کافی تھا۔ کتاب کی اشاعت نے ہندو مسلم اتحاد کا ایک ہی جھٹکے میں خاتمہ کر دیا۔ دلوں میں

غازی علم الدین کے جنازے میں تقریباً چھ لاکھ مسلمان شریک ہوئے تھے جبکہ اس وقت لاہور محض، دو لاکھ نفوس پر مشتمل تھا۔ جنازے کا جلوس ساڑھے پانچ میل لمبا تھا۔ نماز جنازہ چار مرتبہ پڑھائی گئی۔ مولانا شمس الدین، سید دیدار علی شاہ، سید احمد شاہ اور چوتھی مرتبہ پیر جماعت علی شاہ نے یہ فریضہ سرانجام دیا۔ پہلی نماز میں دو لاکھ افراد شریک تھے۔ جہاں پر جنازہ رکھا گیا تھا وہاں اب مسجد تعمیر ہو چکی ہے اور چارپائی والی جگہ پر مسجد کا محراب بنا ہوا ہے۔ میانوالی میں قبر کشائی کے بعد کفن پر گرد و غبار کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ دوبارہ غسل کے بعد کفن پہلا ہی رہنے دیا گیا۔ ان کا مزار میانی صاحب قبرستان کے بائیں جانب سڑک کے کنارے ہی واقع ہے۔ زائرین کی آمد کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ مزار کی اندرونی فضا ہمہ وقت بہت معطر رہتی ہے۔

بے شمار گرہیں پیدا ہو گئیں۔ فرنگی آقا کو یہی ماحول درکار تھا وہ ہندوؤں کی پیٹھ ٹھونک کر آگے بڑھنے کی تحریک دیتا رہا۔ درحقیقت وہ ہندوستان میں نفرت کے جذبہ کا سب سے بڑا خریدار تھا۔ اسے علم تھا کہ یہی جذبہ اس کی توانائی کا سرچشمہ ثابت ہوتا رہے گا لہٰذا وہ بے خوف و خطر اپنے غلاموں کو الجھا کر محظوظ ہوتا اور اپنے اقتدار کو تقویت دیتا رہا۔ مسلمانوں نے اس کتاب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیں لیکن شنوائی کہیں بھی نہ تھی۔ راجپال کے خلاف شدید مظاہرے ہونے لگے۔ کتاب کو ضبط کر کے پابندی لگا کر راجپال کی گرفتاری کا مطالبہ زور پکڑنے لگا تو فرنگی حکومت کو ملک میں نقص امن اور اپنے اس 'قیمتی ہرکارے' کے ضیاع کا خدشہ لاحق ہو گیا۔ حالات دن بدن مائل بہ خرابی تھے۔ صورتِ حال کی سنگینی محسوس کر کے اس منصوبہ کے 'ماسٹر مائنڈز' نے ایک بار پھر سر جوڑ لیے۔

''مسلمان سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ ہماری حکومت کے خلاف ان کی نفرت اور غصہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔'' ایک افسر نے کہا۔

''یو آر رائٹ! ان میں کئی لیڈرز تو راجپال کو قتل کرنے کا اعلان بھی کرنے لگے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو ہمارا قیمتی مہرہ اس بساط پر پٹ کر رہ جائے گا۔'' دوسرے افسر نے ایک اور پہلو کی نشاندہی کی۔

''اس مسئلہ کا ایک سادہ ساحل یہی ہے کہ وقتی طور پر ان مسلمانوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے راجپال کو گرفتار کر کے ہلکی پھلکی سزا دے دی جائے۔'' میٹنگ میں ہونے والے اس فیصلہ کے بعد حکومت برطانیہ نے راجپال کے خلاف دفعہ 153 تعزیرات ہند کے تحت مقدمہ درج کر لیا۔ مسلمانوں کے لیے یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ اب وہ خلوص نیت سے اس ملعون کے لیے سزائے موت کے خواہاں تھے لیکن نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ماتحت عدالت نے اسے ایک سال چھ ماہ قید بامشقت اور ایک ہزار روپے جرمانہ کی سزا دے کر مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا۔ مسلمان صدمہ وحیرت سے انگشت بدنداں رہ گئے۔

''یہ کیسا انصاف ہے؟ وہ ہزاروں دردناک اموات کا مستحق تھا۔ محض ڈیڑھ سال قید اور ایک ہزار روپے جرمانہ! یہ سب کیا ہے آخر؟''

''یہ سب ہمارے جذبات کا مذاق بنانے کے لیے کیا جا رہا ہے۔'' ایک رہنما نے کہا۔ ''تم لوگوں نے کبھی انگریزوں کا پسندیدہ کھیل کرکٹ دیکھا ہے جہاں دونوں اطراف سے کھلاڑی کھیلتے ہیں۔ راجپال کا یہ معاملہ بھی کرکٹ کی کوئی جدید شکل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں فرنگی ہی دونوں جانب سے کھیل رہا ہے۔ وہ ہمیں دلاسے اور ہندو کو شاباش دیتا ہے۔''

مسلمانوں کا یہ غم وغصہ کسی آتش فشاں کا روپ اختیار کرتا جا رہا تھا جبکہ دوسری جانب سیاست کی بساط پر ہندو اور انگریزوں کا گٹھ جوڑ ایک نیا گل کھلانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

☆......☆

راجپال اپنی سزا پر بے حد تلملایا ہوا تھا۔

حق فساد کی ادائیگی کے باعث وہ اس بھرم میں زندگی گذار رہا تھا کہ فرنگی آقا اسے کوئی نقصان نہ ہونے دیں گے اسی لیے جب ایک قریبی و ہم راز دوست اس سے ملاقات کے لیے جیل میں آیا تو وہ شکوہ کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''میرے ساتھ دہری چال چلی گئی ہے۔ مجھے شطرنج کے مہرے کی طرح استعمال کر کے اس کال کوٹھری میں سڑنے کے لیے پھینک دیا گیا ہے۔ بہت انیائے کیا ہے صاحب بہادر نے۔''

''ارے نہیں مورکھ! یہ سب تیری بھلائی کے لیے ہی ہوا ہے۔'' دوست نے سرگوشی میں بتایا۔ ''مسلے بالکل آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔ ہمارے مخبروں نے بتایا ہے کہ وہ تجھے ہر قسم کا نقصان پہنچانے کے لیے بھی تیار ہیں۔ یہ کال کوٹھری ہی اس سے تیری جندگی کی جمانت ہے۔''

''واہ رام تیری لیلا نیاری! اب یہ سے آگیا ہے کہ فرنگی سرکار ان مسلوں سے ڈر کر اپنے ہی متر کو قید کرے گی۔'' وہ تلخ ہوا۔

''ارے مورکھ! اتاؤلا کیوں بن رہا ہے؟ تجھے فرنگیوں کی چالیں سمجھ میں آنے لگیں تو ان کی جگہ بادشاہ تو نہ بن جائے۔ وہ بڑا مضبوط قلعہ تیار کر رہے ہیں۔ مسلوں کا مکو ٹھپ ہو جائے گا۔ ابھی تو سیشن کورٹ میں اپیل کر دے۔ اس کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھے گا تو 'ہائی کورٹ' تجھے باعزت بری کر کے قانونی سہاگا دے ڈالے گی۔'' یہ منصوبہ سن کر راجپال کی آنکھوں میں تفکر کی گہری پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ مایوسی اور بے زاری کے بادلوں میں اسے پہلی بار اُمید کی ہلکی سی کرن جھانکتی محسوس ہوئی۔ اس نے سیشن کورٹ میں اپیل دائر کر دی جس کی سماعت 'کرنل ایف سی تکوس' نے کی اور منصوبہ کے عین مطابق 8 فروری 1927 کو ماتحت عدالت کے فیصلے میں تخفیف کر کے سزا صرف چھ ماہ تک قرار دے دی۔ راجپال کو اب اس کھیل میں مزہ آنے لگا تھا۔ اس نے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کر دی۔ 'کرنل دلیپ سنگھ مسیح' کی عدالت نے سماعت شروع کی اور بالآخر ہائی کورٹ کے چیف جسٹس 'سر شادی لال' کی ذاتی سفارش سے 4 مئی 1927 کو سیاہ بخت کے خلاف فیصلہ سناتے ہوئے کہا گیا۔

''کتاب کی عبارت پر کسی کو سزا دینا خلاف قانون ہے۔ عبارت خواہ کیسی ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہو، اگر کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتی تو ناشر کو پرسش نہیں کی جا سکتی۔''

''یہ ناانصافی ہے۔ ہم اس فیصلہ کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔'' عدالت میں موجود مسلمان بھڑک اٹھے۔

''راجپال کو سزائے موت دو! انگریز سرکار مردہ باد۔'' آن ہی آن میں وہاں نعرہ زنی واحتجاج کا ایک بازار گرم ہو گیا۔

''آرڈر۔ آرڈر! یہ لوگ عدالت کی توہین کر رہے ہیں۔ انہیں فوری گرفتار کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔''

اس نئے فیصلہ پر وہ سب اپنے حاکم کے دہرے معیار اور منافقت پر صدمہ سے چور تھے۔ توہین عدالت ان حکام کو برداشت نہ تھی اور خود ان سے وہ اس بات کی توقع

رکھتے تھے کہ مسلمان اپنے محبوب رسول کی شان میں گستاخی خاموشی سے سہہ لیں۔ اس ہستی پر انگلیاں اٹھانے والے کے خلاف کچھ بھی نہ کہیں جنھیں اپنی امت کے سوا اور کچھ بھی عزیز نہ تھا، جو شب و روز صرف امت کی بخشش کے لیے گریہ وزاری کرتے تھے، جو محسن انسانیت اور محبوب خدا تھے اور جن کے بارے میں خود اللہ تبارک و تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تھا کہ نبی کی اطاعت درحقیقت اللہ ہی کی اطاعت ہے۔ یہ کیسا انصاف تھا؟ یہ کیسا معیار تھا؟ نہیں! یہ تو درحقیقت چودہ سو سال قبل فرما دیے گئے اس ارشاد کا عملی ثبوت تھا کہ۔

''یہود و نصاریٰ کبھی تمہارے دوست نہیں ہو سکتے۔''

وہ تب بھی دوست نہ تھے اور اب بھی ظرف و اخلاق کی تمام تر حدود فراموش کیے دشمنی کی ایک نئی مثال قائم کر رہے تھے۔

☆......☆

شاتم رسول کی اس رہائی اور حکومت کی دیدہ دلیری پر ہر مسلمان صدمہ سے بے حال تھا۔ وہ اپنے مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے بے تاب تھے۔ مختلف جلسے کرتے، حکومتی ارکان کے سامنے مطالبے پیش کرتے لیکن کہیں شنوائی ہی نہ تھی۔ راجپال نفرت کا کاروبار دھڑلے سے کر رہا تھا۔ اخبارات میں علماء مذمتی بیان دے کر عملی اقدامات اٹھانے کے لیے مصر تھے لیکن زمینی حقائق تو یہ تھے کہ انصاف فروخت ہو چکا تھا۔ قلم کار، شاعر اور ادیب بھی جہاد بالقلم کا فریضہ احسن طریقہ سے سرانجام دے رہے تھے۔ 'حفیظ جالندھری' نے اس موقع پر کرب و تڑپ سے گندھی ایک نظم 'محمدؐ اصل ایماں ہے' تخلیق کی جسے اگست 1927 میں 'خواجہ حسن نظامی' نے اپنی مرتبہ کتاب 'محمدؐ روشن' میں شائع کیا۔

رسول اللہ کی توہین کو برداشت کرتے ہو
کمال ضبط دکھلاتے ہو یا مرنے سے ڈرتے ہو
تمہاری بے حسی کا آسمانوں پر بھی ماتم ہے
اللہ تعالیٰ یہی وہ قوم ہے جو فخر آدم ہے
رسول پاک کی توہین ہو اور تم رہو زندہ
یہی بے غیرتی ہے جس سے ہے اسلام شرمندہ
محمدؐ کے لیے بھی اب تمہیں غیرت نہیں آتی
'رنگیلا' لفظ سنتے ہو یہ چھاتی پھٹ نہیں جاتی
دل آزاری کا سدباب اگر تم کر نہیں سکتے
تو اتنا ہی کرو، کیا ڈوب کر مر بھی نہیں سکتے

محمدؐ اصل ایماں ہے، یہی خالق کا فرماں ہے
اسی کا نام ہے اسلام، اسی کا نام قرآں ہے
نماز و روزہ، حج و زکوٰۃ اسلام ہے بیشک
مگر ناقص ہیں یہ، حب نبیؐ دل میں نہ ہو جب تک

محمدؐ پر جب تک مال و جان اولاد قرباں ہو
مسلماں لاکھ کہلاؤ، مگر تم نامسلماں ہو
مسلمانو! خدارا آنکھیں کھولو ہوش میں آؤ!
مسلمانو! اٹھو جرأت دکھاؤ جوش میں آؤ!
محمدؐ کے لیے ہر چیز قرباں ہے یہ دکھلا دو
فدا اس نام پر جان مسلماں ہے، یہ دکھلا دو
یہ دکھلا دو کہ تم زندہ ہو، تم میں جان باقی ہے
ابھی اسلام قائم ہے، ابھی ایمان باقی ہے

مسلمانوں کے دلوں میں ایک آگ روشن ہو چکی تھی جو اپنے مجرم و گناہ گار کو صفحہ ہستی سے نابود کر دینا چاہتی تھی لیکن عالم یہ تھا کہ کوئی امید بر نہ آتی تھی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ بے بسی کے اس دبیز اندھیرے میں کچھ نفوس بہرحال ایسے بھی تھے جو اپنے دل میں اس ملعون کو قتل کر دینے کی خواہش پر عمل درآمد کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ انہی افراد میں سب سے پہلے قدم اٹھانے والا شخص 'خدا بخش اکو جہاں' تھا۔

☆......☆

وہ 24 ستمبر 1927 کا چمکیلا دن تھا۔

موسم میں گرمی اور حبس کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ راجپال اپنے ایک قریبی ساتھی کے ساتھ تانگے پر سوار بڑی شان سے لاہور کی سڑکوں پر وندناتا پھر رہا تھا۔ ہائی کورٹ سے بریت کے بعد اس کے تیور ہی شاہانہ ہو چکے تھے۔ وہ ایک 'فرعون' بن چکا تھا۔ راہ گیر ہندو اسے پہچان کر کورنش بجا لانے لگتے۔ ان کا فدویانہ رویہ راجپال کے تکبر کو مزید ہوا دے کر اس کی انا کو بے پناہ تسکین پہنچاتا تو دوسری جانب مسلمانوں کے چہروں سے چھلکتی واضح نفرت اور طیش دیکھ کر اس کی گردن فخر و غرور سے تن جاتی۔ اس روز بھی وہ انہی جذبات کو پوری شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ یکا یک کوئی برق رفتاری سے تانگے کو روک کر پائیدان پر پاؤں جمائے اس کی طرف لپکا۔ سرخ و سفید رنگت، گھنگریالے بالوں اور صحت مند وجود کا حامل یہ تیس سالہ فرد اندرون یکی دروازے کا کشمیری شیر فروش تھا جو اپنے چاقو سے راجپال کا

زخرہ ادھیڑ دینا چاہتا تھا۔ خدا بخش نے پوری قوت سے اس پر وار کیا لیکن شومئی قسمت وہ جھکائی دے کر وار بچانے میں کامیاب ہو گیا، خنجر کی تیز دھار اس کے کندھے کو چیرتی ہوئی گذری تو راجپال کو اپنے بدن میں مرچیں سنسناتی محسوس ہونے لگیں۔ خون ابلتا ہوا اس کا لباس بھگو رہا تھا۔ خدا بخش نے للکارتے ہوئے دوسرا وار کرنا چاہا لیکن راجپال کے دوست' کوچوان اور راہگیروں نے اسے دبوچ کر سڑک پر پٹخ دیا۔

''چھوڑ دو مجھے! میں اس لعنتی انسان کو موت کے حوالے کر کے ہی دم لوں گا۔ میں اسے ہر اس شخص کے لیے عبرت کا نشان بنا دوں گا جو میرے آقا کے بارے میں منفی سوچ رکھے گا۔'' وہ مچل کر عوام کی گرفت سے خود کو آزاد کروانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن قسمت اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس کی گرفتاری کے بعد طے شدہ منصوبہ کے مطابق وکیل صفائی کی سہولت دیئے بغیر عجلت میں سات سال قید با مشقت کی سزا سنا دی گئی۔

''میرے فرنگی دوستوں کا بھی جواب نہیں۔ ایسے شاندار انیائے کے بعد کوئی مسلا دوبارہ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔'' وہ اپنے زخم کو سہلاتا جام اٹھا کر کہنے لگا۔ احباب کے تائیدی قہقہے اور شراب و شباب کا سرور محفل کو مکمل طور پر گرما چکا تھا۔

☆......☆☆

جاڑے کی آمد آمد تھی۔

سورج کی قہر برساتی کرنوں کا شباب اب کسی دوشیزہ کی مہربان نرماہٹ اور اپنائیت میں ڈھلنے لگا تھا۔ لاہور کے چوراہوں' سڑکوں' دکانوں اور گلی کوچوں میں ہر سو انگریز سرکار کی' پھرتیاں' زبان زدِ عام تھیں۔ اس قدر برق رفتار سزا کے اعلان نے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں کر دی تھی کہ مکروہ سیاست کی اس بساط پر انہوں نے اپنے مہرے بہت سوچ سمجھ کر پھیلائے ہیں۔

اس روز اکتوبر کی نو تاریخ تھی۔ انارکلی کے قدیم تاریخی بازار میں بھی مختلف ٹولیوں میں بٹے لوگ خدا بخش کے بارے میں ہی گفتگو کر رہے تھے کہ اس دوران ایک افغانی وہاں آنکلا۔ 'عبدالعزیز' نامی یہ نوجوان بلحاظ پیشہ ایک تاجر تھا اور اسی دن ہی تجارت کی غرض سے لاہور آیا تھا۔

''کیا بات ہے یارا؟ یہاں اتنی خاموشی کیوں ہے؟ جب سے آیا ہوں ہر کسی کا چہرہ ستا ہوا اور آنکھیں اداس و مضطرب دکھائی دے رہی ہیں۔'' اس نے ایک دکاندار سے دریافت کیا۔

''یہ خدا بخش اکو جہاں کے راجپال پر ناکام حملے اور اسے ملنے والی سزا کے بارے میں چہ گوئیاں کر رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''یہ خدائی خوار راجپال کون ہے؟''

''شاتم رسول...... اس بدبخت نے ایک کتاب......''

''بس! آگے ایک لفظ نہیں یارا! میرے لیے اس کا تعارف ان دو لفظوں میں ہی کافی ہے۔ مجھے اتنا بتا دو کہ یہ خنزیر اس شہر کے کس کونے میں دھرتی کا بوجھ بنا موجود ہے؟ قسم پروردگار کی! میں اسے اگلا سانس بھی لینے نہ دوں گا۔''

عبدالعزیز کی آنکھوں میں لہو اتر آیا۔

''اسپتال روڈ پر اس کی کتابوں کی دکان ہے۔ وہیں موجود ہوگا وہ۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہے۔'' دکاندار نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے کہا۔

عبدالعزیز کسی بگولے کی مانند اپنے لباس میں پہلے سے ہی موجود خنجر چھپاتا وہاں سے روانہ ہو گیا۔ مختلف لوگوں سے پتا پوچھتے ہوئے دکان میں پہنچا تو گدی پر بیٹھے ایک شخص نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔ اس کی پیشانی پر کشک اور نیم شفاف سر پر بالوں کی ایک چوٹی تھی۔ اندرونی جانب دو ملازمین کتابوں کے ساتھ معروف نظر آ رہے تھے۔ عبدالعزیز بلا تاخیر آگے بڑھا اور برق رفتاری سے خنجر زنی کرتے ہوئے پل بھر میں ہی اس کا جسم لہولہان کر دیا۔

''تو نے اس کائنات کے محسنؐ پر انگلی اٹھائی ہے۔ ارے بدبخت! ہم تو ان کے لیے اپنی جان' مال' اولاد تک قربان کر دیں۔ تیری کیا حیثیت ہے؟'' اس کے ہاتھ رک ہی نہ رہے تھے۔

''ارے مار دیا! اس مسلے نے ستیانند جی کو مار ڈالا۔'' ایک ملازم واویلا کرتا ہوا دکان سے باہر جا پہنچا۔ آن ہی آن میں وہاں ہندو برادری کا مجمع لگ گیا اور عبدالعزیز کو جکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔

راجپال کا ستیانند نامی وہ دوست جاں بہ لب تھا۔ اس کے جسم پر وحشیانہ وار دیکھ کر راجپال کے بدن میں پھریری دوڑ گئی۔ اسے بخوبی علم تھا کہ اس کا معاون قانون عبدالعزیز کو بھی چند ہی دنوں میں سات سال قید با مشقت اور جرمانہ کی سزا سنا کر پابند سلاسل کر دے گا لیکن اس کے

بعد کیا ہوتا؟ پندرہ روز میں دو قاتلانہ حملوں نے اس کے دل و دماغ میں آندھیاں برپا کردی تھیں۔ وہ اپنی فریاد لیے ایک بار پھر گورا صاحب کے پاس جا پہنچا۔

''ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا مسٹر راجپال! ریلیکس ہو جاؤ۔'' افسر نے پچکارا۔

''آپ نے ستیا نند کا حال نہیں دیکھا کیا؟ اس مسلے نے قیمہ بنا دیا تھا اس کا۔ میں تو یہی سوچ کر کانپ جاتا ہوں کہ اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو......''

''اگر مگر چھوڑو۔ اب تم چاہتے کیا ہو؟ سیدھی طرح بتاؤ!''

''میری سرکھشا کے لیے سنتری بھیج دیجیے۔ وہ گھر اور دکان میں مجھے سرکھشت رکھیں بس! دو بار تو قسمت میرا ساتھ دے چکی ہے۔ میں آیندہ اپنی رکھشا کے لیے کوئی خطرہ نہیں اٹھا سکتا۔'' اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''آل رائٹ! تو اس کے بدلہ میں ہمارے لیے کیا کرو گے؟ کتاب والا معاملہ پرانا ہونے لگا ہے۔ اس میں اب وہ 'مزہ' نہیں رہا۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ ان مسلوں پر ایک اور وار کرنے کا سمے ہو گیا ہے۔ چنتا نہ کریں۔ اس بار ان کی آتما تڑپ اٹھے گی۔'' راجپال نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

اس نے قاتلانہ حملوں کا بدلہ چکانے کے لیے مکمل ذہن سازی کرلی تھی۔ اس ضمن میں پہلے اس نے رسوائے زمانہ کتاب 'ستیارتھ پرکاش' کا دوبارہ ایڈیشن چھاپا۔ 'چودھواں باب' (دوبارہ تحقیق مذہب اسلام) میں صفحہ 707 تا 781 قرآنی سورتوں کے بارے میں مصنف نے جی بھر کے ہرزہ سرائی کر رکھی تھی۔ راجپال بظاہر مالی نقصان اٹھا کر بھی اس کی خوب ترویج کرنے لگا لیکن اندرون خانہ تو اسے برطانوی سرکار ہی بھرپور مالی تقویت دے ہی رہی تھی۔ اس نے بیانگ دہل 'آٹھ سو صفحات' پر مشتمل اس کتاب کے دیباچہ میں لکھا۔

''اردو ستیارتھ پرکاش کی قیمت پہلے دو روپیا تھی۔ پھر میں نے ڈیڑھ روپیا کردی۔ ساتویں ایڈیشن کی قیمت پرچار کے خیال سے 'چودہ آنے' رکھی گئی۔ اب ستیارتھ پرکاش کے خلاف جو ایجی ٹیشن ہو رہا ہے اس نے کتاب کی مانگ کو بہت بڑھا دیا ہے۔ اس لیے اس نئے ایڈیشن کی محنت اور لاگت سے بھی کم صرف 'دس آنہ' قیمت رکھی جاتی ہے۔ امید ہے کہ آریہ پرش ہزاروں کی تعداد میں اس کی اشاعت کریں گے۔''

منصوبہ کامیاب رہا۔ مسلمانوں کے جذبات بری طرح مجروح ہوئے۔ راجپال کے خلاف نفرت کی اب کوئی حد نہ رہی تھی۔

☆......☆

محمد الدین بے حد مضطرب تھا۔

وہ صبح ہی سے گھر میں موجود تھا اور اب چارپائی پر کسلمندی سے لیٹا اپنے والد طالع مند اور بھائی علم الدین کے متعلق سوچ میں غرق تھا۔ اس کے ہر ایک انداز میں تھکاوٹ اور بے چینی نمایاں تھی۔ محمد الدین اپنے بھائی کے برعکس ایک تعلیم یافتہ نوجوان اور سرکاری ملازم تھا۔ تحمل مزاج، سلجھا ہوا دھیما انداز اور پروقار ٹھہری ہوئی شخصیت کا حامل۔ کچھ عرصہ پہلے وہ رشتہ ازدواج میں بھی منسلک ہو چکا تھا۔ وہ بظاہر اپنی زندگی میں بہت مطمئن تھا لیکن یہ بے کلی جانے کیوں کبھی کبھی طبیعت پر حاوی ہو جاتی تھی۔

غازی علم الدین کی شہادت کے بعد انگریز اور ہندوؤں کی اسلام کے خلاف یہ مذموم حرکات کچھ عرصہ تو ٹھپ رہیں لیکن 1933 میں کراچی میں ایک بار پھر بھی المناک واقعہ دہرایا گیا۔ آریہ سماج حیدرآباد (سندھ) کے سیکرٹری 'نتھورام' نے 'ہسٹری آف اسلام' کے نام سے ایک شرانگیز کتاب لکھی۔ عدالت نے اسے بھی معمولی جرمانہ اور ایک سال قید کی سزا سنا دی۔ نتھورام نے جوڈیشل کمشنر کراچی کی عدالت میں اپیل دائر کر دی۔ اسی سماعت کے دوران 'عبدالقیوم' نامی ایک نوجوان نے تیز دھار چاقو لیے نتھورام کی گردن پر وار کر دیئے جو مہلک ثابت ہوئے۔ یہ نوجوان ہزارہ کا رہائشی تھا اور کراچی میں وکٹوریہ گاڑی چلاتا تھا۔ جونا مارکیٹ کی مسجد میں نماز کے دوران اس واقعہ کا علم ہوا تو دانستہ طور پر عدالت میں نتھورام کے پاس جا بیٹھا۔ اپنے مقدمہ کی سماعت کے دوران اس نے جج کو 'جارج پنجم' کی تصویر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تاریخی الفاظ ادا کیے۔

''تم اپنے بادشاہ کی توہین برداشت نہیں کر سکتے تو میں اپنے آقا کی شان میں گستاخی کرنے والے کو کس طرح معاف کر سکتا ہوں۔''

''کیا بات ہے پتر؟ اتنا بے چین کیوں ہے؟ آج دفتر بھی نہیں گیا؟'' ماں نے محبت سے دریافت کیا۔

''بس یونہی! دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کل رات سے علمو اور ابا کی بڑی یاد ستا رہی ہے۔'' بوجھل انداز میں کہتے ہوئے وہ والدہ کو یہ بتا ہی نہ سکا کہ گذشتہ شب خواب میں بھائی کو زخمی حالت میں دیکھنے کے بعد اسے ایک لحہ کے لیے بھی سکون میسر نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں! اس بار سیالکوٹ میں اتنے مہینے لگا دیئے دونوں نے۔ ایک تو علم الدین کو خط لکھنا بھی نہیں آتا کہ اپنی اور تیرے ابا کی خیریت ہی بتا دیا کرے۔'' والدہ بھی بیٹے اور شوہر کی کمی بہت محسوس کر رہی تھیں۔

''میرے پاس ان کا پتا بہر حال موجود ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ ایک چکر لگا آؤں۔ کل لوٹ آؤں گا۔'' اس نے اجازت طلب کی اور رخت سفر باندھ لیا۔

سیالکوٹ میں جب وہ اپنے والد کے بتائے گئے ٹھکانے پر پہنچا تو علم الدین کو ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے پایا۔ بڑے بھائی کو غیر متوقع طور پر سامنے پا کر وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر حال احوال دریافت کرتے ہوئے محمد الدین کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کا خواب بالکل سچا تھا۔ علم الدین کا ہاتھ شیشہ لگ جانے کے باعث زخمی اور پٹی میں لپٹا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے بھائیا؟ اتنا مرجھایا ہوا سا کیوں لگ رہا ہے؟ لاہور میں سب کچھ ٹھیک تو ہے ناں؟'' وہ بڑے بھائی کے مزاج میں تبدیلی بھانپ گیا۔

''ہاں سب ٹھیک ہے۔ بس سفر کی تھکاوٹ ہے۔ تم سناؤ! کب تک لوٹنے کا ارادہ ہے؟'' وہ جانے کیوں خواہش کے باوجود اسے لاہور کے اصل حالات سے آگاہ نہ کر سکا۔

''سچ بتاؤں! اس دور دراز اور اردگرد سے کٹے ہوئے علاقہ میں میرا بھی دل اکتانے لگا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ کوئی مجھے آوازیں دیتا لاہور بلا رہا ہے۔ ایک دھند ہے جس کے پار جانے کے لیے میرا دل مچلتا ہے لیکن کام بھی تو ہر حال میں مکمل کرنا ہے ناں! ابا کو اس عمر میں اکیلے چھوڑنے کا حوصلہ بھی نہیں مجھ میں۔'' وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں کہتا کسی نادیدہ الجھن میں گرفتار دکھائی دیتا تھا۔ اسی اثناء میں طالع مند بھی وہیں چلا آیا۔ اس کے بالوں میں گو سفیدی غلبہ پانے لگی تھی لیکن کمر اب بھی سیدھی اور ارادے توانا تھے۔

''یہاں کا بڑا صاحب ہمارے کام سے بہت متاثر ہوا ہے۔ وہ اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں 'کوہاٹ' میں کام دلوانے کی بات کر رہا تھا۔ میں نے حامی بھی بھر لی ہے۔ یہ پھیرا کچھ لمبا ہو جائے گا لیکن منافع اس قدر مل جائے گا کہ ہم ایک اچھے علاقہ میں بڑا سا گھر لے کر اپنے علمو کی شادی کر دیں۔ بس پھر یہ سارا کام سنبھالے گا اور میں اپنے پوتے پوتیوں کو گھوڑا بن کر سیر کروایا کروں گا۔'' اس نے اپنے منصوبہ سے آگاہ کیا۔ شادی اور بچوں کا تذکرہ سنتے ہی شرمیلے مزاج علم الدین کے چہرے پر سرخی چھا گئی۔ اسی خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا اور اگلے روز محمد الدین لاہور چلا آیا۔ وہ والدہ کی تاکید کے باوجود انہیں لاہور میں چھائے اذیت ناک ماحول کی بابت کچھ بھی نہ بتا سکا تھا۔

واپسی کا سفر بھی ملال اور بے کلی ہی لیے ہوئے تھا۔

☆......☆

طالع منداور علم الدین کی مصروفیات کم ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھیں۔

ان دونوں کی ہنر مندی' ایمانداری اور خلوص نیت سے کیا گیا کام مالکان کو اس قدر پسند آتا تھا کہ وہ انہیں ازخود کسی نئے فرد سے متعارف کروا دیا کرتے۔ سفر کا یہی سلسلہ اس بار انہیں یکم جنوری 1928 کو 'کوہاٹ' لے گیا۔ روانگی سے قبل اہلخانہ سے مختصر ملاقات سے بھرپور تشفی تو نہ ہو پائی تھی تاہم معاش اور اس سفر کی اہمیت سے وہ بھی بخوبی واقف تھے اس لیے اعتراض کرنا ہی بے جا تھا۔

کوہاٹ آمد ان باپ بیٹے کے لیے بڑا یادگار تجربہ تھا۔ غیور اور بہادر پٹھانوں کا یہ علاقہ خوبصورتی اور دلکشی میں اپنی مثال آپ تھا۔ علم الدین ذاتی طور پر علاقہ اور مکینوں سے بہت متاثر ہوا۔ مخیر طبع' مہمان نواز' احسان شناس اور جانثار لوگ اسے اپنے دل کے بہت قریب محسوس ہوتے۔ طالع مند نے کوہاٹ میں 'اکبر خاں پٹھان' سے ایک مکان کرائے پر لیا اور حسب سابق دونوں اپنے مخصوص انداز میں کام مکمل کرنے لگے۔ کئی ماہ اسی خاموشی اور مصروفیات میں بیت گئے۔ اہل علاقہ بھی ان باپ بیٹے کی شرافت اور پیشہ وارانہ کاملیت واخلاص کے قائل ہونے لگے اور پھر ایک واقعہ ایسا ہوا کہ وہ مکمل طور پر ان کے گرویدہ ہو گئے۔

اس روز وہ روشن خاں کے گھر کام کر رہے تھے۔ اسی اثناء میں ایک شخص وہاں آیا اور روشن کو علاقہ میں ہونے

والے جھگڑے کی بابت بتانے لگا۔

"دیکھو خاناں! کیسا وقت آ گیا ہے؟ بھائی دوسرے بھائی کا دشمن ہونے لگا ہے۔ اکبر خاں کے بھائی نے اس سے خوب جھگڑا کیا۔ اکبر نے وار تو بچا لیے لیکن اس کے دفاعی وار سے زخمی بھائی نے الٹا اسی کے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کروا کے اسے گرفتار کروا دیا۔"

"ہاں بس اب زمانہ ہی ایسا ہو گیا ہے۔" روشن نے رسمی سے انداز میں جواب دیا۔ طالع مند اور علم الدین کی سماعت بھی ان انکشافات سے محروم نہ رہ سکی۔ ان کی آنکھیں چار ہوئیں اور ذہنی رو باہم جڑتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں باقی کام کل مکمل کر دوں گا خان!"

"کیوں؟ کہاں جا رہے ہو؟ تم تو کام چھوڑ کے کبھی کہیں جاتے نہیں ہو۔"

"اکبر کی خبر گیری کے لیے جا رہا ہوں۔" طالع مند نے متانت سے کہا۔

"تمہاری اس سے کوئی رشتہ داری ہے بھلا؟" وہ پنجاب کے اس پردیسی کا ردِعمل دیکھ کر حیران ہو گیا۔

"رشتے داری ہی تو سب کچھ نہیں ہوا کرتی خان! ایک رشتہ انسانیت کا بھی تو ہوا کرتا ہے۔ میں اس کا کرایہ دار ہوں۔ اس نے اپنی ہر خوشی کے موقع پر مجھے یاد رکھا ہے۔ آج وہ مصیبت میں ہے تو میں اسے کیسے بھول جاؤں؟"

طالع مند کے خلوص و محبت پر روشن متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور خود بھی اس کے ہمراہ چل دیا۔ ان دونوں کی بھرپور کوششوں سے اکبر خاں بالآخر پولیس کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ وہ بھی اس اخلاص کا ایسا گرویدہ ہوا کہ دونوں باپ بیٹے سے مزید قیام کا کرایہ وصول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ رشتہ ہر گزرتے دن کے ساتھ گہرا ہوتا چلا گیا اور ایک سال بعد جب انہوں نے لاہور واپسی کا ارادہ کیا تو اکبر نے اس دوستی و پیار کی نشانی کے طور پر دونوں کو ایک ایک چادر تحفہ میں دے کر افسردگی سے رخصت کیا۔ اس کی خواہش تھی کہ یہ ہنرمند اور اعلیٰ ظرف باپ بیٹا کچھ عرصہ مزید کوہاٹ میں قیام کریں۔ طالع مند نے اہلخانہ کے ساتھ کچھ عرصہ گذارنے کے بعد واپسی کی ہامی بھری اور مارچ 1929 میں وہ دونوں اپنی روح کی پیاس بجھانے لاہور چلے آئے۔

☆......☆

لاہور میں حالات جوں کے توں برقرار تھے۔

راجپال دھڑلے سے شر اور نفرت کا کاروبار کر رہا تھا گویا مسلمانوں کے سینوں پر مونگ دل رہا تھا۔ بہار کا موسم تھا لیکن دلوں میں جلتے بھانبھڑوں کی تپش کسی بھی بیرونی خوبصورتی سے سوا تھی۔ مزاحمتی مظاہرے اب باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ انگریز حکومت کے تعاون سے زہریلے ناگ کی طرح پھنکارتا راجپال مسلمانوں کے وجود میں مچلتے آتش فشاں سے خائف اب اپنی دکان اور گھر تک ہی محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی رہائش گاہ دکان کے سامنے ہی واقع تھی لہٰذا ہمہ وقت سنتریوں کے کڑے پہرے میں رہتے ہوئے وہ ان جلسوں سے خوب محظوظ ہوا کرتا۔ فرنگی خوب اطمینان سے مسلمانوں کو چار چوٹ پہنچا رہے تھے۔ لاہوری دروازے کے باہر ہونے والے اجتماع سے قبل لاہور کے ڈپٹی کمشنر 'مسٹر اوگلوی' نے شہر میں دفعہ 144 نافذ کر دی۔ والیٔ دو جہاںؐ کے جانثار ایسی پابندیوں کو کہاں خاطر میں لانے والے تھے۔ وہ گلی کوچوں میں بپھرے شیروں کی طرح گرجتے حکومتی ایوانوں تک اپنے مطالبات پہنچانے کی کوششیں کرتے رہے جس کے نتیجہ میں دفعہ کی خلاف ورزی کے جرم میں انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ ان گرفتاریوں اور تشدد کے باوجود ان کے ارادے اٹوٹ تھے۔ بہتی ندی کی روانی، لہروں کی طغیانی اور ہواؤں کا بہاؤ بھی بھلا کسی بشر کے روکنے سے رک سکا ہے؟ سرفروشی کی تمنا دل میں لیے وہ بے خوف و خطر جلوس کا انعقاد کرتے رہے۔

اس روز بھی ایسا ہی ایک جلسہ منعقد ہوا تھا۔ علم الدین دیہاڑی و مزدوری کی تلاش میں باہر نکلا ہوا تھا جب جمِ غفیر دیکھ کر فطری تجسس کے باعث رک گیا۔ مقرر کی شعلہ بیانی اور تقریر کا متن جان کر اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے ہی رہ گیا۔ وہ شدت سے اپنا سر دائیں بائیں جھٹک کر کانوں پر ہاتھ مارنے لگا کہ کہیں سماعت کسی خرابی کا شکار ہو گئی ہے لیکن حقیقت کسی بھی طور تبدیل نہ ہو سکی۔ وہ لمحات اس کے لیے جاں گسل تھے۔ خدایا! یہ کیسا انکشاف تھا؟ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی روح خاردار جھاڑی میں الجھ گئی ہو اور اسے کوئی بے دردی سے کھینچ رہا ہے۔ آتشیں آنسو آنکھوں سے بہنے کی بجائے روح کو بے طرح جھلسا رہے تھے۔ بے یقینی، صدمہ، دکھ، کرب، طیش اور غصہ نے اس کا وجود ادھ موا سا کر دیا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے گھر لوٹ آیا۔ اگلے روز تک یہی کیفیت برقرار رہی تو محمد الدین تشویش سے پوچھنے لگا۔ "کیا بات ہے علمو؟ لاہور میں دل نہیں لگ رہا

کیا؟''

''نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ویسے آج کل یہ جلسوں میں کس بات کا تذکرہ ہے؟ ایسا لگتا ہے کوئی پرانا روگ ہے جواب ناسور بن چلا ہے۔''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ ایک موذی راجپال نے دل آزار کتاب شائع کی ہے جس میں ہمارے پیغمبرؐ کے بارے میں ناروا زبان استعمال کی گئی ہے۔'' بھائی کی زبان سے یہ انکشاف سن کر علم الدین کو اپنا وجود ایک دھماکے سے منتشر ہوتا محسوس ہوا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اردگرد کسی نے خوفناک الاؤ روشن کر دیا ہے۔

''بہت غلط ہوا ہے یہ، بہت غلط۔'' وہ اپنے آنسو ضبط کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

اس روز کے بعد علم الدین مسکرانا بھول گیا۔ وہ ہمہ وقت وحشت زدہ دکھائی دینے لگا تھا۔ نظریں خلاؤں میں بھٹکتی رہتیں اور سماعت میں چنیانوالی مسجد کے مولانا سید عبد الواحد غزنوی کے وہ درس گونجا کرتے جس میں وہ محسن انسانیتؐ کی شان کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اہلخانہ بہرحال اس کیفیت سے انجان تھے۔ وہ فطری تشویش میں مبتلا اپنے اپنے اندازے لگایا کرتے۔

''کوہاٹ سے واپسی پر علمو کو جانے کیا ہو گیا ہے۔ وہ کسی سے بولتا ہی نہیں۔'' ماں بے حد پریشان تھی۔

''جی ماں جی! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ پہلے تو وہ چلبلے انداز میں مجھ سے چھیڑ خانی کر لیا کرتا تھا۔ ننھی گڑیا کو باہر کھلانے بھی لے جاتا تھا لیکن اب تو ڈھنگ سے کھاتا پیتا ہے نہ ہی پوری نیند لیتا ہے۔'' بھابی نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔

''اس کی شادی کر دیں ماں جی! بالکل ٹھیک ہو جائے گا وہ۔'' اس کی بہن معراج بیگم نے ایک ماہرانہ اور آفاقی حل پیش کیا۔

''میں اس بارے میں تیرے ابا سے پہلے ہی بات کر چکی ہوں۔ میری بھتیجی فاطمہ ہی اس گھر کی چھوٹی بہو بنے گی۔ اب تو جلد ہی بھائی کے پاس جا کر جھولی پھیلاتی ہوں اور رشتہ لے کر ہی اٹھوں گی۔'' ماں نے انکشاف کیا۔

''ماموں کو بھلا کیا اعتراض ہوگا؟'' معراج نے کہا۔

''ہمارا علمو پڑھ لکھ نہیں سکا تو کیا ہوا؟ وہ شریف ہے، محنتی اور کماؤ ہے۔ انہیں اور کیا چاہیے؟''

''بالکل ماں جی! بڑی خوش قسمت ہوگی وہ لڑکی جو ہمارے علمو کی دلہن بنے گی۔'' بھابی نے محبت سے کہا اور پھر تینوں خواتین خوشی و جوش سے متوقع منگنی و شادی کی منصوبہ بندی کرنے لگیں۔

ان سب کی باتوں سے بے خبر علم الدین، اپنے بچپن کے دوست عبدالرشید کے ساتھ دہلی دروازہ لاہور کے سامنے موجود تھا۔ ایک عظیم الشان اجتماع میں امیر شریعت سید عطاءاللہ شاہ بخاریؒ، مفتی کفایت اللہ اور مولانا سید احمد دہلوی بھی موجود تھے۔ ایک روز قبل امیر شریعت نے لاہور میں آکر خود تانگہ پر سوار ہو کر اعلان کیا کہ دہلی دروازہ کے اجتماع میں سب کی شرکت ناگزیر ہے۔ لوگ ان کی حالت اور سر پر عمامہ کی غیر موجودگی پر بے حد حیران تھے۔

''حضرت! آج آپ ننگے سر کیوں ہیں؟'' ادب سے استفسار ہوا۔

''جس شہر میں آقائے دو جہاں کی ناموس پر حملہ کرنے والا زندہ ہو، وہاں بخاری سر پر عمامہ کس طرح باندھ سکتا ہے؟''

جلسہ کا آغاز قرآن پاک کی تلاوت سے ہوا اور پھر شاہ جی کی گرجدار آواز نے لاہور کی فضاؤں کو مزید مرتعش کر دیا۔

''آج آپ لوگ جناب فخر رسلؐ کی عزت و ناموس کو برقرار رکھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ انسان کو عزت بخشنے والی ہستی کی عزت خطرہ میں ہے۔ آج اس جلیل المرتبت کی ناموس خطرہ میں ہے جس کی دی ہوئی عزت پر تمام موجودات کو ناز ہے۔ آج مفتی کفایت اللہ اور احمد سعید کے دروازے پر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور ام المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کھڑی آوازیں دے رہی ہیں ہم تمہاری مائیں ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کفار نے ہمارے لیے کتنے نازیبا الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ارے دیکھو! کہیں ام المومنین عائشہؓ دروازہ پر تو کھڑی نہیں۔ آج اگر کوئی روحانیت کی آنکھ سے دیکھنے والا ہو تو دیکھ سکتا ہے رسول کریمؐ اور آپؐ کی ازواج مطہرات ہم مسلمانوں کی مائیں اہل اسلام سے فریاد کر رہی ہیں کہ تمہاری سرزمین میں ہماری بے حرمتی کی جا رہی ہے۔ ہمیں کھلے بندوں برا بھلا کہا جا رہا ہے۔ اگر کچھ پاس رسالتؐ ہو تو ناموس رسالت کی حفاظت کرو۔'' امیر شریعت کے مذکورہ الفاظ دلی گہرائیوں اور ایسے جوش و ولولہ سے ادا ہوئے کہ سامعین کی نظریں حقیقتاً دروازے پر مرکوز ہو گئیں۔ ہر سو آہ و بکا کی صدائیں گونجنے لگیں۔ ''تمہاری محبتوں کا تو یہ عالم ہے کہ عام حالت میں

کٹ مرتے ہو لیکن کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آج گنبد خضریٰ میں رسول اللہؐ تڑپ رہے ہیں۔ آج سیدہ خدیجہؓ اور سیدہ عائشہؓ پریشان ہیں۔ بتاؤ! تمہارے دلوں میں امہات المومنین کے لیے کوئی جگہ ہے؟ آج ام المومنین عائشہؓ تم سے اپنے حق کا مطالبہ کرتی ہیں۔ وہی سیدہ عائشہؓ جنہیں رسول اللہؐ ’حمیرا‘ کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ جنہوں نے والیٔ دو عالمؐ کو بوقت وصال مسواک چبا کر دی تھی۔ یاد رکھو! اگر تم نے ان کے لیے جانیں دے دیں تو یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں۔ جب تک ایک مسلمان بھی زندہ ہے ناموس رسالتؐ پر حملہ کرنے والے چین سے نہیں رہ سکتے۔ راجپال کافر نے تمہارے نبیؐ کے لیے دشنام طرازی کی ہے۔ غیور مسلمانو! یا سننے والے کان نہ رہیں یا کہنے والی زبان نہ رہے۔ اس گستاخ کے لیے ’داتا کی نگری‘ میں اب کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ پولیس جھوٹی، حکومت کوڑھی اور ڈپٹی کمشنر نااہل ہیں۔ وہ ہندو اخبارات کی ہرزہ سرائی تو روک نہیں سکتے لیکن علمائے کرام کی تقریریں روکنا چاہتے ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ دفعہ 144 کے یہیں پرخچے اڑا دیئے جائیں۔ میں اس دفعہ کو اپنے جوتے کی نوک تلے مسل کر بتا دوں گا۔

پڑا فلک کو دل جلوں سے کام نہیں
جلا کر راکھ نہ کردوں تو داغ نام نہیں

داغ دہلوی کا یہ شعر کچھ اس انداز میں پڑھا گیا کہ لوگ زاروقطار رونے لگے۔ اس تقریر نے شہر بھر میں آگ لگا دی تھی۔ علم الدین کے ذہن میں بھی سرخ چادر سی تنی تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اس نے راجپال کو نشان عبرت بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ سینے میں روشن آگ مزید پرتپش ہوگئی۔ اس رات وہ آتش نوا مقرروں کی تقریریں سن کر دیر سے گھر لوٹا تو طالع مند خاصی تشویش سے اسی کا منتظر تھا۔

’’اتنی دیر سے کیوں آئے ہو علمو؟ کہاں تھے اب تک؟‘‘ والد کے استفسار پر وہ خالی الذہنی کے عالم میں انہیں دیکھتا رہا۔

’’میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔ جواب کیوں نہیں دیتے؟‘‘

’’کیا کسی گستاخ رسول کو زندہ رہنے کا حق ہے؟‘‘

’’نہیں! مسلمان اسے کبھی زندہ نہیں چھوڑیں گے اسے زندہ رہنے کا حق ہے ہی نہیں۔‘‘

’’کیا مارنے والے کو بھی سزا ملے گی؟‘‘

’’ہاں پتر! انگریزوں کا قانون اسے پھانسی کی سزا دے گا لیکن بہت خوش قسمت ہوگا وہ شخص جسے یہ سعادت ملے گی۔‘‘ طالع مند نے حسرت سے کہا اور بیٹے کو سونے کی تلقین کرتا ہوا خود بھی اندرونی جانب بڑھ گیا۔

اس رات علم الدین کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس گفتگو کے ذریعہ اس نے بالواسطہ طور پر والد سے اجازت لے لی تھی۔ اسے چینیاں والی مسجد میں سنا جانے والا وہ درس آج بھی یاد تھا کہ نبی پاکؐ کی محبت ہر رشتہ سے افضل ہے۔ اپنے ایمان کی کاملیت ثابت کرنے کا وقت آچکا تھا۔ وہ کسی بھی قیمت پر راجپال کو جہنم واصل کرنا چاہتا تھا اور نہ خود علم الدین کو بھی ایسی بے حمیت زندگی جینے کا کوئی حق نہ تھا جس میں وہ اپنے آقاؐ کے مجرم کو ہر سو دندناتا دیکھتا رہے۔

اگلے چند روز وہ شیدے سے بلاناغہ ملتا رہا۔ شیدا علم الدین کا مزاج آشنا تھا۔ راجپال اور اس کی کتاب کے ذکر کے باعث وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کا مطمع نظر کیا ہے۔ شیدے نے بالا ہی بالا اپنے ایک دوست سے اس شاتم رسول کا مکمل پتا معلوم کرنے کا کہہ رکھا تھا۔ اگلے روز دوست نے راجپال کا اتا پتا بتاتے ہوئے ایک اور حقیقت گوش گذار کی کہ وہ ان دنوں ’ہردوار‘ گیا ہوا تھا۔ شیدے نے یہ خوشخبری فوراً علم الدین کو سنادی۔ علم الدین بہت خوش تھا۔ اس رات وہ دونوں کافی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔

مطمئن و سرشار علم الدین گھر لوٹا تو طالع مند نے نہایت غصہ سے اس کا استقبال کیا۔ ’’کہاں تھے آج تم؟‘‘

’’کہیں بھی نہیں! دیہاڑی کی تلاش میں تھا بس۔‘‘ اس نے مختصراً کہہ کر اندر جانا چاہا۔

’’جھوٹ بولتے ہو میرے ساتھ۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے اس لوفر شیدے کے ساتھ دوبارہ یارانہ گانٹھ لیا ہے۔ خدا جانے تم کب اس کا پیچھا چھوڑو گے؟‘‘ طالع مند اس کے بگڑے ہوئے معاملات پر خاصے زودرنج تھے۔

’’ابا جی! غصہ چھوڑیں۔ میں سمجھا دوں گا اسے۔‘‘ محمد الدین نے مصالحت کروانی چاہی۔

’’سمجھا لے اسے اپنی زبان میں۔ کام پر یہ باقاعدگی سے نہیں جاتا۔ کھانے پینے کا اسے ہوش نہیں رہا۔ اب راتیں بھی گھر سے باہر گذارنے لگا ہے۔ اس موالی کے ساتھ رہنے سے یہی کچھ ہونا تھا۔ اس کا باپ خود تو جوئے میں دکان ہار چکا ہے اسے بھی شاید کسی جوئے اور نشے پر لگا دیا ہے۔‘‘ وہ بلا سوچے سمجھے بولتے چلے گئے۔ علم الدین کو ان کی یہ بدگمانی اور شیدے کے متعلق خیالات نے بہت دکھ

پہنچایا لیکن وہ اپنی صفائی میں کچھ بھی کہہ کر انہیں اصل منصوبہ کی بھنک بھی نہیں لگنے دینا چاہتا تھا۔

اس رات حیران کن طور پر علم الدین کی آنکھ لگ گئی۔ خواب میں نورانی چہرے اور جاہ وجلال والے ایک بزرگ نمودار ہوئے اور شفقت سے بولے۔

"علم الدین! تیرے نبیؐ کا دشمن اس دھرتی پر سانس لے رہا ہے اور تم ابھی تک سو رہے ہو۔ اٹھو اور جلدی کرو۔"

اس تنبیہہ کے بعد علم الدین کی آنکھ فوراً کھل گئی۔ اسے شدت سے اب صبح کا انتظار تھا۔ وہ معمول کے مطابق اپنے اوزار لیے گھر سے نکلا اور شیدے کے ساتھ 'بھاٹی دروازے' کے سامنے کھلے میدان میں جا پہنچا۔

"کیا بات ہے؟ بہت کھوئے کھوئے دکھائی دے رہے ہو۔" اس نے شیدے کی بدلی ہوئی کیفیت محسوس کرلی۔

"بہت دنوں سے نیند آنکھوں میں آتی ہی نہیں۔ کل رات اچانک آنکھ لگ گئی۔ خواب میں ایک بزرگ کی بشارت ہوئی۔" شیدے نے بتایا۔

"کیا انہوں نے تمہیں یہ کہا کہ تیرے نبیؐ کا دشمن اس دھرتی پر سانس لے رہا ہے اور تم ابھی تک سو رہے ہو۔" علم الدین نے ہیجان سے کہا۔

"خدا کی قسم! یہی الفاظ تھے لیکن تمہیں کیسے علم ہوا؟" وہ فرطِ حیرت سے بولا اور اگلے ہی لحہ معاملہ کی تہ تک پہنچ گیا۔

"یہ کام میں ہی کروں گا۔ راجپال کو میری چھری مارے گی۔" علم الدین نے کہا۔

"نہیں علمو! یہ قرض مجھے چکانے دے۔ تجھ پہ اپنے خاندان کی بھی تو بہت سی ذمے داریاں باقی ہیں۔"

"ایسا سوچنا بھی مت شیدے! خاندان' ماں باپ' بھائی بہن سب کچھ میرے نبیؐ پر قربان۔"

اس کے بعد ان دوستوں میں تکرار کا آغاز ہوگیا۔ دونوں ہی اس سعادت کے حصول کے لیے تڑپ رہے تھے۔

"اس طرح تو یہ معاملہ حل نہیں ہوگا۔" شیدے نے بے چینی سے ہاتھ مسلے۔ "ایسا کرتے ہیں کہ پرچیاں ڈال لیتے ہیں۔ جس کا نام آیا وہی یہ کام مکمل کرے گا۔"

تجویز معقول تھی۔ علم الدین بھی متفق ہوگیا۔ تین بار قرعہ ڈالا گیا اور ہر بار علم الدین ہی کا نام نکلا۔ خوشی اور جوش سے اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ "بہت خوش قسمت ہے یار تو! میری دلی دعا ہے کہ پروردگار تجھے اس نیک کام میں کامیابی نصیب فرمائے۔" شیدے نے خلوص دل سے کہا۔ اس نیک فال کے بعد علم الدین کا دل کسی اور کام کی طرف مائل ہی نہ ہو رہا تھا۔ طالع مند کے مزاج کی برہمی یاد کر کے مارے باندھے معمولات نمٹاتا رہا۔ اس رات وہ عجب سرشاری میں مبتلا تھا۔ وہ تصور میں راجپال کی لاش دیکھتا رہا، پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ خواب میں ایک بار پھر وہی بزرگ نمودار ہوئے اور کہنے لگے۔

"علم الدین! یہ وقت سونے کا نہیں۔ تمہیں جس کام کے لیے منتخب کیا گیا ہے اس کی تکمیل کے لیے فوری پہنچو ورنہ بازی کوئی اور لے جائے گا۔" یہ الفاظ مکمل ہوتے ہی اس کے جسم کو زوردار جھٹکا لگا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ فضا میں فجر کی اذانیں گونج رہی تھیں۔ اس نے خشوع وخضوع سے نماز ادا کی اور صدق دل سے دعا مانگنے لگا۔

"یا اللہ! میں ایک عاجز اور گناہ گار انسان ہوں لیکن تیرے محبوب پاکؐ کے دشمن راجپال کافر کو جہنم واصل کرنے کا ارادہ کرچکا ہوں۔ دست غیب سے میری مدد فرمانا! اس راستہ میں کوئی رکاوٹ نہ آنے دینا۔ میری چھری کو نبیؐ کے گستاخ اور دشمن اسلام کی گردن زنی کی سعادت دینا۔" وہ نہایت عاجزی سے دعا کرتا رہا۔

چھ اپریل 1929 کا وہ سورج ایک تاریخی منظر کا گواہ بننے کے لیے طلوع ہوچکا تھا۔

☆......☆

طالع مند کے چھوٹے سے گھر میں معمولات زندگی کا آغاز ہوگیا تھا۔

علم الدین نے غسل کر کے صاف ستھرا لباس زیب تن کیا اور خوشبو لگانے کے بعد والدہ سے میٹھے چاول پکانے کی فرمائش کردی۔ گزشتہ ایام کے برعکس آج وہ قدرے پُرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ طالع مند اس کے تاثرات و سنجیدگی کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ باپ بیٹے نے مل کر چاول تناول کیے۔ طالع مند اس روز دانستہ طور پر اسے کچھ بھی کہنے سننے سے گریز کر رہا تھا۔ آج علم الدین کا رشتہ طے ہوجانے کا باقاعدہ اعلان کیا جانا تھا۔ گھر میں دبا دبا سا جوش اور سنسنی کی کیفیت برپا تھی لیکن علم الدین ہر بات سے بے نیاز اپنی ذات میں مگن تھا۔ والد کے جانے کے بعد وہ بھابی کے پاس چلا آیا۔

"کیابات ہے دیور جی؟ نئے کپڑے۔ سر پر پگڑی۔ خوشبوئیں۔ لگتا ہے دل میں بڑے لڈو پھوٹ رہے ہیں۔"

وہ بھرپور شوخ انداز میں فاطمہ کے حوالے سے اسے چھیڑتے ہوئے بولی۔

"بھابی! تیرے پاس کچھ پیسے ہیں کیا؟ مجھے ضرورت ہے۔ ہاں مگر لوٹانے کا کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔" اس کی سنجیدگی کو بھی بھاوج نے مستی خیزی سے دیکھا اور ایک روپیا لاکر اسے تھما دیا۔ وہ خوابیدہ معصوم بھتیجی کی پیشانی پر ممتانت سے پیار کرتا اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔ شیدے سے آخری ملاقات کے بعد اپنی چھتری اور گھڑی بطور یادگار دیں اور جگری دوست کو الوداع کہہ کر آتمارام کباڑیے کی دکان کا رخ کرلیا جہاں کئی تیز دھار چھریاں پہلے ہی سے اس کی نظر میں تھیں۔ بھاؤ تاؤ کے بعد اس نے جو ہتھیار خریدا اس کی کل لمبائی ساڑھے تیرہ انچ تھی۔ تیز دھار پھل ساڑھے آٹھ انچ لمبا تھا۔ چھری شلوار کے نیفے میں اڑسنے کے بعد وہ انارکلی چلا آیا جہاں اسپتال روڈ پر راجپال کی دکان تھی۔ اس سے تھوڑی ہی دور لکڑی کا ٹال تھا جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا کھوکھا تھا۔ علم الدین وہاں موجود نوجوان کے پاس جاکر ہلکی پھلکی گفتگو میں مشغول ہوگیا۔

"ارے ویرے! میں نے سنا ہے کہ راجپال کی دکان بھی یہیں کہیں ہے۔"

"ہاں! لیکن اٹھائیس مارچ سے وہ خبیث یہاں آ نہیں رہا ورنہ سنتری تو ایک منٹ کے لیے اسے اکیلا نہیں چھوڑتے۔" نوجوان نے بتایا۔ علم الدین مایوس ہونے کی بجائے وہیں ایک تھڑے پر بیٹھ گیا۔ اسے کامل یقین تھا کہ آج 'مطلوب' سے ضرور ملاقات ہوگی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک گاڑی اس کی دکان کے باہر آکر رکی۔ تنی ہوئی گردن' مغرور آنکھوں اور مکار صورت ایک شخص برآمد ہوا۔ اس کا ہر ایک انداز علم الدین کی رگوں میں شرارے دوڑا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں لہو رنگ ہوگئی تھیں۔

"یہی ہے وہ موذی۔" نوجوان نے بتایا تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر تیز تیز قدموں سے راجپال کے پیچھے چل دیا۔

مہاشے راجپال دکان میں پہنچ کر پولیس کو اپنے حفاظتی اہلکاروں کو بھیجنے کے لیے ٹیلی فون کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ دکان میں اس وقت کیدار ناتھ اور بھگت رام نامی دو ملازم کتابوں کی ترتیب میں مصروف تھے۔ عرصہ دراز سے فرنگی چھتر چھایہ میں زندگی کی حفاظت کرنے والا راجپال موت کی آہٹیں اپنی جانب بڑھتی محسوس ہی نہ کرسکا۔ ہوش تو اس وقت آئی جب ایک کڑکدار للکار سماعت میں پڑی۔

"اے میرے رسول کے دشمن اور گستاخ! مرنے کے لیے تیار ہوجا۔"

وہ نظارہ راجپال کے لیے بہت خوفناک تھا۔ دو مرتبہ موت کے چنگل سے بچنے کے بعد اپنے تئیں خود کو ناقابل تسخیر سمجھنے لگا تھا۔ اس لمحہ شدت سے دل میں زندگی کے لیے خوف محسوس ہوا۔ علم الدین نے چھری ہوا میں لہرائی اور طیش کے عالم میں پے در پے اس کے بدن میں گھونپتا چلا گیا۔ دہشت اور سراسیمگی سے راجپال کے منہ سے صرف 'ہائے' برآمد ہوسکی۔ یہ فرعون صفت اور متکبر انسان کا عبرتناک انجام تھا کہ موت نے اسے کوئی آواز نکالنے کی مہلت نہ دی۔ راجپال کی 'ہائے' سن کر ملازمین بھاگے ہوئے باہر آئے۔ خون میں لت پت مہاشے کو دیکھ کر وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اس پگڑی پوش نوجوان کو دیکھنے لگے جو نم آلود لہجہ میں ایک ہی بات دہرا رہا تھا۔

"الٰہی! تیرا شکر ہے۔ میں نے اپنے آقا کی گستاخی کا بدلہ لے لیا۔" وہ اپنے مقصد خیر میں کامیابی کے بعد 'ودیارتن' کے ٹال پر پہنچا اور وہاں موجود نلکے پر اپنے ہاتھوں سے لہو صاف کرنے لگا۔ اسے علم نہ تھا کہ دکان سے نکلتے ہی ملازمین شور وغل برپا کررہے ہیں۔ خون آلود ہاتھ صاف کرنے کے بعد وہ گھر جانا چاہتا تھا لیکن ایک فوری خیال نے اسے اپنے فیصلہ پر عمل کرنے سے روک دیا۔ خدا بخش اکو جہاں اور عبدالعزیز کی ناکام کوششوں کا تصور ذہن میں آتے ہی اسے خدشات اور وسوسوں نے گھیر لیا کہ کہیں اس بار بھی مردود راجپال کے جسم میں سانس باقی نہ رہ گئی ہو۔ وہ تڑپ کر پلٹا اور ایک بار پھر موقع واردات پر جا پہنچا جہاں صدمہ وحیرت سے چور ہندو اپنے گرو گھنٹال کی نعش پر بین کر رہے تھے۔ پولیس نے غیر معمولی مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملازمین کی نشاندہی پر علم الدین کو گرفتار کرکے 'پولیس لائن' حوالات میں لے گئے۔

☆......☆

راجپال کے قتل اور علم الدین کی گرفتاری نے لاہور میں تہلکہ مچا دیا۔ اہلخانہ تک جس وقت یہ خبر پہنچی طالع مند کی زوجہ محلہ بھر میں بیٹے کی منگنی کے لڈو بانٹ رہی تھی۔

"الٰہی! تیرا کرم ہے۔ میرا بیٹا گستاخ رسول کا قاتل

اٹھاؤں تو بھی شکرانے کا حق ادا نہ کر سکوں گی۔" وہ آنسوؤں سے چمکتی آنکھیں پونچھتے اہل محلہ کو از سر نو مٹھائی کھلانے لگی۔

"میرے نبی کا مجرم آج اپنے انجام تک پہنچ گیا۔ گھی کے چراغ جلاؤں یا سب کے منہ موتی چور کے لڈوؤں سے بھر دوں۔"

علاقہ سے مرد و زن اسے اور طالع مند کو مبارکباد دینے چلے آرہے تھے۔

"بھائی طالع! کل صبح میں نے علمو اور شیدے کو پرچیاں ڈالتے دیکھا تھا۔ وہ دونوں کسی خواب کا ذکر کرتے ہوئے خود کچھ کرنے کے لیے جھگڑ رہے تھے۔ مجھے اب سمجھ آرہی ہے کہ ہمارے محلّے کے یہ لونڈے کس قدر دلیر، موقع شناس اور خوش قسمت ہیں کہ وہ کسی کے بھی علم میں لائے بغیر یہ نیک کام انجام دینا چاہتے تھے۔" ایک ہمسایہ نے جذبات سے لرزتی آواز میں اسے بتایا۔

"ہاں بھائی طالع مند! تو بڑا ہی خوش نصیب ہے۔ تیرا بیٹا 'غازی' بن گیا ہے۔ غازی علم الدین۔" ان سب کی گفتگو سنتے وہ تشکر کے ساتھ شرمندگی سے بھی بوجھل ہوا جا رہا تھا۔ شیدے کے بارے اپنی غلط فہمیاں اسے کانٹے کی طرح چبھنے لگیں۔

"واہ میرے مولا! میں تو اپنے علمو کو کھوٹا سکہ سمجھتا رہا۔ مجھے کیا علم تھا کہ کروڑوں مسلمانوں میں سے تیرا منتخب کردہ 'غازی' ہوگا۔ کیا میں اس قابل ہوں کہ غازی کا باپ ہونے جیسی سعادت پا سکتا۔ یہ سب تیرا ہی کرم ہے مالک!" وہ فرطِ جذبات سے رونے لگا۔

"چاچا! سنا ہے گرفتاری کے وقت علمو کو ہندوؤں نے بڑا مارا پیٹا بھی تھا۔ اسے ترازو کے کنڈے کی طرف دھکیلا گیا جس کی نوک سے اس کی کہنی اور پھر گھٹنے میں کیل لگنے سے زخم آگئے تھے۔ بڑا خون بھی بہا تھا اس کا۔" ایک نوجوان نے متاثر کن انداز میں بتایا۔

"وہ میرے نبی کا سپاہی ہے پتر! ایسے زخم تو اس کے لیے پھولوں جیسے ہوں گے۔" طالع مند نے عزم سے کہا۔ وہ اپنے خاندان کو ملنے والی اس سعادت پر شکرانہ ادا کرتے نہ تھک رہا تھا۔

راجپال کے ایک مسلمان کے ہاتھوں قتل کی خبر لاہور بھر میں گردش کرنے لگی۔ رات گئے تک اخبارات کے خصوصی ضمیمے فروخت ہوتے رہے۔ فرنگی سرکار چوٹ کھایا

☆......☆

غازی علم الدین کے خلاف قتل کی پہلی ایف آئی آر راجپال کے ملازمین کیدار ناتھ اور بھگت رام کی جانب سے درج کروائی گئی۔

میو اسپتال میں ہونے والے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نہایت عبرتناک تھی۔ بھرپور قوت سے کیے جانے والے چھری کے وہ وار بہت مہلک ثابت ہوئے تھے۔ چار زخموں نے راجپال کی بائیں ہتھیلی کو چیر ڈالا تھا۔ دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی بھی گہرائی تک زخم خوردہ تھی۔ گہرے پانچویں زخم نے اس کے سر کو چیر ڈالا تھا جس سے کھوپڑی دائیں طرف سے چٹخ گئی تھی۔ دو گہرے زخم بائیں کندھے پر آئے تاہم مہلک ترین وار چھاتی پر تھا جس میں چھری پسلیوں کو چیرتی، بائیں پھیپھڑے سے ہوتی ہوئی دل تک جا پہنچی۔ چھری سات انچ اندر گہرائی میں اتر گئی تھی۔ اس قتل اور مقدمہ کا چرچا شہر بھر میں تھا۔ اخبارات میں تہلکہ مچ چکا تھا۔ ہندو اخبارات نے راجپال کو آزادی رائے کا علمبردار قرار دیا تھا اور اس واقعہ کو اسلامی انتہا پسندی قرار دے کر خوب اچھالا۔ اسلامی تعلیمات کو نہایت منفی رنگ دیا جانے لگا۔ ہندو احتجاجی جلوس نکال کر مہاشہ راجپال کی ارتھی کو مکمل سرکاری اعزاز اور ایسے رستوں سے گزار کر شمشان تک پہنچانا چاہتے تھے جہاں مسلمانوں سے تصادم کا کوئی خطرہ نہ ہو۔ اس صورت میں ڈپٹی کمشنر کو ایک بار پھر شہر میں دفعہ 144 نافذ کرنی پڑی۔

دوسری جانب مسلمان غازی علم الدین کو سزا کا حقدار نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے مقدمہ کی پیروی کے لیے مسلمان وکلاء پر مشتمل 'غازی علم الدین ڈیفنس کمیٹی' تشکیل دی جس کی صدارت 'علامہ محمد اقبال' کے سپرد کی گئی۔ اس کمیٹی کے دیگر اراکین میں 'بیرسٹر میاں عبدالعزیز مالواڈہ'، 'بیرسٹر ایم سلیم'، 'مولوی غلام محی الدین قصوری'، 'ڈاکٹر تصدق حسین خالد'، 'بیرسٹر خواجہ فیروز الدین احمد'، 'بیرسٹر فرخ حسین'، 'سر شیخ عبدالقادر' اور 'میاں عزیز الدین شامل تھے۔

دس اپریل 1929 کو ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور 'مسٹر ای۔ ایس۔ لوئیس' کی عدالت میں زیر دفعہ 302 تعزیرات ہند مقدمہ قتل کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ غازی علم الدین ہتھکڑیاں پہنے نہایت سکون و اطمینان سے متبسم انداز میں ایک بینچ پر بیٹھا رہا۔ اس نے دھاری دار

باہر لاتعداد مسلمان موجود تھے کیونکہ عدالت بھی شمع رسالتؐ کے پروانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ وکیل استغاثہ 'ایشرداس' کے تیور نہایت جارحانہ تھے۔ صفائی کی جانب سے فرخ حسین اور خواجہ فیروز الدین نے مقدمہ کی پیروی کی۔ کیدار ناتھ (مقتول کا ملازم)' بھگت رام (ملازم)' نانک چند (کلاتھ مرچنٹ)' پرمانند (پیپر مرچنٹ)' ودیا رتن (ایندھن فروش)' وزیر چند (ٹھیکیدار)' آتمارام (کباڑیہ) کے علاوہ پولیس اہلکاروں تاراچند (ہیڈ کانسٹیبل نمبر 1658 تھانہ کچہری)' رحمت خان (کانسٹیبل)' برکت علی (ہیڈ کانسٹیبل ٹریفک ڈیوٹی)' ہنس راج (ہیڈ کانسٹیبل نمبر 1818 تھانہ کچہری)' گردھاری لال (اسسٹنٹ سپرانٹنڈنٹ ڈی اے وی سکول بورڈنگ ہاؤس)' محمد عثمان (ڈرافٹسمین)' خوشحال چند (دکاندار)' شیر محمد (کانسٹیبل نمبر 1893 تھانہ کچہری)' جلال دین (سب انسپکٹر سی 234 تھانہ کچہری)' جواہر لال (انسپکٹر پولیس سی آئی ڈی لاہور) نے گواہان کے فرائض سرانجام دیے اور بائیس مئی کو سیشن جج نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ ''یہ مقدمہ بالکل صاف اور واضح ہے۔ میں دو اسیسر کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ ملزم علم الدین نے راجپال کو قتل کیا ہے۔ اس کا مقصد خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ قتل ہے اور اس کے بدلہ میں اسے سخت سزا ملنی چاہیے۔ لہٰذا میں ملزم علم الدین کو دفعہ 302 تعزیرات ہند کے تحت مجرم گردانتے ہوئے سزائے موت کی توثیق کرتا ہوں اور اس کو پھانسی کا حکم دیتا ہوں کہ اسے اس وقت تک پھانسی پر لٹکایا جائے جب تک مر نہیں جاتا۔''

عدالت میں بھنبھناتا ہوا شور یکدم بلند ہو گیا۔ ہندو بے حد خوشی سے نعرے لگانے لگے جبکہ مسلمان انصاف کے اس دوہرے معیار پر سراپا احتجاج تھے۔

''آرڈر، آرڈر،'' جج نے سختی سے کہا۔ ''مجرم کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ سات یوم کے اندر اندر اپیل کر سکتا ہے۔ اس کو فیصلہ کی نقل مہیا کر دی جائے گی اور مقدمہ کا ریکارڈ ہائیکورٹ میں جمع کروا دیا جائے گا تاکہ سزائے موت کی توثیق ہو سکے۔ اس امر میں کسی بھی قسم کی کوئی تاخیر نہیں ہوگی۔''

عدل و انصاف کے اس 'قتل' کے بعد عدالت برخاست ہو گئی۔

☆......☆

علم الدین اسے اپنی خوش نصیبی گردان کر مسرتوں سے نہال تھا تاہم اس کے اہلخانہ اور دیگر پروانہ رسولؐ نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس ضمن میں طالع مند نے 'بمبئی' جا کر برصغیر کے چوٹی کے وکیل 'محمد علی جناح' سے ملاقات کی۔

''کیس بآسانی جیتا جا سکتا ہے بشرطیکہ مدعی صحت جرم سے انکار کر دے۔ بصورت دیگر برطانوی انتظامیہ اور ہندو اسے کسی قیمت پر رہا نہیں ہونے دیں گے۔'' انہوں نے اپنے مخصوص نپے تلے اور دوٹوک انداز میں سائلین کو حقائق سے آشنا کیا۔

''جناح صاحب! ہم نے اسے سمجھایا تھا کہ اپنا بیان تسلیم کرنے سے انکار کر دے لیکن وہ مانتا ہی نہیں۔'' طالع مند ان کی بارعب شخصیت اور پروقار انداز سے متاثر ہو کر بولا۔

''میں یہ کیس ضرور لڑوں گا۔ اگر علم الدین اقبال جرم سے انحراف کر دے تو میں اسے باعزت بری کروالوں گا لیکن میں یہ بھی سمجھ رہا ہوں کہ وہ ایسا ہرگز نہیں کرے گا۔''

''جی ہاں! وہ کہتا ہے کہ راجپال میرے نبیؐ کا مجرم ہے۔ اس کا قتل میں فخر سے قبول کرتا ہوں۔ اگر انکار کر دیا تو روز آخرت اپنے آقاؐ کا سامنا کیسے کر پاؤں گا؟''

طالع مند کی بات سن کر ان کے لبوں اور آنکھوں میں محبت آمیز چمک پیدا ہو گئی۔ انہوں نے کیس کی پیروی کرنے کی ہامی بھر لی اور چودہ جولائی کو لاہور آ کر 'فلیٹیز ہوٹل' میں ٹھہر گئے۔

پندرہ جولائی کو غازی علم الدین کا مقدمہ لاہور ہائیکورٹ میں 'جسٹس براڈوے' اور 'جسٹس جان اسٹون' پر مشتمل ڈویژنل بینچ میں پیش ہوا۔ محمد علی جناح کی معاونت فرخ حسین کر رہے تھے۔ انہوں نے مقدمہ کے واقعات کو نہایت باریک بینی سے جانچ کر عینی شاہدین کے بیانات پر کڑی جرح کی اور ماہرانہ انداز میں ان کے تضادات سامنے لے آئے۔ (جیسا کہ کیدارناتھ نے اپنے ابتدائی بیان میں بھگت رام کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ ہی دکان میں کام کر رہا تھا اور کیدارناتھ کی طرح اس نے بھی علم الدین کو کتابیں پھینک کر مارا تھا۔ اس نے یہ بھی تسلیم نہ کیا تھا کہ علم الدین نے اقبال جرم کر لیا تھا جبکہ سیشن عدالت میں دیے گئے بیان میں کیدار کا کہنا تھا کہ ملزم نے کہا تھا میں نے رسول کریمؐ کی توہین کا بدلہ لے لیا

ہے؟)

اسی طرح انہوں نے بھگت رام اور ستر سالہ آتما رام کے بیانات میں بہت سے سقم نکال کران کی گواہیوں کو بھی باطل ثابت کردیا۔ مزید جرح کے بعد انہوں نے پُر زور تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ''تعزیرات ہند دفعہ 308 کے تحت علم الدین نے قتل اشتعال میں کیا ہے کیونکہ راجپال نے ایک شرانگیز کتاب کی اشاعت کی تھی۔ دفعہ (A)353 کے تحت نفرت پھیلانا بھی جرم ہے۔ اگر معزز عدالت نے راجپال کو باعزت بری قرار دے دیا تھا تو بیس' اکیس سالہ اس نوجوان پر سزائے موت کا فوری اطلاق کیونکر ہوتا ہے۔ اس کی عمر اور قتل کے محرکات کو دیکھتے ہوئے اسے دفعہ 304 کے تحت زیادہ سے زیادہ دس سال کی سزا دی جاسکتی ہے۔''

ان دلائل نے عدالتی جانبداری کی قلعی مکمل طور پر کھول دی۔ سرکاری وکیل 'دیوان رام لال' کے چھکے چھوٹ چکے تھے لیکن اس نے طے شدہ 'اسکرپٹ' کے مطابق ایک ہی موقف اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''پیغمبر اسلامؐ کی اہانت واقعی افسوسناک ہے لیکن تعزیرات ہند میں چونکہ اس جرم کی کوئی سزا مقرر نہیں لہٰذا ہم اسے خلاف قانون حرکت قرار نہیں دے سکتے۔ یہ قتل اشتعال انگیزی کے دائرہ کار میں نہیں آتا۔''

فریقین کے دلائل سننے کے بعد سترہ جولائی 1929 کو لاہور ہائی کورٹ نے بھی سیشن کورٹ کا فیصلہ برقرار رکھنے کی توثیق کردی۔ غازی علم الدین کی مسرت بے بہا تھی۔ وہ سجدہ شکر ادا کرتے نہ تھک رہا تھا۔ اپنے لیے شہادت کا رتبہ اور بارگاہِ رسالتؐ میں حاضری کی سعادت پا کر کون مسلمان غمگین ہوسکتا ہے بھلا؟ اخبارات میں محمد علی جناح کے دلائل پر انہیں اس مقدمہ کا اصل فاتح قرار دے کر ہائیکورٹ کے ججوں کا یہ فیصلہ بعید از انصاف قرار دے دیا۔ انصاف فروخت ہو چکے تھے۔ مسلمان ایک ایسی قوم سے عادل ہونے کی امید لگائے بیٹھے تھے جن کے لیے مذہب اور بانی مذہب کا تقدس اور اہمیت سمجھنا ہی محال ہے۔ کائنات کو ایک عظیم دھماکے کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہونے کے داعی اور انسان کو بندروں کی ارتقائی شکل سمجھنے والے افراد کیونکر انصاف کرسکتے تھے۔ وہ اپنے اہم ترین 'مہرے' سے محرومی پر بے حد تلملائے ہوئے تھے۔

☆......☆

ہائی کورٹ کے اس فیصلہ سے ہندو قیادت کو خوش کرنے کے بعد انگریز انتظامیہ مسلم ردِعمل سے بھی خائف تھی۔ انہیں علم تھا کہ مسلمان اپنے غازی کی رہائی کے لیے ہر ممکن کوشش جاری رکھیں گے۔ کیا عجب کہ وہ اسے جیل سے فرار بھی کروانا چاہیں۔ ایسے ہی ان گنت تحفظات کے پیشِ نظر غازی علم الدین کو تین اکتوبر 1929 کو بذریعہ بس 'گوجرانوالہ' اور پھر ریل کے فرسٹ کلاس ڈبے میں چار سپاہیوں' دو سارجنٹس اور ایک کپتان کے ہمراہ 'میانوالی ڈسٹرکٹ جیل' پہنچا دیا گیا۔

مسلمان زعما اب بھی ہمت ہارنے کے لیے تیار نہ تھے۔ انہوں نے یہ معاملہ 'پریوی کونسل' میں چیلنج کردیا۔ انہیں یقین تھا کہ وہاں فرقہ وارانہ منافرت اور اشتعال انگیزی کے خلاف مسلمانوں کی شنوائی ضرور ہوگی لیکن یہ بھی خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔ پریوی کونسل کی جانب سے 'پندرہ اکتوبر' کو مذہبی اشتعال انگیزی پر کسی قسم کے اظہار رائے کے بغیر ہی اپیل نامنظور کردی گئی۔

میانوالی جیل میں غازی علم الدین کی شہرت اس کے آنے سے قبل ہی پہنچ چکی تھی۔ خونخوار ترین قیدی بھی اس عاشق رسول کا بے حد احترام کررہے تھے۔ اسے پھانسی کی کوٹھری میں بند کردیا گیا۔ ملاقاتی افراد اشکبار آنکھیں لیے اسے ملنے آتے تو اس کا چٹانی حوصلہ اور باوقار متبسم انداز دیکھ کر مزید متاثر ہونے لگتے۔

''کیوں روتے ہو؟ کیا تمہیں میری اس سعادت پر دکھ ہے؟ جو کچھ میں دیکھنے لگا ہوں اگر وہ تمہیں بھی نظر آنے لگے تو تم بھی شوق شہادت سے بوجھل ہو جاؤ۔ خدارا! میرے پاس آکر اظہار افسوس اور آنسو مت بہایا کرو۔'' اس کا غیر متزلزل انداز مقابل کو بحرِ ندامت میں غرق کردیتا۔ جیل کی اس کوٹھری میں غازی علم الدین کی صحت شاندار ہونے لگی تھی۔ وزن میں اضافہ بھی دیکھا گیا اور خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ اس سے ملاقات کے لیے اہلخانہ ہی نہیں' اکثر جیل منتظمین اور بااثر افراد بھی مشتاق رہتے تھے۔ جوں جوں دن گذر رہے تھے غازی علم الدین کی ذات کے اسرار بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ ایسا بھی کئی بار دیکھنے میں آیا کہ جیل میں کسی بیمار قیدی کو وہ اپنے ہاتھ سے دو گھونٹ پانی پلا دیتا تو قیدی صحت یاب ہوجاتا۔ انہی دنوں قیدیوں کی نگرانی پر مامور سپاہی 'نواب دین پھگواڑہ' کو ایک محیّر العقل تجربہ ہوا۔ وہ اپنے معمولات کے مطابق نگرانی میں مشغول تھا کہ اسے علم الدین کی کوٹھری خالی دکھائی دی۔ نواب دین کی سٹی گم ہوگئی۔ اس قیدی کی اہمیت اور برطانوی سرکار کی اس کے متعلق 'تشویش' تو اب کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہ

ہی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں یہی خیال پیدا ہوا کہ کوئی سرفروش غازی کو جیل سے فرار کروا کے لے گیا ہے۔ اس نے جیل میں موجود اعلیٰ حکام کو اس حادثہ کی اطلاع دی۔ آن ہی آن میں وہاں افراتفری کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ انتظامیہ جب کوٹھری تک پہنچی تو یہ دیکھ کران کی حیرت کی انتہا نہ رہی غازی علم الدین نہ صرف وہاں موجود تھا بلکہ کوٹھری بھی عجیب وغریب شعاعوں سے منور تھی۔ اس کے پاس نورانی صورت اور جاہ وجلال والے سبز پوش بزرگ کھڑے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے حوصلہ مندر ہنے کی تلقین کررہے تھے۔

رعب‘ ہیبت اور محبت کے جذبات ان پر بیک وقت حملہ آور ہوئے اور انہیں خود بھی احساس نہ ہوا کہ آنسو کب پلکوں کی باڑھ پھلانگے چہرہ بھگونے لگے تھے۔

☆......☆

میانوالی جیل میں غازی علم الدین سے الوداعی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

انتیس اکتوبر کے اس سرد دن میں شیدا اسے ملنے آیا تو اس کی حالت نے علم الدین کو حیران کردیا۔ شیدے کی ڈاڑھی بے ترتیب‘ آنکھیں لہورنگ اور چہرے پر اداسی کے دبیز بادل چھائے تھے۔

”یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تو نے؟ میرا ابا اگر تجھے ایسے دیکھ لے تو ڈانٹ کر کہے۔ علمو! تیرا لفنگا دوست اب ہر وقت ہی نشے میں رہنے لگا ہے۔“ اس کے بے ساختہ انداز پر شیدے کے ہونٹوں پر پژمردہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”چاچا طالع مند کا رویہ اب میرے ساتھ بہت تبدیل ہوگیا ہے۔ بڑا پیار کرنے لگا ہے وہ مجھے۔ کہتا ہے میں تیرے اور علمو کے بارے میں ہمیشہ غلط سوچتا رہا۔“

”بلے بھئی بلے! یہ کی ناں ابا نے سمجھداروں والی بات۔“ وہ دانستہ طور پر ہلکا پھلکا انداز اختیار کیے ہوئے تھا لیکن نتیجہ برعکس برآمد ہوا اور شیدے کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

”کیا تو میری طرح خوش نہیں ہے یار؟“ اس بار وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”ہماری سب سے بڑی خواہش یہی تھی ناں کہ اپنے آقا کے نام پر کٹ مریں۔ اللہ پاک نے کتنی بڑی کرم نوازی کی ہے کہ لاکھوں مسلمانوں میں اپنے اس حقیر بندے کو ملعون راجپال کے خاتمہ کے لیے منتخب کرلیا۔“

”میں خوش ہوں علمو! رب دی سونہہ (قسم)! بہت خوش ہوں۔ تجھے ملنے والی اس سعادت پر کوئی کافر ہی دکھی ہوسکتا ہے۔

”مجھے پتا ہے کہ تجھے بھی اس سعادت کی بڑی تمنا تھی لیکن یہ بات کیوں بھول رہا ہے کہ میں تیری مدد کے بغیر اس عمل میں کامیاب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کا اجر تو بھی ساری زندگی پاتا رہے گا۔“ اس کی بات پر شیدا گہری سانس بھر کر اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

”میری موت پر غم نہ کر شیدے! میں جانتا ہوں کہ تجھے اس پھانسی کا افسوس ہے۔ میرے لیے دعائے خیر کرتے رہنا۔“ وہ اسے بھرپور دلاسہ دیتا رہا اور پھر وقت ملاقات اپنے اختتام تک آن پہنچا۔ عمر کی نقدی سے کچھ اور سکے عدم کے کاسہ میں جا گرے۔ زندگی کے شجر سے اختتامی پتوں میں ایک اور پتا جھڑ گیا۔

☆......☆

تیس اکتوبر کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔

غازی علم الدین کے چہرے اور آنکھوں کی چمک میں کچھ مزید اضافہ ہو چلا تھا۔ سزائے موت کے قیدی بالعموم حواس باختگی کا شکار ہو جایا کرتے ہیں لیکن اسے تو گویا ہر گزرتا لمحہ اطمینان قلب کی دولت سے مالا مال کررہا تھا۔ ہونٹوں پر ہمہ وقت تبسم کھلا رہتا۔ وہ صبر واستقلال اور عشق رسول کی ایک نئی مثال قائم کررہا تھا۔ بے چین آنکھوں میں اپنے محبوب سے ملاقات کی پیاس اور یقین کے رنگ دیکھنے والے کی نظریں بھی خیرہ کردیا کرتے تھے۔ اسے شکوہ تھا تو محض اتنا کہ ملاقاتی اس کی خوشی میں شرکت کی بجائے منع کرنے کے باوجود افسردگی سے آنسو بہانے سے باز ہی نہ آتے تھے۔ آج کی ملاقات تو یوں بھی بہت اہم تھی کیونکہ اہلخانہ کسی بھی لمحہ یہاں پہنچ سکتے تھے۔

انتظار کی یہ گھڑیاں زیادہ طویل ثابت نہ ہوئیں اور عزیز از جان وہ رشتے اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ طالع مند کی آنکھوں میں فخر ومسرت کی لہریں اس کا وجود مزید ہلکا پھلکا کرگئیں۔

”ہمیں تجھ پہ بہت فخر ہے پتر! پروردگار تیرے جیسی اولاد ہر باپ کو عطا کرے۔“ طالع مند کا لہجہ ضبط کے باوجود گلوگیر ہوگیا۔

”آج میں آپ سے بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں ابا جی! چند گھنٹوں بعد میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ مرنے کے بعد مجھے یہیں غسل دینا اور میانوالی میں ہی نماز جنازہ بھی پڑھوانا۔ زندگی میں بہت گناہ گار رہا ہوں۔ میری مغفرت کے لیے دعا کرنا۔ میری نعش لاہور

لے جائیں تو وہاں بھی غسل ضرور دینا۔ میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ میرا جنازہ اسی چارپائی پر قبرستان جائے جس پر عاشق رسولؐ مولوی تاج دین' کی نعش لے جائی گئی تھی۔ آپ میرے لیے یہ بندوبست کروا دیں گے ناں؟"

"میں پوری کوشش کروں گا پتر!" طالع مند کی آنکھوں سے آنسو آگئے۔

"رو کیوں رہے ہیں ابا جی؟ میانوالی سے لاہور تک گاڑی جس اسٹیشن پر بھی رکے' وہاں بھی لوگوں کو رونے یا ماتم مت کرنے دینا۔ میری روح کو بڑی تکلیف ہوگی۔ انہیں کہنا با آواز بلند کلمہ کا ورد کرتے رہیں۔ 'لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ' کا یہ ورد دشمنوں کے لیے بڑا بھاری ثابت ہوگا۔ انہیں یہ بھی التجا کرنا کہ مجھ گناہ گار کے لیے دعا کریں کہ قبر میں میرا حساب آسان ہو۔ لاہور میں میرا جنازہ چوبرجی گراؤنڈ میں پڑھوا دینا۔ قبر پکی نہ بنانا۔ بس اتنا کرنا کہ وہاں گلاب کے پودے لگا دینا۔ میری لاش کسی صندوق میں بند کر کے دفن کرنے کی بجائے قبر کے خاکی فرش پر رکھ دینا۔ میرے نبیؐ کو یہی طریقہ پسند تھا۔ میں نے آپ سب کا بھی ساری زندگی بڑا دل دکھایا ہے۔ مجھے معاف کر دینا...... اماں! مجھے اپنا دودھ بخش دے گی ناں! بڑا ستایا ہے تجھے میں نے۔" اس کا انداز دیکھ کر جیل کے سنگی در و دیوار بھی روتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ والدہ کا کلیجہ بھی تڑپ اٹھا اور وہ بے اختیار دھاڑیں مارنے لگیں۔

"ان آنسوؤں کے ساتھ میرا جنازہ بھاری مت کریں ماں جی! آپ تو خوش نصیب ہیں کہ مجھے ایسی موت نصیب ہو رہی ہے جس کی تمنا ہر مسلمان کرتا ہے۔" وہ بھرپور مسکراہٹ سے بولا تو والدین اور بھائی نے فرطِ محبت سے سلاخوں کے عقب میں کھڑے علم الدین کے ہاتھ چوم لیے۔ ان کے دل فخر و عجز سے معمور تھے کہ ان کا سپوت ابوالاثر حفیظ جالندھری کا مطلوب 'فخر آدم' ثابت ہوا تھا۔ اس سعادت پر زندگی بھر بھی شکرانہ بجالاتے تو حق بندگی ادا نہ ہو پاتا۔

☆......☆

اس رات میانوالی جیل میں کسی پر بھی نیند مہربان نہ ہوئی تھی۔

ساتھی قیدی محبت و عقیدت سے غازی علم الدین کی کوٹھری پر نظریں جمائے بیٹھے تھے جہاں وہ نوعمر مرد مومن عبادت میں مشغول تھا۔ وہ سب اس شخص کی خوش بختی' ہمت و جرأت کے قائل تو روز اول ہی سے تھے لیکن چند روز پہلے ہونے والے ایک واقعہ نے انہیں غازی کا مزید گرویدہ بنا دیا تھا۔

ہوا یوں تھا کہ خان بہادر ملک عطا محمد خاں اس سے ملاقات کے لیے جیل آئے تو اسے فرار کی سنجیدہ و بھرپور پیشکش کر دی۔ غازی علم الدین نے نہایت ادب و وقار سے جواب دیا ہے۔ "میں راجپال کا قاتل ہونے پر نادم نہیں' فاخر ہوں۔ اگر اپنے نفس یا کسی پیشکش کے ہاتھوں مغلوب ہو کر اقرار کر بیٹھا تو اپنے آقاؐ کی شفاعت کا طالب کیسے بنوں گا؟ راجپال کی ہندو برادری یہ نہ کہے گی کہ محمدؐ کا عاشق ایسا بزدل تھا کہ جان بچا کر بھاگ نکلا۔" اس روز کے بعد غازی علم الدین نے جیل انتظامیہ سے درخواست کی کہ اہلخانہ کے سوا اسے کسی سے ملاقات نہیں کرنی۔

رات کا سفر دھیرے دھیرے طے ہوتا جا رہا تھا۔ تہجد کے بعد وہ ذکر الٰہی میں مصروف تھا کہ منتظم اعلیٰ خصوصی طور پر اس سے ملنے کے لیے چلا آیا۔ "اللہ پاک ایسی سعادت ہر کسی کو نصیب فرمائے غازی! میں تمہارے جذبہ اور ہمت کا مرید ہو گیا ہوں۔"

"آپ یہ دعا بھی کیجیے صاحب بہادر کہ پروردگار ہم مسلمانوں کو اتنی مضبوطی عطا کر دے کہ دشمن پھر کبھی ہمارے رسولؐ کی شان میں گستاخی کرنے کا سوچ بھی نہ سکے۔"

"آمین..... کوئی وصیت کرنا چاہو گے جوان؟"

"میرے تمام رشتہ داروں کو ایک پیغام ضرور پہنچانا صاحب! میرے پھانسی لگ جانے سے ان میں سے کسی کے گناہ بخشے جائیں گے' نہ ہی کسی کو جنت کا ٹکٹ ملے گا۔ ہر ایک کے ذاتی اعمال ہی انہیں دوزخ کی آگ سے بچائیں گے۔ وہ نماز قائم کرتے رہیں' شرعی احکام کی سخت پابندی کریں' زکوٰۃ باقاعدگی سے دیں۔ جب مجھے دفن کر چکیں تو دو رکعت نفل نماز شکرانہ اور دو نفل برائے مغفرت ضرور ادا کریں۔ جنازے کے ہمراہ فساد نہیں امن و امان قائم رکھا جائے۔ شرکاء ماتم کی بجائے ذکر الٰہی کرتے رہیں۔"

"میں اس امانت کا حق ضرور ادا کروں گا۔" سپرنٹنڈنٹ نے یقین دلایا۔

کچھ ہی دیر بعد مجسٹریٹ دو سپاہیوں اور داروغہ جیل کے ہمراہ کوٹھری کے دروازے پر موجود تھا۔

"وقت آگیا ہے علم الدین!"

"میں تو کب سے تیار ہوں صاحب!" اس نے پُروقار انداز میں جواب دیا۔

"کوئی آخری خواہش؟"

"صرف دو رکعت نماز شکرانہ کی مہلت۔" غازی علم الدین نے خشوع وخضوع سے نماز ادا کی اور خوشی کے آنسوؤں سے لبریز آنکھیں پونچھ کر داروغہ جیل سے مخاطب ہو کر کہا۔

"گواہ رہنا! ایک پروانہ رسولؐ کے شوق شہادت اور آخری سجدہ نماز کے۔"

جیل کے تمام تر قیدی اپنی کوٹھریوں اور بیرکوں میں اس فدائی رسول کی آخری جھلک کے لیے تعظیمی انداز میں کھڑے ہو گئے۔ جیل کے در و دیوار 'درود پاک' کی روح پرور صداؤں سے گونج رہے تھے۔ غازی علم الدین نہایت وقار ومتانت سے تختہ دار پر پہنچا اور وارفتگی شوق میں پھانسی کا پھندا خود اپنے گلے میں ڈالنے کے لیے مچل اٹھا لیکن خلاف شریعت جان کر ضبط کیے کھڑا رہا۔ مجسٹریٹ کی نظریں گھڑی پر ساکت تھیں۔ غازی نے طائرانہ نگاہ حاضرین پر ڈالی اور کہنے لگا۔ "لوگو! گواہ رہنا! میں نے ہی راجپال کو حرمت رسولؐ کی خاطر قتل کیا تھا...... لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ......" اس نے دار و رسن کو بوسہ دیا۔ داروغہ نے چہرے کو سیاہ کپڑے سے ڈھکا اور پھندا گردن میں ڈال دیا۔ مجسٹریٹ کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور اس کے خفیف اشارے کے ساتھ غازی علم الدین کے پاؤں تلے سے تختہ کھینچ لیا گیا۔ پروانۂ رسولؐ نے پل بھر میں ہی شہادت کا رتبہ پا کر ایک لازوال تاریخ رقم کر دی۔

بنا کر دند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

☆......☆

لاہور کے ایک گمنام علاقہ کا بے پروا، لاابالی اور ان پڑھ 'علموا' اب غازی علم الدین شہید بن کر کروڑوں دلوں کی دھڑکن بن چکا تھا۔

شہادت کے بعد بھی گورنر پنجاب کی ناعاقبت اندیشی نے اس معاملہ کو الجھائے رکھا۔ اس کے جاری کردہ احکامات کے مطابق میت کو میانوالی میں قیدیوں کے قبرستان میں دفن کر کے لاہور بھیجنے سے انکار کر دیا گیا۔ روزنامہ 'انقلاب' سمیت کئی اخبارات میں اس خبر کو نمایاں سرخیوں میں جگہ ملی۔ عوام الناس میں اضطراب کی کیفیت برپا ہو گئی تھی۔ رہی سہی کسر منادیوں اور ڈھنڈورچیوں نے ڈھول اور نقاروں کی صداؤں میں شہر بھر میں اعلان کر کے پوری کر دی۔ ہر سو 'غازی علم الدین زندہ باد' کے نعروں کی گونج سنائی دیتی تھی۔ قدم ملتے گئے قافلہ بڑھتا گیا۔ مجمع بیس، پچیس ہزار کے قریب جا پہنچا۔ اس جلسہ میں قرارداد منظور کی گئی کہ اگر جسد خاکی بلاشرط ورثاء کے حوالے نہ کیا گیا تو اگلی صبح ہڑتال کی جائے گی۔ اس تحریک کا ایک ہی نعرہ تھا کہ نعش لیں گے یا نعش بن جائیں گے۔ اس مظاہرے کے بعد حکومتی ارکان سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ عوام کے بپھرے ہوئے سمندر سے خائف نظر آنے لگے تھے۔

اسی دوران ایک وفد 'علامہ محمد اقبال' کی سربراہی میں گورنر پنجاب 'سر جیفری ڈی مونٹ مورنسی' سے ملا۔ اس وفد میں سر میاں محمد شفیع' سید مراتب علی شاہ' مولانا ظفر علی خان' فضل حسین' خلیفہ شجاع الدین' سید حبیب شاہ اور سترہ میونسپل کمشنرز شامل تھے۔ یہ وہ مرحلہ ومقام تھا جہاں سر شفیع کی سرکار دوستی' ظفر علی خان کی سرکار دشمنی اور اقبال کی بے نیازی مکمل طور پر پس منظر میں چلی گئیں۔

"اگر علم الدین کی نعش آنے سے لاہور میں فساد برپا ہوا تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟" گورنر کے بظاہر سپاٹ وسرد انداز میں اس کا خوف جھلک رہا تھا۔

"یور ایکسی لنسی! ایسی کوئی بات ہوئی تو بے شک میری گردن اڑا دی جائے۔" علامہ اقبال نے پُراعتماد انداز میں جواب دیا۔

"آل رائٹ! آپ کو ہماری کچھ شرائط پوری کرنا ہوں گی۔ نعش آنے کی اطلاع صرف بیس گھنٹے قبل یہاں دی جائے گی۔ جنازہ شہر کے اندر سے نہ گزرے۔ مسلمان اپنے جذبات احساسات پر ضبط قائم رکھیں۔ اخبارات ذمہ دار اور مصالحانہ کردار ادا کریں۔ جلسے اور احتجاج کا سلسلہ ترک کر دیا جائے۔"

"ہمیں منظور ہے۔ غازی علم الدین شہید کا جنازہ نہایت پُرامن ہوگا۔"

ان ضوابط ومراحل سے گزر کر تیرہ نومبر کو ایک وفد سید مراتب علی شاہ اور مجسٹریٹ مرزا مہدی حسن کی قیادت میں میانوالی آیا اور چودہ نومبر کو غازی علم الدین شہید کا جسد خاکی بذریعہ ریل لاہور چھاؤنی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچا دیا گیا۔ تر و تازہ اور خوشبوؤں سے معطر شہید کا چہرہ ہنوز متبسم اور پُرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ چھاؤنی پر نعش سینٹرل جیل نے وصول کی۔ علامہ اقبال' سر محمد شفیع' چند میونسپل کمشنروں نے دستخط کے بعد اپنی ذمہ داری پر براستہ چوبرجی 'میانی صاحب قبرستان' کی راہ لی۔ الفاظ کا کوئی ذخیرہ' ادب کا کوئی خزینہ' قوت بیان کی کوئی بھی وسعت اور استعداد اظہار اس منظر کا نقشہ نہیں کھینچ سکتی۔ چوبرجی کے میدان کی طرف

جانے والے سب رستے مسلمانوں کے قدموں کی دھمک اور کلمہ طیبہ کے ورد سے تھرا رہے تھے۔ چوبرجی کے احاطے میں موجود سب رہٹ چل رہے تھے۔ بلدیہ لاہور کے سقے جوش و عقیدت سے مشکیزے لیے کھڑے تھے۔ بلدیہ کے فائر بریگیڈ کا انجن پائپ کے ذریعہ میدان میں پانی بہم پہنچا رہا تھا۔ اس جنازے میں لاہور کا ہر فرد شرکت کا خواہاں تھا۔ برقعہ پوش خواتین کی کثیر تعداد شہید کے آخری دیدار کے لیے میدان میں چلی آرہی تھیں۔ ستر اسی سالہ خمیدہ کمر بوڑھے دشواری سے چلتے عزم و محبت کو اپنا عصا بنائے بے تابی سے وہاں پہنچنے کے لیے مچل رہے تھے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق انبالہ، امرتسر، لدھیانہ، منٹگمری، جالندھر، قصور، گوجرانوالہ، جہلم، گجرات اور میانوالی سے تقریباً چھ لاکھ مسلمان اس جنازے میں شریک ہوئے تھے۔

لمبے بانسوں پر بندھی چارپائی پر پھولوں کا بستر تھا جس پر چوبی صندوق رکھا گیا تھا۔ پندرہ روز قبل تختہ دار پر چڑھنے والے غازی علم الدین شہید کا جسد خاکی معطر تھا۔ صندوق کے بالائی حصہ پر ایک چادر پڑی تھی جس کے حاشیوں پر لکھا تھا۔

''شنیدم کہ درروز امید و بیم
بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم''

اس چادر پر کئی بالشت اونچی پھولوں کی تہہ تھی۔ معتقد اپنی جھولیوں اور ٹوپیوں میں پھول بھر بھر کر لائے تھے اور میت پر ڈال رہے تھے۔ عرق گلاب کی ان گنت بوتلیں اس پر چھڑکی جاچکی تھیں۔ طالع مند نے علامہ اقبال سے جنازہ پڑھانے کی درخواست کی تو وہ اس مطالبہ پر لرز کر رہ گئے۔

''میں بہت گناہ گار انسان ہوں محترم! میری اتنی بساط کہاں کہ اس شہید رسول کی نماز جنازہ پڑھا سکوں۔''

اس عاجزی انکار کے بعد چوبرجی کے وسیع میدان میں مسجد وزیر خاں کے خطیب 'حضرت قاری محمد شمس الدین' نے نماز جنازہ پڑھائی۔ نماز جنازہ کے لیے وہ میدان منتخب ہوا جسے 'چاند ماری' کہتے تھے اور جہاں آج کل چوبرجی کے کوارٹرز اور دیگر آبادی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ علاقہ دریا کی ترائی تک حد نظر بڑا سرسبز تھا۔ لحد تیار ہوئی تو مولانا ظفر علی خان فرط جذبات میں اندر جا کھڑے ہوئے اور بے اختیار روتے ہوئے بولے۔ ''کاش یہ سعادت مجھے نصیب ہوتی۔''

اقبال نے پرنم آنکھوں سے میت کو کندھا دیا اور اپنے ہاتھوں سے شہید کا جسد خاکی قبر میں اتار کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''اسیں تے گلاں ای کردے رہ گئے۔ ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا۔''

(ہم باتیں ہی کرتے رہے اور ایک ترکھان زادہ ہم سب پر بازی لے گیا۔)

بے شک عشق ہر منزل آسان کر دیتا ہے۔ شاید ایسی ہی سعادت کے لیے سلطان باہو نے کہا تھا۔

''غوث قطب تے ارے ارے
عاشق اگے جاندے ہو''

(غوث اور قطب اپنی ریاضتوں کے باوجود عاشق رسولؐ سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ عشق حقیقی کے سچے مسافر اپنی منزل بہت جلد پا لیتے ہیں)

☆......☆

غازی علم الدین شہید کے جنازے پر علامہ اقبال کے اظہار حسرت کے بعد 'حضرت پیر جماعت علی شاہ' نے تحریک پاکستان کے پنجابی شاعر 'عشق لہر' کو دعوت کلام دی جنہوں نے مجمع کو ایک بار پھر اشکبار ہونے پر مجبور کر دیا۔

''میاں اج دو رنگیاں ویکھیاں نیں
نالے غم سانوں 'نالے عیدوی اے
علم دین دی ایس بہادری دی
دید وی اے تے نالے شنید وی اے
جنت وچ رضواناں نے پچھنا نیئں
کول خط اودھے تے نالے رسید وی اے
عشق لہر! محمدؐ دا اوہ عاشق
غازی مرد وی اے تے شہید وی اے''

(آج میں نے دہرے رنگ دیکھے ہیں۔ ہمیں خوشی بھی ہے لیکن یہ خوشی غم کے لبادے میں لپٹی ہے۔ علم الدین کی اس قابل دید بہادری کی دھوم ہر سو ہے۔ اسے بھلا جنت میں داخلے سے قبل کیسے سوال ہوں گے؟ اس کے پاس تو عاشق رسولؐ ہونے کی مکمل سند موجود ہے۔ وہ نبی کا سچا عاشق تھا۔ ہمارے لیے وہ بیک وقت غازی بھی ہے اور شہید بھی)

ماخذات:

☆دیوان حسان بن ثابتؓ......☆غازی علم الدین شہید از ظفر اقبال نگینہ......☆سیارہ ڈائجسٹ (رسول نمبر)
☆غازی علم الدین شہید از عبدالرشید عراقی



لفظوں کی ساحرہ

زرین قمر

اس کے دل میں تڑپ چھپی تھی۔ اس کا خواب تھا کہ وہ ناول لکھے۔ اس نے تنگدستی میں، بھوکے رہ کر ایک ٹائپ رائٹر خریدا۔ مسودہ مکمل کیا اور اسے پبلشر کو بھیج دیا۔ ایک دو نہیں بارہ پبلشر نے اس کی کتاب کو مسترد کردیا۔ وہ ناکامی کے عمیق غار میں گرتی جارہی تھی کہ اس کے پبلیکیشن ایجنٹ نے بیٹی کی فرمائش پر اس کی کتاب چھاپنے کا ارادہ کرلیا پھر جب وہ کتاب سامنے آئی تو دولت کی برسات شروع ہو گئی۔

عالمی سطح پر معروف مصنفہ کی داستان

گھنے جنگل کی فضا میں ہلکی ہلکی کہر چھائی ہوئی تھی۔ سردیوں کا موسم تھا۔ صبح کاذب کا ملگجا اندھیرا طلوع ہوتے ہوئے سورج کی ٹھنڈی کرنوں سے آہستہ آہستہ چھٹ رہا تھا اور جے کے نامی وہ بچی ہلکی نیلی فراک کے ساتھ گھرا نیلا اوورکوٹ پہنے گھنے درختوں کے درمیان دور جارہی تھی۔ اس کے سر پر موٹے کپڑے کی لمبی نوکدار ٹوپی تھی۔ ایسی ٹوپی صرف قصے کہانیوں میں ہوتی ہے، مغرب میں کسی جادوگرنی کا ذکر آتا ہے تو اسی قسم کی ٹوپی اس کے سر پر ضرور ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس قسم کی ٹوپی دیکھ کر لوگ چونک جاتے، ٹوپی کے علاوہ ایک اور عجیب وغریب چیز اس کے ہاتھ میں

تھی۔ لمبے ڈنڈے والی جھاڑو، ایسی جھاڑو بھی جادوگرنیوں کے ساتھ لازمی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ اس کی چھوٹی بہن ڈانیا رولنگ بھی تھی جس نے پیلی فراک پہنی ہوئی تھی اس کے جسم پر بھی جے کے رولنگ کی طرح گہرا نیلا اوور کوٹ تھا اور سر پر جادوئی ٹوپی۔ وہ جے کے سے عمر میں دو سال چھوٹی تھی۔ یہ لباس ان کے پسندیدہ کھیل کا حصہ تھا جو وہ اکثر کھیلا کرتی تھیں۔ اس کھیل میں ان کا پڑوسی دوست جو بھی شریک ہوتا تھا، اس وقت بھی وہ ان کے ساتھ تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی جادوئی چھڑی تھی اور وہ ان کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

''رک جاؤ جینی۔'' جو نے زور سے کہا تو آگے دوڑتی ہوئی جے کے نے پلٹ کر دیکھا۔

''کیا ہوا؟'' جے کے نے حیرت بھری آواز میں پوچھا۔

''آخر یوں بھاگنے سے کیا ہوگا؟ اب تک کچھ بھی تو نہیں ہوا۔'' جو نے تذبذب سے کہا۔

جے کے نے جو سے کہا تھا کہ جادوئی چھڑی ہاتھ میں لے کر بھاگنے سے جنگل میں جادوئی ہیولے نظر آئیں گے۔

جو کے رکتے ہی ڈانیا بھی رک گئی تھی اور سوالیہ نظروں سے بہن کو دیکھ رہی تھی۔

''صرف بھاگنے سے کچھ نہیں ہوتا، تمہیں جادوئی منتر بھی پڑھنا ہے، یہ بات کیوں بھول جاتے ہو؟'' جینی نے اسے سمجھایا۔

''وہ منتر بہت مشکل ہے۔'' جو نے کہا جس کی عمر بمشکل پانچ سال تھی، وہ اس کا ہم عمر تھا۔

''میرے ساتھ دہراؤ۔'' جینی نے کہا اور جو اس کے الفاظ دہرانے کے لیے تیار ہوگیا۔

''ڈیمبھرا...... ایڈیمبرا...... اٹ ول ڈو......''

''ڈم...... ب......'' جو دہراتے دہراتے الجھن سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''ڈیم برا...... ایڈیم برا......'' جینی نے رک رک کر دہرایا اور جو نے اس کی تقلید کی جب کہ ڈانیا صرف اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔

''اٹ ول ڈو۔'' جینی نے باقی حصہ ادا کیا اور جو نے اسے بھی دہرایا۔

''چلو اب پھر شروع کرو۔ تم دونوں میرے پیچھے پیچھے دوڑو اور یہ منتر پڑھتے ہوئے جادو کی چھڑی کو لہراتے جاؤ۔ دیکھنا ابھی جنگل میں جادوئی دوست نظر آئیں گے۔'' جینی نے پُریقین لہجے میں کہا اور پھر دوڑنے لگی۔ ڈانیا اور جو بھی اس کے پیچھے دوڑنے لگے تھے لیکن اس بار وہ جادوئی چھڑی کو ہلانے کے ساتھ ساتھ منتر بھی پڑھتے جارہے تھے۔

''جودو...... جودو!'' انہیں دور سے آتی ہوئی مبہم سی آواز سنائی دی اور وہ لوگ رک گئے۔

''جو! تمہاری امی پھر تمہیں بلا رہی ہیں۔'' جینی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ اسے یہ مداخلت پسند نہ تھی۔ وہ یہ کھیل بہت شوق سے کھیلتی تھی اور اس میں کسی کی مداخلت اسے بالکل پسند نہیں تھی۔

''ہم پھر کھیلیں گے، ابھی میں جارہا ہوں۔'' جو نے جواب دیا اور اپنی چھڑی پھینک کر بھاگتا ہوا آواز کی سمت چلا گیا۔ جینی اپنی چھوٹی بہن ڈانیا کے ساتھ وہاں تنہا رہ گئی تھی اس نے پھر سے منتر پڑھتے ہوئے دوڑنا شروع کردیا تھا، تبھی اسے ایسا لگا جیسے کسی نے دھکا دیا ہو۔ وہ گری تھی۔ اسے منہ پر چوٹ آئی تھی۔ شاید یہ چوٹ کا اثر تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس کی آنکھ کھلی تو وہ بیڈ سے نیچے گری ہوئی تھی اور پسینے سے شرابور تھی۔ وہ اکثر یہ خواب دیکھا کرتی تھی۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اس کی والدہ اسے ہر روز فیری ٹیل یعنی جادوئی کہانیاں سناتی تھیں، یہ کہانیاں اسے اتنی پسند تھیں کہ ہر رات سونے سے پہلے انہیں سننے کی فرمائش کرتی تھی اور اس کی والدہ ایک موٹی سی کتاب سے اسے ایک چیپٹر سنا دیتی تھیں لیکن وہ کہانی کا ایک حصہ ہی سناتی تھیں۔ ایسی ادھوری کہانی سنا کر وہ تو چلی جاتی تھیں مگر رولنگ کا تجسس مزید بڑھ جاتا تھا تب وہ چادر اوڑھ کر ٹارچ کی روشنی میں کہانی کا اگلا حصہ ضرور پڑھتی تھی۔ اسے جادوئی کہانیوں سے دیوانگی کی حد تک پیار تھا اور رفتہ رفتہ اس کے دل میں ایسی کہانیاں خود بھی لکھنے کی خواہش سر اٹھانے لگی تھی۔

جے کے انگلینڈ کے شہر گلوز یسٹر شائر کے قصبے یٹی میں 31 جولائی 1965ء کو پیدا ہوئی تھی۔ اس کے والد پیٹر جیمس رولنگ ایک رولز رائس ایئر کرافٹ انجینئر تھے جو شادی سے پہلے اس کی والدہ سے کنگس کراس اسٹیشن پر ملے تھے اور یہ ملنا ان کے درمیان محبت کا سبب بنا تھا۔ یہ وہی اسٹیشن تھا جسے بعد میں جے کے کی زندگی میں ایک اہم مقام حاصل ہوا اور

اس نے جے کے کی زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔ اس کے والد کی ملاقات چودہ مارچ 1964ء کو اس کی والدہ سے ہوئی تھی اور جلد ہی ان کی شادی ہو گئی تھی۔

اپنی والدہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ اپنی چھوٹی بہن ڈائنا کو من گھڑت جادوئی کہانیاں سناتی تھی جنہیں وہ بہت شوق سے سنتی تھی پھر بات شوق تک نہ رہی، جے کے پر آہستہ آہستہ جادوئی کہانیوں کا والہانہ پن غالب آتا گیا اور دیوانگی یہاں تک بڑھی کہ وہ کلاس میں پڑھائی کے دوران اپنی کہانیوں کے جادوئی کرداروں کی تصاویر بنانے لگی جس پر اسے کئی بار سزا بھی ملی۔

جب اس نے نوجوانی میں قدم رکھا تو اس کی آنٹی نے اسے جیسیکا مٹ فورڈ کی کتاب Hons and Rebels پڑھنے کے لیے دی جو اسے اتنی پسند آئی کہ اس کے بعد اس نے جیسیکا فورڈ کی ساری کتابیں یکے بعد دیگرے پڑھ ڈالیں اور وہ اس کا آئیڈیل بن گئی۔ اب کہانیاں لکھنے کا شوق مزید بڑھ گیا تھا لیکن اس کے والد کا کہنا تھا کہ اس شوق کو پیشے کے طور پر نہیں اپنایا جا سکتا۔ انہوں نے اس کے رائٹر بننے کی مخالفت کی اور مشورہ دیا کہ وہ اگر ادب سے دلچسپی رکھتی ہے تو لٹریچر پڑھ سکتی ہے۔ اس کی والدہ نے بھی اسے سمجھایا اور اس نے اس اُمید پر کالج میں ایڈمیشن لے لیا کہ لٹریچر پڑھنے کے بعد اس کے رائٹر بننے کے شوق کو جلا ملے گی۔ اس نے Wyedean school & college میں داخلہ لے لیا جہاں اس کی والدہ سائنس ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کرتی تھیں۔ وہ تعلیم میں تیز تھی۔ ہمیشہ ہر جماعت میں اے گریڈ حاصل کرتی تھی۔ اس کے انگلش ٹیچر Steve eddy اسے بہت پسند کرتے تھے۔ وہ اپنے کالج کی ہیڈ گرل تھی۔

انگلش لٹریچر کے بعد اس نے فرنچ اور کلاسکس میں بی اے کیا اور لندن آکر Ammesty International research institute میں ملازمت کرلی۔ اس کی والدہ اس کے لیے اُمید کی ایک کرن تھیں۔ وہ ہمیشہ اس کا حوصلہ بڑھاتی تھیں۔ ایک بار کرسمس کے موقع پر وہ اپنی والدہ سے ملنے اپنے گھر گئی تو اس نے دیکھا کہ وہ بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ وہ شدید بیمار تھیں۔ کام کرتے ہوئے ان کے ہاتھ کانپتے تھے۔

''آپ اپنا علاج کروائیں۔ اپنی پروا کیوں نہیں کرتیں؟'' جے کے نے شکوہ کیا۔

''نہیں ایسا نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔'' انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔

''لیکن آپ مجھے بہت کمزور لگ رہی ہیں؟'' اس نے کہا۔

''تمہارا وہم ہے اور سناؤ کہانیاں لکھنے کا شوق کہاں تک پہنچا؟'' انہوں نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

''میں لکھتی رہتی ہوں۔'' اس نے اداسی سے کہا۔ ''لیکن مجھے کوئی اُمید نظر نہیں آتی۔ میں کسی پبلشر کو نہیں جانتی۔ میں کیا کروں؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ اس کی ماں نے انجانے میں اس کے اہم ترین دکھ کو چھیڑ دیا تھا۔ اس کا بچپن کا شوق اب تک پورا نہیں ہوا تھا جسے وہ ہر چیز پر ترجیح دیتی تھی۔

''ناامید مت ہو۔ اگر تمہارا شوق سچا ہے تو تم ایک دن ضرور کامیاب ہو گی۔'' انہوں نے کہا پھر ایک دم ان پر کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ گر گئیں۔

اس کے والد اور ڈائنا دوڑتے ہوئے آئے تھے اور انہوں نے اس کی والدہ کو سنبھالا تھا پھر انہیں اسپتال پہنچا دیا گیا جہاں سے کئی دن بعد وہ وہیل چیئر پر واپس آئیں۔ اس بار جب جے کے واپس جانے لگی تو وہ بہت اداس تھی اور اپنی ماں سے جدا ہونا نہیں چاہتی تھی لیکن کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ وہ ملازمت سے چھٹی پر آئی تھی اور اسے ہر حال میں واپس جانا تھا۔

''میں چاہتی ہوں کہ تم اپنا سفر جاری رکھو، تمہارا رائٹر بننے کا خواب صرف تمہارا ہی نہیں میرا بھی ہے۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ تم اپنی ملازمت جاری رکھتے ہوئے اپنا شوق پورا کرو۔'' اس کی والدہ نے دعا دینے والے انداز میں اسے سمجھایا۔

جب وہ ان سے رخصت ہو رہی تھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اسے لگ رہا تھا کہ اتنی وسیع دنیا کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ تنہا رہ گئی ہے۔ اب اس کی ماں اس کے ساتھ کھڑی ہو کر اسے اس کا حق نہیں دلوا سکتی تھی۔

وہ ملازمت پر واپس آ گئی اور اس نے 1988ء میں ایک مختصر مضمون لکھا جو اس کی تعلیم کے بارے میں تھا اور جسے یونیورسٹی کے جرنل میں شائع کیا گیا۔ یہ مضمون رومن، یونانی اور انگلش زبانوں میں تھا۔ یہ ایک اضافی صلاحیت تھی جو جے کے نے تعلیم اور ملازمت کے دوران حاصل کی کہ اس نے مختلف زبانوں کے لٹریچر لینگویج کے کورسز کیے اور ان

میں دسترس حاصل کی۔
ریسرچ سینٹر میں ملازمت کے دوران اسے اکثر والدہ کے فون آتے تھے اور کبھی وہ بھی انہیں فون کرلیتی تھی۔ یہ اس کے باس کو پسند نہیں تھا پھر ایک روز جب وہ فون پر اپنی والدہ سے ان کی طبیعت کے بارے میں پوچھ رہی تھی اس کے باس نے اسے اپنے آفس میں بلایا اور کہا کہ چونکہ وہ اپنی والدہ کے بارے میں بہت فکر مند ہے اور اس کے پاس بے فکر ہوکر دفتر کا کام کرنے کا وقت نہیں ہے چنانچہ وہ اسے ملازمت سے برخاست کرتے ہیں۔
جے کے کے سامنے اس حکم کو ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا اس نے باس کو کافی اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ وہ آیندہ اس بات کا خیال رکھے گی اور انہیں شکایت کا موقع نہیں دے گی لیکن وہ اس کی کوئی بات بھی سننے کے لیے تیار نہیں تھے چنانچہ وہ بوجھل قدموں سے ان کے دفتر سے نکل گئی۔ اس روز اس نے اپنے فلیٹ میں پہنچنے کے بعد کئی اخباروں کا مطالعہ کیا۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ایک رائٹر کے طور پر کام کرنے کے لیے اسے کس شہر میں رہنا مناسب ہوگا پھر اس نے مانچسٹر کا انتخاب کیا جہاں بہت سے پبلشنگ ہاؤسز تھے اور اس کے لیے اپنی کہانی لکھنے کے زیادہ امکانات روشن تھے۔ وہ لکھنا تو چاہتی تھی لیکن اس کا ذہن اب تک کلیئر نہیں تھا کہ اسے کس موضوع پر لکھنا چاہیے اور اس کے کردار کیسے ہونا چاہئیں۔ مانچسٹر میں اس نے چیمبر آف کامرس میں ملازمت کرلی جو کچھ ہی عرصے جاری رہی۔ اس کا لکھنے کا شوق اسے کہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا اور یہی بات افسران کو گراں گزرتی۔ چیمبر آف کامرس کی ملازمت چھوڑنے کے بعد وہ کسی نئی ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہوگئی کیونکہ اسے اپنی گزر اوقات کے لیے معقول رقم کی ضرورت تھی پھر اس نے گارڈین میگزین میں ایک اشتہار دیکھا۔ پرتگال کے ایک اسکول میں بچوں کو انگلش لینگویج پڑھانے کے لیے ٹیچر کی ضرورت تھی۔ جے کے نے وہاں اپلائی کردیا اور اسے فوراً ہی بلا لیا گیا۔
یہ 1990ء کا زمانہ تھا۔ وہ پرتگال جانے کے لیے سفر کا آغاز کررہی تھی اور ٹرین چار گھنٹے لیٹ تھی۔ یہ وہی Kingscross station تھا جہاں برسوں پہلے اس کے والدین کی ملاقات ہوئی تھی اور انہوں نے ایک دوسرے کو اپنی آیندہ زندگی کا ساتھی منتخب کرلیا تھا۔ یہ اسٹیشن اس کی زندگی میں بھی ایک نئی تبدیلی لے کر آیا تھا۔ جب وہ ٹرین کا انتظار کررہی تھی تو اس کے ذہن میں عجیب خیالات آرہے تھے مختلف قسم کی شکلیں اس کے ذہن کے پردے پر ابھر رہی تھیں۔ جیسے ہی ٹرین آئی، وہ اس میں سوار ہوگئی۔
ٹرین میں اس کی سیٹ کھڑکی کے قریب تھی۔ وہ باہر کے منظر سے لطف اندوز ہورہی تھی۔ دور دور تک سبزہ نظر آرہا تھا۔ ٹرین روانہ ہونے میں ابھی چند لمحے تھے۔
”آپ کی خدمت میں بہترین معیاری اشیاء موجود ہیں، آپ کیا لینا پسند کریں گی؟ ٹافیاں یا لالی پاپ؟“ اسے ایک خاتون کی آواز سنائی دی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے سامنے ایک ادھیڑ عمر خاتون ٹافیوں بسکٹ اور ویفرز کی ٹرالی لیے کھڑی مسکرا رہی تھی۔
”کیا؟ کیا کہا؟“ جے کے نے پوچھا۔
”میرے پاس ہر فلیور کی ٹافیاں موجود ہیں، لیمن، لائم، اسٹرابیری...... کون سی چاہئیں، ویسے تم کہاں جارہی ہو؟“ خاتون نے پوچھا۔
”میں ملازمت کی تلاش میں اگلے شہر جارہی ہوں۔“ جے کے نے جواب دیا۔ ”جہاں سے مجھے آگے جانا ہے۔“
”تمہارے لیے نیک خواہشات کا تحفہ ہے میرے پاس۔“ خاتون نے کہا اور چند ٹافیاں اس کی طرف بڑھا دیں۔
”شکریہ!“
”پریشان مت ہونا، سب ٹھیک ہوجائے گا، ہم پھر ملیں گے۔“ خاتون نے زندہ دلی سے کہا اور اسے ٹافیاں دیتی ہوئی رخصت ہوگئی۔ جے کے نے وہ ٹافیاں اپنے پرس میں رکھیں اور اپنی سیٹ سے ٹیک لگا کر پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے میں مصروف ہوگئی۔
”پریشان مت ہو۔ زندگی میں ملنے والی ناکامیوں کو جیت میں بدلنا سیکھو۔ تم ضرور ایک دن کامیاب ہوگی۔“ اس کے ذہن میں اس کے والد کے کہے ہوئے الفاظ گونجنے لگے اور اس نے سیٹ کی پشت سے سر لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔
”زمین پر قدم جمانا سیکھو۔ کامیابیوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت تم میں خود پیدا ہوجائے گی۔“ اس کے ذہن میں اس کے والد کے کہے ہوئے الفاظ پھر گونجے اور ساتھ ہی

ساتھ بچپن سے اب تک مختلف مواقع پر نظر آنے والا منظر پھر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ ایک بڑا سا کالے رنگ کا جنگلی الو اڑتا ہوا ٹرین کی کھڑکی کے قریب آیا تھا اور اپنی کرخت آواز نکالتا ہوا واپس پلٹ گیا تھا، اسی کے ساتھ جے کے اور ڈانیا کا بچپن اپنے جادوئی لباس پہنے اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔ وہ دونوں پُراسرار جنگل میں تھیں جہاں جانوروں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

''جووو...... جو......'' اسے پھر جو کی والدہ کی آواز سنائی دی تھی اور جو کھیل ادھورا چھوڑ کر چلا گیا تھا پھر اس کی بہن بھی منظر سے غائب ہو گئی تھی اور جے کے نے خود کو دیکھا تھا۔ وہ اب بچی نہیں تھی بلکہ جوان تھی وہ جنگل میں کسی کو تلاش کر رہی تھی۔ چند قدم آگے جا کر اسے جادوئی اسٹک پڑی ملی تھی۔ وہ اور آگے بڑھی تو ایک سفید کاغذ ملا جس پر سرخ رنگ کا دھبا پڑا ہوا تھا اور اس سے چند قدم آگے ایک مفلر پڑا تھا جو کچھ دیر پہلے اس کے بچپن کے ہیولے کے گلے میں تھا۔

''ہیلو...... ہیلو...... کیا یہاں کوئی ہے!...... ہیلو! کوئی ہے؟'' اس نے کئی بار کہا اور آگے بڑھتی گئی۔ کافی آگے جانے کے بعد اسے ایک لڑکا ملا جو سیاہ گاؤن اور ریڈ شرٹ پہنے ہوئے تھا اور اس کی پشت جے کے کی طرف تھی۔ جے کے نے اس کا کاندھا چھوا تو وہ لڑکا پلٹا۔ اس کی آنکھوں پر عینک تھی۔ آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ گلے میں ٹائی تھی وہ خاموش کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک جے کے کی آنکھ کھل گئی۔ ٹرین تیزی سے جنگل، میدان اور ندیوں کو پیچھے چھوڑتی آگے بڑھ رہی تھی۔ جے کے حیران تھی کہ اس نے تصور کی آنکھوں سے جو منظر دیکھا تھا وہ جیسے اس کے لیے وجدان ثابت ہوا تھا، اسے لگا کہ برسوں سے اس کا خواب اس کے ذہن میں موجود تھا لیکن وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی اور اب اچانک اس پر یہ حقیقت آشکارا ہو چکی تھی کہ دراصل وہ کیا لکھنا چاہتی تھی۔ اسے اس کا آئیڈیل کردار مل گیا تھا جو اس کی کہانی کا ہیرو بننے والا تھا۔

''ہیری پورٹر، اس کا نام ہیری پورٹر ہوگا۔ وہ ایک اسکول جائے گا۔ جادوگری کے اسکول۔ اوہ! میرا پین کہاں ہے؟'' وہ بڑبڑائی اور اس نے اپنا پرس کھول کر اپنی ڈائری اور پین نکالا اور لکھنا شروع کر دیا۔ پھر وہ سارے سفر کے دوران لکھتی رہی تھی اور اپنی منزل پر پہنچنے کے بعد بھی اس کا لکھنا جاری رہا تھا، پھر اسی سال اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا جس کی خبر اسے اس کی بہن ڈانیا نے دی تھی۔ اس کی والدہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ جے کے نے لکھنے کے لیے کسی کہانی کا انتخاب کر لیا ہے اور اس پر کام بھی شروع کر دیا ہے۔ اس کی والدہ کے انتقال نے ذہنی طور پر اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا اور اپنی اس کیفیت کو اس نے ہیری پورٹر کی کیفیت میں اس کی پہلی کتاب میں ظاہر کیا جب وہ اپنے والدین سے بچھڑ جاتا ہے۔

پرتگال جانے کے بعد اس نے اپنی چھوٹی بہن ڈانیا کو خط لکھا جس میں اپنے سارے دکھ بیان کر دیئے۔

''ڈانیا! میں یہاں اکیلی ہوں...... نیا شہر...... نیا ماحول اور اجنبی لوگوں میں، میں نے ایک ہاسٹل میں رہائش اختیار کر لی ہے جہاں میری دو روم میٹس ہیں۔ ایک ایوا اور دوسری ڈینی، وہ میری ہم عمر ہیں اور ان سے میری دوستی ہو گئی ہے۔ میں یہاں انگلش لینگویج پڑھانے آئی ہوں۔ یہاں کے لوگ پرتگالی بولتے ہیں اور میں انگلش، میں حیران ہوں کہ انہیں اپنی بات کیسے سمجھا سکوں گی۔ میں جانتی ہوں کہ اب مجھے بہت محنت کرنا ہوگی۔ ماں کے مرنے کے بعد سے زندگی میرے لیے اتنی آسان نہیں رہی ہے۔ میں رات میں لکھتی ہوں اور دن میں لینگویج سینٹر جاتی ہوں۔ بہت مصروف ہو گئی ہوں، شاید کرسمس پر بھی تم سے ملنے نہ آسکوں۔''

ڈانیا کو خط لکھنے کے بعد وہ اپنی روزمرہ مصروفیات میں مگن ہو گئی تھی پھر ایک روز اس کی دوستوں ایوا اور ڈینی نے اسے رات کو اپنے ساتھ ڈنر پر چلنے کے لیے مجبور کیا۔

''نہیں ایوا، میں نہیں جا سکوں گی تمہیں معلوم ہے یہ میرے لکھنے کا وقت ہے۔''

''یہ سب کام تو ہوتے ہی رہیں گے جے کے چلو...... کچھ انجوائے کرتے ہیں۔ زندگی میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ تم نے خود کو بہت مصروف کر لیا ہے، اتنا مصروف کہ تمہاری زندگی میں کوئی اور آ ہی نہیں سکتا۔'' ایوا نے سمجھایا۔

''ہاں...... چلو...... آج مزہ کریں گے...... خوب پئیں گے۔ ڈانس کریں گے اور کوئی اچھا چاہنے والا دوست بھی بنائیں گے۔'' ڈینی نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... میں نہیں جا سکتی۔'' جے کے نے ایک بار پھر معذرت کی۔

''تمہیں چلنا ہوگا۔ تم ہماری دوست ہو نا؟'' ڈینی نے ضد کرتے ہوئے کہا اور پھر جے کے نے ان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کرلیا۔

وہ تینوں ایک مقامی ریستوران ڈار یبریا میں پہنچیں جہاں رات کی رونقیں عروج پر تھیں۔ میوزک کی دھن پر نوعمر جوڑے محو رقص تھے۔ اس کی دونوں سہیلیاں بھی رقص میں معروف ہوگئیں اور وہ کاؤنٹر پر رک گئی تا کہ ایک زندگی بخش پگ لے سکے تب ہی ایک ہینڈسم نوجوان اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

''میں جوشی آرنش ہوں، کیا میں تمہارے ساتھ رقص کرسکتا ہوں۔'' اس نے پوچھا اور جے کے اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

''میں...... جینی رولنگ ہوں۔'' اس نے اپنا تعارف کیا اور چند باتیں کرنے کے بعد جوشی کے ساتھ محو رقص ہو گئی۔ چند ہی لمحوں میں وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے اور آئندہ ملنے کے وعدے پر ایک دوسرے سے جدا ہوگئے تھے۔ جے کے کی دوستوں سے یہ بے تکلفی چھپ نہیں رہی تھی پھر چند روز بعد ایک رات جب جوشی کا فون آیا تھا تو ایوا نے ریسیو کیا تھا جو اس وقت جے کے سے بات کررہی تھی اور جے کے نے جوشی کا نام سنتے ہی فون جھپٹ لیا تھا۔

''ہیلو...... جوشی!'' جے کے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جینی میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔'' دوسری طرف سے جوشی کی محبت میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

''اس وقت؟'' جے کے نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔

''یہی تو دیوانوں کے ملنے کا صحیح وقت ہے جینی آجاؤ۔'' جوشی کے لہجے میں التجا تھی اور جینی نے بے ساختہ اس کی دعوت قبول کرلی تھی۔ ملنے کے لیے جوشی نے اسے ڈار یبریا میں ہی بلایا تھا۔

''اوہ! آج بہت ٹھنڈ ہے۔'' جینی نے جوشی کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا اور جوشی نے اپنی سیاہ جیکٹ اتار کر اس کے کاندھوں پر ڈال دی۔

''تمہیں مجھ میں ایسا کیا خاص نظر آیا کہ تم مجھ سے پھر ملنے پر مجبور ہوگئے؟'' جینی نے پوچھا۔

''تمہاری مسکراہٹ۔'' جوشی نے بے ساختہ جواب دیا اور جے کے ہنسنے لگی۔

''میں اگر تمہیں اپنی فیملی سے ملواؤں تو تمہارے بارے میں کیا بتاؤں؟'' جینی نے پوچھا۔

''میں ایک مقامی ٹی وی چینل میں جاب کرتا ہوں، ایک صحافی ہوں۔'' جوشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔''اور تم؟''

''میں یہاں ایک لینگویج سینٹر میں انگلش پڑھاتی ہوں، میرا تعلق برطانیہ سے ہے اور میں رائٹر بننا چاہتی ہوں۔ آج کل کچھ لکھ بھی رہی ہوں۔''

''بہت خوب۔'' جوشی نے تعریف کی۔

پھر وہ کافی دیر تک بے تکلفی سے گفتگو کرتے رہے تھے اور بعد میں جوشی اسے چھوڑنے ہاسٹل تک آیا تھا۔ رات بہت ہو چکی تھی۔ جوشی کو اس نے اپنے کمرے میں بلا لیا اور خود لباس تبدیل کرنے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو جوشی اس کا وہ ناول پڑھ رہا تھا جو اس نے ابھی لکھنا ہی شروع کیا تھا۔

''تم کیا کررہے ہو؟'' جینی نے غصے سے پوچھا تو جوشی اسے حیرت سے دیکھتا ہوا کھڑا ہوگیا۔

''تم میری ذاتی چیزیں دیکھ رہے ہو؟ تمہیں یہ حق کس نے دیا؟'' وہ زور سے چیخی۔ جوشی حیران تھا کہ وہ اتنی سی بات پر کیسے غصے میں آگئی تھی۔

''تم اتنی رات کو میرے کمرے میں آکر میری ذاتی چیزوں کو چھیڑ رہے ہو؟'' وہ اور زور سے چیخی اور اسی وقت برابر کے کمرے کا دروازہ کھول کر ایوا نے جھانکا۔

''کیا ہوا جینی؟ کوئی مسئلہ ہے؟''

''نہیں...... تم جاؤ...... سو جاؤ...... مجھے افسوس ہے کہ میری آواز سے تم ڈسٹرب ہوگئیں۔'' جینی نے معذرت کی اور وہ کمرے میں واپس چلی گئی۔

''جاؤ جوشی...... تم بھی جاؤ۔'' جینی نے غصے سے کہا۔

''میری بات تو سنو جینی......!''

''کیا بات سنوں...... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' جوشی نے بے اختیار کہہ دیا اور وہ اسے حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔

''کیا؟''

''ہاں! میں تمہاری چاہت میں اپنا دل ہار چکا ہوں، تمہیں جیون ساتھی بنانا چاہتا ہوں۔'' جوشی نے کہا اور جینی نے فرط جذبات سے ...... اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔ اس

نے اسی رات فون کر کے ڈانیا کو یہ خوش خبری سنائی تھی۔ ڈانیا نے اسے مبارک باد دی تھی اور اس کی شادی میں شرکت کا وعدہ کیا تھا لیکن اسے یہ خبر بھی دی تھی کہ ان کے والد نے دوسری شادی کر لی ہے اور ڈانیا سے الگ ہو گئے ہیں۔

ڈانیا، جوشی اور جینی کی شادی میں شرکت کرنے پرتگال آئی تھی۔ ایک مقامی چرچ میں ان کی شادی 16 اکتوبر 1992ء کو ہوئی جس کے بعد جوشی جینی کے ساتھ ہی رہنے لگا تھا لیکن اپنی رنگین طبیعت کی وجہ سے وہ جینی کا ساتھ زیادہ نہ دے سکا اور جینی کی ایک بچی جیسکا کے دنیا میں آنے کے چند ماہ بعد ہی اسے چھوڑ گیا۔ جس رات یہ حادثہ پیش آیا اس رات جوشی کافی دیر سے گھر آیا تھا اور نشے میں دھت تھا اس نے اس حالت میں جینی سے پیار جتانا چاہا لیکن وہ ذہنی طور پر تیار نہیں تھی۔ اس کی بیٹی جھولے میں پڑی بلک بلک کر رو رہی تھی اور جوشی نشے میں دھت جینی سے عشق جتانے کے جنون میں سب بھول بیٹھا تھا پھر اس نے اپنی خواہش پوری نہ ہونے پر جینی کو مارنا شروع کر دیا۔ اس کے لکھے ہوئے ناول کے ڈبے کو کھول کر سارے کاغذات کمرے میں بکھیر دیئے۔ دونوں کے جھگڑے کی آوازیں سن کر جینی کی دوستوں نے مقامی پولیس اسٹیشن فون کر کے جھگڑے کی اطلاع دے دی اور چند ہی لمحوں میں پولیس کی گاڑیاں سائرن بجاتی وہاں پہنچ گئیں۔ انہوں نے جوشی کو گرفتار کر لیا اور جینی کو ہدایت کی کہ وہ اپنی بچی کو دیکھے۔ اس سے وہ بعد میں بات کریں گے۔

جینی تیزی سے اپنے فلیٹ میں داخل ہوئی کیونکہ جوشی نے اسے دھکے دے کر فلیٹ سے نکال دیا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی کو گود میں اٹھایا اور اپنے ناول کے بکھرے ہوئے کاغذات ڈبے میں ڈالے۔ اپنا بیگ اٹھایا اور اپنی دوست کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔

''اوہ جینی!'' ایوا نے دکھ سے کہا۔

''کیا تم مجھے ایک رات کے لیے اپنے کمرے میں رکھ سکتی ہو؟'' جینی نے اداسی سے کہا۔

''بالکل! کیوں نہیں۔ آؤ اندر آجاؤ۔'' ایوا نے کہا اور اس کی گود سے بچی کو لے لیا۔

''اوہ ایوا! مجھے اس سے یہ امید نہیں تھی۔'' جینی نے اندر آتے ہوئے کہا پھر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

''چپ ہو جاؤ جینی...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' ایوا نے اسے دلاسہ دیا۔

''کیسے ٹھیک ہو جائے گا ایوا؟ پہلے میں اکیلی تھی لیکن اب میرے ساتھ میری بیٹی بھی ہے۔ مجھے اس کے لیے ایک ٹھکانا اور خوراک چاہیے، میں کیا کروں۔ میں شاید اب اس شہر میں بھی نہ رہ سکوں۔ جوشی میرا دشمن ہو گیا ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی اور عورت آگئی ہے۔ اسے میری اور جیسکا کی پروا نہیں۔''

''تم پریشان مت ہو۔ ابھی آرام کرو صبح کچھ کریں گے۔'' ایوا نے تسلی دی وہ ساری رات دونوں باتیں کرتی رہی تھیں۔ نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ جینی کے سامنے زندگی ایک نئی کروٹ لے رہی تھی۔ اسے اب نئے سرے سے زندگی گزارنے کا آغاز کرنا تھا۔

دوسری صبح وہ ایک ٹرین سے واپس ایڈمبرگ آگئی تھی اپنی بہن ڈانیا کے پاس، اس وقت تک وہ ہیری پورٹر کے تین چیپٹر تیار کر چکی تھی جو اس کے ساتھ تھے۔ اس کے بعد کافی عرصہ وہ مایوسی کی زندگی گزارتی رہی۔ وہ خود کو ایک ناکام فرد سمجھتی تھی لیکن اس کے باوجود وہ ہیری پورٹر پر لکھتی رہی۔ اس دوران اس نے ایک بار خودکشی کی کوشش بھی کی۔

اس نے اپنی تنگدستی کے زمانے میں ایک نیشنل سیکیورٹی رضاکار تنظیم کی خدمات بھی حاصل کیں اور اپنی بچی کو لے کر ان کے دفتر گئی جہاں اس کا فارم پُر کیا گیا۔

''جیئٹ رولنگ۔'' اس کا نام پکارا گیا تو وہ اپنی بچی کو لے کر کھڑی ہو گئی۔

''آپ میرے ساتھ آئیں۔'' نام پکارنے والی نے کہا اور اسے ایک چھوٹے سے آفس میں لے گئی۔

''تم جیئٹ رولنگ ہو؟'' اس نے ایک فارم نکالتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''تمہارا شوہر کہاں ہے؟''

''میں نے اسے چھوڑ دیا۔'' جینی نے ہچکچاتے ہوئے کہا تو خاتون نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔

''میرا خیال ہے تم نے امدادی رقم کی درخواست کی ہے؟''

''ہاں!'' اس نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں ہمیں زندہ رہنے کے لیے رقم چاہیے۔''

''میرا خیال ہے تم بے گھر ہو؟''

''نہیں بے گھر نہیں لیکن میں اپنی بہن اور بہنوئی کے ساتھ رہتی ہوں۔''

''اس سے پہلے تم کہاں رہتی تھیں؟''

''میں پرتگال میں تھی پھر مجھے طلاق ہو گئی۔'' جینی نے بتایا۔

''گویا میں یہاں علیحدگی کی وجہ گھریلو جھگڑا لکھوں؟'' خاتون نے پوچھا۔ ''کیا تمہارے والد تمہیں سپورٹ نہیں کرتے؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ ہم کہاں ہیں اور میں انہیں بتانا بھی نہیں چاہتی۔'' جینی نے کہا۔

''ایک آخری سوال۔''

''جی پوچھیں؟''

''کیا تم اب اُمید سے ہو؟''

''نہیں۔''

''ٹھیک ہے مس جینی یہ آپ کی اکاؤنٹ بک ہے یہ ہر ہفتے آپ پوسٹ آفس لے کر جائیں گی اور وہ لوگ آپ کو رقم دیں گے۔'' خاتون نے ایک نوٹ بک دیتے ہوئے کہا۔

''شکریہ۔'' جینی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کتنی رقم ملا کرے گی؟''

''69 پاؤنڈز۔''

''ایک ہفتے میں صرف 69 پاؤنڈز میں اس میں کیسے گزارا کروں گی؟''

''ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔''

''لیکن یہ تو ہمارے اخراجات پورے کرنے کے لیے ناکافی ہے۔''

''یہ تو آپ کو بچی کے والد کو چھوڑنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ خدا حافظ۔'' خاتون نے کہا اور جینی سر جھکا کر وہاں سے واپس آ گئی۔

سب سے پہلے اس نے اپنے رہنے کے لیے ایک فلیٹ کرائے پر لیا جہاں اسے اپنی بیٹی جیسیکا کے ساتھ رہنا تھا اور جیسے وہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی زندگی کی ہر آسائش دینا چاہتی تھی۔

''تمہارے ساتھ یہاں کون رہے گا؟'' مالک مکان نے پوچھا۔

''ہم دونوں، میں اور میری بچی۔'' جینی نے جواب دیا۔

''تو تم کرایہ دینے کی زحمت کیوں کر رہی ہو؟ کسی رشتے دار کے ساتھ بھی رہ سکتی ہو۔''

''میری بہن اسی شہر میں رہتی ہے لیکن میں کسی کی مدد لینا نہیں چاہتی اور اپنی بچی کے لیے ایک سر چھپانے کی جگہ بنانا چاہتی ہوں تمہیں کرایہ وقت پر ملے گا تم اس کی پروا مت کرو۔''

''ٹھیک ہے، تم یہاں رہ سکتی ہو۔'' مالکہ مکان نے اس سے متاثر ہو کر کہا اور وہ خوشی سے اس کے گلے لگ گئی۔

یہ دو کمرے کا فلیٹ تھا جس کے ہر کمرے میں ایک کھڑکی تھی اس نے اپنے کمرے میں ایک بیڈ اور ایک کرسی کے ساتھ رائٹنگ ٹیبل ڈالی جس پر کچھ کتابیں بھی تھیں۔ اس کا فل اسکیپ سائز کا گتے کا ڈبہ اس کے ساتھ تھا جس میں ہیری پورٹر پر لکھے ہوئے اب تک کے تمام چیپٹرز موجود تھے، اس میز کے قریب ہی ایک بانس کی بنی ٹرالی میں جیسیکا کے کپڑے رکھے تھے۔ یہ اس کی کل کائنات تھی جہاں سے اس نے اگلی زندگی کا سفر شروع کیا۔

اس نے اپنا پہلا کرسمس اپنی چند ماہ کی جیسیکا کے ساتھ منایا اور پورا وقت اس کو دعائیں دیتی رہی اور اس سے وعدہ کیا کہ میں تمہیں زندگی کی ہر آسائش مہیا کروں گی۔ بچی چھوٹی ہونے کے ناطے اسے ملازمت کرنے کی اجازت بھی نہیں تھی، وہ خاصی پریشان تھی کہ ان حالات میں وہ اپنا ناول کیسے مکمل کر سکے گی۔ یہی بات اس نے اپنی بہن ڈانیا سے کہا جب وہ اس سے ملنے آئی۔

''جینی...... تم کیا چاہتی ہو؟ تمہیں کس چیز سے خوشی مل سکتی ہے؟ مجھے بتاؤ۔'' ڈانیا نے پوچھا۔

وہ اٹھی اور الماری سے وہ ڈبہ نکال لائی جس میں ہیری پورٹر کا ناول موجود تھا اس نے یہ ڈبہ ڈانیا کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ مجھے خوشی دے سکتا ہے۔'' جینی نے کہا تو ڈانیا نے ڈبہ کھول کر دیکھا۔

''یہ کیا ہے؟''

''یہ ایک کتاب ہے اس کو میں ممی کی وفات سے پہلے سے لکھ رہی ہوں۔ اس میں پہلی سے لے کر میری آخری کتاب تک موجود ہے میری ساتویں اور آخری کتاب۔''

''ساتویں کتاب! تم نے سات ناول لکھ لیے

ہیں؟'' ڈانیا نے حیرت سے کہا۔
''ہاں۔''
''کیا میں یہ پڑھ سکتی ہوں؟''
''ہاں...... بالکل......!'' جینی نے جواب دیا لیکن اپنی رائے مجھے غیر جانبداری سے دینا بالکل سچی رائے۔''
''ہاں...... کیوں نہیں۔'' ڈانیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔
پھر اس نے ایک ہی رات میں پہلا ناول پڑھ لیا تھا جس کے کچھ صفحے لکھنے باقی تھے۔
''اوہ جینی...... زبردست...... یہ تو بہت اچھا ہے۔ تم نے اسے مکمل کیوں نہیں کیا؟''
''بتاؤ اور بتاؤ...... تمہیں کیسا لگا؟'' جینی نے تجسس سے پوچھا۔
''بہت اچھا...... اس میں جادوئی کمالات ہیں۔ یہ اپنی قسم کا منفرد ناول ہے۔ بہت خوب، تم نے بہترین لکھا ہے۔'' ڈانیا نے تعریف کی۔ ''کیا تم بھی کرنا چاہتی ہو؟''
''ہاں! میں یہی کرنا چاہتی ہوں۔'' جینی نے کہا۔
''تو پھر کرو۔ فوراً اس میں دیر مت لگاؤ۔'' ڈانیا نے کہا دوسرے دن وہ چلی گئی لیکن جینی کو اور مصروف کر گئی دوسرے دن جینی نے ہیری پورٹر کے مسودے کا ڈبہ اپنے سامنے میز پر رکھا اور چند لمحے سوچتی رہی۔
''اوکے ہیری...... اب سب کچھ تمہارے اور میرے درمیان ہے۔'' اس نے ایک عزم سے کہا اور ڈبہ کھول کر مسودہ نکال لیا پھر اس نے اس سارے کام کو نئے کاغذات پر بہترین رائٹنگ میں لکھنا شروع کر دیا تھا تاکہ اسے پبلشر کے لیے تیار کر سکے، وہ فلیٹ میں جیسیکا کے ساتھ اکیلی ہوتی۔ سارا وقت اس کے کام میں مصروف رہنے کے ساتھ ساتھ وہ ناول کو فیئر بھی کرتی جا رہی تھی۔ کبھی اس کے ساتھ کرسی پر بیٹھی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی ہوتی تھی کبھی اس کی گود میں بیٹھی ہوتی جینی ایک ہاتھ سے اسے پکڑے دوسرے ہاتھ سے ناول پر کام کر رہی ہوتی تھی۔
ایک شام جینی بچہ گاڑی میں اسے بٹھائے فٹ پاتھ سے گزر رہی تھی کہ اس کی نظر ایڈن برگ کے ایک کیفے The Elephant House پر پڑی یہ کیفے سڑک کے کنارے واقع تھا۔ جینی کے فلیٹ سے قریب تھا اور یہاں بیٹھ کر باہر کا منظر بہت اچھا نظر آتا تھا۔ وہاں بیٹھ کر اس کی اور جیسیکا کی خوراک کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے کچھ کھانے کا آرڈر دے دیتی تھی۔ اس طرح کھانا بنانے پر جو وقت خرچ ہوتا وہ بچ جاتا تھا۔ جینی نے ہیری پورٹر ناول کا پہلا حصہ Harry potter and the phillosophers stone یہیں بیٹھ کر مکمل کیا۔
1995ء میں جینی نے اس بک کو ایک پبلشر Christopher little literary agents کو بھیجا، اس پبلشر نے جینی سے ملاقات کی اور اس کی بک کی بارہ کاپیاں بارہ پبلشرز کو بھجوائیں اور جینی کو وہ لمحہ یاد آیا جب اس نے ایک اسٹور میں ٹائپ رائٹر دیکھ کر اپنی خریدی ہوئی کھانے پینے کی اشیاء واپس کر دی تھیں اور وہ ٹائپ رائٹر خرید لیا تھا جس سے بعد میں اس نے ہیری پورٹر ٹائپ کر کے اس کا پہلا ٹائپ شدہ مسودہ تیار کیا تھا۔ اس نے یہ ناول لکھنے کے لیے بڑی جدوجہد کی تھی لیکن اس کی ناامیدی اور دکھ کی انتہا نہ رہی جب بارہ کے بارہ پبلشرز نے اس کے مسودے کو ریجیکٹ کر دیا۔
کتاب کے مسترد ہو جانے کے بعد جینی بہت دلبرداشتہ اور اداس تھی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ خدا اس کی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ اس سے کوسوں میل دور لندن میں بیٹھا کرسٹوفر لٹل اپنے دفتر میں اپنی بیٹی سے ہیری پورٹر کے بارے میں بات کر رہا تھا جو اس کی بیٹی ایلس نیومن نے پڑھا تھا اور اسے پسند آیا تھا۔
''میں چاہتی ہوں آپ بھی یہ ناول پڑھیں۔'' ایلس نے کہا۔
''تم جانتی ہو یہ ناول بچوں کے لیے لکھا گیا ہے اور بچوں کی کتابیں زیادہ فروخت نہیں ہوتی ہیں چنانچہ اس پر رقم لگانا فضول ہے۔'' کرسٹوفر نے کہا۔
''نہیں ایسا نہیں ہے۔ یہ ناول بہت دلچسپ ہے اور میں اس کا دوسرا حصہ بھی پڑھنا چاہتی ہوں۔ آپ اسے پڑھیں اور شائع کریں۔''
''پڑھنا بے کار ہے میں عنوان دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ کہانی کیسی ہوگی۔'' کرسٹوفر نے کہا۔
''آپ کا خیال غلط ہے، یاد کریں ہماری دادی کہتی تھیں کہ خزانہ ہمیشہ نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ اسے تلاش کرنا پڑتا ہے۔ آپ اسے پڑھیں آپ کو مایوسی نہیں ہوگی اگر یہ ناول آپ کو پسند نہیں آیا تو میں ملازمت چھوڑ دوں گی۔'' ایلس نے کہا جو اس کی بیٹی ہونے کے ساتھ ساتھ اس

کی سیکریٹری کے طور پر بھی خدمات انجام دیتی تھی۔

''بہت خوب۔'' کرسٹوفر نے حیرت سے کہا۔ وہ جان گیا تھا کہ اس ناول میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے ایلس کو متاثر کیا تھا چنانچہ اس نے ناول پڑھنے کا فیصلہ کیا۔

ایک سال بعد جینی کے گھر فون آیا اس وقت اس کی بہن ڈانیا بھی وہاں موجود تھی فون پر دوسری طرف سے پبلشر کرسٹوفر بول رہا تھا۔

''ہیلو جینٹ رولنگ! میں کرسٹوفر لٹل بول رہا ہوں تمہارے ناول ہیری پورٹر کے بارے میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''اوہ......ڈانیا......میرا پبلشنگ ایجنٹ مجھ سے بات کر رہا ہے۔'' اس نے اپنی بہن کو بتایا جس سے وہ کچھ ہی دیر پہلے کسی اسکول میں بچوں کو پڑھانے کی ملازمت کرنے کے بارے میں بات کر رہی تھی۔

''اوہ! کیا کہہ رہا ہے؟'' ڈانیا نے پوچھا۔

''وہ میرا انٹرویو کرنا چاہتا ہے۔ مجھے لندن بلا رہا ہے اپنے آفس میں۔''

''ضرور جاؤ۔ کامیابی تمہارے قدم چومے۔'' ڈانیا نے کہا۔ اس نے جیسیکا کو اپنے پاس رکھنے کی ذمہ داری لے لی تھی اور جینی کو لندن بھیج دیا تھا۔

جینی جب کرسٹوفر سے ملی تو وہ بہت نروس تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کرسٹوفر سے کیا بات کرے۔

''میں چاہتا ہوں کہ اس بک کو پبلش کرنے سے پہلے کچھ باتیں طے کر لی جائیں۔'' کرسٹوفر نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔''

''میں تمہیں ہر کنٹریکٹ کے لیے ایک اسٹینڈرڈ رقم دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔''

''چونکہ تم زندگی میں پہلی بار کوئی بک پبلش کروانے جا رہی ہو تو میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا کوئی اٹارنی منتخب کر لو جو تمہارے معاملات کو دیکھا کرے۔''

''ٹھیک ہے۔'' جینی نے کہا وہ خاصی نروس تھی اور اس کے منہ سے ''ٹھیک ہے'' کے علاوہ کوئی لفظ ادا نہیں ہو رہا تھا۔

''سب سے پہلے میں کہوں گا کہ تم اپنا نام بدل لو۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ جہاں تک میرا تجربہ ہے لڑکے کسی لڑکی کا لکھا ہوا ناول پڑھنے میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے چنانچہ تمہیں نام بدلنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔''

''اس کے علاوہ اس کام سے زیادہ اُمید مت لگانا آج کل لوگ کتابیں پڑھنا زیادہ پسند نہیں کرتے تمہیں بہت زیادہ رقم کی اُمید نہیں رکھنا چاہیے۔''

''میں رقم کے لیے نہیں لکھتی، میں اس لیے لکھتی ہوں کہ مجھے لکھنا پسند ہے۔''

''یہ بہت اچھی سوچ ہے۔'' کرسٹوفر نے کہا پھر وہ واپس آ گئی تھی پھر اس نے اپنا قلمی نام اپنی دادی کے نام پر جین کیتھرین رکھا جس کا مخفف J.K Rowling اس کی کتابوں پر لکھا گیا۔ اس کا پبلشر مسلسل اس سے رابطے میں تھا۔ اسی دوران جینی نے ایک بچوں کے اسکول میں ملازمت بھی کر لی کیونکہ اسے گزر اوقات کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ ایک روز کلاس میں پڑھانے کے دوران اسکول کی منتظم اس کے کلاس روم میں آئیں اور اسے بتایا کہ اس کے لیے فون آیا ہے۔ وہ دوڑتی ہوئی ان کے آفس میں گئی۔ دوسری طرف سے کرسٹوفر بول رہا تھا۔

''جینی مبارک ہو میں نے تمہاری بک Blooms burys پبلشرز کو بھیجی تھی وہ اسے پبلش کرنے کے لیے تیار ہیں۔''

''اوہ شکریہ۔'' جینی نے کہا۔ اسکول ہیڈ کے آفس سے نکلتے ہوئے اس کے دل کی عجیب حالت تھی۔ وہ کاریڈور میں جا کر خوشی سے چیخ پڑی اور دوسرے کمروں سے ٹیچرز باہر نکل آئے۔

''اوہ......سوری......'' جینی نے قدرے شرمندگی سے کہا۔

اس بار جب وہ مسٹر کرسٹوفر سے ملی تو انہوں نے اسے ایک چیک پیش کیا۔

''یہ بہت زیادہ تو نہیں ہے یہ 5000 ہزار پاؤنڈ کی رقم ہے۔ کچھ ہی عرصے میں تمہاری بک شائع ہو جائے گی لیکن یاد رکھنا کہ بچوں کی کتابیں زیادہ رقم نہیں بناتیں۔''

''میں جانتی ہوں لیکن میں اس رقم کا کیا کروں؟'' جینی نے حیرت اور خوشی سے پوچھا۔

''جاؤ اس سے اپنے لیے جو چاہو خرید لو۔'' کرسٹوفر نے جواب دیا۔

جینی نے اس رقم سے سب سے پہلے اپنی بیٹی کے لیے

بہت بڑا کپڑے کا ٹیڈی بیئر خرید اتھا جسے دیکھ کر جیسیکا بہت خوش ہوئی تھی۔

پھر جون 1997ء میں بلوم بیری نے ہیری پورٹر کی پہلی کتاب فلاسفر اسٹون پبلش کی جس کی ایک ہزار کاپیاں شائع ہوئیں جن میں سے پانچ سو لائبریریوں کو دے دی گئیں اور پھر پانچ ماہ بعد اس کتاب نے پہلا ایوارڈ حاصل کیا جو Nestle smarties book prize کہلاتا ہے اس کے بعد اس بک نے British book ایوارڈ بھی حاصل کیا جو اسے بچوں کی بہترین سالانہ بک پر دیا گیا جس کے بعد امریکا میں اس کتاب کے حقوق خریدنے کے لیے پبلشرز کی بولیاں لگنے لگیں جسے Scholestic insurance company نے 105,000 ڈالر میں خرید لیا۔ جب جینی رولنگ نے یہ خبر سنی تو خوشی سے پاگل ہو گئی۔

اسی ماہ جب وہ اپنی پہلی کتاب کی تقریب اجراء کے موقع پر ایک لائبریری میں موجود تھی جہاں اس کی کتاب کے کافی خریدار موجود تھے تو وہ خود کو نروس محسوس کر رہی تھی۔ لائبریری نے اس کی کتابیں شوکیس میں لگانے کے بعد اسے اجراء کی تقریب میں خطاب کرنے کی دعوت دی تو وہ دھڑکتے دل کے ساتھ مائیک کی طرف بڑھی۔

''ہیلو حاضرین۔''

''میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں اگر آپ میں سے کچھ لوگ اس کتاب کے شروع کے چیپٹرز میں سے کچھ سوالات کرنا چاہیں تو میں جواب دوں گی۔ ابھی آپ نے زیادہ تو نہیں پڑھا ہوگا لیکن جو بھی پڑھا ہے آپ اس پر سوال کر سکتے ہیں۔'' جینی نے کہا پھر اس نے لوگوں کے لیے کچھ چیپٹر پڑھ کر بھی سنائے تھے جنہیں بہت پسند کیا گیا تھا۔

اس کے بعد مسٹر کرسٹوفر نے جینی کو مشورہ دیا کہ وہ مستقل طور پر نیو یارک میں رہائش اختیار کر لے کیونکہ زیادہ تر پبلشرز نیو یارک ہی میں ہیں اور وہ تمہارے لیے کام کرنا چاہتے ہیں مجھے یقین ہے کہ ہیری پورٹر سیریز بہت پیسا بنائے گی۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' جینی نے پوچھا۔

''تمہاری کتابوں کے حقوق 105,000 ڈالرز میں فروخت ہو گئے ہیں۔''

''اوہ کرسٹوفر...... بہت شکریہ۔''

''اس دنیا میں تمہیں خوش آمدید جینی۔'' کرسٹوفر نے

سفاکیت اور درندگی کا انوکھا کھیل

عالم اسلام پر تاتاریوں کی جانب سے کی جانے والی لشکر کشی تقریباً دو دہائیوں سے زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ اس لشکر کشی کے دوران تاتاریوں نے سفاکیت اور درندگی کی وہ مثالیں قائم کیں کہ جن کی نظیر نہ اس سے پہلے کہیں ملتی ہے اور نہ ہی اس کے بعد دنیا میں کسی نے اپنی مفتوح اقوام سے ایسا سلوک کیا۔ تاتاریوں نے عام اور نہتے مسلمانوں سے انتہائی بہیمانہ سلوک کیا۔ قتل و غارت گری کی وہ داستانیں رقم کیں کہ انہیں لکھتے ہوئے آج کا مؤرخ بھی کانپ اٹھتا ہے۔ شہر فتح کرنے کے بعد پوری پوری آبادیوں کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔ خصوصاً وہ شہر جہاں مسلمانوں نے زیادہ مزاحمت دکھائی ان علاقوں میں تو انسانوں کے ساتھ ساتھ کتے اور بلیوں کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ پوشیدہ خزانوں کی برآمدگی کے لیے مشتبہ مالدار افراد پر تشدد کے نت نئے طریقے ایجاد کیے گئے۔ مقتولین کی کھوپڑیوں کے مینار بنانا ان کا مشغلہ بن گیا تھا۔ شہر کے باسیوں سے تمام مال و دولت چھینتے، ان کا قتل عام کرتے۔ اس کے بعد ان کے مکانات کو آگ لگا دیتے اور اس طرح تہہ خانوں میں چھپے ہوئے لوگ بھی زندہ جل کر ہلاک ہو جاتے۔ سمرقند بخارا، قوقند، اترار اور دیگر شہروں میں عام مسلمانوں اور جنگی قیدیوں سے یہی سلوک کیا گیا۔ حد تو یہ ہے کہ جن شہروں کو امان دی گئی اور باقاعدہ معاہدہ کر کے قبضہ کیا گیا ان شہروں میں بھی کسی نہ کسی بہانے سے یہی سلوک کیا گیا۔ ایسے مواقع پر وہ مسلمان عمائدین جو غداری کر کے تاتاریوں سے ساز باز کر لیتے انہیں بھی بعد میں قتل کر دیا جاتا۔

مرسلہ: نورین مصطفی۔ لاڑکانہ

خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''شکریہ کرسٹوفر۔'' جینی نے فون رکھتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے ڈانیا کو یہ خبر سنائی تھی جو اس کے پاس موجود تھی۔

''اوہ......! ڈانیا میں بہت خوش ہوں میں نے اپنی غربت پر فتح پالی ہے۔'' جینی نے کہا۔

''اصل چیز دولت نہیں جینی اصل چیز تمہاری خوشی ہے جس کی تلاش میں تم بچپن سے تھیں، تم نے وہ خوشی حاصل

کرلی ہے۔تم رائٹر بن گئی ہو۔"

"آج اگر ممی زندہ ہوتیں تو کتنی خوش ہوتیں میرے ساتھ ساتھ ان کا بھی یہی خواب تھا۔" جینی نے کہا۔

"وہ ہمیں دیکھ رہی ہوں گی جینی......وہ تم پر خوش ہو رہی ہوں گی۔" ڈانیا نے کہا اور پھر دونوں خوشی سے اچھل پڑیں۔

26 دسمبر 2001ء میں رولنگ نے ایک اسکاٹش ڈاکٹر نیل مری سے دوسری شادی کی جس سے اس کا ایک بیٹا ڈیوڈ گورڈنگ رولنگ اور ایک بیٹی میکنزی جین رولنگ پیدا ہوئی۔

ہیری پورٹر سیریز منظر عام پر آنے کے بعد اسے بہت سے انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا۔ بے شمار انٹرویوز ہوئے اس نے لوگوں کو اپنی زندگی میں لکھنے کے دوران پیش آنے والی مشکلات کے بارے میں بتایا۔اس نے عوام سے کچھ نہیں چھپایا۔نہ اپنی غربی نہ امیری اور اپنی امیری میں اس نے غریبوں کو شامل کرلیا۔اس کے پاس بے شمار دولت ہونے کے باوجود اس کے بینک اکاؤنٹ میں اتنی رقم نہیں ہوتی کہ اسے کروڑ پتی کہا جاسکے۔اس کی ساری رقم مختلف رضا کار کمپنیوں میں ہوتی ہے جہاں سے وہ غریبوں کے کاموں کے لیے تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس نے بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنے اس فلیٹ کی مووی بھی آن لائن کردی جس میں اس نے اپنی زندگی کے دس سال اپنی بچی جیسیکا کے ساتھ کسمپرسی کے عالم میں گزار دیئے۔ جب وہ یہ انٹرویو دے رہی تھی تو اس کی حالت دیکھنے والی تھی۔ اس کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو رواں تھے، آواز بھرائی ہوئی تھی۔ وہ بات کرتے کرتے شدت جذبات سے خاموش ہو جاتی تھی۔

"میں نے اپنی زندگی کی ناکامیوں سے سیکھا ہے۔" اس نے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "مجھے مشورہ دینے والا کوئی نہیں تھا۔ میں ناکام ہوتی......روتی......اور پھر خود کو دوبارہ محنت کے لیے تیار کرلیتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ میں لکھنے کے لیے ہی پیدا ہوئی ہوں۔ مجھ پر بے انتہا تنقید بھی کی گئی لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ کیمرے کی آنکھ اس کے فلیٹ کی منظر کشی کررہی تھی۔ یہ دو چھوٹے کمروں کا فلیٹ تھا ہر کمرے میں ایک کھڑکی تھی جو سڑک کی جانب کھلتی تھی۔ کمرے میں دن کے وقت بھی ہلکی سی روشنی ہوتی تھی۔

"یہاں میں نے خود کو دریافت کیا۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ وہ جگہ ہے جہاں میں ہمیشہ واپس آنا چاہوں گی۔ سامنے رکھی یہ میز جو چھوٹی ہے لیکن اس نے ہیری پورٹر جیسی طویل اور مشہور زمانہ سیریز لکھنے میں میرا ساتھ دیا ہے۔ اس کرسی اور میز سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ یہ جانتی ہیں کہ ایک ٹائپ رائٹر خریدنے کے لیے میں نے کتنے وقت بھوکے گزارے ہیں۔ میں نے اور میری بچی نے کون کون سے دکھ سہے ہیں۔ اب میں نے یہ جگہ خرید لی ہے۔ یہ میری یادگار جگہوں میں سے ہے۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آپ اپنے دیکھنے والوں کو کوئی خاص پیغام دینا چاہیں گی؟" نمائندے نے پوچھا۔

"وہی پیغام جو میں ہمیشہ ہر تقریب اور انٹرویو میں دیتی ہوں کہ کبھی ناکامیوں سے مایوس مت ہونا اپنی ناکامیوں سے سبق لینا سیکھیں انہی سے آپ کو کامیابی کے راستے ملیں گے۔" اس نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ "ہماری ناکامیاں دراصل ہمیں کامیابیوں کی نئی منزل کا پتا دیتی ہیں۔ میری زندگی کی مثال آپ کے سامنے موجود ہے۔ نہ میں کامیابیوں کے حاصل ہونے پر مطمئن ہو کر بیٹھی اور نہ ناکامیوں سے گھبرا کر پیچھے ہٹی، میں کل بھی جدوجہد کررہی تھی اور آج بھی کررہی ہوں، میں اب مزید شوق اور لگن سے بچوں کے لیے کہانیاں لکھ رہی ہوں جن میں سے کافی منظر عام پر آچکی ہیں اور آئندہ بھی آتی رہیں گی۔ جدوجہد اور مسلسل جدوجہد ہی کامیابی کا راز ہے۔" وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی اور پھر خلاؤں میں دیکھتے ہوئے کیمرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی۔

"اگر تم نے اپنے لیے منتخب کرلیا کہ تمہیں دنیا میں پہچانا جائے تو ہزاروں لوگ تمہیں بدلنے کے لیے تمہاری مدد کریں گے۔"

ہیری پورٹر کی سیریز اکتوبر 2015ء میں مکمل ہو چکی تھی جو اب تک اپنے ریکارڈ برقرار رکھے ہوئے ہے اور اس کے بعد بھی جے کے رولنگ نے تھک کر بیٹھ جانا پسند نہیں کیا۔ وہ تب سے اب تک کئی ناولز لکھ چکی ہے۔ وہ سب کے سب بیسٹ سیلرز رہے ہیں اور ابھی اس کا یہ سفر جاری ہے۔



روشن ستارہ

کرن صدیقی

خدمتِ خلق ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں وہ ایک شوخ و شنگ، نٹ کھٹ لڑکی تھی مگر سونے کا دل رکھتی تھی۔ اسے زندگی کا ہمسفر ملا تو وہ اس سے بڑھ کر خدمت گزار بندہ تھا۔ ان دونوں نے مل کر ایک تاریخ رقم کی اور تاریخ میں ایک نیا باب رقم ہو گیا۔

وطنِ عزیز کا نام روشن کرنے والی شخصیت کا احوال

پردہ اٹھا کر جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا، اس نے دیکھا کہ چند لڑکیاں بیٹھی ہیں، اس نے ان کا جائزہ لیا تو چونک گیا۔ ان میں وہ لڑکی بھی تھی جس کا نام آتے ہی لوگ کانوں کو ہاتھ لگا لیتے تھے۔

یہ کھارادر کے علاقے کی مشہور ڈسپنسری تھی جو خدمت خلق کے نام پر چل رہی تھی۔ ڈسپنسری میں کام کرنے یا پھر نرسنگ کا کام سیکھنے کے لیے ہر روز ایک دو لڑکیاں آتی رہتی تھیں اس لیے ان لڑکیوں کی آمد پر اسے حیرت نہ تھی اسے حیرت تھی کہ ان میں وہ لڑکی بھی شامل تھی۔

چلبلی سی شوخ لڑکی، جس کی شہرت نہ صرف اسکول بلکہ

پورے محلے میں لڑاکا لڑکی کی تھی۔ ڈسپنسری کے مالک کے کانوں میں بھی اس کی اڑتی اڑتی سی شہرت پہنچ چکی تھی یہی سبب تھا کہ لڑکیوں کے اس گروہ میں اسے شامل دیکھ کر تعجب ہوا تھا۔ اس نے یہ سوچا ہوگا کہ یہ شرارت کی پڑیا اس کی ڈسپنسری میں کسی نئی شرارت کا پلان لے کے تو نہیں آئی؟ مالک نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا ''خیریت؟ مجھ سے کوئی کام؟''

سوال کے لہجے میں استفسار سے کہیں زیادہ حیرت تھی۔

ان سب کو بھی ڈسپنسری کے مالک کے انداز پہ تھوڑی سی حیرت ہوئی کیوں کہ مالک کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اکھڑ رویے کا مالک لیکن خاموش طبع شخص ہے جو لوگوں سے خصوصاً خواتین سے بلا ضرورت بات نہیں کرتا۔

ان لڑکیوں ... میں سے ایک نے بہت عاجزی سے کہا۔

''ہم نرسنگ سیکھنے آئے ہیں۔''

''تم سب؟''

یہ سوال پوچھتے ہوئے اس کی مرکز نگاہ وہ ہی آفت کی پرکالہ تھی جس سے پورا محلہ پناہ مانگتا تھا۔ اس کی فتنہ پرداز طبیعت کی شہرت ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ اس لڑکی نے بھی تائیدی جواب دیا اس کا جواب سن کر وہ پھٹ ہی پڑا۔

''نہ بابا نہ، یہ تم لوگ کیسی بات کر رہے ہو میں اس آفت کی پرکالہ کو (یہ کہتے ہوئے مالک نے اشارہ اس لڑکی کی طرف کیا) اپنی ڈسپنسری میں نرسنگ سکھوائیں مطلب یہ کہ یہاں بھی دھما چوکڑی ہونے لگے جیسا یہ اپنے اسکول اور محلے میں کرتی ہے۔ اے بائی! (میمنوں میں عزت دار خاتون کو بائی کہا جاتا ہے یہ لفظ بیگم صاحبہ یا محترمہ کا ہم پلہ ہے) تو میرے کو معاف کر کوئی اور جگہ ڈھونڈ، ادھر تیرا گزارہ نہیں۔''

اس شوخ و شریر لڑکی کے چہرے سے، اپنے متعلق یہ رائے سن کے غصے کے آثار ہویدا ہوئے اور وہ غصے سے بل کھانے لگی۔ اسے یہاں آنے سے پہلے ہی اندازہ تھا کہ یہاں اسے کیا کچھ سننے کو مل سکتا ہے۔ اگر ڈسپنسری کے مالک کا درشت رویہ مشہور تھا تو وہ اپنے بارے میں لوگوں کی رائے سے بھی بے خبر نہیں تھی کہ اسے شیطان کی خالہ، شرارت کی پڑیا اور آفت کی پرکالہ کے علاوہ اور بھی کیا کچھ کہا جاتا ہے مگر وہ یہ طے کر کے آئی تھی کہ یہ کام سیکھ کے رہے گی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ وہ خاموشی سے بیٹھی تھی ورنہ وہ تو ایسی شعلہ جوالا فطرت کی مالک تھی کہ چلتی ہوا سے جھگڑا مول لے۔

''اچھا ٹھیک ہے کل آنا، میں ڈاکٹر سے مشورہ کرلوں۔''

ڈسپنسری کے مالک نے کہا تو وہ سب اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھ گئیں۔

☆......☆

دروازے پہ زور سے دستک ہوئی۔

''بلقیس جا کے دیکھ تو ماں، کس نے دروازہ بجایا۔''

''میں نہیں جاتی تو خود دیکھ لے۔'' کھٹی میٹھی املی کھاتی بلقیس نے ماں کو ٹکا سا جواب دیا اور پھر اپنے شغل میں مصروف ہوگئی۔ ماں اسے گھورتی اور زیر لب بڑبڑاتی اسے برا بھلا کہتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ جا کے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ محلے کے کچھ بچے، بچیاں تھیں۔ دروازہ کھلنے پر بچوں نے ادب سے سلام کیا ''سلام رابعہ ماں۔''

''وعلیکم السلام بچو! کیسے آئے؟''

''ہم کچھ بتانے آئے ہیں۔''

''کیا ہوا ہے؟''

''یہ دیکھو ذرا۔'' ایک بچی نے اپنا چہرہ آگے کیا جس پہ ایک گہرا نشان تھا پھر دوسرا بچہ آگے بڑھا جس کے بازو پہ ایک جگہ دانتوں کے نشان تھے۔ کئی بچوں نے اپنی اپنی شکایتیں بیان کیں، کسی کو کاٹا گیا تھا کسی کو نوچا گیا تھا، کسی کے بال کھینچے گئے تھے، کسی کو دھکا دے کے گرایا گیا تھا۔ الغرض ہر بچے کے پاس الگ طرح کی شکایتیں تھیں لیکن ایک بات جو تمام متاثرہ بچوں کی شکایتوں میں مشترک تھی وہ یہ کہ وہ سب بلقیس کے ظلم کا شکار رہے تھے، ان تمام کی یہ درگت اسی کے ہاتھوں بنی تھی۔ رابعہ ماں نے تحمل سے سب بچوں کی باتیں سنیں پھر سب کو مناسب تسلی دلاسہ دے کر اور دلار پچکار کر بلقیس کی گوشمالی کے وعدے پر رخصت کیا۔ غصے کے عالم میں دروازہ بند کر کے وہ اندر آئیں۔ بلقیس ابھی تلک اپنے ہی شغل میں لگی ہوئی تھی۔ ماں کے غصے کو اس نے دیکھا ہی نہیں یا دیکھا بھی تو نظر انداز کر دیا۔

''بلقیس اے بلقیس!''

بلقیس نے یہ ظاہر کیا کہ اس نے ماں کی آواز سنی ہی نہیں۔

''او بلقیس تو بہری ہوگئی ہے کیا؟ میں تیرے کو کتنی آوازیں دے رہی ہوں اور تو ہے کہ میرے کو جواب ہی نہیں دے رہی۔''

''کیا ہے ماں؟'' بلقیس نے بڑی ہی بیزاری سے ماں کی طرف دیکھا۔

''تجھے بتائیں کہ کیا ہے؟ تو مجھے بتا کہ یہ سب کیا

ہے؟"

"کیا؟" بلقیس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

اب تو ماں کے غصے کی کوئی حد ہی نہ رہی اور پھر جو وہ گرجی برسی الامان الحفیظ لیکن آفرین ہے بلقیس کو کہ اس پہ ذرہ برابر اثر نہ ہوا اور ہوتا بھی کیوں؟ یہ کوئی آج کی بات تھوڑا ہی تھی ہر دوسرے دن یہ ہی قصہ تھا۔ کوئی دن خطا نہ ہوتا کہ اسکول یا محلے سے بلقیس کے خلاف شکایتیں نہ آتی ہوں۔ بلقیس دیکھنے میں جتنی پیاری تھی، شرارتی بھی وہ اتنی ہی تھی اور نڈر بھی بہت تھی۔ رابعہ ماں بلقیس کو سمجھا سمجھا کے عاجز آ گئی تھیں لیکن مجال ہے کہ بلقیس میں کوئی تبدیلی آئی ہو رابعہ ماں اس کی شرارتوں کی وجہ سے کبھی کبھی اسے مارتی بھی تھیں لیکن بلقیس تو اپنے نام کی بس ایک ہی تھی، اس پہ بھلا کیا اثر ہوتا۔ کبھی کبھی تو رابعہ ماں بلقیس کی حرکتوں کے نتیجے میں آنے والی شکایتوں سے اتنی پریشان ہو جاتی تھیں کہ اکثر اوقات تو دروازہ کھٹکھٹائے جانے پر وہ گھر کے کسی گوشے میں چھپ جاتی اور گھر والوں سے کہہ دیتیں "اگر کوئی بلقیس کی شکایت لے کر آئے تو مجھے نہیں بلانا بول دینا میں گھر پہ نہیں ہوں۔"

اگر ایسی صورت میں بلقیس دروازے پر چلی جاتی تو بس سمجھیں نماز بخشوانے والوں کو روزے گلے پڑ جاتے تھے۔ وہ الٹا شکایت لے کر آنے والوں کو ہی مجرم ثابت کر دیتی تھی، ایسے گرجاتی تھی وہ۔

یہ حقیقت ہے کہ جو بچے شرارتی ہوتے ہیں وہ ذہین بھی بہت ہوتے ہیں اور عموماً یہ بھی ہوتا ہے کہ ایسے بچوں کا دھیان پڑھائی کے علاوہ ہر چیز کی طرف ہوتا ہے، بلقیس کا بھی یہ ہی معاملہ تھا۔ ہر ممکن کوشش کے باوجود اس کا دل پڑھائی میں نہ لگا۔ اس کے والد عثمان میمن اس کی منیری میں ہی ایک حادثے کے نتیجے میں وفات پا گئے تھے۔ ان کی والدہ رابعہ حاجیانی ایک دین دار اور باہمت خاتون تھیں۔ انہوں نے ازدواجی زندگی کا سکھ صرف چار سال ہی دیکھا تھا اور محض انیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئیں۔ بلقیس کے بعد دو بیٹے اقبال اور محمود غزنوی تھے۔ بیوہ ہونے کے بعد انہوں نے دوسری شادی نہیں کی اور اپنے بل بوتے پہ اپنے بچوں کی پرورش کا بیڑہ اٹھا لیا۔ پہلے انہوں نے پچیس روپے ماہانہ پر ایک اسکول میں استانی کی حیثیت سے نوکری کی پھر بعد میں عبدالستار ایدھی کی ڈسپنسری میں نرسنگ بھی شروع کر دی۔ ان کی ایک بہن بھی وہاں نرسنگ کے شعبے میں کام کرتی تھی۔ رابعہ ماں نے بچوں کو پڑھانے میں بڑی محنت کی۔ بڑے بیٹے اقبال نے بی اے تک تعلیم حاصل کی جبکہ چھوٹے بیٹے محمود غزنوی نے میٹرک کی سند حاصل کر کے بس کر دی۔ بلقیس البتہ سب سے پیچھے رہی کیوں کہ اس شوخ و شریر لڑکی کا پڑھائی میں دل لگتا ہی نہیں تھا۔ سارا وقت اپنی شرارتوں سے سب کا ناک میں دم کیے رہتی۔ بلقیس کچھ تو فطرتاً شرارتی تھی اور کچھ اس لیے بھی کہ اکلوتی اور ماں کی لاڈلی بیٹی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد ماں نے اپنے تینوں بچوں کو والد کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ رابعہ حاجیانی نے اولاد کی دل جوئی اور ناز برداری اس درجہ کی کہ بلقیس خود کو بچپن سے ہی شہزادی تصور کرنے لگی۔ اسکول میں بھی اس کا رویہ اپنی ساتھیوں سے حاکمانہ ہوا کرتا تھا۔ لکھنے پڑھنے میں پیچھے لیکن شرارتوں میں سب سے آگے رہتی۔ محلے میں بھی سب کو اس نے زچ کر رکھا تھا۔ آئے دن اسکول سے اس کی شکایت آتی کہ اس نے لڑکیوں کو بہت تنگ کیا ہے۔ بلقیس کا ہوم ورک کبھی مکمل نہ ہوتا اور اسے استانیوں سے ڈانٹ پڑتی تب وہ ہم جماعت لڑکیوں سے ان کی کاپیاں مانگتی تو اس کے لاابالی پن اور غیر ذمہ دارانہ رویے کو دیکھتے ہوئے وہ منع کر دیتیں، تب انتقاماً بلقیس کبھی ان کی کتابیں کبھی ان کی کاپیاں اور کبھی اور کوئی چیز ان کے بستوں سے نکال کے باہر گلی یا کچرے میں ڈال دیتی۔ جب ڈھنڈیا مچتی تو کاپیاں کتابیں کسی ایسی ہی جگہ سے ملتیں کہ کسی کا گمان بھی وہاں نہ جا سکتا تھا لیکن سب یہ ضرور جان جاتے کہ یہ کارنامہ کس نے انجام دیا ہے۔ شکایت کرنے پر جب بلقیس سے باز پرس ہوتی تو وہ بہت ہی سوکھا سا منہ بنا کر کہتی کہ جب میں نے پیار سے تم سے کاپی مانگی تو مجھے نہیں دی، اب اگر وہ کچرے میں پڑی ملی ہے تو کس سے شکوہ ہے اور کس بات کا شکوہ ہے؟

یہ شاندار جواب سن کر سننے والوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ جاتے اور بلقیس شان بے نیازی سے اٹھلاتے ہوئے یہ جا وہ جا۔

اس زمانے میں پارکر پین بہت مہنگا ہوتا تھا کیوں کہ اس کے لیے کہا جاتا تھا کہ اس قلم میں سونے کی نب ہوتی ہے۔ کلاس میں ایک لڑکی پارکر پین لے کر آئی اور لا کے فخریہ سب کو دکھا رہی تھی، بلقیس نے بھی دیکھا۔ ان دنوں وہ ساتویں جماعت کی طالبہ تھی اور بات بھی یہ 1960-1961 کی ہے۔ ان دنوں پارکر پین بیس روپے کا ہوا کرتا تھا۔ اس لڑکی کو وہ پین اس کے کسی عزیز نے تحفے میں دیا تھا۔ ہم جماعت لڑکیاں اسے رشک سے دیکھ رہی تھیں۔ بلقیس پہلے تو یہ سب غلغلہ دیکھتی رہی پھر اس نے اس لڑکی کو مخاطب

کیا۔ ”اے جرینہ میرے کو بھی اپنا پین دکھانا، جرا میں بھی تو اس سے لکھ کے دیکھوں کہ کیسا لکھتا ہے۔“

”نہ بابا تیرے کو نہیں دیتی پین، تیرا اپنا ہے تو تو ہے نا، چیجیں کھراب ہی کرتی ہے۔ اتنا مہنگا پین ہے، یہ کھراب نہیں کروانا رے۔“

”اچھا ابھی اس سے کبھی لکھ لیوے نا تو میرے کو بتانا۔“

یہ کہہ کے بلقیس وہاں سے اٹھ گئی لیکن زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ ایک دن وہ لڑکی جو کہ پارکر پین کی مالک تھی کلاس میں بیٹھ کے رونے لگی۔ اس کا پیارا اور قیمتی پارکر پین بستے میں ڈیسک میں کہیں بھی نہیں تھا۔ سبھی لڑکیوں کو افسوس ہوا۔ انہوں نے ڈھونڈنا شروع کیا اور بالآخر وہ پین باہر گلی میں کچرے کے قریب پڑا ہوا ملا۔ سب نے بلقیس کی طرف دیکھا مگر بلقیس نے تو شرمندہ ہونا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔

”اگر اس وقت جرا سا میرے کو دکھا دیتی تو کیا تیرا پین گھس جاتا، اب اچھا ہوا نا، تو رو رہی ہے، تیرے کو بہت مجا آرہا ہوگا نا، بہت اچھا ہوا تیرے ساتھ۔“ اب ایسی بے خوف اور ڈھیٹ لڑکی کو کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔

بلقیس کا یہ ہی مزاج تھا کہ وہ پڑھائی کے لیے کبھی سنجیدہ نہ ہو پائی۔ اس کا ذہن اس طرف تھا ہی نہیں۔ جیسے تیسے تو وہ دھکے کھا کھا کے آٹھویں پاس کر کے نویں جماعت تک آئی۔ وہ بھی اس لیے کہ اس کی استانیاں اسے مزید ایک سال اپنی جماعت میں برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتی تھیں۔ جب تک معاملہ اسکول کی ٹیچرز کے ہاتھ میں تھا بات بنی رہی بلقیس جیسے تیسے اگلی جماعت میں زبردستی بھیجی جاتی رہی۔ بورڈ کے امتحانوں میں اسکول کی استانیاں کچھ نہیں کر سکتی تھیں تو وہاں تک آ کے بلقیس کا تعلیمی سلسلہ تمام ہوگیا۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ اسکول کا معیار اچھا نہیں تھا یا استانیاں قابل نہیں تھیں۔ نہیں ان دونوں میں سے کوئی بھی بات نہیں تھی۔ رونق اسلام اسکول کل بھی پورے کھارادر میں تعلیم کے حوالے سے اچھی شہرت کا حامل تھا، آج بھی ہے اور صرف اسکول ہی نہیں کالج بھی اس علاقے میں اس حوالے سے مشہور ہے کہ یہاں پڑھائی کا معیار اچھا ہے اور اساتذہ قابل ہیں جب یہ دونوں باتیں درست ہیں کہ اسکول کا تعلیمی معیار بھی اچھا ہے استانیاں بھی لائق ہیں تو کیا بلقیس کند ذہن تھی؟ نہیں بات یہ بھی نہیں تھی بلقیس بھی کند ذہن نہیں تھی۔ بس اس کا دل پڑھنے لکھنے میں نہیں تھا اتنی سی بات تھی ورنہ وہ بیشتر معاملات میں خاصی ہوشیار واقع ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ ماں کی لاڈلی تھی کیوں کہ ایک تو اپنی ماں کی اکلوتی بیٹی تھی اور پھر سب سے بڑی اولاد، دونوں بھائی بلقیس سے چھوٹے تھے۔ رابعہ ماں کو بلقیس سے کتنی محبت ہوسکتی ہے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں، وہ خود کہتی ہیں۔ ”حالات چاہے جیسے بھی رہے ہوں لیکن میری ماں نے کبھی مجھے محسوس نہیں ہونے دیا کہ ہم کتنی مشکل سے گزارہ کر رہے ہیں۔ کبھی میری کسی چیز میں کمی نہیں آنے دی۔ اس زمانے میں یارڈلے صابن سب سے مہنگا صابن ہوا کرتا تھا۔ میری ماں اس سے مجھے نہلاتی تھی۔ میں نے یارڈلے کے علاوہ کوئی اور صابن استعمال نہیں کیا تھا۔ میری ماں ہمیشہ میرے لیے اچھی سے اچھی چیز لاتی تھیں۔“

جب رابعہ ماں کو گھر آ کر بلقیس کی شکایتیں سننا پڑتیں تو ان کا پارا اور ہائی ہو جاتا اور اکثر تو بلقیس کی پٹائی بھی ہو جاتی تھی لیکن اس پہ کوئی اثر نہ ہوتا۔

رابعہ ماں بلقیس کی ہر خواہش پوری کرتی تھیں لیکن بہرحال ایک ماں تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹی بھی لکھ پڑھ کے کسی قابل بنے۔ اب یہ اور بات ہے کہ بلقیس کا پڑھنے میں دل نہ لگا تب انہوں نے چاہا کہ وہ گھرداری سیکھ لے آخر اسے پرائے گھر جانا ہے۔ بلقیس کا گھر کے کاموں میں بھی دل نہ لگتا۔ اس زمانے میں گیس تو ہوتی نہیں تھی لکڑیاں، کوئلے، برادہ یا اپلے جلا کر کھانا پکایا جاتا تھا۔ گھر کی صفائی یا اپلے تھوپنے کا کام اگر بلقیس کے سپرد کر دیا جاتا تو بس سمجھیں کہ گھر میں زلزلہ آ جاتا یا کہ طوفان، بلقیس آنکھوں میں آنسو لیے پاؤں پٹخ پٹخ کر اپنی خفگی کا اظہار کرتی۔ مسلسل یہ صورت حال دیکھ کر رابعہ ماں نے سمجھ لیا کہ گھرداری بھی بلقیس کے بس کی بات نہیں۔ اڑوس پڑوس کی کچھ لڑکیوں کو سلائی سیکھنے جاتے دیکھا تو بلقیس کو بھی شوق اٹھا کہ وہ بھی سلائی سیکھنے جائے گی۔ ماں تو خوش ہوگئیں کہ چلو کوئی تو ہنر اس لاابالی لڑکی کو آئے گا لیکن حسرت ان غنچوں پہ جو چار دن بھی نہ کھلنے پائے اور اس سے پہلے ہی مرجھا گئے۔ بات دراصل یہ ہوئی کہ بلقیس کی شہرت وہاں بھی پہنچ چکی تھی اور سلائی سکھانے والی استانی حوا آپا، بلقیس پہ کڑی نظر رکھتی تھیں۔ ایک سال تک بلقیس نے سلائی سیکھی اور اس ہنر میں خاصی ماہر بھی ہوگئی لیکن ایک دن کسی غلطی پہ حوا آپا نے بلقیس کو تھپڑ مارا تو بلقیس جیسی سرپھری لڑکی کو یہ بات کہاں برداشت، وہ گھر بیٹھ گئی اور ماں کے سمجھانے کے باوجود دوبارہ وہاں نہ گئی۔ پھر اسے خیال آیا کہ محلے کی لڑکیاں ایدھی کی ڈسپنسری میں نرسنگ سیکھنے جاتی ہیں تو کیوں نہ ان کے

ساتھ جا کے وہاں یہ کام سیکھ لوں، چنانچہ ایک دن وہ اسکول سے ہی اپنے محلے کی چند لڑکیوں کے ساتھ جو اسکول میں بھی اس کے ساتھ ہی پڑھتی تھیں، ڈسپنسری چلی آئی، جس کا ذکر ابتدا میں آچکا ہے۔ اس سے اگلے دن جب وہ ڈسپنسری پہنچی تو وہاں کے کچھ اصول اور ضابطوں کے آگاہ کرنے کے بعد اسے ڈسپنسری میں کام سیکھنے کی اجازت مل گئی۔

جب بلقیس نے ڈسپنسری آنا شروع کیا تو کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ بلقیس یہاں ٹک پائے گی۔ اس کی لاابالی طبیعت اور بے چین فطرت کہاں اسے چین لینے دیتی۔ وہاں کے مالک کا بھی یہ ہی خیال تھا کہ بلقیس جیسی نٹ کھٹ لڑکی چند دن یہاں کام کرنے کے بعد غائب ہو جائے گی لیکن بلقیس نے سب کو حیران کر دیا۔ اس نے اپنی فطرت کے برخلاف جس طرح محنت اور لگن سے کام سیکھا وہ واقعی لائق تحسین ہونے کے ساتھ ساتھ حیران کن بھی تھا۔

اصل میں فلاحی کام خشک اور بیرنگ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سخت نوعیت کے بھی ہوتے ہیں۔ نہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو فلاحی کاموں کی طرف آتے ہیں ورنہ یہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ دردمند دل اللہ ہر ایک کو عطا نہیں کرتا۔ بلقیس بظاہر جتنی غیر ذمے دار اور بے پروا نظر آتی تھی اس کے سینے میں اتنا ہی ایک حساس اور خوبصورت دل چھپا ہوا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس نے جب فلاحی کاموں میں حصہ لینا شروع کیا تو اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کا ایسا شاندار مظاہرہ کیا کہ اسے جاننے والے دنگ رہ گئے۔

اس نٹ کھٹ اور شرارتی سی لڑکی نے آتے ہی ڈسپنسری کے ماحول کو جیسے بالکل بدل ڈالا جو شوخیاں اور شرارتیں وہ گھر میں کرتی تھی وہ ہی سب اس نے یہاں بھی شروع کر دیا اور ڈسپنسری کے چپ چپ اور پُرسکون ماحول میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔

بلقیس کا معصوم چہرہ، دلربا مسکراہٹ، نوعمری کا الہڑپن اور شوخی اس پہ اس کی چنچل ادائیں، ان سب نے مل کے ایدھی صاحب جیسے خشک مزاج کو بھی.... اکثر مسکرانے پر مجبور کر دیتیں۔

بلقیس جب یہاں آئی تو کئی لڑکیوں نے جو یہاں کام کرتی تھیں اور جو یہاں سے کام کر کے جا چکی تھیں، انہوں نے بلقیس کو ایدھی صاحب کے بارے میں بہت خوفناک باتیں بتائیں۔ بالالفاظ دیگر بلقیس کو ڈرانے کی پوری پوری کوشش کی لیکن وہ بلقیس سے مکمل طور پر واقف نہیں تھیں۔ بلقیس ان سب کی باتیں سن کے دل ہی دل میں ہنستی رہتی لیکن ان سے جواب میں کچھ نہ کہتی۔ بلقیس کو ایدھی صاحب سے نہ تو ڈر لگتا اور نہ وہ ان کے بارے میں دوسروں کی طرح منفی سوچ رکھتی تھی۔ بات اصل میں یہ تھی کہ بلقیس شروع سے ہی اور لڑکیوں سے مختلف تھی۔ عادت مزاج کے اعتبار سے بھی اور ماحول کے لحاظ سے بھی اور کچھ اس کی فطرت بھی باغیانہ تھی، بقول پروین شاکر۔

"کچھ تو تیرے موسم بھی مجھے راس کم آئے
اور کچھ میری مٹی میں بغاوت بھی بہت تھی"

سو اسی کے مصداق بلقیس نے بھی بہکانے والیوں کی باتوں کا کوئی اثر نہ لیا بلکہ اثر لیا تو الٹا یعنی جتنا وہ لڑکیاں اسے ایدھی سے ڈرانے اور متنفر کرنے کی کوشش کرتیں اس کے دل سے ایدھی کے لیے خوف اور بیزاری دور ہوتی جاتی تھی۔ یہ وہ ہی تو والی بات ہے کہ اسپرنگ کو جتنا زیادہ دباؤ وہ اتنی ہی زیادہ

بلقیس نسوانی عزم و ہمت کا وہ روشن نشان ہیں کہ انہیں دیکھ کے رشک آتا ہے کہ کوئی خاتون فلاح و بہبود کے شعبے میں اتنی ان تھک محنت اور لگن سے کام کر سکتی ہے؟ بلقیس ایک خوش حال میمن گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ آبائی تعلق بانٹوا کے ایک نواحی گاؤں سے ہے اور میمنوں کی بانٹوا شاخ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ویسے تو میمن مالی طور پر آسودہ لوگ تصور کیے جاتے ہیں کیوں کہ یہ کاروبار اور تجارت سے وابستہ ہوتے ہیں۔ نوکریوں کی طرف ان کا اتنا رجحان نہیں ہوتا، میمنوں میں بھی جو چند شاخیں زیادہ خوشحال سمجھی جاتی ہیں ان میں بانٹوا میمنوں کا نام نمایاں ہے۔ بانٹوا میمنوں میں رواج تھا کہ شادی کے موقعے پر لڑکی والے اپنی بیٹی کو جہیز میں نہ صرف گھر دیتے تھے بلکہ گھر میں ضروریاتِ زندگی کی تمام چیزیں بھی ساتھ ہی دینا ہوتی تھیں یہاں تک کہ باورچی خانے میں استعمال ہونے والا تمام سامان بشمول نمک مرچ وغیرہ تک برتنوں میں ڈال کے یوں سجا دی جاتی تھی کہ کوئی بھی شخص وہاں آ کے اسی لمحے سے عائلی زندگی کا آغاز کر سکتا ہے مگر بلقیس نے ایدھی صاحب کی راہ پر چلنے کے لیے ایسا کچھ لینے سے انکار کر دیا تھا۔

قوت سے اچھلتا ہے یا کہ گیند کو دیوار پہ جتنی طاقت سے ماریں وہ اس سے زیادہ طاقت سے پلٹ کر آئے گی۔ بلقیس کی فطرت کو دیکھتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اس سے ایدھی صاحب کے خلاف اتنا زیادہ نہ کہا سنا جاتا تو شاید وہ بھی اور لڑکیوں کی طرح کچھ عرصے بعد ڈسپنسری سے چلی جاتی اور آج اس کا نام بھی نہ ہوتا اس داستاں میں لیکن قدرت نے کچھ عظیم کام اور ایک عظیم انسان اس کے مقدر میں لکھ دیا تھا۔ سو کیسے نہ ہوتا وہ سب جو کہ ہوا اور قدرت جب کسی کام کا ارادہ کر لیتی ہے تو پھر اس کے راستے بھی خود ہی ہموار کرتی ہے۔ بلقیس کے لیے یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ ایدھی صاحب نے بہت ڈرتے ڈرتے بلقیس کو اپنے یہاں کام سیکھنے کی اجازت دی تھی مگر وہ یہ دیکھ کے حیران رہ گئے کہ بہت جلد بلقیس نے ان کی ڈسپنسری میں جگہ بنالی اور اتنی اہم جگہ بنائی کہ ہر ایک کو ہر کام کے لیے بلقیس کی ضرورت پڑتی۔ یوں لگتا تھا کہ بلقیس ان سب کے لیے ناگزیر ہے اور اس کے بغیر یہ لوگ کوئی کام نہیں کر سکتے۔ ایدھی صاحب کو اس دن بہت حیرانی ہوئی کہ ڈسپنسری میں کام کرنے والی لیڈی ڈاکٹر آپا سے کہہ رہی تھی کہ وہ بلقیس کو بھیجے تاکہ مریضہ کی مرہم پٹی میں وہ اس کی مدد کروائے۔ ایدھی اس ڈاکٹر کے پاس چلے آئے اور اس سے پوچھا؟

"تم بلقیس کو کیوں بلا رہی ہو، کام کے لیے اور لوگ نہیں ہیں کیا؟"

لیڈی ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "بات یہ نہیں ہے کہ اور لوگ ہیں یا نہیں ہیں، لوگ تو یہاں کام کرنے کے لیے بہت ہیں لیکن بات یہ ہے کہ بلقیس کا کام ان دوسری لڑکیوں سے کہیں اچھا ہے۔ اسے کوئی بات بار بار سمجھانا نہیں پڑتی۔ وہ کام کو پوری طرح سمجھ جاتی ہے اور اچھی طرح انجام دیتی ہے۔ اس کے علاوہ بلقیس کے ساتھ کام کرنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ وہ کام کے دوران ہنسی مذاق کر کے سب کا دل بہلائے رکھتی ہے۔ یوں ہمیں پتا بھی نہیں چلتا کہ کب کام نمٹ گیا۔"

شاید یہی وہ لمحات تھے جب ایدھی صاحب نے اس نٹ کھٹ البیلی سی لڑکی کو ذرا سنجیدہ لینا شروع کر دیا۔ انہوں نے بلقیس کے کام کا جائزہ لینا شروع کیا تو یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ بظاہر غیر ذمے دار نظر آنے والی شوخ و شنگ سی بلقیس درحقیقت کس قدر حساس اور سمجھ دار واقع ہوئی ہے۔ وہ کسی کو بھی تکلیف میں دیکھ کر تڑپ جاتی ہے۔ سب کچھ بھول بھال کے اس کی مدد کرنے اور دیکھ بھال میں لگ جاتی ہے۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ وہ مریض کی دیکھ بھال کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی دل جوئی اس انداز سے کرتی کہ مریض کی تکلیف آدھی رہ جاتی۔ یہ بڑے ہنر کی بات تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جتنی تیز رفتاری سے وہ باتیں کیا کرتی اتنی ہی پھرتی سے وہ کام بھی نمٹا دیا کرتی۔

یہ وہ باتیں تھیں جو رفتہ رفتہ ایدھی صاحب کے دل میں جگہ بنانے لگیں۔ انہیں متاثر کرنے لگیں اور سادہ لوح ایدھی کچھ البیلے خواب آنکھوں میں سجانے اور اُمید کے خوش رنگ پھول اپنے دامن میں سمیٹنے کی آرزو کر بیٹھے لیکن وہ ڈرتے یوں تھے کہ ان میں اور بلقیس میں کئی لحاظ سے فرق تھا۔ اگرچہ دونوں کا خاندانی پس منظر ایک تھا۔ ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ آبائی علاقہ ایک تھا۔ دونوں میں دور پرے کی رشتہ داری بھی تھی۔ یہ باتیں تو بہت خوش آیند تھیں لیکن دونوں کی عمر میں فرق ذرا زیادہ تھا۔ بلقیس کی طبیعت میں جو شوخی اور چلبلا پن تھا وہ اس کی عمر کا تقاضہ تھا لیکن اس کے غیر ذمے دار ہونے کا تاثر پیش نہیں کرتا تھا۔ ایدھی صاحب ایک بہت حساس دل شخص تھے۔ انہیں دوسروں کے کام آنے کا جنون تھا۔ یہ چیز ان کے اندر خون کی طرح رواں تھی کہ وہ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر اس کی مدد کیے بغیر رہ نہیں سکتے تھے چاہے وہ ان کا دشمن ہی کیوں نہ ہو اور کسی کی مدد کرنے کے سلسلے میں وہ دن رات کا فرق بھی نہ دیکھتے۔ ایسے شخص کے ساتھ ہر عورت گزارہ نہیں کر سکتی۔ کوئی ایسی ہی حساس طبع اور دردمند عورت ہوتی جو ہر لحظہ ہر مقام پر اپنے درد دل رکھنے والے شوہر کے شانہ بہ شانہ قدم سے قدم ملا کر چلے تب تو زندگی کا سفر کٹتا ورنہ گھر کی طرف سے بے سکونی ہو تو انسان کبھی کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ بلقیس کی فطرت کا یہ پہلو اس کی تمام بے پروائیوں اور خامیوں پہ بھاری تھا کہ وہ بھی مزاجاً ایدھی صاحب جیسی ہی انسانیت کا درد رکھنے والی اور دوسروں کے کام آنے والی لڑکی تھی اور یہ چیز اس کی شخصیت کی اتنی بڑی خوبی تھی کہ دیگر تمام باتوں پر حاوی تھی۔

بلقیس نے بھی اتنے دن میں ایدھی صاحب کو بہت غور سے دیکھ پرکھ لیا اور جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اگر اس سے ایدھی کے خلاف اتنی باتیں نہ کی جاتیں تو شاید وہ ایدھی کی طرف بالکل بھی توجہ نہ دیتی لیکن ایدھی کے خلاف ہونے والی باتوں نے اسے مائل کیا کہ وہ ایدھی صاحب کو جاننے کی کوشش کرے اور یوں اس پہ یہ راز کھلا کہ درحقیقت ایدھی صاحب اس بادام کی مانند ہیں جس کے سخت خول کے پیچھے

ایک نرم و شیریں میوہ پوشیدہ ہے۔

ان کا سنگم آسمانوں پہ طے تھا لہٰذا دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھتے گئے۔ اگرچہ ایدھی صاحب کے مزاج میں سختی بہت تھی لیکن بلقیس بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔ وہ اپنی ہی من مانی کرتی تھی۔ مزاجوں کا اختلاف بھی دونوں کو قریب آنے سے نہ روک سکا کیوں کہ دونوں کی روحیں ایک ہی خمیر سے گندھی اور ایک ہی مٹی سے بنی تھیں۔ انسانیت کے لیے کام کرنے کا جنون دونوں میں وہ مشترک اور طاقت ور جذبہ تھا کہ اس نے دیگر تمام باتوں کو دھندلا دیا تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ہر قسم کے اختلاف کو ختم کر دیا تھا۔ زبان سے ایک لفظ کہے بغیر دونوں نے سمجھ لیا کہ اللہ نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے لیے بنایا ہے۔ مزاج، طبیعت اور گھریلو ماحول کا فرق بھی اس کشش باہمی پہ غالب نہ آسکا جو دونوں ایک دوسرے کے لیے محسوس کر رہے تھے۔ بالآخر ایک دن ایدھی نے ہمت کر کے بلقیس سے کہہ ہی دیا کہ وہ زندگی کا سفر اس کی معیت اس کی رفاقت میں گزارنا چاہتے ہیں۔ بلقیس جتنی بھی تیز طرار ہو، تھی تو ایک مشرقی لڑکی اور پھر یہ کہ وہ دور آج کی طرح کھلا ڈلا اور بے باک نہیں تھا۔ بلقیس ایدھی صاحب کے اپنے بارے میں جذبات سے بے خبر نہیں تھی خود اس کے دل میں بھی ایدھی صاحب کے لیے نرم گوشہ بن گیا تھا اس لیے اس نے ایدھی صاحب کو وہ ہی جواب دیا جو ایسے موقعے پہ کوئی بھی شریف مشرقی لڑکی دیتی ہے۔ وہ ہی مشرقی روایتی شرمیلا سا جواب کہ میری امی سے بات کریں۔ بلقیس کی خالہ بھی چوں کہ ڈسپنسری میں کام کرتی تھیں تو ایدھی صاحب نے پہلے ان ہی سے بات کی۔ انہوں نے اپنی بہن یعنی بلقیس کی والدہ حاجیانی رابعہ سے بات کی۔ بات تو انہوں نے خاموشی سے سن لی لیکن سوچ میں ڈوب گئیں۔ بہن نے پوچھا۔ ”کیا سوچنے لگ گئیں؟“

”سوچنے والی تو بات ہے۔“

”ایسی بھی کیا بات ہے سوچنے والی؟ جدھر بیری ہو پتھر تو آئیں گے نا۔“

”سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ ایدھی کے اپنے پلے کچھ نہیں، اس کا نہ ڈھنگ سے رہنے کا ٹھکانا نہ کھانے پینے کا حساب کتاب، میری بیٹی کو کہاں رکھے گا۔ کیا کھلائے گا یہ سب نہ سوچوں؟“ رابعہ ماں تو جیسے پھٹ پڑیں۔

”دیکھ بائی یہ تو سب نصیبوں کی باتیں ہیں، تیری بیٹی وہاں جائے گی تو اپنا نصیب لے کے جائے گی تو اتنی فکر نہ کر۔

سماجی بہبود کے شعبے میں خواتین کا بہت نام بھی ہے اور کام بھی، مثال کے طور پر ڈاکٹر رتھ فاؤ جیسی عظیم ہستی کو کون بھول سکتا ہے۔ بے شک انہوں نے جذام کے مریضوں کے لیے جس طرح اپنی پوری زندگی وقف کی اور نہ صرف زندگی بلکہ اپنی کمائی، اپنا سکون، آرام، اپنا آبائی وطن اور اپنے عزیز رشتے دار بھی، سبھی کچھ کوڑھ کے ان بے بس اور لاچار مریضوں کے لیے وقف کر دیا کہ جنھیں ان کے پیاروں نے چھوڑ دیا تھا اور معاشرے نے بھی انہیں دھتکار دیا تھا۔ ایسے بچھڑے ہوئے، پسے ہوئے اور کچلے ہوئے لوگوں کو گلے لگانا انہیں پھر سے ایک نارمل انسان ہونے کا احساس دلانا اور ان میں جینے کی امنگ پیدا کرنا بہت بڑی بات ہے اور یقیناً یہ ملکوتی صفات میں شمار کی جاسکتی ہے۔ بلقیس اور رتھ فاؤ لوگوں کی خدمت کے حوالے سے بے شک ایک جیسی عظمت کی حامل ہیں لیکن بس فرق دونوں کی خدمات کے شعبوں کا ہے۔ رتھ فاؤ کی خدمت کا دائرہ کار جذام کے مریضوں کے علاج اور ان کی بعد از علاج بحالی اور نارمل زندگی گزارنے میں مدد دینے تک تھا جبکہ بلقیس ایدھی عام معاشرتی مسائل اور عام آدمی کی زندگی میں پیش آنے والے تمام دکھوں اور تکلیفوں کے حوالے سے سرگرم ہیں اور یہ سب انہوں نے اپنے شوہر کی دست راست بن کر کیا اور ایدھی صاحب کے بعد اپنے بیٹے کی معاونت سے یہ سب کر رہی ہیں لیکن یہاں یہ واضح کرنا ازحد ضروری ہے کہ یہ دونوں عظیم خواتین اپنی اپنی جگہ بہت عظیم اور قابلِ احترام ہیں۔ کسی کو کسی سے کم تصور کرنا زیادتی ہوگی۔ دونوں عظیم ہیں انسانی خدمت اور فلاح و بہبود کے شعبے میں کارہائے نمایاں سرانجام دینے کے حوالے سے۔

ہاں۔“

”اے بہن تیری بات اپنی جگہ لیکن یہ تو سوچ میری ایک ہی بیٹی ہے میں نے اس کو بہت لاڈ سے پالا ہے۔ ابھی وہ بھی کیا سوچے کہ ماں نے اتنے دلار سے پالا اور ایسے فقیر سے رشتہ کر دیا جدھر کوئی سکھ نہیں؟“

رابعہ ماں کے لہجے میں اس مرتبہ خاصی فکر مندی تھی۔ ظاہر ہے وہ بیٹی کی ماں تھیں تو ان کے ذہن میں ایسے اور ان جیسے کئی خدشات کا ابھرنا لازمی تھا۔ جب یہ بات پھیلی کہ ایدھی صاحب نے بلقیس کے لیے رشتہ بھیجا ہے تو سبھی نے بلقیس کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اس رشتے سے انکار کر دے۔ ان میں ڈسپنسری میں کام کرنے والی لڑکیاں بھی تھیں اور بلقیس کی سہیلیاں بھی۔ اس رشتے سے انکار پر اکسانے والیوں میں سب سے پیش پیش امینہ تھی، کبھی کہتی کہ ایدھی تو فقیر ہے وہ تمہیں بھی اپنی طرح فقیر بنا دے گا۔ کوئی اور کہتی کہ شادی کے بعد ہمارے شوہر تو ہمیں گھمانے پھرانے لے کے جایا کریں گے۔ ہم اچھے اچھے کپڑے زیور پہن کے بناؤ سنگھار کر کے خوبصورت لگیں گے لیکن تم بدرنگ سے حلیے میں مردے ہی نہلایا کرو گی۔ ایدھی تو بس تمہیں اسی کام پہ لگا کے رکھے گا۔

ہر طرف سے بلقیس کو یہ ہی باتیں سننے کو مل رہی تھیں۔ امینہ اور زیادہ بڑھ بڑھ کے بولتی، اس کا کہنا تھا کہ ایدھی ہرگز اس لائق نہیں کہ اس سے شادی کی جائے۔ وہ کسی لڑکی کو اچھی زندگی نہیں دے سکتا۔ وہ تو یہاں تک کہتی اگر ایدھی کے ساتھ زندگی اچھی گزر سکتی تو میں اس موقعے کو ضائع کیوں کرتی۔ اس سے شادی نہ کر لیتی۔

بلقیس نے یہ سب ایک کان سے سنا دوسرے کان سے نکال دیا۔ اس نے کسی کی بات پر غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی اور اپنی آئندہ زندگی کا فیصلہ تقدیر پر چھوڑ دیا۔ جو ملن آسمانوں پہ طے تھے اسے زمین پہ کون اور کیسے روک سکتا تھا لہٰذا تمام تر خدشات اور تفکرات اور مخالفین کی لاکھ کوششوں کے باوجود 19 اپریل 1966ء کو دونوں رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔ یہ شادی کوئی روایتی شادیوں جیسی نہیں تھی۔ ایدھی نے پہلے ہی بتا دیا تھا وہ شادی والے دن بھی معمول کے لباس میں ہوں گے۔ نیز انہیں کسی قسم کا جہیز نہیں چاہیے، نہ ہی دولہا کی طرف سے دلہن کے لیے لباس یا کسی طرح کی اور چیزیں مثلاً زیور، میک اپ وغیرہ جیسی اشیا جائیں گی۔ اگرچہ اس پہ کئی رشتے داروں کی جانب سے اعتراضات بھی کیے گئے لیکن ایدھی نے ان سب کی کوئی پروا نہیں کی اور سب سے اہم بات تو یہ ہوئی کہ بلقیس نے ایسی فضول اور غیر ضروری باتوں کی بالکل پروا نہیں کی۔ اس کی ماں نے بلقیس کو پیسے دے دیے تھے کہ وہ اپنی مرضی سے شادی کا جوڑا بنا لے اور بھی جو کچھ خریدنا ہو خرید لے۔

شادی والے دن ایدھی صاحب اپنے روزمرہ لباس میں تھے اور لگ نہیں رہے تھے کہ وہ دولہا ہیں۔ بلقیس دلہن تو بنی تھی لیکن بہت زیادہ سجی بنی نہیں تھی اس کے باوجود وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ شادی کا دن تو ہوتا ہی دولہا دلہن کا ہے اور اس دن سب سے اچھے وہ ہی دونوں لگ رہے ہوتے ہیں، تو جو کہا جاتا ہے نا کہ دلہناپے کا اپنا روپ ہوتا ہے تو یہ ہی بات بلقیس پہ بھی صادق آئی اور وہ سادہ سی سجاوٹ کے باوجود بہت پیاری لگ رہی تھی۔ کچھ دلہناپے کا روپ اور پھر کم عمری کی چھبن، ان سب نے مل کے بلقیس کو ایسا جگمگا دیا کہ ہر نظر میں اس کے لیے ستائش تھی لیکن یہ بھی بڑی ستم ظریفی ہوئی کہ جس کے لیے یہ دن بہت اہم تھا، جس کے لیے بلقیس سجی بنی تھی اس ہی نے نظر بھر کے اپنی دلہن کو نہ دیکھا۔ ہوا یوں تھا کہ نکاح کے بعد ابھی لوگ مبارک بادیں دینے ہی لگے تھے کہ اطلاع آئی ایک بچی عمارت کی چھت سے گر پڑی ہے اور تشویش ناک حالت میں ہے۔ ایدھی صاحب یہ سنتے ہی سب چھوڑ چھاڑ کے بھاگے تاکہ بچی کو اسپتال لے جایا جا سکے۔ حالانکہ اس بچی کے والد ایدھی صاحب کے ان سخت مخالفین میں سے تھے جنہوں نے ایدھی کو سخت سے سخت اذیت پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ اس موقع پہ بلقیس کا حوصلہ اور رویہ قابل داد تھا اس نے شادی کی تقریب یوں چھوڑ کے چلے جانے پہ نہ اس وقت نہ بعد میں، کبھی بھی ایدھی کو مطعون کیا بلکہ بعد میں بھی ہر ایسے موقعے پر ایدھی صاحب کا ساتھ دے کے ان کا حوصلہ بڑھایا۔ بلقیس کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو یقیناً جھگڑے ہوتے اور زوردار جھگڑے ہوتے، کسی بھی نئی نویلی دلہن کے لیے یہ کوئی کم صدمے کی بات نہیں کہ عین شادی والے دن نکاح کے فوراً بعد دولہا اس کا سجا سنورا روپ دیکھنے کی بجائے اسپتال جا کر کسی مریض کی تیمارداری میں مصروف ہو جائے۔ بلقیس کو اس کے دولہا کے بجائے اس کے رشتے دار رخصت کرا کے لے گئے۔ ایدھی اگلے دن تشریف لائے۔ کچھ لوگوں نے شرمندہ کرنا چاہا کہ وہ شادی والے دن اپنی دلہن کو چھوڑ کر تیمارداری میں لگ گئے تھے۔ ایدھی صاحب نے وہ ہی جواب دیا جو ہمیشہ دیتے تھے کہ انسانی جان ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہے لیکن بلقیس نے شکایت کا ایک لفظ نہ کہا۔

ابھی تلک تو بلقیس نے پھولوں جیسی زندگی بسر کی تھی لیکن اب جو زندگی اس کے سامنے تھی وہ زندگی کوئی خوابوں جیسی زندگی نہیں تھی بلکہ حد درجہ کٹھن اور دشوار گزار تھی لیکن بلقیس خوش تھی نہ پیسے کی کمی نہ آسائشات کی عدم دستیابی، نہ شوہر کی عدیم الفرصتی کسی بھی چیز نے اسے پریشان نہیں کیا۔ شاید اس کی مبارزت پسند طبیعت کو ایسے ہی نامساعد حالات درکار تھے کہ جن سے لڑ جھگڑ کے اور مقابلہ کر کے وہ اپنی مشکل فطرت کی تسکین کر سکے۔ بلقیس نے حالات کے چیلنج کو قبول کیا اور بہت ہمت اور خوش دلی سے حالات کا مقابلہ کیا۔ اصل میں بلقیس کی شخصیت کا حقیقی رخ یہ ہی تھا کہ اسے مشکلات سے لڑنے میں مزہ آتا تھا۔ شادی کے بعد وہ زندگی کے اک نئے روپ سے آشنا ہوئی، شروع میں تو اسے یہ سب چیزیں سمجھنے جاننے میں وقت لگا کہ اب اسے کیسے کام کرنا ہے لیکن جب ایک دفعہ اس نے طے کر لیا تو پھر ہر شے خود بخود اپنی ڈگر پر چلنا شروع ہو گئی۔ ایک معمول میں ڈھلتی چلی گئی۔

شادی کے شروع کے دن جو کسی بھی نئی شادی شدہ جوڑے کے لیے سنہرے دن ہو سکتے ہیں وہ بلقیس نے اپنے معمول کے کاموں میں گزارے۔ عورت میں اللہ نے ایک خاص صلاحیت یہ رکھی ہے کہ وہ غیر شعوری طور پر اپنے شوہر کے ہی راستے پر چلنا شروع کر دیتی ہے۔ بلقیس کا اپنا مزاج بھی ایسا ہی تھا اور کچھ ایدھی صاحب کی صحبت کا اثر، اس نے پہلے دن سے دلہناپے کو اتار کے کونے میں ٹانگ دیا تھا۔ جب اس نے شادی کے دوسرے ہی دن سے ڈسپنسری کی صفائی شروع کر دی تو وہاں کام کرنے والی ساری لڑکیاں دانتوں میں انگلی داب کے رہ گئیں اور کئی لڑکیوں نے تو اسے ہمدردی میں سمجھایا بھی۔ ”ارے یہ تم کیا کرنے لگیں بلقیس۔“

”کیا کر رہی ہوں؟“

”یہ تمہارے کرنے کا کام نہیں ہے۔“

”کیوں میرے کرنے کا کام کیوں نہیں ہے؟“

دوسری نے لقمہ دیا۔ ”تم اگر ابھی سے یہ سب کرنے لگیں تو ساری زندگی ایسی ہی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔“

”آگے بھی کرنا اور ابھی بھی کرنا تو ایک بات ہوئی نا۔“

”دیکھو ابھی تم نئی دلہن ہو ابھی تم اپنے کو سجاؤ، بناؤ سنگھار کرو ورنہ شوہر کے دل سے اتر جاؤ گی۔“

”میں جو کر رہی ہوں یہ میرا کام ہے اور میرا شوہر اسی سے میری قدر کرے گا۔“

یہ اور ایسے کتنے ہی اعتراضات، سوال اور جواب ہوتے رہے۔ ایدھی صاحب دنیا سے الگ مزاج کے شخص تھے۔ فقیری خمیر سے ان کی مٹی گندھی تھی۔ عام شوہروں کی طرح وہ بیوی کی ناز برداری اور دل جوئی کے عادی نہیں تھے۔ یہ حقیقت ہے ایک عام عورت جو ایک پُرسکون گھر، شوہر کا ہر وقت کا ساتھ اور تفریحات چاہتی ہو اس کا گزارہ ایدھی صاحب کے ساتھ نہیں ہو سکتا تھا، خدا نے دونوں کی جوڑی بہت اچھی بنائی تھی کہ پانچ عشروں پہ محیط ساتھ اتنا اچھا اور خوشگوار رہا۔ خود بلقیس ایدھی کا کہنا ہے۔ ”ہمارے مزاج نہیں ملتے تھے لیکن ہمارے دماغ ایک جیسے انداز میں سوچتے تھے کہ کسی کو تکلیف میں دیکھتے تو سوچتے اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ ہمیں ایسی صورت میں ایک دوسرے کو یہ نہیں کہنا پڑتا تھا کہ کیا کریں خود بخود ہی ہم کام کرنے لگ جاتے تھے اسی لیے ہماری اتنی اچھی نبھ گئی۔“

شادی کے بعد دونوں نے میٹھادر میں ایدھی صاحب کے والدین کے گھر کے قریب ایک چھوٹے سے گھر میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا پھر کچھ عرصے بعد وہ مرکزی دفتر کے چھت پر بنے کمرے میں منتقل ہو گئے شاید ہی کسی نوبیاہتا جوڑے نے اپنی عائلی زندگی کا آغاز اس انداز سے کیا ہو جیسے ان دونوں نے کیا۔ ایدھی کی صبح تو بہت جلدی ہو جاتی تھی۔ بیدار ہونے کے بعد کمرے کے باہر آ کے بیٹھ جاتے تھے۔ بلقیس رات کی روٹی اور چائے کا ناشتا دیتی پھر پہلے ایدھی صاحب اور ان کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد بلقیس بھی سینٹر چلی جاتی اور اپنے کام شروع کر دیتی۔ ایدھی صاحب تو وقت ضائع کرنا بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ بیدار ہونے کے کچھ ہی دیر بعد سے جو مصروف ہوتے تو اس مصروفیت کے اختتام کا کوئی وقت نہیں ہوتا تھا۔ بلقیس کو بیک وقت کئی سمتوں میں کام کرنا پڑتا تھا۔ دفتر اور فلاحی کاموں کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اس پہ گھر کی بھی ذمہ داریاں تھیں پھر جب بچے ہوئے تو ان کی دیکھ بھال اور پرورش و تربیت بھی بلقیس کے ہی فرائض میں شامل تھا۔ ایدھی صاحب کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا تھا کہ وہ عام مردوں کی طرح گھریلو معاملات میں دلچسپی لیں یا گھر کے مسئلے مسائل حل کرنے میں لگے رہیں۔ یہ بات نہیں کہ انہیں گھر سے رغبت نہیں تھی یا گھر والوں سے محبت نہیں تھی بس بات اتنی سی تھی کہ ان کے کرنے کے اور جو کام تھے ان کے باعث ان کے پاس بہت زیادہ فراغت نہیں تھی۔ اب یہاں بلقیس کے رویے کی تعریف کرنا چاہیے کہ

اگرچہ بچوں کو باپ کے ساتھ اس طرح وقت گزارنے کا موقع نہیں ملا جیسے دوسرے بچوں کو ملتا ہے لیکن باپ اور اولاد کے درمیان دوری یا بیگانگی نہیں تھی۔ جتنا بھی وقت میسر آتا بچے باپ کے ساتھ رہتے۔ بلقیس نے بچوں کا باپ سے ان کی عدم موجودگی میں بھی ربط قائم رکھا۔ چار بچے تو ان کے اپنے تھے اور ایک بچی بلقیس کی خالہ زاد بہن تھی جس نے انہی کے یہاں پرورش پائی۔ بلقیس اور ایدھی نے پانچوں بچوں کو ایک جیسا کھلایا پلایا ان کی پرورش میں اپنے پرائے کا فرق روا نہیں رکھا حتیٰ کہ جب شادیاں کیں تو جیسے اپنی بیٹیوں کو رخصت کیا ویسے ہی اس لڑکی کو بھی رخصت کیا۔

بلقیس کی اور ساری باتوں کو چھوڑیے اس کی یہ بات عام عورتوں میں نہیں ملے گی کہ سماجی بہبود جیسے نازک اور بھاری ذمہ داری والے کام کو اس نے دلچسپ بنادیا۔ نہ صرف اپنے لیے بلکہ ساتھ کام کرنے والی کارکنان کے لیے بھی۔ حالانکہ ایدھی صاحب کا مزاج ایسا نہیں تھا کہ ہنسی مذاق کریں اور وہ بھی خاص طور پر کام کے وقت لیکن ایسے موقعوں پر اکثر بلقیس پرانی والی بلقیس بن جاتی تھی اور اپنے ساتھ کام کرنے والی لڑکیوں کے ساتھ مل کے ہلا گلا کرنے لگتی اور اسی ہلے گلے میں کام نمٹ جاتا، کسی کو احساس بھی نہ ہوتا۔ یوں بھی ہوتا کہ وہ لوگ کبھی کسی زخمی، کسی بیمار یا کسی دور افتادہ سے علاقے سے بھٹک کر آجانے والے بچے کو اس کے گھر پہنچانے یا کسی لاش کو بیرون شہر اس کے لواحقین کے حوالے کرنے جاتے تو ایمبولینس میں ایدھی کے علاوہ بلقیس اور ان کے بچے ہوتے کبھی ان کے ساتھ کام کرنے والے لوگ ہوتے۔ ایسے موقعوں پر بلقیس اپنے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں رکھ لیتی لیکن ایدھی صاحب کی نظر بچا کر۔ ایدھی صاحب کو یہ علم ہو ہی جاتا تھا کہ بلقیس نے سفر کی طوالت کے پیشِ نظر کھانے کا کچھ نہ کچھ انتظام ضرور کیا ہوا ہے۔ جہاں جانا ہوتا وہاں پہنچ کے جو بھی کام ہوتا تھا اسے کر کے واپسی کے سفر میں بوجھل پن ختم کرنے کے لیے اور سفر کو آسان اور ہلکا پھلکا بنانے کے لیے، بلقیس اور کارکن خواتین ایمبولینس کے پچھلے حصے میں جا کے بیٹھ جاتیں۔ کھاتے پیتے باہر کے مناظر دیکھتے سینٹر واپس پہنچتے۔ کسی کو تکان کا احساس بھی نہ ہوتا۔

ایدھی صاحب کی عادت تھی کہ وہ کام کے معاملے میں اس قدر جنونی تھے کہ نہ وقت کی پروا کرتے تھے نہ کھانے پینے کی، خود بھی جنونی کی طرح کام کرتے اور کام کے دوران انہیں کھانے پینے کی قطعی پروا نہیں ہوتی تھی۔ انہیں بھوک پیاس کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ جو ان کے ساتھ کام کرنے والا شخص ہوتا تھا ایدھی صاحب اس کے بارے میں بھی یہ ہی گمان کرتے تھے کہ وہ بھی ان ہی کی طرح کھانے پینے جیسی انسانی علتوں سے ماورا ہے اگر کہیں کام سے گئے ہوئے ہیں۔ وہاں کسی نے چائے کی پیشکش کی تو ایدھی ساتھ جانے والوں سے پوچھے بغیر ہی شکریے کے ساتھ انکار کردیتے۔ ان کے ساتھی بیچارے دل مسوس کے رہ جاتے۔ خود ہی سوچیے کھانے پیے بغیر کیسے اتنے لمبے وقت تک کے لیے کام کیا جاسکتا ہے۔ کیا جسم تھک نہیں جاتا؟ لہٰذا ان کے ساتھ جو بھی جاتا وہ واپس آکے بلقیس سے شکایت ضرور کرتا کہ ایدھی صاحب نے تو ہمیں بھوکا مار دیا۔ کھانا اور چائے تو دور کی بات پانی تک کہیں پینے کو نہیں ملا۔ بلقیس ان کی فریاد سن کے تسلیاں دلاسے دے کے انہیں خاموش کرواتی۔ اکثر یہ ہوتا کہ جب ایدھی صاحب باہر کسی کام سے جانے لگتے اور کسی ساتھی کارکن کو ساتھ چلنے کا کہتے تو وہ بہانہ بنا دیتی کہ اسے تو بلقیس نے اور کام کرنے کو کہے ہوئے ہیں پھر وہ دوسری ساتھی کو بلاتے اس کی نحیف سی آواز آتی، میری تو طبیعت ٹھیک نہیں، میں کیسے چلوں؟ تیسری کو بلوایا جاتا معلوم ہوتا وہ نہیں ہے اور کہیں ڈھونڈے سے نہیں مل رہی، ہوتا یہ تھا کہ جب کارکنوں کو معلوم ہوتا کہ ایدھی صاحب کو باہر کسی کام سے جانا ہے اور وہ کسی نہ کسی کو ساتھ لے کے جائیں گے تو وہ اِدھر اُدھر ہوجاتیں، مشکل سے کوئی ملتی ساتھ چلنے کے لیے جبکہ بلقیس کے معاملے میں نقشہ الٹ تھا۔ وہ اگر باہر جانے کے لیے کسی ایک کو ساتھ چلنے کا کہتی تو دس چلنے کے لیے تیار ہوجاتے۔ شروع میں تو ایدھی نے اس بات پر توجہ نہیں دی کہ ان کے ساتھ مشکل سے کوئی چلنے پر راضی ہوتا ہے اور بلقیس کے ساتھ جانے کو منع کوئی نہیں کرتا لیکن جب کئی دفعہ ایسا ہی ہوا تو بالآخر ایدھی نے بلقیس سے ایک دن یہ بات پوچھ ہی لی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

بلقیس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میرے ساتھ چلنے والا ایک جیتا جاگتا انسان ہے جسے بھوک بھی لگتی ہے اور چائے کی طلب بھی ہوتی ہے اور میں اس ضرورت کا خیال رکھتی ہوں کیونکہ میں خود بھی زندہ انسان ہوں، بس اتنی سی بات ہے۔“

بلقیس اور ایدھی صاحب اکثر اپنے بچوں کے ساتھ بھی یہ ہی کرتے کہ جب وہ بیرونِ شہر کسی کام سے جاتے اور بچے ساتھ ہوتے تو جس کام سے جارہے ہوتے تھے اس کو کرنے کے بعد جب واپسی کا سفر شروع کرتے تو راستے میں کھانے کا

وقت ہوتا تو کسی بھی ایسی جگہ گاڑی روک دی جاتی جہاں آبادی ہوتی۔ وہاں کے کسی بھی رہائشی کو پیسے دے کر گھر کی پلی مرغیاں یا کھیت مالک سے سبزیاں لے لی جاتیں اور کسی گھر میں یہ سامان دے کر کھانا پکوالیا جاتا۔ اکثر لوگ تو پیسے لیتے ہی نہیں تھے اور مہمان نوازی میں فخر محسوس کرتے تھے۔ بلقیس ایسے مواقع کی یاد تازہ کرتے ہوئے کہتیں۔ ''ہم کسی کام سے شہر سے باہر کسی دور دراز کے علاقے میں جاتے تو بچوں کی چھٹی ہوتی تو انہیں بھی ساتھ لے جاتے ایک تو اس لیے کہ بچوں کو ماں باپ کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ملے ماں باپ اپنے کاموں میں مصروف رہتے تھے اور بچے اپنی پڑھائی اور دیگر مصروفیات، میں دوسرے اس لیے بھی کہ اس طرح بچوں کی تربیت ہوتی اور وہ بھی انسانوں کی خدمت کرنا سیکھ لیتے ہیں۔ جب ہم کسی کو کھانے پکا کے دینے کا کہتے تو جتنی دیر میں کھانا تیار ہوتا تب تک بچے اور ہم گاؤں کی سیر کرتے اور وہاں کی کھلی اور صاف خالص ہوا کے مزے لیتے۔ کھیتوں میں نکل جاتے ٹیوب ویل چل رہا ہوتا تو بچے وہاں جا کے نہانے لگتے۔ درختوں کی چھاؤں میں ہمارے لیے چارپائیاں بچھادی جاتیں۔ کھانا کھا کے ہم وہیں آرام کر لیتے پھر کچھ دیر بعد واپسی کی راہ لیتے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اولاد کی تربیت صحتمندانہ انداز میں کی۔''

بلقیس کی زندگی میں بھی اتار چڑھاؤ اور خوشیوں کے ساتھ غم بھی آئے کہ یہ انسانی زندگی کا لازمہ ہے لیکن اس کی مضبوط شخصیت نے ہر طوفان کا مقابلہ کیا، ہر دکھ اور صدمہ جھیلا لیکن کسی سے کبھی شکوہ نہ کیا۔ مشرقی روایتی عورت کی طرح اپنے ہر دکھ کو اپنے اندر اتارا، جتنا اس کے اندر غموں کے دکھوں کے الاؤ دہکتے رہے وہ باہر سے اتنی ہی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ اس آگ میں جل کے سونا بنتی گئی۔ اس کی ذاتی زندگی کے صدمات اس کے خدمت خلق کے جذبے پہ کبھی حاوی نہ ہوئے۔ ایک صدمہ تو ایسا اس کی زندگی میں آیا کہ جو کسی بھی عورت خاص کر کے مشرقی عورت کے لیے ناقابل برداشت ہے، وہ ہے سوکن کا دکھ۔

بہت پہلے کی بات ہے جب ان کے بچے بھی چھوٹے تھے ایک عورت ان کے پاس پناہ کے لیے آئی۔ یہ بات آج تک واضح نہ ہو سکی کہ وہ واقعی کوئی مظلوم عورت تھی یا کسی سازش کی آلۂ کار بن کے ایدھی تک پہنچی تھی۔ اس نے اپنی بیچارگی اور مظلومیت کے ایسے افسانے سنائے کہ سادہ دل ایدھی صاحب بے حد متاثر ہو گئے اور بالآخر اس خاتون کو سہارا دینے کے لیے اس کے دکھ بانٹنے کے لیے اسے شادی کی پیشکش کر بیٹھے۔ بات یہ نہیں کہ ایدھی صاحب کو اس سے عشق ہو گیا تھا بلکہ بات یوں ہوئی کہ اس خاتون نے اپنی مظلومیت کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا کہ شادی کے سوا اس مسئلے کا کوئی حل ... نظر نہیں آرہا تھا۔ خیر ایدھی صاحب نے دوسری شادی کی تو کوئی غلط کام نہیں کیا۔ ایک پرائی عورت کی مدد کرنے، اسے تحفظ دینے کے لیے شرعی رشتے کی حدود میں لے آنا بری بات نہیں لیکن خرابی تب شروع ہوئی جب نکاح کے کچھ ہی دنوں بعد مذکورہ خاتون نے پر پرزے نکالنا شروع کیے۔ اجمالاً یہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس خاتون نے ہر وہ کام کیا جو ایدھی اور اس کے گھرانے کے لیے باعث آزار اور تکلیف کا سبب بن سکتا تھا۔ وہ گھر کی باتیں بیچ سڑک پہ لے آئی، وہ تو کہیے کہ آج کی طرح بے لگام الیکٹرونک میڈیا اور بدتہذیب سوشل میڈیا موجود نہیں تھا ورنہ تو زندگی بھر کی کمائی ہوئے نیک نامی، عزت اور لوگوں سے ملنے والی محبت سب خاک میں مل جاتی۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ وہ خاتون جو نجانے کس نیت بد سے ایدھی سینٹر اور پھر ان کی زندگی میں داخل ہوئی تھی اپنے عزائم میں ناکام ہو کر کہیں چلی گئی اور اس واقعے پر گرد پڑ گئی۔ اس پورے قصے میں بلقیس کا کردار انتہائی قابل تعریف رہا۔ اس نے اس عرصے میں جب تک یہ سب کچھ ہوتا رہا نہ تو اس خاتون اور ایدھی سے لڑائی جھگڑے کیے، نہ بچوں کو باپ سے متنفر کرنے کی کوئی کوشش کی بلکہ معمول کے مطابق اپنا کام کرتی رہی۔ یہ ہے کہ تھوڑا سا ایک طرف کو سرک گئی کہ بہت زیادہ سامنا نہ ہو۔ مبادا کوئی اختلاف بڑھ کے نزاع تک پہنچ جائے آخر کار یہ مسئلہ بھی ختم ہو گیا۔ بلقیس کی زندگی کا دوسرا صدمہ جو بے حد تکلیف دہ ہے، وہ اس کی بڑی بیٹی کبریٰ کی طلاق ہے۔ کبریٰ شروع سے ہی ایک مختلف مزاج کی لڑکی ہے وہ اپنے والدین جیسی سخت اور آسائشات سے خالی زندگی نہیں چاہتی تھی۔ اسے بہت سمجھایا گیا لیکن اس نے ان نصیحتوں کو دل سے قبول نہیں کیا بہر حال اس کی شادی کر دی گئی بلقیس کی خالہ زاد بہن کے بیٹے سے۔ الطاف میں بظاہر کوئی خامی نہیں تھی لیکن میاں بیوی کے مزاجوں میں اس قدر تفاوت تھا کہ تین بچوں کے بعد کبریٰ گھر آکے بیٹھ گئی، باہم افہام و تفہیم سے اس مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کی گئی لیکن ہر کوشش بے سود رہی اور بالآخر دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ کبریٰ تو اس سانحے کے بعد چپ سی ہو گئی خصوصاً جب الطاف کی دوسری شادی کا علم ہوا تو کبریٰ جس اذیت کے عالم میں تھی

بیان کرنا مشکل ہے۔ قریبی رشتے داری تھی۔ ایک دوسرے کی خیر خبر ملتی رہتی تھی۔ کبریٰ کی تکلیف دیکھ کر بلقیس اور ایدھی کے دل پہ کیا گزری یہ وہ ہی جان سکتے ہیں لیکن خلق خدا کی خدمت اس قدر بہترین کام ہے کہ یہ ہر زخم کی دوا ہے۔ ان لوگوں کا دل بہلانے کے لیے کبریٰ کا بیٹا بلال بھی موجود تھا۔ بلال سے محبت اس لیے بھی زیادہ تھی کہ وہ پہلا بچہ تھا جس نے ایدھی اور بلقیس کو نانا نانی بنایا۔ ان دونوں کی زندگی کا محور و مرکز ننھا بلال تھا۔ نانی کی وہ جان تھا تو ایدھی کی روح تھا۔ دونوں اسے دیکھ دیکھ کے جیتے تھے۔ بلال کو ایدھی اور بلقیس نے گود لے لیا تھا۔ وہ گھر سینٹر ہر جگہ جہاں وہ جاتے ان لوگوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ بلقیس بھی اس کے ساتھ مگن رہتی لیکن ابھی اس کی زندگی کے امتحان ختم نہیں ہوئے تھے۔ کبریٰ کو بے سہارا عورتوں کے حصے کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ اپنے صدمے سے باہر نکلے۔ کبریٰ نے وہاں نظم و نسق تباہ کرنے پر ایک عورت کو متعدد بار تنبیہ کی لیکن وہ باز نہ آئی الٹا کبریٰ کے خلاف بغض دل میں پال لیا اور پھر وہ ہوا جو ایدھی خاندان کے دل کا داغ ہے۔ آج بھی یہ صدمہ ان سب کو تڑپا دیتا ہے۔ مذکورہ عورت جس کا نام دلشاد تھا اسے کبریٰ نے دو تین مرتبہ گندگی پھیلانے پر ڈانٹا۔ اس کا بدلہ اس نے ایسے لیا کہ اس کے کلیجے پہ ہاتھ ڈالا۔ ایک دن ننھا بلال سینٹر آیا ہوا تھا اور حسب معمول اِدھر اُدھر کھیلنے بھاگنے دوڑنے میں مگن تھا۔ دلشاد نے سینٹر کی دو تین عورتوں کو ساتھ ملایا اور بلال کو نہلانے کے بہانے غسل خانے میں لے جاکے کھولتے ہوئے گرم پانی سے نہلا دیا۔ بیچارہ بچہ چیخ چیخ کے ماں اور نانی کو پکارتا رہ گیا لیکن وائے بدنصیبی دونوں میں سے کوئی بھی قریب نہیں تھی اور یوں بلال ان سفاک عورتوں کے ہاتھوں جھلس کر رہ گیا۔ اس کی چیخ پکار سن کر جب مرکز کی دوسری عورتیں آئیں تو بلال کو طبی امداد کے لیے لے جایا گیا۔ دلشاد اور اس کی ساتھی عورتوں نورمال اور سائرہ کا کہنا یہ تھا انہوں نے تو معمولی گرم پانی سے بچے کو نہلایا تھا۔ نجانے وہ کیسے جل گیا۔ بیچارے معصوم بچے نے بہت تکلیف جھیلی اور تین چار دن میں ہی سب کو روتا چھوڑ کر اس دنیا سے چلا گیا۔ بھلا تین سال کی عمر بھی کوئی دنیا سے جانے کی ہوتی ہے؟ اتنے معصوم بچے نے تو آنکھ کھول کر صحیح سے دنیا کو دیکھا بھی نہیں ہوتا ہے۔ ابھی تو ماں کی آغوش کی گرمی بھی کم نہ ہوئی ہوتی۔ نانا نانی کو کتنے ہی لاڈ اور کرنے تھے لیکن وہ اتنی ہی عمر لکھوا کر آیا تھا۔ اس انتہائی شدید صدمے سے گزرنے کے باوجود ایدھی اور گھر والوں نے صبر و ضبط اور تحمل کی اعلیٰ مثال قائم کی انہوں نے ان سب عورتوں کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا ورنہ ایسے سنگین جرم کے مجرمان کو جتنی بھی سخت سے سخت سزا دی جائے کم ہے۔ آج بھی بلقیس ایدھی کے دل میں اس تکلیف دہ یاد کا خنجر گڑا ہوا ہے۔ ایدھی صاحب تو اب اس دنیا میں نہ رہے لیکن امید ہے اگلے جہان میں دونوں نانا نواسہ پھر ایک دوسرے کے ساتھ ہوں گے۔

ایدھی صاحب کے جانے کے بعد ان کے جلائے ہوئے چراغ کی حفاظت بلقیس کر رہی ہیں۔ نہ صرف حفاظت کر رہی ہیں بلکہ اس چراغ کی روشنی مزید فزوں تر کرنے کے لیے بھی کوشاں ہیں۔ ان دونوں میاں بیوی نے پہلی مرتبہ لاوارث بچوں کو اپنانے کی رسم کا اجراء کیا جنہیں لوگ کچرے میں پھینک دیا کرتے تھے۔ بلقیس کا کہنا تھا کہ وہ دنیا کی واحد خاتون ہیں جو لاکھ سے اوپر بچوں کی ماں ہیں۔ کیوں کہ ان کے سینٹرز کے باہر رکھے گئے جھولوں میں پائے جانے والے بچوں کے ماں باپ کی حیثیت سے یہ دونوں اپنا نام دیتے تھے۔ یہ بڑے ظرف کی بات ہے کہ معاشرے کے ٹھکرائے اور پسے ہوئے لوگوں اور بے نام و نشان بچوں کو گلے لگا کر ان میں جینے کی امنگ پیدا کرنا۔

کبریٰ اور فیصل بھی اپنے عظیم والد کی وراثت کے امین بن کر ان کے کام کو آگے بڑھانے میں اپنی اولوالعزم والدہ کا ساتھ دے رہے ہیں۔ بلقیس ایدھی کی زندگی خواتین کے لیے ایک بہترین مثال ہے کہ انہوں نے کس طرح فلاحی کاموں کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ گھر بار، بچے، شوہر، خاندان والے اور پھر بھی انسانیت کی خدمت یہ سب کرنا آسان نہیں تھا ایسی عظیم عورتیں کسی بھی قوم کا سرمایہ ہوتی ہیں جن پہ بجا طور پہ فخر کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ بلقیس ایدھی جیسی عورت پاکستانی عورت کا اصل اور صحیح تعارف ہے۔ بلقیس ایدھی پاکستان کے لیے سرمایہ افتخار ہے۔ دنیا بھر میں ان کی عظیم الشان خدمات کو سراہا گیا ہے اور کئی ایوارڈز بھی حاصل کر چکی ہیں ملکی سطح پر انہیں اور ان کے شوہر کو مشترکہ طور پر ہلال امتیاز سے نوازا گیا ہے۔

وہ زندگی کے ساتویں عشرے میں قدم رکھ چکی ہیں اور آج بھی روز اوّل جیسی ہمت سے کام کر رہی ہیں جب تک وہ زندہ ہیں (اور اللہ ان کو طویل عمر عطا کرے) مایوس اور بے سہارا لوگوں اور لاوارث بچوں کے لیے اُمید کی کرن بن کے جگمگاتی رہیں گی۔

بارانِ عجب

عاقب اشعر

ہماری یہ دنیا ایک پُراسرار دھند میں لپٹی ہوئی ہے۔ ایسے ایسے محیرالعقول واقعات رونما ہوتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جائے اور ان واقعات کی توجیح بھی پیش نہ کی جاسکے۔

اسرار میں چھپے چند محیرِالعقول واقعات

ازل سے نوعِ انسان کا آسمان سے بڑا گہرا اور حسین رشتہ چلا آیا ہے۔ جشن کسی نعمت کا ہو یا پھر رقص کسی آفت کا... ابنِ آدم کی نگاہیں ہمیشہ اس نیلے گگن ہی کی طرف اُٹھتیں۔ اس نیلی چھتری نے آدم کے بیٹے کا ساتھ کبھی نہ چھوڑا اور ایک سائبان کی طرح اپنے سائے تلے پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔

اس آسمان پر کالی گھنگور گھٹائیں جب جب چھائیں مسرت و شادمانی کا پیغام لائیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں نے موسمِ نم کی آمد کا مژدہ سنایا تو دل خوشی سے جھوم اٹھے، پھر آن کی آن ٹپ ٹپ چھلکا یہ جام بوندیں قطار اندر قطار زمین کی طرف والہانہ لپکیں، گویا بچھڑے محبوب سے ملن کا وقت آن

پہنچا اور موتیوں کی یہ لڑیاں آسمان سے زمین تک تن گئیں۔ جل تھل ایک ہوگیا۔ زمین کے چہرے سے تمام گرد وغبار دھل گیا اور پھر جب بھی یہ آسمان زمین والوں پر اپنا پیار چاندی کے بور کی صورت برساتا ہے۔ دھنکی روئی کے جیسی سفید برف جب آسمان سے برستی ہے تو پھر عجب ہی نظارہ ہوتا ہے۔ پیڑ ٹیلے میدان سب برف کی دودھیا چادر اوڑھ لیتے ہیں۔ چرند پرند، حیوان انسان سب اپنے اپنے ٹھکانوں میں دبک جاتے ہیں اور اپنی حیران آنکھوں سے قدرت کی صناعی کا مظاہرہ دیکھتے ہیں مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوا، کبھی کبھار اس آسمان کی جھولی سے بڑی عجیب وغریب اشیاء کی برسات بھی دیکھنے کو ملی ہے۔ ان عجیب الخلقت اشیاء کا آسمان سے نزول انسانی فہم وفراست کو دنگ کرتا رہا ہے۔ سائنسی ترقی اور علم کی اوج نے ان گتھیوں کو سلجھانے میں کچھ نہ کچھ مدد تو ضرور کی ہے مگر مکمل حل ان گنجلک واقعات کا شاید انسانی عقل کے دائرہ کار سے باہر ہے۔

ایسی ہی چند عقل کو خیرہ کردینے والی برساتوں کا ذکر کرتا چلوں۔

فروری 1859ء کی ٹھنڈی ٹھار صبح جان لوئیس نے ناشتے کے بعد اپنے مکان کے عقبی باغ میں آرا مشین نصب کر کے لکڑیاں کاٹنے کا آغاز کیا ہی تھا کہ آسمان کالے بادلوں سے ڈھک گیا۔ جان نے موسم کی پروا کیے بغیر اپنے کام کو جاری رکھا۔ کچھ ہی دیر میں ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی مجبوراً جان کو اپنا سامان سمیٹنا پڑا۔ جب وہ لکڑیوں کو باغ سے ملحقہ چھوٹے سے جھونپڑے میں رکھ کر باہر کھلے میں آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی مچھلیاں بکھری پڑی تھیں، یہی نہیں مزید مچھلیاں برس رہی تھیں۔ مچھلیوں کی یہ برسات اگلے آدھے گھنٹے تک جاری رہی۔ جان کے گھر سے ملحق 200 فٹ رقبہ مچھلیوں سے اٹ گیا۔ یہ مچھلیاں دو سے تین انچ تک لمبی تھیں۔ جان نے اپنے گھر والوں کے ساتھ مل کر کئی مچھلیوں کو پانی کے ٹب میں ڈال کر بچا بھی لیا۔ مچھلیوں کی اس عجیب وغریب برسات کی کوئی توجیہہ مقامی حکومت کے پاس نہ تھی۔

ایسا ہی ایک واقعہ 1989ء کے اوائل میں تب پیش آیا جب کوینز لینڈ، آسٹریلیا کا رہائشی ہیرالڈ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے ساتھ اپنے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا۔ موسم کے تیور اس روز سخت خراب تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان سے برف کے گولے گرنا شروع ہوگئے۔ دونوں باپ بیٹا گھر کی طرف دوڑے ہی تھے کہ یکا یک آسمان سے چھوٹی مچھلیاں برسنے لگیں۔ گھر پہنچ کر جب ہیرالڈ نے اپنی بیوی سے اس عجیب وغریب برسات کا ذکر کیا تو وہ یکسر ماننے سے انکاری ہوگئی لیکن جب ہیرالڈ اسے باہر صحن میں لایا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ مچھلیاں لگاتار آسمان سے برس رہی تھیں۔ اس واقعے کا چرچا مقامی اخباروں میں خوب ہوا اور مختلف توجیہات سے اس گتھی کو سلجھانے کی سعی کی گئی۔ کسی نے کہا کہ یہ قریبی جھیل سے بخارات کے ساتھ ہوا میں شامل ہوگئیں اور تیز ہوا ان مچھلیوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ برسانے کا باعث بنی۔ ایک اور توجیہہ یہ پیش کی گئی کہ سمندری پرندوں کے بہت بڑے غول نے یہ مچھلیاں اس علاقے پر سے گزرتے ہوئے نیچے گرائیں۔ ان توجیہات کے باوجود اس عجیب وغریب واقعے کی اصل حقیقت عیاں نہ ہوسکی۔

1991ء میں لندن کے ایک مضافاتی علاقے میں ایک عورت کو اپنے صحن میں پانچ مچھلیاں ملیں۔ یہ مچھلیاں کنکریٹ پر بکھری پڑی تھیں۔ جب حکومتی اداروں نے ان مچھلیوں پر تحقیق کی تو پتا چلا کہ یہ دریائے ٹیمز کے پانیوں میں پائی جانے والی مچھلیاں ہیں لیکن سوال یہ اٹھا کہ آخر دریائے ٹیمز سے یہ مچھلیاں اتنی دور اس گھر میں کیسے پہنچیں۔

مچھلیوں کی ایسی عجیب وغریب برسات کے بیسوں مزید واقعات ریکارڈ کا حصہ ہیں اور آسمان سے برسنے والی عجائب میں سب سے زیادہ مچھلیوں ہی کا ذکر ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں اور مختلف ادوار میں اس قسم کے واقعات گاہے بگاہے تاریخ کا حصہ بنتے رہے ہیں۔

مینڈکوں کی برسات بھی اس ضمن میں ایک عام فہم واقعے کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاریخ ایسے بے شمار واقعات سے بھری پڑی ہے جب آسمان سے مینڈک برسے۔ قدیم عیسائی عقائد کے مطابق جب کوئی قوم گناہوں میں حد سے بڑھ جاتی ہے تو خدا کی جانب سے اس طرح کے واقعات ان کی تنبیہہ کے لیے رونما ہوتے ہیں لیکن بے شمار لوگ اس بات سے متفق نہیں اور ایسے واقعات کی عقلی و سائنسی توجیہہ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وجہ کوئی بھی رہی ہو اس طرح کے واقعات کا سراغ تاریخی کتب میں آسانی سے مل جاتا ہے۔

بیسویں صدی میں اس طرح کا ایک واقعہ لندن ٹائمز نے رپورٹ کیا، جب لندن کی گلیوں میں اچانک مینڈکوں کی برسات شروع ہوگئی۔ یہ برسات کئی گھنٹے جاری رہی اور لندن کے گلی کوچے درمیانی جسامت کے مینڈکوں سے اٹ گئے۔

لندن ٹائمز کے نامہ نگار لکھتے ہیں کہ یہ مینڈک اتنی تعداد میں برسے کہ گلیوں میں چلنا دوبھر ہو گیا۔ اس انہونی برسات کے بعد کئی دن تک صفائی کا عمل جاری رہا تب کہیں جا کر راستے چلنے کے قابل ہوئے۔

جدید دور میں ایسا ایک عجیب و غریب واقعہ گلوکیسٹر شائر میں 1987ء کو پیش آیا۔ ان دنوں موسمیاتی تبدیلیاں عجیب رخ اختیار کیے ہوئی تھیں۔ آسمان دن رات عجیب و غریب قسم کی ریتیلی چادر سے ڈھکا رہتا تھا۔ عین دوپہر کے وقت سورج گدلا ہو جاتا۔ لوگوں میں خوف و ہراس پایا جاتا تھا۔ 23 اکتوبر کے روز بھی موسم کچھ ایسا ہی تھا۔ آسمان شدید قسم کے ریت کے طوفان کی زد میں تھا کہ اچانک آسمان سے گلابی مینڈکوں کی بارش شروع ہو گئی۔ لوگ اس اچانک آپڑنے والی افتاد سے گھبرا کر کسی پناہ گاہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ کئی گھنٹے لگاتار یہ گلابی رنگ کے مینڈک برستے رہے اور علاقے کی سڑکیں گلابی رنگ کے مینڈکوں سے اٹ گئیں۔ محکمۂ موسمیات والوں نے کئی مینڈک نمونے کے طور پر اپنی تحویل میں لے لیے۔ ماہرین نے جب ان مینڈکوں کی ساخت اور رنگت پر تحقیق کی تو پتا چلا کہ اس طرح کے مینڈک براعظم افریقا کے کئی ریتیلے دلدلی علاقوں میں پائے جاتے ہیں اور ان کی گلابی رنگت کی وجہ یہ ہے کہ یہ اس گلابی رنگ کی ریت میں ہم رنگ ہو کر شکاری پرندوں اور جانوروں سے محفوظ رہتے ہیں۔ براعظم افریقا کے دور دراز دلدلی علاقوں میں پائے جانے والے یہ عجیب و غریب مینڈک میلوں کا یہ فاصلہ طے کر کے ایک یورپی ملک میں کیسے پہنچے اس سوال کا جواب بہرحال سائنسی ماہرین کے پاس بھی نہ تھا۔

مچھلیوں اور مینڈکوں کے علاوہ چند انتہائی عجیب و غریب اشیاء بھی آسمان سے گریں جن کی حقیقت سے کوئی آگاہ نہ ہو سکا۔ یعنی کہ آج بھی وہ ایک معما ہے۔

ایک ایسے ہی لاینحل واقعے کا تذکرہ اخبارات کی زینت بنا۔ اخبار لکھتا ہے۔

مارچ 1992ء کی ایک خوب صورت دوپہر کو بوڑھا ڈاؤ اپنی بیوی پاؤلا کے ساتھ گھر کے صحن میں بیٹھا خوب صورت موسم سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک ایک زوردار دھماکے نے دونوں میاں بیوی کو چونکا دیا۔ انہوں نے جب آواز کے محرک کو جاننے کے لیے صحن میں نظر دوڑائی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ایک حیرت انگیز منظر ان کا منتظر تھا۔ آٹے کا کوئی 9,10 کلو وزنی پیڑا صحن کے بیچوں بیچ پڑا تھا۔ یہ پیڑا

بالکل ویسا تھا جو ڈبل روٹی بیک کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے ہمسائیوں کو اطلاع دی سب یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کچھ دیر پڑا رہنے کے بعد یہ پیڑا پگھل کر ایک عجیب وغریب ملیدے کی شکل اختیار کر گیا۔

ایسا ہی ایک اور محیرالعقول واقعہ جون 1979ء کینیڈا میں پیش آیا۔ می چٹ خاندان اونٹاریو کا ایک معزز خاندان سمجھا جاتا تھا۔ می چٹ فیملی کی سب سے چھوٹی بچی ڈونا کو قدرت سے بہت لگاؤ تھا۔ اس نے اپنے عالی شان گھر کے صحن میں طرح طرح کے پھول پودے اگا رکھے تھے اور ان کی دیکھ بھال میں مشغول رہتی تھی۔ جون کی اس تپتی دوپہر بھی وہ صحن میں موجود پھولوں کی کیاریوں کی صفائی میں مشغول تھی جب ہلکی سی آواز کے ساتھ کوئی چیز صحن میں اس کی پشت کی طرف آ کر گری۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ صحن میں پڑے لکڑی کے ٹیبل پر سبز رنگ کی کوئی عجیب وغریب شے پڑی تھی اور اس سے آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ ڈونا کے حواس جب بحال ہوئے تو اس نے بھاگ کر پانی کے پائپ سے وہ آگ بجھائی۔ آگ بجھ جانے کے بعد جب اس نے اسے شے کا معائنہ کیا تو حیرت مزید بڑھ گئی۔ اس کی ساخت کسی ٹھوس مادے کی طرح کی تھی اور آگ بجھ جانے کے بعد بھی کافی گرم محسوس ہو رہی تھی۔ اس واقعے کی اطلاع فوری طور پر مقامی حکومت کو دی گئی، مقامی حکومت نے اس عجیب چیز کو اپنی تحویل میں لے لیا اور مزید تحقیق کے لیے مرکزی حکومت کے محکمۂ ماحولیات کو بھیج دیا۔ کئی روز کی تحقیق کے بعد ادارے نے اپنی رپورٹ جاری کر دی جس میں لکھا تھا کہ اس شے پر مختلف تجربات کیے گئے تو یہ پتا چلا کہ یہ پلاسٹک کی کوئی قسم ہے۔ اس قسم کی پلاسٹک کو جب پگھلا کر ٹھنڈا کیا جائے تو وہ مزید ٹھوس ہو جاتی ہے اور یہ چیز پگھلانے اور ٹھنڈا کرنے کے عمل سے کئی بار گزری ہے۔ اس کے بارے میں ایک یہ بھی تھیوری پیش کی گئی کہ آسمانی بجلی کسی ہوائی جہاز پر پڑی ہو اور اس میں موجود بچوں کے کسی پلاسٹک کے کھلونے کو ساتھ لے گئی ہو اور وہ بجلی کی حدت اور ہوا کی نمی کی وجہ سے کئی بار پگھل کر اس شکل میں می چٹ خاندان کے گھر جا گرا۔ اس رپورٹ اور پیش کردہ تھیوری میں سقم واضح تھے۔ می چٹ خاندان نے اس رپورٹ کو ماننے سے انکار دیا اور اپنے طور پر اس کی آزادانہ تحقیق کا فیصلہ کیا۔ آزادانہ ہوئی تحقیق پہلی والی رپورٹ سے کافی مختلف تھی اور اس میں لکھا تھا کہ اس چیز کی اصل ساخت کا پتا نہیں چل سکا۔ بہر حال یہ پلاسٹک بالکل بھی نہیں۔ اس واقعے اور گرنے والی عجیب وغریب شے کی اصل حقیقت آج تک صیغہ راز میں ہے۔

1992ء انگلستان میں ایک خاندان کے گھر ایک لمبوتری سی شے آسمان سے گری، یہ کیل سے مشابہہ تھی۔ اس کو حکومتی اداروں کے حوالے کر دیا گیا۔ کچھ دن بعد یہ انکشاف ہوا کہ یہ کیل ہوائی جہاز کے پہیوں میں لگی ہوئی ہے اور جہاز کے اڑان بھرنے سے پہلے اس کیل کو اتار لیا جاتا ہے۔ کسی وجہ سے یہ کیل جہاز کے ٹائروں سے منسلک رہی اور لینڈنگ کے وقت جب پہیے کھولے گئے تو یہ نیچے موجود مکان پر آ گری۔

ایک اور عجیب واقعہ کا تذکرہ کروں کہ 1982ء میں نارتھ رکشا میں آسمان سے یکا یک سیکڑوں سیپیاں برسنا شروع ہو گئیں ان سیپیوں کا جب معائنہ کیا گیا تو ان کے اندر موجود جانور زندہ تھے۔ اس عجیب وغریب برسات کی وجوہات بھی سامنے نہ آسکیں۔

اسی طرح 23 ستمبر 1984ء کو ویلز کے باسی تب حیران و پریشان رہ گئے جب آسمان سے شیشے کے چھوٹے چھوٹے شفاف دانوں کی بارش شروع ہو گئی۔ شیشے کے یہ دانے جسامت میں مٹر کے دانوں جتنے تھے۔ ابتدائی طور پر یہ کہا گیا کہ پاس کے پہاڑوں سے پھوٹتا لاوا اس عجیب و غریب واقعے کا موجب بنا ہے مگر جب ان دانوں پر لیبارٹری میں ٹیسٹ کیے گئے تو یہ عقدہ کھلا کہ یہ دانے قدرتی نہیں بلکہ انسانی ہاتھوں سے تیار کردہ ہیں۔ اب یہ کیونکر ممکن ہو کہ انسانی ہاتھوں کے تیار کردہ شیشے کے یہ دانے یوں بارش کی صورت برس پڑے۔ یہ بات بھی صیغہ راز میں ہی رہی۔

سب سے عجیب واقعہ 1974ء میں ہملٹن نیوزی لینڈ میں پیش آیا۔ ہملٹن کے ایک رہائشی علاقے میں اچانک آسمان سے سوڈے کی خالی بوتلیں اور کین برسنے لگیں۔ خالی بوتلوں کی یہ بارش کئی گھنٹے ہوتی رہی اور لوگوں کی چھتیں اور صحن خالی بوتلوں اور کینوں سے بھر گئے۔ حکومت اس واقعے کی اصل وجہ بتانے سے قاصر رہی تاہم مقامی پادری نے یہ بیان دیا کہ لوگوں کی نافرمانیوں سے نالاں ہو کر خدا نے ان پر یہ کچرا برسایا ہے۔ وجہ کوئی بھی رہی ہو یہ عجیب واقعہ بھی لاینحل ہی رہا۔

نارتھ ایمپٹن میں بھی ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی کوئی عقلی توجیہہ پیش نہیں کی جاسکتی۔ 1979ء کے اوائل میں ایک شخص اپنے گھر میں قائم لیبارٹری میں کام کر رہا تھا کہ

اچانک اس کی نظر شیشے کے جار پر پڑی تو وہ دنگ رہ گیا۔ آسمان سے کسی عجیب وغریب چیز کی برسات جاری تھی۔ جب بھاگتا ہوا وہ شخص اپنے صحن میں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ آسمان سے مختلف انواع کے بیج گر رہے تھے۔ یہ برسات مختصر وقت کے لیے نہیں تھی بلکہ دو دن تک وقفے وقفے سے آسمان بیج برساتا رہا۔ برسائے گئے ان بیجوں میں سرسوں، چنے اور لوبیے کے بیج شامل ہیں۔

60ء کی دہائی میں یورپ عجیب وغریب واقعات کا محور ومرکز بنا رہا۔ اس دور کو تاریک دنوں کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ انگلینڈ اور یورپ کے دوسرے شہروں میں سورج دوپہر کے وقت ہی تاریک ہو جاتا اور سیاہ کالی رات کا گمان ہوتا۔ عجیب وغریب ہوائیں چلتیں اور طوفان آتے۔ لوگوں نے اس کو دنیا کا اختتام سمجھ لیا اور شدید خوف وہراس پھیل گیا۔ چند مقامی پادریوں نے بھی کہہ دیا کہ دنیا بس ختم ہونے والی ہے۔ لوگ اپنے گناہوں سے تائب ہو جائیں۔ یہ ہراس یونہی جاری رہتا اگر بات کچھ واضح نہ ہوتی۔ ہائی وے پر سفر کرنے والی گاڑیوں کے مالکان نے بتایا کہ ان کی گاڑیوں کے شیشے عجیب وغریب ریت سے اَٹے ہوئے تھے۔ چند لوگوں کے گھروں میں بھی ریت پائی گئی۔ محکمہ موسمیات نے جب اس پہلو سے تحقیق کی تو یہ ثابت ہوا کہ چند نامعلوم وجوہات کی بنا پر آسمان سے ریت کی بھاری مقدار برس رہی ہے جو بادلوں کے ساتھ مل کر سورج کو ڈھانپ لیتی ہے۔ جس سے سورج دن کے وقت ہی تاریک ہو جاتا ہے۔ یہ ریت کہاں سے آتی ہے جب اس پر تحقیق کی گئی تو مختلف آراء پیش ہوئیں۔ کچھ سائنسدانوں نے کہا کہ بڑے بڑے ریگستانوں سے یہ ریت تیز ہواؤں اور بگولوں کی وجہ سے اوپر والی فضا میں پہنچتی ہے جہاں سے یہ ہوا کی مختلف لہروں میں سفر کرتی دنیا کے مختلف حصوں میں پہنچ جاتی ہے۔

بہت سے لوگوں نے اس تحقیق پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اگر ایسا ہی ہے تو یہ ریت صرف یورپ تک ہی کیوں محدود ہے۔ باقی دنیا کے حصے اس کی دست برد سے کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ کچھ ماہرین نے تو یہ تک کہہ دیا کہ جن دنوں یہ واقعات پیش آئے ہوا کا رخ یورپ کی طرف تھا ہی نہیں، تب پھر یہ ریت کہاں سے آئی؟ یورپ کے اس تاریک دور کا معما بھی حل نہ ہو سکا۔

آسمان سے برستے خون کی برسات افسانوی کہانیوں اور فلموں کی بات لگتی ہے لیکن چند مثالیں ایسی موجود ہیں جب آسمان سے واقعی خون کی بارش ہوئی۔

کولمبیا کے ایک چھوٹے سے قصبے چوکو کے باسیوں کے لیے 31 جولائی 2008ء کا دن انتہائی خوفناک واقعے کی یاد بن کے رہ گیا۔ اس چھوٹے سے قصبے کے لوگ اپنے معمول کے کاموں میں مصروف تھے کہ اچانک آسمان سے بارش شروع ہو گئی۔ قصبے کے کسان اس بارش کی خوشی منانے کی تیاریاں ہی کر رہے تھے کہ یہ عقدہ کھلا کہ آسمان قہر میں ہے اور خون برسا رہا ہے۔ لوگوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا مگر حقیقت میں آسمان سے سرخی مائل مائع متواتر برس رہا تھا۔

کچھ دیر بعد یہ خونی برسات رک گئی تو ماہرین نے اس خونی سیال کے نمونے اکٹھے کرنے شروع کر دیئے تاکہ اصل حقیقت کا پتا چلایا جاسکے۔ چند دن بعد آنے والی رپورٹ انتہائی خوفناک تھی۔ ماہرین نے اس بات کی تصدیق کی کہ برسنے والا مائع واقعی خون تھا۔ مقامی لوگ پہلے ہی خوفزدہ تھے کہ اوپر سے قصبے کے مقامی پادری ہملٹن کورڈوبا نے اعلان کر دیا کہ یہ مقامی افراد کے گناہوں کی نشانی ہے اور خدا قصبے کے لوگوں سے ناراض ہے اور اگر لوگوں نے گناہ چھوڑ کر اپنی زندگی سنوارنے کی سعی نہ کی تو اگلا عذاب اس سے بھیانک ہوگا۔

خونی برسات کے ضمن میں یہ کوئی پہلا واقعہ نہ تھا۔ اس سے پہلے 1890ء میں کیلابر یا اٹلی میں بھی آسمان سے خون برسنے کی خبریں رپورٹ ہوئیں۔ اس خون کو جب ٹیسٹ کیا گیا تو پتا چلا کہ یہ پرندوں کا خون ہے اور رائے پیش کی گئی کہ طوفانی ہواؤں نے پرندوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور یہ خون ان پرندوں کا ہے مگر حقیقت یہ تھی کہ اس وقت اس قسم کی کسی ہوا کا ذکر ہوا اور نہ ہی پرندوں کی باقیات زمین پر گریں۔ صرف خون برسا۔ اس طرح یہ واقعہ بھی تاریخ کے صفحوں میں معمابن کر رہ گیا۔

جے ہڈسن فارم کیلی فورنیا میں 1869ء ایسی ہی ایک عجیب وغریب برسات ہوئی جب تین منٹ تک آسمان سے گوشت اور خون کی برسات ہوتی رہی۔ اس خوفناک بارش نے کئی ایکڑ تک کے رقبے کو متاثر کیا۔ کوئی سائنسی وعقلی وجہ اس برسات کی بھی پیش نہیں کی جاسکی۔

امریکن جنرل آف سائنس نے ایسی ہی ایک اور برسات کا ذکر کیا ہے۔ یہ پُراسرار بارش لبنان کے قریب تمبا کو کے ایک کھیت پر ہوئی۔ اس بارش میں آسمان سے چربی، گوشت کے ریشے اور خون شامل تھا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں سے جب اس بابت پوچھا گیا تو ان کا کہنا تھا کہ ایک خوفناک آواز نے ان کی توجہ کھینچی اور اس کے بعد موٹے موٹے قطروں کی شکل میں خون برسنے لگا۔ مزدوروں نے مزید کہا کہ یہ بارش ایک سرخ رنگ کے بادل سے ہوئی جو کھیت کے عین اوپر منڈلا رہا تھا۔ شاید کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں نے اس قصے میں کچھ اضافہ کر دیا ہو مگر یہ برسات واقعی ریکارڈ کا حصہ ہے۔

کیرالہ بھارت میں بھی اس قسم کا ایک واقعہ 2001ء میں پیش آیا۔ آسمان پر چھائے بادلوں سے جو پانی برسا اس کی رنگت سرخ تھی۔ اہل علاقہ حیران و پریشان رہ گئے۔ ماہرین نے ابتدائی طور پر کسی شہابیے کو اس عجیب برسات کا ذمہ دار ٹھہرایا مگر جب پانی کے نمونوں کو لیبارٹری میں پرکھا گیا تو ثابت ہوا کہ خوردبینی سرخ رنگ کے الجی اس رنگدار بارش کا باعث بنے۔

جی ہاں! چند انتہائی عجیب واقعات میں انسانی جسم کا آسمان سے گرنا بھی شامل ہے۔

میری فورڈ کیلی فورنیا کی رہائشی ایک خاتون ہیں۔ 25 ستمبر 1973ء دوپہر کو میری نے اپنے آٹھ ماہ کے بیٹے کو لے کر چند ضروری اشیاء کی خریداری کا قصد کیا۔ خریداری کر کے میری جب پارکنگ میں کھڑی اپنی کار میں بیٹھی تو اچانک ایک خوفناک آواز سے کوئی بھاری چیز گاڑی کی ونڈ شیلڈ پر آپڑی۔ اس اچانک پڑی افتاد سے میری کے حواس مختل ہو گئے۔ اپنے نومولود کو لے کر جب وہ فوراً گاڑی سے اتری تو منظر دیکھ کر اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ یہ ایک شخص کی لاش تھی بلندی سے گرنے کی وجہ سے لاش کی حالت انتہائی بری تھی۔ خوش قسمتی سے میری اور اس کا آٹھ ماہ کا بچہ اس حادثے میں مکمل طور پر محفوظ رہے۔ اس حادثے کی اطلاع فوری مقامی پولیس کو کی گئی اور انہوں نے لاش کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ اسی روز یہ خبر بھی آئی کہ کیلی فورنیا میں ایک جہاز کا کریش ہوا ہے۔ یہ پیسفک ساؤتھ ویسٹ ایئر لائنز کا طیارہ 182 تھا جو بدقسمتی سے ایک چھوٹے پرائیویٹ جہاز سے ٹکرا کر حادثے کا شکار ہو گیا۔ یہ ایک ہولناک حادثہ تھا جس میں 144 لوگ مارے گئے۔ تحقیقات جب آگے بڑھی تو یہ واضح ہوا کہ میری کی گاڑی پر گرنے والی لاش بھی اسی بدقسمت طیارے کے ایک مسافر کی تھی جو کئی سو میل دور آکر گری تھی۔ بہرحال یہ خوفناک واقعہ بھی اپنی طرز کا ایک انوکھا واقعہ سمجھا جاتا ہے۔

ایسا ہی ایک پُراسرار واقعہ لندن کے علاقے مورٹ لیک میں پیش آیا۔ ستمبر 2012ء کی ایک صبح جب اہل علاقہ بیدار ہوئے تو یہ خبر ان کی منتظر تھی کہ علاقے میں سڑک کے

کنارے ایک شخص کی لاش پائی گئی ہے۔ اسے قتل کی واردات سمجھ کر پولیس نے اپنی تفتیش کا آغاز کردیا۔ اس لاش کی وجہ سے علاقے میں کافی خوف و ہراس پایا جاتا تھا۔ ماؤں نے اپنے چھوٹے بچوں کو گھر سے نکلنے سے منع کردیا کہ مبادا کوئی جنونی قاتل گلیوں میں گھوم رہا ہو مگر صورت حال اس وقت مزید گمبھیر رخ اختیار کرگئی جب اس نامعلوم شخص کی پوسٹ مارٹم رپورٹ آئی۔ پوسٹ مارٹم میں واضح لکھا تھا کہ یہ قتل کی واردات نہیں ہے بلکہ موت بلندی سے گرنے کی وجہ سے ہوئی حالانکہ اس جگہ کے آس پاس کوئی بلند عمارت موجود نہیں تھی۔ اس شخص کے پاس سے کوئی شناختی کاغذ نہ ملا چند کرنسی نوٹ پائے گئے تھے جو بعد میں انگولا کے ثابت ہوئے۔ اس بنا پر یہ تھیوری پیش کی گئی کہ یہ شخص غیر قانونی طور پر جہاز کے پہیوں کے ساتھ گھس کر سفر کررہا تھا اور جب جہاز نے لینڈنگ کے لیے اپنے پہیے کھولے تو یہ شخص نیچے آگرا اور دردناک موت کا شکار ہوا۔

آسمان سے برستے نوٹوں کی برسات شاید ہر ابن آدم کا خواب رہا ہے۔ بیشتر لوگ تو اس خواب کی تعبیر بھی نہ پاسکے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ خواب کبھی سچ نہیں ہوا۔

تاریخ میں چند ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جب واقعتاً آسمان سے کرنسی نوٹوں یا سکوں کی برسات ہوئی۔

فروری 2015ء کویت کی خوب صورت سڑکوں پر ٹریفک رواں دواں تھی کہ ایک سگنل پر گاڑیوں کو رکنا پڑا۔ لوگ سگنل کھلنے کا انتظار کررہے تھے کہ اچانک آسمان سے نوٹوں کی برسات شروع ہوگئی۔ آن کی آن لوگوں نے اپنی گاڑیاں چھوڑ پیسے اکٹھے کرنے دوڑ پڑے۔ لوگ پاگلوں کی طرح نوٹ اکٹھے کررہے تھے۔ یہ نوٹ 500 درہم کے کویتی درہم تھے۔ حکومت ان نوٹوں کے بارے میں کچھ بتانے میں ناکام رہی۔ ماہرین کے تجزیے کے مطابق دو تین ملین درہم کے نوٹ اس دن آسمان سے برسے، ہوائیں ان نوٹوں کو اڑائے پھریں، ایک ملازم کی بیوی جو اس وقت گاڑی میں موجود تھی نے بتایا کہ میرے سامنے اچانک ہزاروں نوٹوں کی برسات شروع ہو گئی۔ لوگ دیوانہ وار نوٹ اکٹھے کرنے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔“

1957ء میں بھی اسی طرح کا ایک واقعہ پیش آیا جب فرانس میں 1000 فرینک کے نوٹ آسمان سے گرنا شروع ہوگئے۔ 3 دسمبر 1968ء رمیس گیٹ انگلینڈ میں ایک اسٹور کے باہر ایک پینس کے ہزاروں سکے گرنے لگے۔ اسٹور کیشیئر نے بتایا کہ یہ سکے چھوٹے چھوٹے برسٹ میں لگاتار پندرہ منٹ تک گرتے رہے۔ یہ سکے گرنے کے باعث مڑتڑ گئے تھے ایسا صرف بہت زیادہ بلندی سے گرنے کی وجہ سے ہوسکتا ہے۔ قریب سے گزرنے والے افراد سے جب استفسار کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ انہوں نے سکے آسمان سے گرتے تو نہیں دیکھے مگر زمین پر گرنے کی آواز ضرور سنی۔ اس اسٹور کے ارد گرد کوئی اونچی بلڈنگ بھی موجود نہیں پائی گئی۔

28 مئی 1981ء انگلینڈ کے علاقے ریڈیش کی ایک عورت نے دعویٰ کیا کہ جب وہ مقامی چرچ کے صحن سے گزر رہی تھی تو 50 پینس کا ایک سکہ آسمان سے اس کے راستے میں گرا۔ اس بات کو محض افسانہ ہی سمجھا جارہا تھا مگر اسی شام بہت سے بچوں نے انہیں 50 پینس کے سکے سے مقامی کینڈی شاپ سے خریداری کی کوشش کی تو دکان کے مالک نے ان سے پوچھ گچھ کی۔ سب بچوں کا کہنا تھا کہ انہیں یہ سکے چرچ سے ملے ہیں جہاں یہ ان کے سامنے آسمان سے گرے۔ دکان کے مالک نے جب چرچ کے پادری سے پوچھا کہ خیراتی گلے سے رقم کم تو نہیں تو پادری کا جواب تھا کہ وہاں موجود خیراتی رقم پوری ہے اور اس سے کچھ نہیں چرایا گیا۔

آسمان سے گرنے والی عجیب وغریب اشیاء کا ذکر برفانی گولوں کے بغیر بالکل ادھورا ہے۔ تاریخ بھری پڑی ہے ان واقعات سے جب آسمان سے برف کے بڑے بڑے گولے گرے۔ ان گولوں کا رنگ سبز یا نیلا بیان کیا گیا ہے۔ یہ گولے سائز میں گولف کی ایک گیند سے لے کر فٹ بال تک کے حجم میں پائے گئے ہیں۔ خوش قسمتی سے ان برفانی گولوں کے گرنے سے کسی جانی نقصان کی اطلاع نہیں۔ ایک واقعے میں اس طرح کا ایک گولا گرنے سے ایک بھیڑ ضرور ہلاک ہوئی۔

8 جولائی 1984ء کا وہ دن بھی معمول کے مطابق جارہا تھا کہ فرانس میں موجود ایک گھر کی چھت پر کوئی بہت وزنی چیز آگری۔ یہ برف کا ایک بہت بڑا ابلاک تھا۔ یہ ٹکراؤ اتنا شدید تھا کہ چھت میں ایک بہت بڑا سوراخ ہوگیا۔ خوش قسمتی سے گھر کے مکین کسی قسم کے جانی نقصان سے محفوظ رہے۔

آسمان سے نازل ہونے والی اشیاء کا جب تاریخ کے آئینے میں جائزہ لیا جائے تو ایسا واقعہ سب سے پہلے بنی اسرائیل کے دور کا ملتا ہے۔ مذہبی صحیفوں میں اس واقعے کا ذکر بارہا ملتا ہے۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنے چند خصوصی انعام کیے تھے ان میں من وسلویٰ کا ذکر اہمیت کا حامل

ہے۔ من دھنیے کے بیج جیسی ایک چیز تھی جو آسمان سے گرتی تھی اور زمین پر جم جاتی تھی بنی اسرائیل اسے جمع کر لیتے تھے اور استعمال میں لاتے تھے۔ بعض روایات میں ذکر ہے کہ من اوس کے قطروں کی صورت نازل ہوتی تھی۔ سلویٰ ایک خاص قسم کا بٹیر تھا۔ یہ خصوصی انعام اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا۔ آسمان سے نازل ہونے والے اس رزق سے پوری ایک قوم کی ضروریات پوری ہوتی تھیں۔

اس کے بعد اس قسم کے واقعات کا ذکر چوتھی صدی عیسوی کے ایک دانشور ایتھینیئس کے ہاں پایا جاتا ہے۔ ایتھنیئس قدیم یونان کے علاقے کری سینز سے تعلق رکھتا تھا اس نے اپنی تالیفات میں بارہا ایک عجیب و غریب برسات کا ذکر کیا ہے جس میں آسمان سے مچھلیوں کی برسات ہوئی تھی۔

اس کے بعد تو تاریخ میں متعدد بار ایسے واقعات کا ذکر ہوا ہے۔ ہونڈورس میں کئی صدیوں سے روایت چلی آرہی ہے کہ لوگ ہر سال برسات کے پہلے دن اپنے اپنے برتن اٹھائے گلیوں میں نکل آتے ہیں، اس اُمید پر کہ آسمان سے مچھلیوں کی برسات ہوگی اور حیرت انگیز طور پر کئی دفعہ اس قسم کی برسات ہوئی بھی ہے، جس کا ذکر تاریخی کتب میں آتا ہے۔

ایکواڈور بھی زمانوں سے اس قسم کے واقعات کا محور و مرکز رہا ہے۔ مچھلیوں کی برسات تو وہاں ایک معمولی نوعیت کا واقعہ سمجھی جاتی تھی۔ اس بارے میں عام رائے یہ پائی جاتی تھی کہ قریبی آتش فشاں اس قسم کی بارشوں کا باعث ہیں۔

اس قسم کے واقعات کی مختلف توجیہات پیش کی گئی ہیں۔ قدیم لوگ ان واقعات کا ذمہ دار آسمانی دیوی دیوتاؤں کو ٹھہراتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ جب آسمانی خدا کسی بستی سے خوش ہو تو انعام کے طور پر اچھی چیزیں آسمان سے برساتا ہے اور جب لوگوں کے برے اعمال زیادہ ہو جائیں تو پھر عذاب کے طور پر آسمان سے بری اور نقصان دہ چیزوں کا نزول ہوتا ہے۔ یہ رائے جزوی طور پر تو ٹھیک ہے کہ قرآن میں متعدد اقوام پر آسمان سے نازل ہونے والے عذاب اور بنی اسرائیل پر خصوصی انعام من و سلویٰ کا ذکر ملتا ہے مگر ہر واقعہ اس ضمن میں ڈالنا بھی درست معلوم نہیں ہوتا۔

موجودہ دور میں ان واقعات کی توجیہہ کے طور پر دو مشہور تھیوریاں موجود ہیں:

1۔ ہوائی بگولے
2۔ ٹیلی پورٹیشن

پہلی تھیوری کے مطابق ان واقعات کی اصل وجہ تیزی سے گھومتی ہواؤں سے بننے والے ہوائی بگولے ہیں۔ یہ بگولے بے پناہ طاقت ور ہوتے ہیں اور اپنے رستے میں آنے والی ہر چیز کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں۔ جب یہ ہوائی بگولے تیزی سے سفر کرتے ہوئے کسی اور علاقے میں داخل ہوتے ہیں تو اپنے اندر سموئی ہوئی چیزوں کو آسمان سے برسانے کا باعث بنتے ہیں۔ یہ تھیوری سائنسی بنیادوں پر پیش کی گئی اور بہت سارے سوالات کا جواب دیتی ہے مگر پھر بھی ان اشیاء کی برسات جن کی ہیئت کا ہی صحیح سے علم نہیں وہ کہاں سے آئیں جیسے کینیڈا میں گرنے والی وہ عجیب و غریب شے، آٹے کا 9 کلو وزنی پیڑا۔ اسی طرح خون کی برسات، پیسوں کی برسات اس تھیوری پر سوال اٹھاتے ہیں۔

پیش کی جانے والی دوسری تھیوری پر کافی لے دے ہوئی کیونکہ سائنسی نقطہ نظر سے یہ تسلیم شدہ نہیں ہے اور سائنس فکشن فلموں کا شاخسانہ لگتی ہے۔ بہر حال اس کے حق میں بھی دلائل موجود ہیں۔ اس تھیوری کے مطابق ایسے واقعات ٹیلی پورٹیشن کا شاخسانہ ہیں۔ ٹیلی پورٹیشن میں کوئی شے زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر منٹوں، سیکنڈوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ اس طرح پہنچ جاتی ہے کہ اس کی ساخت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ دلیل کے طور پر مچھلیوں اور مینڈکوں کی مثال دی جاتی ہے کہ جب وہ کسی دوسری جگہ برستے ہیں تو صحیح سلامت ہوتے ہیں۔ ٹیلی پورٹیشن کے حوالے سے کئی واقعات بھی نقل کیے جاتے ہیں جہاں انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ پلک جھپکتے منتقل ہوئے۔ ظاہر ہے اس تھیوری میں سقم موجود ہیں بہر حال بہت سارے ایسے لوگ بھی ہیں جو اس پر مکمل یقین رکھتے ہیں۔

آسمان سے برسنے والی عجیب و غریب چیزیں ہمیشہ سے انسانی عقل کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے کا باعث بنی ہیں۔ بے شمار لوگ ان واقعات سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہوئے۔ سائنس کو بنیاد بنا کر جہاں اس کی توجیہات پیش کرنے کی کوشش کی گئی وہاں کئی لوگوں نے مذہب کی روشنی میں ان واقعات کی حقیقت بیان کرنے کی سعی کی لیکن سچ یہی ہے کہ اس طرح کے عجیب و غریب واقعات کی کوئی ایک ٹھوس وجہ معلوم نہ کی جا سکی۔ دیکھنا یہ ہے کہ برق رفتار ترقی کرنے والی سائنس کسی نتیجے پر پہنچ پائے گی یا پھر یہ واقعات ہمیشہ ایسے ہی تحیر کے پردوں میں لپٹے رہیں گے۔



مطرب

وحید ریاست بھٹی

مغنی کا فن اس کی آواز سے ہویدا ہوتا ہے، اس کے گلے کا سوز و گداز اسے مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ برصغیر میں بھی ایک سے بڑھ کر ایک گویے گزرے ہیں۔ ہر ایک کی الگ پہچان رہی ہے۔ وہ بھی اپنے دور کا ایک مقبول گلوکار تھا لیکن نئی پود اسے بھلا چکی ہے۔

برصغیر کے ایک بڑے مطرب کا تذکرہ

آج سے ٹھیک ایک سو دو سال پہلے 1913ء میں متحدہ ہندوستان کی پہلی خاموش فیچر فلم راجا ہریش چندر بنا کر دادا صاحب پھالکے (1870-1944) ہندی سینما کے بانی کہلائے، اس تین ہزار سات سو فٹ لمبی فلم کے ہیرو "ڈی ڈی دبکے" تھے، اس فلم کی سب سے دلچسپ بات یہ کہ اس میں ہیروئن کا کردار کسی خاتون اداکارہ نے نہیں بلکہ ہیروئن کا کردار ایک مرد اداکار سولنکی نے ادا کیا تھا، سولنکی بمبئی کے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا پکانے پر معمور تھا، دادا صاحب پھالکے ایک رات بمبئی کے ہوٹل میں کھانا کھانے گئے تو فلم کی ہیروئن سولنکی کے ہاتھ کی لذت نے انہیں اتنا متاثر کیا کہ انہوں نے اس کک کو ہندوستان کی پہلی خاموش فیچر فلم کے لیے بطور فلمی ہیروئن سائن کرلیا، اس فلم میں صرف ایک نسوانی کردار آٹھ سالہ بچی

نے ادا کیا تھا اور اس بچی کا نام تھا مندا کنی، یہ آٹھ سالہ بچی دادا صاحب پھالکے کی سگی بیٹی تھی، یوں دادا صاحب پھالکے کے ساتھ ان کی آٹھ سالہ بیٹی کو بھی ایک اعزاز حاصل ہوگیا کہ وہ آٹھ سالہ بچی مندا کنی ہندی سینما کی پہلی Child Artist کہلائی۔

دادا صاحب پھالکے نے راجا ہریش چندر کے بعد مزید ایک سو کے قریب فلمیں شائقین سینما کے لیے پردۂ اسکرین پر پیش کیں، بمبئی کے ساتھ ساتھ متحدہ ہندوستان کے دیگر بڑے شہروں میں بھی اس نئی صنعت کو خوب پھلنے پھولنے کے مواقع میسر آئے، خاص کر لاہور، مدراس اور کلکتہ اس حوالے سے اپنی الگ ہی پہچان رکھتے ہیں، زیرِ نظر تحریر کا تعلق کلکتہ (بنگال) کی ایک عظیم فلمی شخصیت سے ہے اور اس عظیم فلمی موسیقار، اداکار، شاعر اور گلوکار کا نام ہے، پنکج ملک۔ پنکج ملک کے متعلق جاننے سے پہلے ہم بنگال (کلکتہ) میں فلم سازی کی ابتدا کے حوالے سے یہاں مختصراً عرض کیے دیتے ہیں۔

ہیرالال سین (1866-1917) کو نہ صرف بنگال بلکہ ہندوستان کی فلم انڈسٹری کا باوا آدم تصور کیا جاتا ہے۔ 1890-1900 کے عشرے میں ہی کلکتہ میں ہیرالال سین اور ان کے بھائی موتی لال سین نے اس دور کے مشہور ڈراموں کو فلم کے سانچے میں ڈھالنے کا پروگرام تشکیل دیا جس میں دونوں بھائی بڑی حد تک کامیاب ٹھہرائے جاسکتے ہیں، دونوں بھائیوں نے پہلے 1901ء میں مشہور عرب داستان ”علی بابا“ 1902ء میں ”الہ دین کا چراغ“ اور پھر 1903ء میں انہوں نے ”علی بابا چالیس چور“ جیسے کلاسک ڈراموں کو پردۂ اسکرین پر پیش کر کے نہ صرف کلکتہ بلکہ ہندوستان بھر کے عوام سے بے پناہ داد وصول کی۔ یاد رہے کہ یہ تمام کلاسک ڈرامے غیر متکلم (Silent) تھے، ان کے آغاز سے پہلے ایک پراثر آواز کا مالک شخص ناظرین کو ڈرامے کی کہانی سناتا اور وہیں موجود سازندے حسبِ ضرورت Back Ground Music کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آواز سے پہلے ساز ہی فلموں میں بنیادی کردار ادا کرتے تھے، شاید اسی بنا پر ہی آگے چل کر 1931ء میں پہلی فلم سے ہی موسیقی کو جزو لاینفک کا درجہ دے دیا گیا۔ کلکتہ میں جہاں ہیرا لال سین اور ان کے بھائی موتی لال سین نے عربی، اساطیری عہد اور ہندی دیومالائی کہانیوں کو پردہ اسکرین پر پیش کر کے اپنا نام تاریخ فلم میں رقم کروایا۔ وہیں ایک اور شخص بھی اسی عہد میں اپنے فن کا لوہا منوانے میں انتہائی کامیاب قرار پایا۔ اس معروف فلمی شخصیت کا نام ہے جے ایف مدن یعنی جمشید جی فرام جی مدن جو سیٹھ جمشید (1856-1923) کے نام سے فلمی دنیا میں پہچانے جاتے ہیں، انہوں نے 1902ء میں بمبئی چھوڑ کر کلکتہ میں انگریزی فلموں کی نمائش کے لیے تھیٹر قائم کیا، جس کا نام انہوں نے الفنسٹون بائیسکوپ رکھا جو 1919ء میں مدن تھیٹرز لمیٹڈ میں ضم کردیا گیا، اس سے پہلے سیٹھ جمشید جی نے کلکتہ میں ایک جگہ ٹینٹ لگا کر بائیسکوپ شو دکھانے کا تجربہ کیا جو کہ اتفاق سے بہت کامیاب رہا، اس کامیابی سے حوصلہ پا کر سیٹھ جمشید جی نے فرانس سے اس وقت کی جدید ترین مشینری منگوا کر اپنی قائم کردہ فلم کمپنی الفنسٹون بائیسکوپ کے تحت مختصر دورانیے کی فلمیں بنا کر نمائش پذیر کرنا شروع کردیں، اس دور خاموشی کا سلسلہ 1912ء تک زور و شور سے جاری رہا، ایک اور شخصیت بھی ایسی ہے کہ جس کا تذکرہ کیے بغیر بنگالی فلمی تاریخ تشنہ رہے گی بلکہ یہ کہنا زیادہ قرین قیاس ہوگا کہ اس شخصیت کا ذکر کیے بغیر خاموش فلموں کی تاریخ مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ اس شخصیت کا نام ہے دھریندر ناتھ گنگولی (1893-1978) انہوں نے بنگالی میں پہلی فلم کمپنی Indo British Film Co کی 1918ء میں بنیاد رکھی۔ انہوں نے پہلی بنگالی فیچر فلم بلوا منگل 8 دسمبر 1919ء میں نمائش کے لیے پیش کی جو کہ ایک خاموش فلم تھی اور یہ فلم مدن تھیٹرز کے بینر تلے پیش کی گئی۔ مدن تھیٹرز ہی وہ ادارہ ہے جسے پہلی متکلم بنگالی فلم بنانے کا منفرد اعزاز حاصل ہے اور اس پہلی بنگلہ متکلم فلم کا نام ”جمائی ششٹی“ ہے جو 11 اپریل 1931ء کو کراؤن سینما حال کلکتہ میں نمائش پذیر ہوئی مگر یہ ایک مختصر دورانیے کی فلم تھی باقاعدہ طور پر پہلی مکمل بنگالی فیچر فلم دینا پاؤنا (1931) تھی جو نیو تھیٹرز کے بینر تلے 30 دسمبر 1931ء کو چترا سینما کلکتہ میں ریلیز کی گئی۔

بات ہو رہی تھی پہلی بنگالی متکلم فلم دینا پاؤنا کی جو کہ 1931ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی اس سے پہلے بمبئی کے میجسٹک سینما میں 14 مارچ 1931ء کو مسلم پس منظر میں ہندوستان کی پہلی بولتی ہندی فیچر فلم عالم آرا امپیریل فلم کمپنی نے پارسی الہند ہب اردیشر ایرانی (1969-1886) کی ہدایات میں نمائش کے لیے پیش کر کے تاریخ رقم کردی۔ اس پہلی بولتی ہندی فیچر فلم کی کہکشاں ان ستاروں پر مشتمل تھی۔ ”ماسٹر وٹھل، زبیدہ، پرتھوی راج کپور، ڈبلیو ایم خان، جلو، جگدیش سیٹھی اور سوشیلا وغیرہ۔“ معزز قارئین یہ بات یاد رہے کہ اس پہلی بولتی فلم کے ہیرو کے لیے محبوب صاحب (1964-1907) کا انتخاب کیا گیا تھا مگر بعد میں فلم ساز کے اصرار پر ماسٹر وٹھل کو

بطور ہیرو کاسٹ کرنے کا اصولی فیصلہ کیا گیا، محبوب صاحب اس واقعے سے اتنے دلبرداشتہ ہوئے کہ وہ فلموں میں اداکاری سے ہی تائب ہو گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ فلم کے ہی نہایت اہم ترین شعبہ ہدایت کاری میں سب سے بڑے ہدایت کار ہدایت کار اعظم کے طور پر تسلیم کیے گئے۔ اس فلم (عالم آراء) کی موسیقی دو موسیقاروں فیروز شاہ مستری اور بی ایرانی کے حسین تخیل کا نتیجہ تھی، کل ملا کے اس پہلی فلم میں سات گانے تھے، پہلا گیت جو منشی ظہیر کے کلکِ قلم کا نتیجہ تھا، اس کے بول تھے "دے دے خدا کے نام پہ پیارے، طاقت ہے گر دینے کی" جسے فلم میں پشاور سے تعلق رکھنے والے اداکار و گلوکار وزیر محمد خان نے اپنی آواز دے کر امر کر دیا اور یہ پہلا گیت جو ایک Solo Song تھا، وزیر محمد خان پر ہی فلمایا گیا، ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلموں میں فن گائیکی جیسے حسین گناہ کا مرتکب بھی ایک مسلمان ہی قرار پایا، فلموں میں گانے شامل کرنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ فلم عالم آراء کے ہدایت کار پارسی المذہب اردیشر ایرانی تھے، چونکہ گانا پارسی مذہب میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے، اسی بناء پر اسے اردیشر ایرانی نے اپنی پہلی بولتی فلم میں نیک شگون کے طور پر شامل کیا۔ ہم یہ بات بلا جھجک کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہندوستان کی پہلی فلم کے ہدایت کار پارسی المذہب نہ ہوتے تو شاید آج فلمی موسیقی کا وجود نہ ہوتا۔

اب بنگالی فلموں کی طرف واپس لوٹتے ہیں، بنگالی فلموں سے مراد ہے بنگال (کلکتہ) میں بنائی گئی بنگالی اور ہندی فلمیں۔ سرزمین کلکتہ میں فلم سازی کا ذکر ہو اور ایسے میں وہاں قائم شدہ فلمساز ادارے نیو تھیٹرز کا تذکرہ نہ ہو یہ ناممکنات میں سے ہے۔ نیو تھیٹرز کو کلکتہ میں وہی مقام حاصل ہے جو کسی زمانے میں بمبئی میں رنجیت مووی ٹون، منروا مووی ٹون، پربھات اور بمبئی ٹاکیز کو حاصل رہا ہے۔ نیو تھیٹرز کو کلکتہ میں پہلی ہندی فیچر فلم بنانے کا اعزاز حاصل ہے۔ نیو تھیٹرز کو 10 فروری 1931ء میں بی این سرکار (1980-1901) نے قائم کیا۔ اسی ادارے نے پہلی بولتی بنگالی فلم دینا پاؤنا "پریمنکر اتارتھی" کی ہدایت میں 30 دسمبر 1931ء کو نمائش کے لیے پیش کی۔ اس پہلی بولتی بنگالی فلم کے موسیقار آر سی بورال (1981-1903) تھے۔ کلکتہ (بنگال) میں قائم کیے گئے اس فلم ساز ادارے میں 1931ء سے 1955ء تک ایک سو پچاس کے قریب یادگار فلمیں بنا کر نمائش پذیر کی گئیں، ابھی حال ہی میں (2003ء) "آدھر پریم" نامی بنگالی فلم تیار کر کے اس ادارے نے ایک دفعہ پھر سے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ بی این سرکار کی انہی خدمات کے پیشِ نظر بھارت سرکار نے 1970ء میں انہیں "دادا صاحب پھالکے" ایوارڈ سے سرفراز فرمایا۔ پہلی ہندی فیچر فلم جو کلکتہ میں بنائی گئی وہ "محبت کے آنسو" عرف Tears Of Love تھی جو نیو تھیٹرز کے بینر تلے 24 ستمبر 1932ء کو نمائش پذیر ہوئی اور یہ عظیم گلوکار و اداکار کندن لعل سہگل (1947-1904) کی بھی پہلی فلم تھی، اس فلم کی موسیقی آر سی بورال نے مرتب فرمائی تھی۔ کے ایل سہگل نے اس فلم سے اپنے پندرہ سالہ فلمی کیریئر کا آغاز کیا، فلم تو زیادہ کامیاب نہ ہو سکی مگر اسی فلم نے کے ایل سہگل جیسا سچا سنگیت بھگت ضرور متعارف کرایا۔ معزز قارئین بات نیو تھیٹرز کی ہو رہی تھی۔ یہ وہی ادارہ ہے جس نے بنگال (کلکتہ) کی فلمی صنعت کو بولتی فلموں کے ابتدائی دور سے بہترین اور معیاری فلمیں شائقین فلم و موسیقی کے لیے پیش کیں۔ اس ادارے سے وابستہ فلمی شخصیات نے ہندی اور بنگالی سینما پر نہایت ہی گہرے نقوش مرتب فرمائے، اس عظیم ادارے سے پریمنکر اتارتھی (1890-1964)، پی سی بروا (1951-1903)، دیبکی بوس (1971-1898)، نیتن بوس (1986-1897) اور مکل بوس (1899) جیسے بڑے ہدایت کار منسلک رہے۔

کے ایل سہگل، کے سی ڈے، آر سی بورال، تمر برن اور پنکج ملک جیسے منجھے ہوئے موسیقار اسی ادارے نیو تھیٹرز کے ماتھے کا جھومر تھے۔ اداکاروں میں کے ایل سہگل، کانن دیوی، اوما ششی، پرتھوی راج کپور، چھبی بسواس، بکاس رائے، پہاڑی سانیال، کے سی ڈے، پنکج ملک اور وسنت چودھری نیو تھیٹرز کے معروف اداکاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ بولتی فلموں کے ابتدائی دور کے سب سے بہترین گلوکار نیو تھیٹرز سے ہی منسلک تھے، جن میں کے ایل سہگل، کے سی ڈے، کانن دیوی، اوما ششی اور پنکج ملک شامل تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ سب سے بہترین شعبہ موسیقی کسی ادارے کے پاس تھا تو وہ نیو تھیٹرز ہی تھا تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ اسی فلم ساز ادارے کو ایک اور منفرد اعزاز حاصل ہے کہ فلموں میں پس پردہ گلوکاری کا اولین تجربہ اسی ادارے کی فلم دھوپ چھاؤں۔ 1935ء میں کیا گیا، آگے چل کر اس دلچسپ تجربے پر تفصیلاً روشنی ڈالی جائے گی۔ قارئین ذی وقار یہاں ضمناً عرض کرتا چلوں کہ بولتی فلموں کا پہلا عشرہ ہی (1931-1940) چند یادگار ترین واقعات کے حوالے سے ہمیشہ تاریخ فلم و موسیقی میں سنہرے باب کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ اسی اولین عشرے میں پہلی بولتی فلم عالم آراء 1931ء، پس پردہ گلوکاری کے لحاظ سے دھوپ چھاؤں

1935ء، پہلی رنگین فلم کسان کنیا۔ 1937ء اور پہلی بغیر کسی گیت کے فلم نوجوان 1937ء شائقین فلم و موسیقی کے لیے پردۂ اسکرین پر پیش کی گئیں اور جنہیں ناظرین نے سندِ قبولیت سے سرفراز فرمایا۔ عالم آراء۔ 1931ء اور کسان کنیا۔ 1937ء امپریل فلم کمپنی کی فخریہ پیش کش تھیں جب کہ فلم دھوپ چھاؤں۔ 1935ء نیو تھیٹرز اور فلم نوجوان 1937ء واڈیا مووئیز کے تعاون سے نمائش کے لیے پیش کی گئیں۔

نیو تھیٹرز سے ہی وابستہ ایک شخصیت ایسی بھی ہے جو کہ ایل سہگل اور کے سی ڈے (1893-1962) جیسے بڑے سنگرز کو بولتی فلموں کے شروعاتی دور میں تعلیم موسیقی دیا کرتی تھی اور انہیں بتایا کرتی تھی کہ فلم میں گیت گانے کے لیے کن کن احتیاطی تدابیر کو ملحوظ خاطر رکھنا پڑتا ہے، اس مہان شخصیت کا نام ہے پنکج ملک۔ بولتی فلموں کے ابتدائی دور کی موسیقی بس خانہ پری کے برابر تھی، نہ کوئی نامی گرامی موسیقار اور نہ ہی کوئی سپر ہٹ فلم بلحاظ موسیقی ہمیں دیکھنے اور سننے کو نظر آتی ہے۔ خدا بھلا کرے نیو تھیٹرز والوں کا جو انہوں نے فلم کے اس اہم ترین شعبہ پر خصوصی توجہ فرمائی۔ آر سی بورال، کے سی ڈے اور پنکج ملک ایسے نام ہیں جنہوں نے فلمی موسیقی کو وقار بھی بخشا اور معیار بھی۔ آر سی بورال اور پنکج ملک نے دو تین سازوں کے بجائے تیس سازوں کے آرکسٹرا کا استعمال شروع کیا، اس موسیقاروں کی انہی خدمات کے پیشِ نظر مشہور درویش صفت شاعر ساغر صدیقی نے کہا تھا کہ

پہلا طرب شناس بڑا سنگدل تھا اے دوست
چیخیں تھیں جنہیں جھوم کر نغمات کہہ گیا!

موسیقار، گلوکار، اداکار اور شاعر پنکج ملک کا جنم 10 مئی 1905ء کو کلکتہ کے ایک متوسط بنگالی خاندان میں ہوا۔ ان کے خاندان میں حالانکہ موسیقی کی کوئی ایسی خاص روایت نہیں تھی مگر ان کے والد منموہن ملک کو روایتی موسیقی کا بہت شوق تھا اور وہ مذہبی رسومات کی ادائیگی کے وقت بہت سے سازندوں اور بھجن و کیرتن وغیرہ گانے والوں کو بلایا کرتے تھے اور ان سے من کی شانتی کے لیے دیر تک مذہبی گیت سنا کرتے تھے، وہیں ان کا لختِ جگر پنکج ملک بھی موجود ہوتا، اسی وجہ سے اسے موسیقی سے دلچسپی کم عمری میں ہی ہو گئی تھی، گھر والوں نے پہلے تو اس کی تعلیم و تربیت کے لیے گھر پر ہی ایک قابل استاد کا بندوبست کیا، پھر استاد کے ہی مشورے پر نزدیکی اسکول میں پڑھنے کے لیے داخل کروا دیا گیا، میٹرک واجبی نمبروں سے پاس کرنے کے بعد جب اسکاٹش چرچ کالج کلکتہ میں داخل کروایا گیا تو نوجوان پنکج ملک نے تعلیم سے زیادہ موسیقی میں دلچسپی کا مظاہرہ کیا، پھر کیا تھا کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر ساری توجہ موسیقی کی جانب مبذول کر دی۔ والد منموہن ملک نے بھی بچے کی دلچسپی کے پیش نظر اسے بحرِ موسیقی سے سیراب ہونے کی اجازت دے دی۔ پنکج ملک نے سال 1925ء کی ابتداء میں ہی دُرگا داس بینرجی (1893-1943) اور دینندر ناتھ ٹیگور (1882-1935) جو کہ عظیم بنگالی شاعر و موسیقار رابندر ناتھ ٹیگور (1861-1941) کے بھتیجے تھے، سے موسیقی کے ابتدائی اسباق پڑھے۔ پنکج ملک پر قسمت کی دیوی کچھ زیادہ ہی مہربان تھی جو اسے عالمی شہرت یافتہ شاعر و موسیقار و مصنف اور نوبل انعام یافتہ رابندر ناتھ ٹیگور کے خاندان کی دہلیز تک لے گئی۔ قسمت کی اسی کرم فرمائی کی وجہ سے ٹیگور کے اثرات ان کی زندگی اور موسیقی دونوں پر یکساں طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ 1927ء میں جب اس کی عمر صرف 22 برس تھی، اس نے ایک موسیقار کے طور پر انڈین براڈ کاسٹنگ کمپنی میں ملازمت حاصل کر لی۔ 1928ء میں پنکج ملک نے ایک گلوکار کے طور پر کلکتہ میں ریڈیو کے لیے آڈیشن دیا تھا اور آر سی بورال اس وقت کلکتہ ریڈیو اسٹیشن پر شعبہ موسیقی کے پروگرام ڈائریکٹر تھے، انہوں نے پنکج ملک سے جو پہلا گیت گوایا وہ رابندر ناتھ ٹیگور کا تخلیق کردہ تھا اور اس گیت کے بول تھے، Nemeche Aaj Prothom Badal۔ یہی گیت اس کی پہلی کمرشل ریکارڈنگ کے حوالے سے شمار ہوتا ہے۔ پنکج ملک صاحب اس کے علاوہ ریڈیو اسٹیشن کلکتہ سے موسیقی کے متعلق Sangeet Shikshar اور Mahishamardini جیسے مقبول پروگرام بھی کئی سال تک پیش کرتے رہے۔

پنکج ملک نے اس زمانے میں فلموں سے ناتا جوڑا جب ہندوستانی سینما اپنی بے زبانی سے آواز، ساز اور مکالموں کے سنہری دور کی طرف سفر شروع کر رہا تھا، یہ وہ دور تھا جب میوزک ریکارڈنگ کی تیکنیک ابھی اپنے شروعاتی دور میں تھی۔ 1935ء تک کلکتہ کے نیو تھیٹرز کی بنیادیں کافی گہرائی تک پیوست ہو چکی تھیں۔ ایک صبح ہدایت کار نتین بوس، موسیقار و گلوکار پنکج ملک کو اپنے ساتھ اسٹوڈیو لے جانے کے لیے ان کے گھر پہنچے۔ پنکج ملک باتھ روم میں تھے، اس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر کا رواج شروع ہو چکا تھا اور دور کہیں سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ ادھر باتھ روم میں پنکج ملک اس گانے کے ساتھ سر ملا رہے تھے جس طرح نیوٹن کے ذہن میں پیڑ سے زمین پر سیب

گرتے ہی زمین کی قوتِ کشش کا خیال بجلی کی طرح کوندا تھا، اسی طرح نیتن بوس کے ذہن وقلب میں بھی پس پردہ گلوکاری کا خیال اچانک آگیا، نیتن بوس اس زمانے میں بنگالی فلم ”بھاگیہ چکرا۔ 1935ء“ بنا رہے تھے اور اس فلم کے ہندی ورژن کا نام ”دھوپ چھاؤں“ 1935ء تھا، پس پردہ گلوکاری کی تیکنیک میں جو پہلا گانا ریکارڈ کیا گیا، وہ رائے چند بورال (آر سی بورال) کی موسیقی میں پارول گھوش، کے سی ڈے اور پہاڑی سانیال کی آوازوں میں تھا اور اس تاریخی گیت کو پنڈت سدرشن نے لکھا تھا گیت کے بول تھے ”پریم کی نیا چلی جل میں موری“۔

پس پردہ گلوکاری کے حوالے سے پہلی روایت اتنی معتبر نہیں، جتنی کہ دوسری روایت۔ قارئین ذی وقار آئیے Play Back Singing کے متعلق دوسری روایت کا جائزہ لیتے ہیں، یوں تو آپ کو بخوبی علم ہے کہ فلموں میں موسیقی کا رواج پہلی بولتی فلم Takie Movie عالم آراء 1931ء سے ہی شروع ہوگیا تھا لیکن المیہ یہ تھا کہ فلم میں وہی اداکار کام کر سکتے تھے جو تھوڑی بہت موسیقی کی شدھ بدھ رکھتے تھے۔ اس سے یہ نقصان ہوا کہ نہ ہی اچھے اداکار اور نہ ہی اچھے گلوکار فلموں کے ابتدائی دور میں ہمیں نظر آتے ہیں۔ دوسری جانب فلموں میں گانوں کی بہتات کا اندازہ آپ اس بات سے بخوبی لگا سکتے ہیں کہ 1932ء میں بنی فلم ”اندر سبھا“ میں 71 گانے تھے جس کا کوئی بھی گیت آج کہیں نہیں سنا جا سکتا کیونکہ اس فلم کے ریکارڈ ناقدری زمانہ کا شکار ہوگئے، 1931ء سے 1940ء تک 931 فلمیں نمائش پذیر ہوئیں اور ان میں موجود گانوں کی تعداد نو ہزار کے قریب تھی۔ یہاں ایک دلچسپ بات عرض کرنا چاہوں گا کہ پہلی خاموش فلم ”راجا ہریش چندر۔ 1913ء“ تو انٹرنیٹ اور ڈیوی ڈی پر باآسانی دستیاب ہے مگر یہ کسی المیے سے کم نہیں کہ برصغیر کی پہلی بولتی فلم ”عالم آراء۔ 1931ء“ کی ایک جھلک بھی ناظرین دیکھنے سے محروم ہیں۔ فلموں کی تعداد اور کثرتِ گیت اب اس بات کے متقاضی تھے کہ فن گلوکاری کو فن اداکاری سے جدا تصور کیا جائے، اسی بات کے پیشِ نظر نئے نئے تجربات کے متعلق سوچا جانے لگا۔ 1935ء برصغیر کی فلمی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہ جانے والا سال ہے کیونکہ اسی سال پہلی بار پس پردہ گلوکاری کا تجربہ کیا گیا۔

ہوا یوں کہ 1935ء میں نیو تھیٹرز کلکتہ نے بنگالی فلم ”بھاگیہ چکرا“ کو Remake کیا تو اس کا ہندی نام دھوپ چھاؤں رکھا اور اس فلم کے ہدایت کار نیتن بوس تھے جب کہ اس کی کاسٹ میں پہاڑی سانیال، اوما ششی، بی بھادری، بکرم کپور، نواب، کیدار شرما، ترلوک کپور، سردار اختر اور کے سی ڈے شامل تھے۔ فلم کی موسیقی آر سی بورال اور پنکج ملک نے مرتب کی تھی، اس فلم میں اسٹیج پر ایک لمبا سین تھا، بھاری بھرکم کاسٹ کی موجودگی میں گانا بھی گایا جانا تھا، نیتن بوس کے لیے مشکل یہ تھی کہ ایک کیمرے اور ایک مائیک کے ساتھ اتنے سارے اداکاروں کی آواز ریکارڈ کرنا اور پھر گانا بھی پیش کرنا کافی مشکل کام تھا، انہوں نے اس مشکل صورتِ حال کو اپنے بھائی مکل بوس جو کہ اس فلم کے ساؤنڈ ریکارڈسٹ بھی تھے، سے ڈسکس کیا اور دونوں بھائی مزید مشورے کے لیے موسیقار پنکج ملک کے گھر چلے گئے، جب دونوں بھائی پنکج ملک کے گھر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ پنکج ملک گراموفون پر ایک گیت سن رہے ہیں اور ساتھ ساتھ گنگنا بھی رہے ہیں۔ نیتن بوس نے وہیں سے ایک آئیڈیا لیا کہ کیوں نہ اسی طرح گیت پس پردہ ریکارڈ کر کے چلایا جائے اور اسٹیج پر اداکار اپنے ہونٹوں کو حرکت دیں۔

دونوں بھائیوں اور موسیقار پنکج ملک کے درمیان یہ بات طے ہوگئی اور یوں ہندی فلم انڈسٹری کا پہلا گیت بطور پس پردہ گلوکار کے سی ڈے (نابینا گلوکار، موسیقار اور اداکار) سپر بھاسر کار، پارل گھوش اور ہری متی دوا کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا۔ گویا پہلا پس پردہ گایا جانے والا گیت ایک چہار گانا تھا جسے کے سی ڈی سپر بھاسر کار، ہری متی دوا اور پارل گھوش نے آواز دی مگر پردہ سیمیں پر کے سی ڈے، پہاڑی سانیال اور اوما ششی پر فلمایا گیا اس گیت کو لکھنے کا اعزاز گیت کار پنڈت سدرشن کو حاصل ہوا اور گیت کے بول کچھ یوں تھے۔ ”میں خوش ہونا چاہوں خوش ہو نہ سکوں“ اور یوں ہندی فلموں میں پس پردہ گلوکاری کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

پنکج ملک نے سب سے پہلے کلکتہ کے نیو تھیٹرز میں کے سی ڈے یعنی کرشنا چندر ڈے (جو کہ نابینا تھے اور مشہور گائیک منا ڈے کے چچا بھی) اور کے ایل سہگل یعنی کندن لعل سہگل جیسے بڑے گلوکاروں کو ابتدائی دور میں خصوصی تربیت دی اور انہیں فلموں میں گانے کے متعلق مکمل رہنمائی فرمائی۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں مہان گائیک آخری سانس تک پنکج ملک کی دیوتا سمان عزت وتوقیر کرتے رہے، پنکج ملک نیو تھیٹرز میں نئے نئے سنگرز کو ٹھیک ڈھنگ سے تربیت دینے پر مامور کیے گئے اور وہ بنگالی اور ہندی فلموں میں لازوال موسیقی دے کر اپنے انتخاب کو بالکل درست ثابت کرنے میں سو فیصد کامیاب ٹھہرائے جاسکتے

ہیں، بطور فلم میوزک ڈائریکٹر ان کو سب سے پہلے فلم ''یہودی کی لڑکی۔ 1933ء'' سے کام کرنے کا موقع ملا اور یہ فلم مشہور و معروف ڈراما نگار آغا حشر کشمیری کے ہی تحریر کردہ ڈرامے ''یہودی کی لڑکی'' سے ماخوذ کی گئی تھی، یہ فلم نیو تھیٹرز کی پیش کش تھی اور اس فلم کے ہدایت کار ''پریمنکر اتارتھی'' تھے اور اس میں کردار نبھانے والوں میں کے ایل سہگل، رتن بائی، نواب، کمار، پہاڑی سانیال، حمید، غلام محمد، رہارانی اور مس تارا شامل تھے، اس فلم کی موسیقی بہت پسند کی گئی، خاص کر ہندی فلموں کے باقاعدہ طور پر تسلیم کیے گئے پہلے شاعر آرزو لکھنوی کی یہ غزل ''یہ تصرف اللہ اللہ تیرے میخانے میں ہے'' جسے کے ایل سہگل نے گا کر امر کردیا، بہت پسند کی گئی۔ دوسری غزل جو عظیم کندن لعل سہگل کے ہی گلے سے نکل کر ہمیشہ کے لیے یادگار ہوگئی۔ وہ غزل اردو ادب کے بڑے شاعر مرزا غالب کی تھی۔ ''نکتہ چیں ہے غم دل، اس کو سنائے نہ بنے'' یاد رہے کہ فلموں میں شامل کی گئی یہ مرزا غالب مرحوم کی پہلی غزل بھی ہے۔ کے ایل سہگل نے یہ غزل کچھ اس رنگ میں گائی ہے کہ آج بیاسی برس گزرنے کے بعد بھی اسی طرح تروتازہ محسوس ہوتی ہے اور آج بھی کے ایل سہگل کی گائی ہوئی یہ غزل کانوں میں رس گھولتی محسوس ہوتی ہے، اس غزل کی طرز پنکج ملک نے ''راگ بھیم پلاسی'' میں بنائی تھی اور اس میں صرف دو ساز ''طبلہ اور ہارمونیم'' استعمال کیے تھے۔ نیز یہ غزل مرزا غالب کی غزلیات گانے والوں کے لیے سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

پنکج ملک کو نیو تھیٹرز میں رہ کر آر سی بورال یعنی رائے چند بورال جیسے لوگوں کا ساتھ نصیب ہوا۔ پنکج ملک کو ہدایت کار و اداکار پی سی بروا کی لازوال اور امر فلم ''دیوداس۔ 1935ء'' میں بھی تمر برن (1987-1904) جیسے بڑے موسیقار کے ساتھ کام کرنے کا موقع میسر آیا، جس میں سہگل کے لیے ''دکھ کے اب دن، بیتت ناہیں'' اور ''بالم آئے بسو مورے من میں'' جیسے سدابہار گیت تیار کرنے کا موقع ملا۔ ان ہر دو گیتوں نے ناظرین کو دورانِ فلم آنسو بہانے پر مجبور کردیا تھا۔ اس کے علاوہ پنکج ملک کی اور بھی کئی قابلِ ذکر فلمیں ہیں جن کی موسیقی دے کر انہوں نے ناقدین سے اپنے آپ کو ایک بڑا موسیقار تسلیم کروالیا۔ ان کی آر سی بورال کے ساتھ مشہور فلموں میں مایا۔ 1936ء، منزل۔ 1936ء، ہدایت کار ہیم چندر کی کروڑ پتی۔ 1936ء ہدایت کار نیتن بوس کی یادگار فلم ''پریزیڈنٹ۔ 1937ء'' اور بنگالی فلم ''گریہا دہا۔ 1936ء'' شامل ہیں۔ ان فلموں کے بعد پنکج ملک نے انفرادی طور پر اپنی پہلی ہی فلم ''مکتی۔ 1937ء'' کو مدھ بھری موسیقی سے یادگار بنا دیا، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کلکتہ کے نیو تھیٹرز میں سہگل صاحب کے داخلے سے سب سے زیادہ نقصان، گلوکار و موسیقار پنکج ملک کو ہی اٹھانا پڑا، پنکج ملک بنیادی طور پر بنگالی کے گلوکار تھے اور ان کا ہندی یا اردو تلفظ بھی زیادہ عمدہ نہیں تھا۔ مثال کے طور پر فلم ''میری بہن۔ 1944ء'' میں ان کا گایا اور موسیقی سے سنوارا گیا گیت ''اے کاتبِ تقدیر، مجھے اتنا بتا دے'' پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ گیت کے ایل سہگل نے کچھ ایسے انداز میں گایا ہے کہ جیسے الفاظ ہاتھ باندھے ہوئے ان کے روبرو کھڑے ہوں اور ان کی جادو بھری آواز سے اپنے آپ کو سنوارے جانے کے متمنی ہوں۔ سہگل صاحب نے بھی یہ گیت گا کر الفاظ کی حرمت کا حق ادا کردیا جب کہ ان کے مقابلے میں پنکج ملک صاحب تلفظ کے زیادہ بہتر نہ ہونے کی وجہ سے سہگل صاحب سے یہاں مات کھا گئے، وہ سوز و گداز نہ پیدا کرسکے جو کے ایل سہگل کا طرۂ امتیاز تھا، سہگل اور ملک دونوں سنگرز کی آواز میں بظاہر کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے مگر موسیقی کے ''بھید بھاؤ'' سمجھنے والوں کے نزدیک دونوں بڑے سنگرز کی آواز میں بہت زیادہ فرق تھا۔ ان دونوں سنگرز کی آواز کا واضح فرق فلم ''دھرتی ماتا۔ 1938ء'' کے گیت (جسے گیت کار پنڈت سدرشن نے لکھا تھا اور اس گیت کی دھن خود پنکج ملک نے تخلیق کی تھی) دنیا رنگ رنگیلی رے بابا، دنیا رنگ رنگیلی، میں آسانی سے پہچانا جاسکتا ہے۔ پنکج ملک اور اوما ششی کے بعد جب اس گیت میں عظیم گلوکار کے ایل سہگل کی آواز یہ کہتے ہوئے ابھرتی ہے ''دکھ کی ندیاں جیون نیا، آشا کے پتوار لگے'' تو سارے ماحول میں ایک متاثر کن گونج سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنی آواز میں ایسی میٹھی گونج اور درد پیدا کرنے کے لیے سہگل آفاقی گلوکار کے طور پر یاد کیے جاتے ہیں اور یہ بات پنکج ملک کی آواز میں بھی پیدا نہ ہوسکی، جس کا نقصان بہرحال ان کو اٹھانا پڑا۔ قارئین ذی وقار ایک بات ریکارڈ کی درستگی کے لیے یاد رہے کہ یہی گیت فلم کے لیے کے سی ڈے، اوما ششی اور کے ایل سہگل کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا جب کہ گراموفون ریکارڈ پر پنکج ملک، اوما ششی اور کے ایل سہگل کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔

پنکج ملک نے موسیقار اور گلوکار کے طور پر اپنی پہچان بنانے کے بعد اداکاری کی طرف بھی رخ کیا اور پنکج کمار ملک کے نام سے ہندی اور بنگلہ فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے مگر انہیں حقیقی شہرت بطور موسیقار ہی حاصل ہو پائی، مشہور

ہدایت کار فانی موجمدار کی ہدایات میں بننے والی فلم "کپل کنڈلا۔1939ء" میں ایک بوڑھے گلوکار کا کردار ادا کیا اور ایک ناقابل فراموش گانا "پیا ملن کو جانا، ہاں پیا ملن کو جانا" بھی گایا۔ یہ بات ذہن نشیں رہے کہ اس گیت کو پنکج ملک نے خود ہی لکھا تھا اور اس کی بے مثال اور مدھ بھری دھن تخلیق کرنے کا اعزاز بھی انہیں ہی حاصل ہے۔ یہ وہ تاریخ ساز گیت ہے جس کی عظیم الشان طرز کو چھ مختلف فلموں کے لیے استعمال کیا گیا اور یہ فلمی تاریخ کا اپنی نوعیت کا واحد اور انوکھا واقعہ ہے۔ پہلی بار یہ گیت فلم "کپل کنڈلا۔1939ء" دوسری بار اس گیت کی طرز ایک تامل فلم "اشوک کمار۔1941ء" میں تیسری بار جیوپیٹر پکچرز کی تامل فلم "سنیاسی۔1941ء" چوتھی مرتبہ ایک بار پھر ہدایت کار ٹی آر رگھوناتھ کی تامل فلم "ستیہ جنم عرف ویداوتھی۔1941ء" اس فلم کے موسیقار ٹی کے جیارا مالیئر تھے۔ پانچویں مرتبہ اس بے مثال گیت کو پنکج ملک نے اپنی لاجواب موسیقی سے لبریز فلم "میری بہن۔1944ء" میں اپنی اور "الاگھوش" کی آواز میں سننے والوں کی سماعتوں کی نذر کیا۔ چھٹی مرتبہ اس کلاسک گیت کی طرز ایک ملیالم فلم "تھن ماوین کومباتھ۔1994ء" کے لیے استعمال کی گئی اور ہر بار اس گیت نے کامیابی کے قدم چومے۔ لتا منگیشکر نے بھی یہی گیت گا کر پنکج ملک کو شردھانجلی پیش کی تھی، اس کے بعد انہوں نے دیبکی بوس کی فلم "نرتکی۔1940ء" اور پی سی بروا کی سپرہٹ فلم "زندگی۔1940ء" میں بھی فن اداکاری کے جوہر دکھائے۔ یہاں ایک بات ضمناً عرض کرتا چلوں کہ فلم "زندگی۔1940" ہندی اور بنگالی فلموں کے مایہ ناز اداکار و ہدایت کار پی سی بروا کی نیوتھیٹرز کے لیے آخری فلم تھی۔ ان دونوں مشہور فلموں کا میوزک بھی پنکج ملک نے ہی ترتیب دیا تھا اور ان دونوں فلموں کے ہیرو سہگل صاحب تھے۔ 1941ء میں پنکج ملک نے نیوتھیٹرز کی سپرڈپرہٹ فلم "ڈاکٹر" میں موسیقی ترتیب دینے کے ساتھ فلم کے ایسے ہیرو کا رول ادا کیا جو ایک گلوکار کا استاد ہے۔ یہ فلم پورے ملک میں نمایاں طور پر کامیاب ہوئی اور اس فلم کے گانے بہت مقبول ہوئے، جن میں گیت کار آرزو لکھنوی کے لکھے ہوئے گیت "چلے پون کی چال جگ میں"، "گزر گیا وہ زمانہ کیسا کیسا؟" اور "مہک رہی پھلواری بھری"، جنہیں پنکج ملک نے خود ہی گایا تھا، شامل ہیں۔

1937ء میں نیوتھیٹرز کی ایک فلم کے لیے پنکج ملک موسیقی دے رہے تھے، اس فلم کے ہدایت کار پی سی بروا تھے، پنکج ملک معروف شاعر رابندرناتھ ٹیگور" کے پاس ان کی ایک نظم دینیر شیشے گھومیر دیشے کو اس فلم کے لیے ریکارڈ کرانے کی اجازت لینے گئے۔ ٹیگور نے بخوشی اجازت دے دی اور نہ صرف یہ بلکہ ٹیگور نے فلم کی کہانی میں بھی دلچسپی دکھائی اور فلم کے ٹائیٹل کے لیے مکتی نام کی تجویز پیش کی۔ ٹیگور نے اپنی مزید دو نظموں کو فلم کے لیے پیش کیا اور ان میں موسیقی کی باریکیوں کو خیال میں رکھتے ہوئے نظم Diner Sheshey کے کئی الفاظ بھی تبدیل کردیے۔ "مکتی۔1937ء" سے پہلے بنگال میں "رابندر سنگیت" زیادہ مقبول نہیں تھا۔ فلم "مکتی۔1937ء" کے بعد ہی رابندر سنگیت کو عالمگیر شہرت اور مقبولیت عامہ حاصل ہوئی۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ پنکج ملک پہلے خود ریڈیو پر رابندر سنگیت پر پابندی کے متعلق تواتر کے ساتھ تقریر کیا کرتے تھے، اس میں دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ پنکج ملک کی ریاضت اور محنت کے بغیر رابندر سنگیت اتنا زیادہ مقبول نہیں ہو سکتا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران کئی نئے لوگ فلم انڈسٹری سے جڑے اور پرانی طرز کا اسٹوڈیو سسٹم ختم ہونے لگا، تب کئی جانے مانے فنکار، ہدایت کار اور تیکنیکی ماہرین کلکتہ سے بمبئی چلے گئے، نیوتھیٹرز بھی بمبئی آگیا مگر پنکج ملک نے کلکتہ نہیں چھوڑا (صرف دو مرتبہ 1952ء میں فلم "زلزلہ" اور 1954ء میں فلم "کستوری" کی موسیقی ترتیب دینے کے لیے بمبئی گئے) انہوں نے 1944ء میں فلم "میری بہن" عرف My Sister کی موسیقی تخلیق کی... جو بے حد مقبول ہوئی، اس فلم کے لیے ہیرو کے طور پر کے ایل سہگل بطور خاص بمبئی سے کلکتہ گئے تھے، اس فلم کے تقریباً تمام گیت بہت پسند کیے گئے، خاص کر کے ایل سہگل کی جادو بھری آواز میں یہ گیت "دو نیناں متوارے تہارے، ہم پر ظلم کریں"، "چھوٹو نہ چھوٹو نہ، چھوٹو نہ او پیاری سجنیا" اور "ہائے کس بت کی محبت میں گرفتار ہوئے" لیکن جس گیت نے پورے برصغیر میں تہلکہ مچایا، وہ گیت تھا "اے کاتب تقدیر مجھے اتنا بتا دے" جس طرف دیکھیے اسی گیت کے ریکارڈ بج رہے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ مذکورہ بالا گیت پہلے پنکج ملک کی آواز میں ریکارڈ کیے گئے تھے مگر فلم ساز ہیم چندر کے اصرار پر سہگل صاحب کو بمبئی سے بلوا کر نہ صرف یہ گیت دوبارہ ریکارڈ کیے گئے بلکہ اس فلم میں ہیرو کے کردار کے لیے بھی انہی کا انتخاب کیا گیا، فلم میں سہگل صاحب کی آواز میں ریکارڈ کیے گئے گیت شامل کیے گئے اور یہ فیصلہ پنکج ملک کا تھا کہ "مجھ سے بہتر سہگل جی نے گایا ہے" یہ ان کا بڑا پن تھا، ایسی مثالیں فلم انڈسٹری میں آج کل عنقا ہو چکیں۔ اسی فلم "میری

بہن۔1944ء" کے حوالے سے ایک بات ذہن نشیں رہے کہ نیو تھیٹرز کے لیے سہگل صاحب کی یہ آخری فلم تھی۔

نیو تھیٹرز کی فلم "مکتی۔1937ء" سے پنکج ملک نے رابندر سنگیت کو فلمی نغموں سے ہمکنار کیا۔ اس کے بعد بھی انہیں موقع ملا تو انہوں نے فلمی گیتوں میں رابندر سنگیت کا خوب صورتی سے استعمال کیا۔ پنکج ملک کی کوششوں اور کامیابیوں سے ہی متاثر ہو کر دوسرے موسیقاروں کو بھی رابندر سنگیت استعمال کرنے کا حوصلہ ملا اور آج بھی یہ چلن موجود ہے۔ پنکج ملک خود کہا کرتے تھے۔ "رابندر سنگیت میری زندگی ہے اور اسی میں میری نجات ہے، یہ صرف سنگیت ہی نہیں بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ کچھ اور ہے، یہ سنگیت مجھے اس دنیا سے کہیں دور، بہت دور، چاند، سورج اور ستاروں سے بھی آگے لے جاتا ہے، جہاں رنگ برنگی روشنی کی لکیریں گہرے اندھیرے کو روشن کرتی ہیں۔"

پنکج ملک کی زندگی کا اصل مقصد عظیم گلوکار بننے کا نہیں تھا، بلکہ ان کا حسین خواب تھا۔ رابندر سنگیت کی گہرائی میں ڈوبنا وہ چاہتے تھے کہ اس زندگی کے بعد بھی وہ اسی گہرائی میں ڈوبے رہیں۔ پنکج ملک کے گائے ہوئے نغمے ہندوستانی موسیقی کی انمول وراثت ہیں اور پنکج ملک کی موسیقی نے ان نغموں کو انمول بنا دیا ہے، حالانکہ ان کے تعاون کے بغیر بھی رابندر ناتھ ٹیگور، کندن لعل سہگل، کے سی ڈے اور کانن دیوی کا رتبہ بہت بلند ہوتا مگر پنکج ملک کی موسیقی نے انہیں زیادہ بلند درجے پر پہنچا دیا ہے۔ پنکج ملک ایسے پہلے موسیقار تھے جنہوں نے رابندر سنگیت کی خصوصیات اور ان مختلف جہتوں کو پہچانا، جس کی فلموں کے سنگیت کو ان شروعاتی دنوں میں زیادہ ضرورت تھی جن دنوں خاموش فلموں کو آواز ملی تو ایسی موسیقی کی ضرورت تھی، جس میں ایک نئے ہندوستان کی چمک بھی شامل ہو اور جھلک بھی۔ ٹیگور کے گیتوں میں پنکج ملک کو یہ خوبی نظر آئی، اسی لیے انہوں نے اسے بام عروج پر پہنچا دیا۔

رابندر سنگیت کو مزید چار چاند لگانے کے لیے ہندوستانی کلاسیکل موسیقی، لوک سنگیت اور کچھ مغربی موسیقی کو ملا کر پنکج ملک نے اپنی الگ ہی پہچان بنائی۔ 1929ء میں مشہور فلم نمائش کار، ہرین گھوش نے جب خاموش فلموں چور کانٹا اور چیشر مینر کے ساتھ آرکسٹرا کا انتظام کرنے کے لیے پنکج ملک کو مدعو کیا تو پنکج ملک نے رابندر سنگیت کا استعمال ان فلموں کی پس منظر موسیقی کے لیے کیا تھا، اس زمانے میں یہ ان کا رابندر سنگیت کی مقبولیت میں چار چاند لگانے کے لیے ایک تاریخی قدم تھا، جسے اس وقت بہت کم لوگوں نے سمجھا تھا، ایک اور تاریخی کام جو انہوں نے کیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے پہلی بار رابندر سنگیت کو بنگالی سے ہندی میں ترجمہ کیا اور اس طرح کیا کہ بنگالی سے ہندی ترجمہ کرتے وقت اس کی اصل روح، احساس، مٹھاس، تال اور لے کو بھی محفوظ رکھا جا سکے۔ پنکج ملک کو اس خاص کام میں بھی بھرپور کامیابی ملی اور اس کا اثر بمبئی کی فلمی دنیا پر بھی گہرا محسوس کیا گیا۔ شروع کے دنوں میں انل بسواس، سچن دیو برمن اور ہیمنت کمار اور پھر ان کے بعد کی نئی نسل میں آر ڈی برمن اور بپی لہری نے بھی اسی طرز پر رابندر سنگیت کا استعمال کیا، نہ صرف یہ بلکہ نوشاد، رویندر جین اور راجیش روشن جیسے غیر بنگالی موسیقاروں نے بھی ٹیگور کی میلوڈی کا ہندی فلموں میں بھرپور استعمال کیا، کچھ موسیقاروں نے رابندر سنگیت کو اپنی ضرورت کے مطابق ڈھالا بھی اور کچھ نے اصل رابندر سنگیت کو ہی مزید آگے بڑھانے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ پنکج ملک نے ہندی فلموں کے لیے گیت ضرور اپنی موسیقی سے ترتیب دیے مگر ان کا خاص دھیان ٹیگور کے گیتوں اور نظموں پر مرکوز تھا، حالانکہ شانتی نکیتن (رابندر ناتھ ٹیگور کا آشرم) سے ان کا دور کا بھی واسطہ بھی نہیں رہا، پھر بھی ان کی ترجیحات میں رابندر سنگیت ہی رہا۔ وہ کلاسیکل موسیقی کے استاد تھے مگر قطعی طور پر وہ دقیانوسی نہیں تھے۔ پنکج ملک نے رابندر سنگیت کے جو ہندی تراجم کیے وہ بہت کم ریکارڈ کیے گئے۔ ان میں سے زیادہ تر گیت انہوں نے اسٹیج پر یا پھر آکاش وانی ریڈیو اسٹیشن کلکتہ پر درگا پوجا کے موقع پر گائے، 1964ء میں انہوں نے بمبئی میں رابندر سنگیت کا ایک خاص شو اسٹیج کیا تھا، جس کو کچھ لوگوں نے ریکارڈ کر لیا تھا اور بعد میں اسی ریکارڈنگ کو ڈیجیٹل تیکنیک سے دوبارہ ریکارڈ کر کے موسیقی کے شائقین کے لیے البم کی صورت میں پیش کیا، مشہور گلوکار منا ڈے نے بھی رابندر سنگیت پنکج ملک سے ہی سیکھا تھا اور وہ ان کو اپنا چاچا مانتے تھے۔ پنکج ملک میوزیکل ریسرچ فاؤنڈیشن نے 1964ء میں بمبئی میں ہوئے اس پروگرام میں گائے ہوئے پنکج ملک کے گیتوں کا البم دو کیسٹ میں بنایا تھا اور اس البم کا نام Pankaj Mullick Live in Concert رکھا تھا۔ اس سے چند برس پیشتر دور درشن ٹیلی وژن نے ان کی فلمی و فنی خدمات کے حوالے سے ایک خصوصی پروگرام پیش کیا تھا جس میں مشہور فلم ایکٹرس وجینتی مالا نے ان کی ترتیب دی ہوئی دھنوں پر رقص پیش کر کے ناظرین کے دل جیت لیے تھے۔ پنکج ملک، 1931ء سے 1972ء تک ہندی اور بنگالی فلموں میں موسیقی ترتیب دیتے رہے مگر حیرت کی بات ہے کہ جہاں انہوں نے گیتا دت، کانن دیوی، اتپل سین، ریکھا

ملک جیسی دوسرے درجے کی گلوکاراؤں سے گیت تو گوائے مگر وہیں انہوں نے نور جہاں، شمشاد بیگم، سمن کلیانپور، آشا بھوسلے اور لتا منگیشکر جیسی صفِ اوّل کی گلوکاراؤں کو یکسر نظر انداز کیے رکھا۔ ہر موسیقی پسند اس حسین اتفاق کی تہہ میں پہنچنے سے قاصر ہے۔ لتا منگیشکر نے ایک Live Concert میں بتایا کہ میں ایک دفعہ پنکج ملک صاحب سے ملی تو انہوں نے کہا کہ میں نے تمہارے لیے کچھ دھنیں ترتیب دی ہوئی ہیں اور میں تم سے ضرور گیت گواؤں گا مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ میں پنکج ملک جیسے مہان موسیقار کے ساتھ کام کرسکوں۔ اسی طرح کے ایل سہگل کے سی ڈے است برمن سے تو وہ گیت ریکارڈ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر محمد رفیع، مکیش، طلعت محمود وغیرہ سے ان کی بے اعتنائی سمجھ سے بالاتر ہے بس ایک ہی بات سے دل کو تسلی دے کر بہلایا جاسکتا ہے کہ ”شاید قدرت کو یہی منظور تھا۔“

پنکج ملک نے رابندر سنگیت کے نہ صرف گلوکار کے طور پر بلکہ اس کو نئی نسل تک پہنچانے کے لیے بطور استاد بھی بہت زیادہ مقبولیت و شہرت حاصل کی۔ فلم، ریڈیو اور گراموفون جیسے جدید میڈیا کو استعمال کرتے ہوئے پنکج ملک نے رابندر سنگیت کا کافی پرچار کیا اور اسی کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔ پنکج ملک نے موسیقی کے موضوع پر چار کتابیں بھی تصنیف فرمائیں، جن کے نام مائیشا سر مردنی، گیت بلمیکی، راگ لکشن اور گیت منجری ہیں۔ ان کتابوں میں صحیح معنوں میں موسیقی کے راگوں کی تصویر کشی کی گئی ہے اور ہندوستانی کلاسیکل میوزک کے بارے میں تفصیلات درج کی ہیں۔ پنکج ملک نے تقریباً پانچ ہزار دھنیں تخلیق فرمائیں۔ ان کے اس لافانی کارنامے پر زندگی میں ہی کئی اعلیٰ اعزازات سے نوازا گیا۔ سب سے پہلے ان کو 1945ء میں ایک بنگالی فلم ”دوئی پرش“ کے لیے بہترین میوزک ڈائریکٹر کا اعزاز حاصل ہوا۔ 1956ء میں سنگیت رتنا کر کے اعزاز سے ان کو نوازا گیا۔ 1970ء میں حکومت ہند کی طرف سے ان کو پدم شری کا اعزاز عطا کیا گیا۔ 1972ء کا چوتھا ”دادا صاحب پھالکے ایوارڈ“ پنکج ملک کو 1973ء میں دیا گیا جو ہندوستانی فلم انڈسٹری کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ 1975ء میں انہیں ”رابندر ٹیگور آچاریہ“ کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ 1931ء سے 1972ء تک فلموں میں موسیقی دینے والے اس عظیم موسیقار کی بطور موسیقار آخری ہندی فلم ”کستوری۔1954ء“ تھی۔ اس فلم کو مکمل کرانے میں موسیقار جمال سین نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ ان کے چار دہائیوں پر مشتمل فلمی کیریئر کی آخری فلم 1972ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ یہ ایک بنگلہ فلم تھی جس کا نام Bigolita Karuna Janhabi Jamuna تھا۔

9 فروری 1978ء کو 73 برس کی عمر میں جب کلکتہ میں مہان کلاکار شری پنکج ملک کا دیہانت ہوا تو ایک روزنامہ اخبار نے ان کے حوالے سے یادگار سرخی لگائی کہ ”آج ٹیگور کی دوبارہ موت ہوگئی ہے“ یہ چند الفاظ آنجہانی پنکج ملک کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے سب پر بھاری تھے۔ ان کی وفات کے دو برس بعد کلکتہ کے مشہور پبلشنگ ادارے Firma KLM PVT Ltd, Culcutta نے ان کی خودنوشت Amar Jug Amar Gaan جو کہ بنگالی میں ہے شائع کی ہے جس میں ان کی زندگی اور زندگی میں انجام دیئے گئے کارناموں پر بڑی خوب صورتی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ آنجہانی پنکج ملک کے نواسے رجیب گپتا اور مسز جھمک گپتا نے ان کے فن اور سنگیت خاص کر رابندر سنگیت کے حوالے سے ان کی خدمات سے موسیقی پسند طبقے کو روشناس کرانے کے لیے 2005ء کو کلکتہ میں Pankaj Mullick Music & Art Foundation ان کے صد سالہ جنم دن کے موقع پر قائم کی ہے جس کے تحت ملک بھر سے ماہرین موسیقی پنکج ملک کی ترتیب دی ہوئی دھنوں پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہر سال بالعموم پورے ہندوستان اور بالخصوص کلکتہ میں آنجہانی پنکج ملک کو اسی طرح خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے نواسے رجیب گپتا نے ان کی شخصیت اور فن پر ایک خوب صورت کتاب بھی تحریر فرمائی ہے جو Pankaj Mullick Music & Art Foundation کے زیراہتمام شائع ہوئی ہے۔ جس کا نام Betar O Cholochitrer Jogotey Prabadpratim Shongeet Shongeet Sadhok Pankaj Kumar Mullick ہے۔ انڈین پوسٹل سروس نے پنکج ملک کے صد سالہ جنم دن کے موقع پر 2006ء میں ایک یادگاری ٹکٹ جاری کیا۔ یہ ان کی اعلیٰ ترین خدمات کا ادنیٰ ترین صلہ تھا۔ آج بھی اس افراتفری کے دور میں اگر کہیں ریڈیو، ٹیلی ویژن یا ڈی وی ڈی پر عظیم پنکج ملک کا کوئی گیت سننے یا دیکھنے کو مل جائے تو بے ساختہ عبدالحمید عدم کا یہ شعر وردِ زبان ہوجاتا ہے۔

نہ چھیڑ اے ہمنشیں، اب زیست کے مایوس نغموں کو!
کہ اب ”مطرب“ کے تاروں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے

فلم نگری

قصۂ پارینہ

انور فرہاد

قیامِ پاکستان سے پہلے بھی لاہور فلمی نگر تھا۔ متحدہ ہندوستان کے تین شہروں میں فلمیں بنتی تھیں۔ کلکتہ، بمبئی اور لاہور۔ لاہور میں بنی فلمیں پورے ہندوستان میں دیکھی جاتی تھیں لیکن قیام پاکستان کو ناکام بنانے کے لیے متعصب ہندوؤں نے جب فسادات کی ابتداء کی تو بنگال سے پختون خواہ تک یہ آگ پھیل گئی۔ اس آگ نے فلمی دنیا پر بھی اثر ڈالا۔ کلکتہ میں قائم کئی مسلمانوں کی فلم کمپنی کو آگ لگا دی گئی۔ بمبئی میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ لاہور بھی اس آگ سے بچ نہ سکا۔ اسٹوڈیو تک کو خاکستر کردیا گیا۔ جب بمبئی سے مسلمان ہنرمند لاہور آئے اور مقامی ہنرمندوں سے رابطہ کیا تو انہیں سخت مایوسی ہوئی، اسٹوڈیو آتشزدگی کا شکار ہو چکے تھے۔ فلم سازی کے تمام آلات جل چکے تھے۔ اس تباہ حال صنعت کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش ہونے لگی۔ ہنرمندوں نے تمام مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے نت نئے تجربے کیے اور اس صنعت کو اوج پر پہنچا دیا۔

یادوں کے در کھولنے والی ایک خاص تحریر

اللہ رب العزت کا شکر ہے کہ میں جو کچھ لکھتا ہوں، اسے میرے پڑھنے والے پسند کرتے ہیں۔ پڑھنے والے اپنی خواہش کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ میں ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ان کی فرمائش پوری کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر اکثر تاخیر ہو جاتی ہے کیونکہ مواد کی تلاش میرے لیے آسان نہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اب میں 80 برس کا ہوگیا ہوں۔ اکثر مختلف قسم کی بیماریوں کا شکار رہتا ہوں۔ بہت حد تک معذور ہو گیا ہوں۔ زندگی کے دیگر معمولات کی طرح لکھنا پڑھنا بھی اب کارِ دارد ہو گیا ہے۔ مجھے لکھنے کے لیے بہت پڑھنا پڑھتا ہے۔ آنکھوں کا یہ عالم ہے کہ محض چشمے سے کام نہیں چلتا۔ محدب شیشے سے بھی مدد لینی پڑتی ہے۔ یہ سب کچھ میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اپنے چاہنے والوں کو بتا سکوں کہ ان کی فرمائش پوری کرنے میں میری طرف سے کیوں تاخیر ہوتی ہے۔

آج کی تحریر بھی ایک فرمائش کا نتیجہ ہے۔ بیک وقت کئی قارئین نے خطوط میں لکھا ہے۔ ”یوں تو آپ شخصیتوں پر لکھتے ہوئے بہت سی معلوماتی باتیں بھی بتا دیتے ہیں مگر کبھی کبھی شخصیت سے ہٹ کر بھی کچھ لکھیں۔ آج کی نئی نسل ہماری فلم انڈسٹری کی پرانی باتیں بھی جاننا چاہتی ہے۔ ماضی بعید کے واقعات اور حالات سے ہمیں آگاہ کیجیے۔“

یہ تجویز بری نہیں تھی۔ ویسے تو میں سیاق وسباق کو پیش نظر رکھ کر بہت سی معلوماتی باتیں بھی لکھ جاتا ہوں کہ پڑھنے والوں کو ان باتوں کا بھی علم ہو جائے۔ آج کی تحریر کسی شخصیت سے متعلق نہیں، حالات و واقعات کے بارے میں ہے۔ یعنی قصہ ہائے پارینہ ہیں۔

عام طور پر فلم بین یہ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں اردو، پنجابی اور پشتو فلمیں ہی بنتی ہیں مگر اس حقیقت سے کم لوگ واقف ہیں کہ پاکستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں میں فلمیں بنائی جا چکی ہیں۔ مثلاً متذکرہ تینوں زبانوں اردو، پنجابی اور پشتو کے علاوہ سندھی، گجراتی، سرائیکی، ہندکو، انگریزی اور بنگالی زبان میں بھی فلمیں بنائی گئی ہیں۔

آج میں آپ کو ان زبانوں کی پہلی پاکستانی فلموں کی









کہانی سناؤں گا جو معلوماتی بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ پاکستان کی سب سے پہلی اردو فلم ''تیری یاد'' تھی جو 1948ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اس فلم کے بارے میں بتاؤں، یہ بتانا ضروری ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے بھی جس طرح بمبئی، مدراس اور کلکتے میں فلمیں بنتی تھیں، اسی طرح لاہور میں بھی فلمیں بنتی تھیں اور یہاں کی اردو و پنجابی فلمیں پورے متحدہ ہندوستان میں دیکھی اور پسند کی جاتی تھیں۔ لاہور کے فنکار اور ہنر مند جب مقبول ہو جاتے تو انہیں کلکتے اور بمبئی کی فلموں میں بھی جگہ مل جاتی تھی۔

پہلی اردو فلم ''تیری یاد'' پر بھی کچھ باتیں ہو جائیں۔ اس فلم کے لیے 13 گانے ریکارڈ کیے گئے تھے مگر فلم کی محدود طوالت کی وجہ سے صرف دس گانے فلم میں شامل کیے گئے، جنہیں منور سلطانہ، علی بخش ظہور اور آشا پوسلے نے گایا تھا، چونکہ ان گیتوں کے ریکارڈ نہیں بنے تھے اس لیے ان کا ریکارڈ موجود نہیں۔

''تیری یاد'' لاہور میں بروز ہفتہ 7 اگست 1948ء عیدالفطر کے موقع پر پربھات سنیما میں ریلیز ہوئی جب کہ کراچی میں جمعہ 4 نومبر 1949ء کو امپائر سنیما میں ریلیز ہو کر پانچ ہفتے تک زیر نمائش رہی۔ ''تیری یاد'' کے سلسلے میں ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ دیوان سرداری لعل نے یہ فلم بٹوارے سے پہلے بنانی شروع کی تھی جسے انہوں نے تقسیم کے بعد مکمل کی۔

پہلی پنجابی فلم ''پھیرے'' تھی۔ پھیرے سے ان سات پھیروں کی طرف دھیان جاتا ہے جو ہندو مذہب میں شادی کے موقع پر دولہا دلہن جلتی آگ کے گرد لگاتے ہیں۔ پنڈت اشلوک پڑھتا ہے اور چمچے سے گھی آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ سات پھیرے مکمل ہونے کے بعد شادی کی رسم پوری ہو جاتی ہے۔ پاکستان کی پہلی پنجابی فلم ''پھیرے'' کا نام اسی مناسبت سے رکھا گیا تھا کہ اس فلم میں بھی ہیرو ہیروئن کی شادی خانہ آبادی کے لیے سات پھیرے لگوائے گئے تھے۔ بات آپ کی سمجھ میں آ گئی ہو گی کہ ''پھیرے'' کی

کہانی ہندو ماحول کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی گئی تھی۔ اسے بنانے والوں نے ایسی کہانی کا انتخاب کیوں کیا؟ پاکستان کی پہلی پنجابی فلم تھی، اس لیے پاکستان اور اسلامی معاشرے کی کہانی ہونی چاہیے تھی۔ بات دراصل یہ ہے کہ عام طور پر فلم بنانے والے فلم کی کامیابی کے اسباب کا خیال رکھتے ہیں۔ جن دنوں یہ فلم بنائی گئی تھی ان دنوں پاکستان میں بھارتی فلمیں دکھائی جاتی تھیں اس لیے فلم ساز مجید اور ہدایت کار نذیر نے یہ سوچ کر بھارتی فلموں کی طرح ہندو معاشرے پر مصنفہ رانی ممتاز سے کہانی لکھوائی کہ بھارتی فلمیں دیکھنے اور پسند کرنے والے فلم بین اس پنجابی فلم کو بھی اپنی پسندیدگی کی سند عطا کریں گے اور ان کی یہ سوچ غلط بھی ثابت نہیں ہوئی۔ ہندوانہ کہانی کے باوجود ''پھیرے'' شوق سے دیکھی اور پسند کی گئی۔

انیس پکچر کے نام سے فلم ساز ادارے نے اس فلم کو پروڈیوس کیا تھا۔ اس کا منظر نامہ سورن لتا نے لکھا تھا جب کہ مکالمے بابا عالم سیاہ پوش نے تحریر کیے۔ موسیقی جی اے چشتی نے ترتیب دی۔ فلم کے گیت بھی بابا عالم سیاہ پوش نے لکھے۔ عکاسی بھائیا اے حمید نے کی۔ اس فلم کی خاص بات یہ تھی کہ اس کے تمام گانے جے اے چشتی نے ایک ہی دن میں ریکارڈ کیے جب کہ پوری فلم صرف دو ماہ میں مکمل کرلی گئی۔ ''پھیرے'' کی کاسٹ میں نذیر، سورن لتا، ایم اسماعیل، زینت، مایا دیوی، نذر، بابا عالم سیاہ پوش اور علاؤ الدین شامل تھے۔ فلم کی کہانی دو دوست جانی (نذیر) اور جمو (نذر) کے گرد گھومتی ہے۔ ولن کا کردار علاؤ الدین نے بڑی خوبی سے نبھایا جب کہ فلم کی ہیروئن رانی (سورن لتا) نے بھی بڑی خوب صورت اداکاری کی۔ اس فلم کی کامیابی میں جہاں اس کی کہانی اور ہدایت کاری کا بڑا حصہ ہے وہیں فلم کے گیتوں نے بھی اہم کردار ادا کیا جو اس دور سے آج تک تروتازہ محسوس ہوتے ہیں۔ خاص طور پر یہ گانے۔

☆ مینوں رب دی سوں تیرے نال پیار ہوگیا۔ وے چناں سچی مچی (آواز منور سلطانہ)

☆ اکھیاں لادیں نہ فر پچھتا دیں نا (آواز عنایت حسین بھٹی)

یہ عنایت حسین بھٹی کی بطور گلوکار پہلی فلم تھی۔

''پھیرے'' کے ہدایت کار نذیر تھے۔

''پھیرے'' 3 اگست 1949ء کو لاہور کے پیلس سینما میں نمائش پذیر ہوئی اور 25 ہفتے چل کر اس نے پہلی سلور جوبلی فلم کا اعزاز حاصل کیا جب کہ کراچی میں جمعہ 7 اپریل 1959ء میں تاج محل سینما میں ریلیز ہوئی جہاں اس نے پانچ ہفتے مکمل کیے۔ اس پنجابی فلم کی کامیابی کے بعد دھڑا دھڑ پنجابی فلمیں بننا شروع ہوگئیں۔

اسی طرح پہلی پشتو فلم کا اعزاز ''یوسف خان شیر بانو'' کو حاصل ہے۔

پشتو پاکستان کی ایک قدیم اور مقبول زبان ہے اور صوبہ سرحد میں عام طور پر بولی جاتی ہے مگر یہ دلچسپ بات ہے کہ پاکستان کی پہلی پشتو فلم کراچی میں بنائی گئی۔ آج پشتو فلم سازی کا بڑا کام پشاور میں کیا جاتا ہے اور اردو اور پنجابی فلموں کے بعد پشتو فلمیں بڑی معقول تعداد میں بنائی جاتی ہیں۔

پہلی پشتو فلم بنانے کا خیال تین دوستوں نذیر حسین، محمد علی مدن اور شفیع چشتی کو آیا جو کراچی میں رہتے تھے۔

''یار! کیوں نہ پشتو فلم بنانے کا آغاز کیا جائے۔''

''آئیڈیا تو اچھا ہے مگر پشتو فلم دیکھے گا کون؟''

''پشتو بولنے والے پختون بھائی۔''

''ہاں! پختونوں کی کہانیاں ہماری اردو اور پنجابی فلموں میں تو فلمائی جاتی ہیں اور پسند بھی کی جاتی ہیں اگر ان کی اپنی زبان میں ان کی کہانی فلمائی جائیں تو پٹھان بھائیوں کو مزہ آجائے گا۔''

''یہاں کراچی میں بھی بڑی تعداد میں پٹھان بھائی اپنی روزی روٹی کمانے کے لیے رہتے ہیں۔ ان کی جانب سے بھی پشتو فلم کو رسپانس ملے گا اور صوبہ سرحد میں تو زبردست پذیرائی حاصل ہوگی۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ بسم اللہ کی جائے۔ ہمارے ہی ہاتھوں پہلی پشتو فلم بن کر تاریخ رقم کرے گی۔''

یہ 1969ء کی بات ہے کہ تینوں دوستوں نے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پہلی پاکستانی پشتو فلم کا آغاز کردیا۔ انہوں نے اپنی فلم ساز کمپنی وژن پکچرز کے نام سے قائم کی اور باہمی صلاح مشورے کے بعد کہانی کے لیے صوبہ سرحد کی مشہور لوک کہانی ''یوسف خان شیر بانو'' کا انتخاب کیا۔ اس لوک کہانی کو نئے سرے سے فلم کے روپ میں ڈھالنے کے لیے مصنف و نغمہ نگار علی حیدر جوشی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ پشتو زبان کے کہانی نویس نے کہانی لکھ لی تو اس کے مکالمے لکھنے کے لیے عزیز تبسم کا

انتخاب کیا گیا۔ عزیز تبسم کراچی فلم انڈسٹری سے وابستہ تھے اور پختون برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ انہیں فلموں کی شد بد تھی انہوں نے کہانی کی مناسبت سے بڑے خوب صورت مکالمے لکھ لیے تو مصنف علی حیدر جوشی اور دیگر پشتو زبان سے واقفیت رکھنے والوں نے بے حد پسند کیا اور یہی کہا کہ عزیز تبسم ہی کو اس فلم کی ہدایت کاری کی ذمہ داری سونپی جائے۔

"دیکھو بھئی! پہلے یہ سوچ لو سمجھ لو کہ میں نے اب تک کسی فلم کی ڈائریکشن نہیں دی ہے۔"

"تم نے اس فلم کے مکالموں سے پہلے بھی تو کسی فلم کے مکالمے نہیں لکھے تھے۔"

"ہاں......مگر......"

"اگر مگر کچھ نہیں تم فلموں میں کام کرتے رہے ہو۔ فلم کیسے بنتی ہے اور بنائی جاتی ہے اس کا تمہیں کسی قدر اندازہ تو ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ تم پٹھان ہو۔ پختون خواہو اس لیے ہماری اس پہلی پشتو فلم کی تم سے بہتر کوئی ہدایت کاری نہیں کرسکتا اور جہاں تک فلم سازی کی تکنیکی کارکردگی کا تعلق ہے۔ بھائی مددعلی مدن بھی تمہاری مدد کریں گے۔ وہ کراچی فلم انڈسٹری کے تجربہ کار عکاس ہیں۔"

اس طرح کی حوصلہ افزا باتوں کے بعد عزیز تبسم ہدایت کاری پر رضامند ہوگئے۔

اسکرپٹ مکمل ہونے کے بعد اداکاروں اور اداکاراؤں کے انتخاب کا مرحلہ آیا۔ کہانی کے مرکزی کردار یوسف خان اور شیر بانو کا چناؤ اہم ترین تھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ان دونوں کرداروں کے لیے خالص پٹھانوں کو منتخب کیا جائے دیگر کرداروں کے لیے غیر پٹھانوں سے بھی کام چلا لیا جائے گا۔

اب جوڈھونڈ شروع ہوئی تو "ارے یار! بدر منیر کیسا رہے گا ہیرو کے لیے؟"

"کون بدر منیر؟"

"وہی جو کچھ فلموں میں فائٹر کا کردار ادا کر چکا ہے"

ارے وہی یار! جو وحید مراد کا فین تھا اور وحید ہی نے اسے فلموں میں متعارف کرایا تھا۔"

"مگر یار! وہ تو بڑا اچھا کتا جوان ہے۔"

"اور ایسا ہی جوان پشتو فلم کے لیے مناسب ہے۔ ہم کوئی "امراؤ جان ادا" نہیں بنا رہے ہیں کہ......"

"اگر یہ بات ہے تو چلو ٹھیک ہے بدر منیر ڈن۔ اب

حضرت امام حسنؓ گھر میں تشریف فرما تھے۔ انہوں نے پانی طلب کیا۔ لونڈی پانی کا پیالہ لے کر آئی لیکن وہ پیالہ لے کر یوں کھڑی تھی کہ وہ امامؓ کے سر پر تھا۔ چنانچہ امامؓ اٹھے تو کپڑے بھیگ گئے۔ امامؓ نے لونڈی کی جانب دیکھا۔ لونڈی نے جھٹ یہ آیت پڑھی: "اللہ ان لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو غصے میں ضبط اختیار کرتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں۔"

امامؓ نے فرمایا: "جا! معاف کیا۔"

لونڈی پھر گویا ہوئی: "اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو دوسروں سے نیکی کرتے ہیں۔"

امامؓ نے فرمایا: "جا! میں نے تمہیں آزاد کیا۔"

مرسلہ: ارشد کشمیرا، لاہور

★★★★

اسلام دشمنی کا تاریخی گڑھ فرانس ہے جہاں سے گیارہویں صدی عیسوی کی آخری دہائی میں پہلی صلیبی جنگ کا آغاز ہوا تھا۔ گزشتہ مئی میں فرانسیسی انتہا پسند نیشنل فرنٹ کی سربراہ میرین لی پین ملکی صدارتی انتخاب کے دوسرے مرحلے میں تو پہنچ گئی مگر ایمانوئیل میکرون سے ہار گئی جو اب صدر مملکت ہیں۔ اس سے پہلے میرین کا اسلام مخالف باپ ژاں ماری پارٹی کا سربراہ رہا تھا، جب پارلیمنٹ میں "ایف این" زیادہ سے زیادہ آٹھ نشستیں لے سکی تھی۔ باپ کی شدت پسندی کے مقابلے میں میرین لی پین کچھ عرصے سے پارٹی کا نرم امیج دکھانے لگی تھی جب کہ ستمبر کے شروع میں اس کا رائٹ ہینڈ فلورین فلپو یہ کہہ کر پارٹی چھوڑ گیا کہ اب یہ جماعت خوفناک پسپائی پر اتر آئی ہے اور اقتصادی قوم پرستی اور سماجی مسائل کے بجائے دوبارہ امیگریشن اور قومی تشخص پر زور دینے لگی ہے۔

مرسلہ: زاہد حسن، فیصل آباد

شیر بانو کسے بناؤ گے؟"

شیر بانو کے کردار کے لیے تلاش شروع ہوئی تو ایکسٹرا لڑکی یاسمین جونیئر پر نظریں جم گئیں۔ "یار! یہ بھی پشتو اسپیکنگ ہے۔ خالص پٹھانی ہے۔"

"مگر فلم بین کیا کہیں گے۔" کوئی ہیروئن نہیں ملی تھی

کہ ایک ایکسٹرا لڑکی کو ہیروئن بنا دیا؟"

"یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔ روزینہ بھی تو چھوٹے موٹے کردار کرتے کرتے ہیروئن بنی اور "چکوری" کی شبانہ نے چکوری سے پہلے کب کوئی قابلِ ذکر کردار ادا کیا تھا۔"

"تو چلو یاسمین جونیئر بھی ڈن۔"

اور جب یاسمین جونیئر کو بتایا گیا کہ "ہم تمہیں اپنی فلم کی ہیروئن بنا رہے ہیں۔"

"کون سا فلم کا ہیروئن بنا رہے ہو؟"

"اپنی پشتو فلم یوسف خان شیر بانو کی ہیروئن۔"

"پشتو فلم؟"

"ہاں ہم پہلی پشتو فلم بنا رہے ہیں۔ تم پختون ہو نا، اس لیے اس کی ہیروئن کے لیے تمہیں کاسٹ کرنا چاہتے ہیں۔"

"یاسمین جونیئر کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ گویا اس کے نام کوئی بڑی لاٹری نکل آئی ہو۔ اسے بعد میں بتایا گیا کہ اب تم یاسمین جونیئر نہیں، یاسمین خان ہو، ہم اسی نام سے تمہیں فلم میں پیش کریں گے۔"

دیگر کاسٹ کے لیے ترنم، ماہ پارہ، ساقی، شہباز درانی، سیٹھی، شیریں تاج اور نعمت سرحدی کو شامل کیا گیا۔

موسیقی کے لیے لال محمد اقبال، نغمہ نگاری کے لیے علی حیدر جوشی اور عکاسی کے لیے مدد علی مدن کی خدمات حاصل کی گئیں۔

پہلی پشتو فلم ہونے کے ناتے سب نے فلم ساز سید نذیر حسین، مدد علی مدن اور شیخ قاضی کی کوششوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ مکمل تعاون کیا۔ اس طرح نہ صرف یہ فلم کم لاگت سے بنی اور اس کی تکمیل میں زیادہ دیر بھی نہیں لگی۔ یکم دسمبر 1970ء کو کراچی کے گوڈین سنیما میں پہلی پشتو فلم "یوسف خان شیر بانو" ریلیز کر دی گئی۔ اس کی متوقع کامیابی کے بعد دیگر سنیماؤں میں بھی یہ فلم دکھائی گئی اور اس نے 28 ہفتے چل کر سلور جوبلی کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ کراچی کے بعد صوبہ سرحد کے سنیماؤں میں بھی اس فلم نے زبردست عوامی پذیرائی حاصل کی۔

اسی طرح پہلی سندھی فلم کا اعزاز "عمر ماروی" کو ملا۔

"عمر ماروی" کی کہانی وادی سندھ کے ایک قدیم رومان اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کی سبق آموز مثنوی سے ماخوذ ہے۔ جسے قاضی عبدالرحیم نے کہانی کی شکل دی اور اس قدر خوب صورتی اور فنکاری سے پیش کیا کہ زبردست پذیرائی حاصل ہوئی۔

نامور اداکار اور ہدایت کار شیخ حسن اس پہلی سندھی فلم کے تخلیق کار اور ہدایت کار تھے۔ اس فلم کے بارے میں، میں بہت تفصیل کے ساتھ شیخ حسن کی شخصیت اور فن کے بارے میں لکھ چکا ہوں جو سرگزشت کے انہی صفحات میں شائع ہو چکے ہیں۔ بہرحال یہاں اختصار کے ساتھ یہ بتاؤں گا کہ اس پہلی سندھی فلم "عمر ماروی" کے بنانے کا مرحلہ کیسے پیش آیا۔

شیخ حسن کا تعلق نہ سندھ کی دھرتی سے تھا نہ وہ سندھی تھے۔ بمبئی کی فلم انڈسٹری میں فلمیں بناتے تھے۔ وہاں بھی انہوں نے اردو فلمیں بنائیں اور ان میں اداکاری کی اور پاکستان آنے کے بعد بھی اردو فلموں میں اداکاری کی اور اردو زبان کی فلمیں ہی ڈائریکٹ کیں۔

وہ جو فلمیں بھی بناتے تھے، اس کے لیے بڑی تحقیق و تصدیق کیا کرتے تھے۔ انہیں ایک بار خیال آیا کہ کہانیوں کی تلاش کے لیے اندرون سندھ کے دورے کیے جائیں اور اوریجنل کہانی ڈھونڈ نکالی جائے۔ ایسے ہی ایک دورے کے دوران ان کی ملاقات سید حسین علی شاہ فاضلانی سے ہوئی جو ایک بڑے زمیندار تھے اور ادب آرٹ کے دلدادہ تھے۔ انہیں معلوم ہوا کہ کراچی سے ایک فلم ڈائریکٹر ادھر آئے ہوئے ہیں تو انہیں بلا کر ان سے ملاقات کی اور بتایا کہ میں اگرچہ اندرون سندھ رہتا ہوں اور زمینداری کرتا ہوں، اس کے باوجود فن اور فنکاروں سے پیار کرتا ہوں اور......"

"آپ کو فلموں میں کام کرنے کا شوق ہو تو کراچی چلیے اور میری فلموں میں اداکاری کیجیے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ شیخ صاحب! کیا مجھ جیسا ایک دیہاتی اداکاری کر سکے گا؟"

"کیوں نہیں۔ کوشش، لگن اور شوق ہو تو کوئی بھی شخص کچھ بھی کر سکتا ہے۔ آپ تو ماشاء اللہ پڑھے لکھے بھی ہیں۔ آپ کے لیے زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔"

جب تک شیخ حسن وہاں رہے فاضلانی صاحب سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں ایک دن شیخ صاحب بولے۔

"مجھے یہاں کی ایک لوک کہانی بہت پسند آئی ہے اللہ نے کبھی موقع دیا تو اسے ضرور فلماؤں گا۔"

"کون سی لوک کہانی؟"

"عمر اور ماروی کی محبت بھری کہانی۔"

''یہ تو سندھ کے عظیم پیر و مرشد اور صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کی ایک مثنوی کی منظوم کہانی ہے۔''

''جی ہاں، مجھے زبانی طور پر کہانی سنانے والے نے یہی بتایا ہے۔ فاضلانی صاحب! زبردست کہانی ہے۔''

''اگر آپ کو واقعی یہ بہت پسند آئی ہے تو اسے اردو میں منتقل کروا کر فلم بنائیے۔''

''نہیں فاضلانی صاحب! اس فلم کا صحیح مزہ تو سندھی زبان ہی میں آئے گا۔''

''مگر سندھی زبان کی فلم تو ہمارے ہاں نہیں بنتی۔ اردو اور پنجابی زبان کی فلمیں بنتی ہیں۔''

''نہیں بنتی ہیں تو میں بناؤں گا۔''

''یعنی آپ پہلی سندھی فلم بنانے کا اعزاز حاصل کریں گے؟''

''جی ہاں۔''

''تو پھر......'' فاضلانی جھٹ بول پڑے۔ ''اس ثواب میں آپ مجھے بھی شامل کر لیں۔''

''وہ تو آپ پہلے سے شامل ہیں بطور اداکار۔''

''میرا مطلب کچھ اور ہے۔ پہلی سندھی فلم اگر سندھ دھرتی کے ایک بیٹے کے پیسے سے بنائی جائے تو کتنا اچھا ہو گا۔ میں نے جو کچھ کمایا ہے اسی سندھ دھرتی سے کمایا ہے۔''

''اگر آپ کی یہ خواہش ہے تو میں اس کا احترام کروں گا۔ بسم اللہ! آپ پہلی سندھی فلم ''عمر ماروی'' کے فلم ساز اگر آپ اجازت دیں گے تو میں بطور ہدایت کار آپ کی خدمت کرنے کو تیار ہوں۔''

فاضلانی نے زور سے قہقہہ لگا کر شیخ حسن کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ''بظاہر تو آپ بڑے سنجیدہ طبیعت کے لگتے ہیں مگر آپ میں حس مذاق بھی بہت ہے۔''

شیخ حسن اندرون سندھ کہانی کی کھوج میں گئے تھے۔ وہاں انہیں کہانی بھی ملی اور اسے فلمانے کے لیے فلمساز بھی دستیاب ہو گیا۔

شیخ حسن کراچی آئے تو انہوں نے فاضلانی فلمز کے نام سے ایک فلم ساز ادارے کا قیام عمل میں لایا اور اگلا کام یہ کیا کہ کسی مستند سندھی ادیب کو ڈھونڈ نکالا اور ان سے پوچھا۔ ''آپ نے شاہ عبداللطیف بھٹائی کو پڑھا ہے؟''

قاضی عبدالرحیم زور سے ہنسے۔ ''ارے بابا! ان کو پڑھے بغیر کوئی سندھی زبان کا ادیب کیسے بن سکتا ہے؟ وہ تو سندھ دیش کے عظیم صوفی شاعر ہیں۔''

''سائیں! ان کی مثنوی میں ایک منظوم کہانی ہے، عمر ماروی کی میں اس کہانی کو فلمانا چاہتا ہوں۔''

''ضرور فلمائیں۔ بہت محبت بھری کہانی ہے۔ کیا اس کہانی کو اردو زبان میں فلم کا روپ دینا چاہتے ہیں؟''

''نہیں قاضی سائیں! میں اسے سندھی زبان ہی میں فلمانا چاہتا ہوں۔''

''مگر سائیں! میری معلومات کے مطابق تو یہاں اس سندھ دھرتی میں ابھی تک کوئی سندھی فلم نہیں بنی ہے۔ کیا سندھی بھاشا میں بھی فلم بن سکتی ہے اور اسے لوگ دیکھ سکتے ہیں؟''

''واقعی! یہاں اب تک کوئی سندھی فلم نہیں بنی ہے اسی لیے تو میں پہلی بار ایک سندھی فلم بنا کر اس کا آغاز کرنا چاہتا ہوں اور رہی بات اسے دیکھنے کی تو یہ زبان بولنے اور سمجھنے والے لوگ ہی اسے دیکھیں گے۔''

سندھی ادیب قاضی عبدالرحیم کو شیخ حسن نے نہ صرف شاہ کی مثنوی کی منظوم کہانی کو نثر کے روپ میں لکھنے کا ٹاسک دیا بلکہ ان سے کہا۔ ''آپ اس کہانی کو فلمی انداز میں بھی ڈھالیں گے۔''

قاضی عبدالرحیم کراچی میں رہتے تھے اور ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ فنی اور ثقافتی کاموں میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ فلمیں بہت شوق سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے بخوشی شیخ حسن کی فلم لکھنے کی ذمہ داری سنبھال لی۔ یہ ان کی دیدہ وری کا کمال تھا کہ انہوں نے بھٹائی شاہ کی اصل کہانی میں جابجا انحراف کرتے ہوئے اس میں تبدیلی کی اور مزاحیہ عنصر داخل کر کے اس کہانی کا المیہ انجام بھی بدل دیا اور اسے ایک کامیڈی فلم کی شکل دے دی جس سے اس فلم کی تفریحی حیثیت میں اضافہ ہو گیا۔

شیخ حسن بھی بہت جہاں دیدہ ہدایت کار تھے۔ انہوں نے ان ساری تبدیلیوں کو قبول کیا کہ تماشائی کن باتوں کو پسند اور ناپسند کرتے ہیں۔ ٹریجڈی اینڈ کی فلمیں عام طور پر فلاپ ہو جاتی ہیں۔ فلم کی کچھ اپنی ضرورتیں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے اوریجنل کہانیوں میں تبدیلی لازمی بھی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں اس فلم کے مکالمہ نگار رشید احمد لاشاری نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ لاشاری صاحب عمر ماروی کے نغمہ نگار بھی تھے۔ موسیقی عبداللطیف اور غلام علی نے ترتیب دی تھی۔ انہوں نے شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کچھ اصل اشعار بھی گیتوں کی شکل میں شامل کیے۔

کاسٹ میں فاضلانی، نکہت سلطانہ، چارلی، ببو، سرفراز، غریب شاہ، اقبال، لالی، قمر آرا، سلمٰی رشیدہ، ایس اے غفار، وحید اور شیخ حسن شامل تھے۔ اس فلم میں عمر سومرو کا کردار سید حسین علی شاہ فاضلانی نے جب کہ ماروی کا کردار نکہت سلطانہ نے بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ شیخ حسن نے ماروی کے منگیتر کا کردار بڑی کامیابی سے ادا کیا۔ چارلی نے فلم کے تفریحی پہلو کو بڑی تقویت بخشی۔ برصغیر کی پہلی سندھی فلم کراچی میں بروز اتوار 13 مئی 1956ء کو عیدالفطر کے موقع پر نشاط سینما میں نمائش پذیر ہوئی جہاں 6 ہفتے 5 دن جب کہ کل 14 ہفتے تک زیر نمائش رہی جب کہ اندرون سندھ بھی اسے بڑے شوق سے دیکھا گیا اور اچھا رسپانس ملا۔

سندھی فلموں کے بارے میں یہ بات جاننے کی ہے کہ سندھی زبان بولی اور سمجھی صرف سندھ میں ہی جاتی ہے اس لیے اس کا کاروباری سرکٹ صرف سندھ تک محدود ہے اس لیے سندھی فلمیں اس تناظر میں سراٸیو نہ کر سکیں۔ کچھ سندھی فلمیں ضرور بنائی گئیں مگر آخر کار مایوس کن کاروبار کی وجہ سے سندھی فلمیں نہ بنائی جا سکیں۔

پاکستان میں پہلی گجراتی فلم ''ماں تے ماں'' تھی۔

گجراتی فلم بنانے کا خیال یوں آیا کہ کراچی میں گجراتی زبان کے اسٹیج ڈرامے بہت مقبول تھے۔ کراچی میں گجراتی زبان بولنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ جو عام طور پر کاروبار کرتے ہیں۔ ان کی بہترین تفریح اسٹیج ڈرامے تھے جو کراچی میں اسٹیج ہوتے تھے اور کاروباری لحاظ سے کامیاب رہتے تھے۔

ان ہی کامیابیوں کو دیکھ کر کچھ لوگوں نے سوچا کہ ان کی گجراتی زبان میں بھی فلم بننی چاہیے۔ کراچی کی فلم انڈسٹری میں گجراتی اسپیکنگ کوئی بندہ موجود نہیں تھا۔ لہٰذا انہوں نے فلم ساز قدیر خان سے کہا۔ ''آپ کوئی گجراتی فلم بھی بنائیں۔''

''گجراتی فلم؟ نہیں یار! گجراتی فلم چلے گی نہیں۔''

''کیسے نہیں چلے گی اگر گجراتی اسٹیج ڈرامے اتنے چلتے ہیں تو......''

''ہاں گجراتی ڈرامے تو......'' قدیر خان نے اعتراف کیا۔ یہ قدیر خان وہی تھے جنہوں نے ''نادان'' جیسی سپر ہٹ فلم کے علاوہ کئی فلمیں بنائی تھیں۔ وہ گجراتی فلم بنانے پر رضا مند ہو گئے اور اپنے فلم ساز ادارے ایشین مووِیز کے بینر تلے پہلی گجراتی فلم بنانے کا اعلان کر دیا۔

انہوں نے سب سے پہلے اقبال اختر کو بطور ہدایت کار لیا جو ان کی فلموں کو پہلے بھی ڈائریکٹ کر چکے تھے۔

''یار اقبال اختر ایک گجراتی فلم بنانی ہے۔''

اقبال اختر نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ''یہ آپ کس چکر میں پڑ گئے؟''

''کیوں چکر کیسا؟''

''آپ اگر پنجابی فلم بنائیں یا کوئی پشتو فلم بنائیں تو اس سے کمائی کا کچھ آسرا ہو سکتا ہے۔ گجراتی فلم کون دیکھے گا؟''

''کراچی میں بہت گجراتی رہتے ہیں۔ وہ اگر گجراتی ڈرامے شوق سے دیکھتے ہیں تو کیا گجراتی فلم نہیں دیکھیں گے؟''

قصہ مختصر یہ کہ قدیر خان نے اقبال اختر کو گجراتی فلم بنانے پر رضا مند کر لیا۔ اب مرحلہ اس کی کہانی اور اسکرپٹ رائٹنگ کا در پیش ہوا اور انہوں نے یہ کام صبا فاضلی کو سونپا۔ صبا فاضلی نے ایک پس ماندہ بستی میں مقیم کرداروں کے حوالے سے کہانی تحریر کی۔ کہانی فلم ساز اور ہدایت کار دونوں کو اچھی لگی۔

''فاضلی صاحب! آپ کو اس کا فاضل......میرا مطلب ہے دیگر کام بھی آپ ہی کو کرنا پڑے گا۔''

''کیسا کام؟''

''ارے یار!'' اقبال اختر نے قدیر خان کی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''ان کا مطلب ہے اس فلم کے مکالمے بھی آپ ہی لکھیں گے۔''

''اچھا یہ مطلب ہے۔ لکھ دوں گا۔''

اسکرین پلے ہدایت کار اقبال اختر نے خود ہی لکھا جب کہ گیتوں کے لیے موسیقار لعل محمد اقبال اور نغمہ نگاری کے لیے میر جونا گڑھی کا انتخاب کیا اور عکاسی کی ذمہ داری جان محمد جمن کو سونپی گئی۔ اب اگلا مرحلہ بہت دشوار گزار تھا اور یہ تھا پرفارم کرنے والے آرٹسٹوں کا انتخاب۔ انہوں نے کراچی میں اسٹیج کیے جانے والے اسٹیج آرٹسٹوں کا جائزہ لیا تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی۔

''خان صاحب! یہ آرٹسٹ تو فلم میں نہیں چلیں گے۔''

قدیر خان نے اقبال اختر کی بات میں وزن محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''پھر کیا کرو گے؟''

""چونکہ ہم فلم بنا رہے ہیں اس لیے ہمیں ایسے آرٹسٹوں کو کاسٹ کرنا پڑے گا جو فلم کے تقاضے پورے کر سکیں۔ جنہیں فلم بین قبول کر سکیں۔""

""ٹھیک ہے۔ تم فلم کی ڈیمانڈ کے مطابق آرٹسٹ منتخب کرو۔""

اور اقبال اختر کے مشورے پر اداکار آغا سجاد، شائستہ قیصر، سائرہ بانو، اے کے پٹیل، خورشید انور، عثمان میمن، سجانی بایونس وغیرہ کاسٹ کر لیے گئے۔ اسکرپٹ مکمل ہونے کے بعد فلم کا نام ''ماں تے ماں'' رکھا گیا۔

''ماں تے ماں'' کا مرکزی رومانوی کردار شائستہ قیصر اور آغا سجاد نے ادا کیا۔ آغا سجاد تو بطور اداکار اداکاری کرتے رہے تھے مگر شائستہ قیصر کو پہلی بار اداکاری کا موقع دیا گیا تھا۔ اس فلم کی خاص بات یہ تھی کہ اس کی تمام شوٹنگ صرف 22 دنوں میں مکمل کر لی گئی تھی۔ تمام اِن ڈور شوٹنگ اقبال اختر کرتے تھے جب کہ آؤٹ ڈور خورشید نے مکمل کرائی۔ پوری فلم بڑے اطمینان اور اچھے طریقے سے بنائی گئی۔

پہلی گجراتی فلم ''ماں تے ماں'' کی نمائش منگل کے دن یکم دسمبر 1970ء کو کراچی کے کوہ نور سینما میں ہوئی اور چار ہفتے تین دن تک چلی۔ کل چھ ہفتے مکمل کیے۔ یہ فلم اگرچہ کامیاب رہی لیکن اس کے بعد صرف ایک اور گجراتی فلم ''پریم بندھن'' ہی بنائی جا سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گجراتی فلم دیکھنے والے بس کراچی ہی میں رہتے تھے اس لیے گجراتی فلموں کو گھاٹے کا سودا سمجھ کر اس سلسلے کو آگے نہیں بڑھایا گیا۔

پہلی سرائیکی فلم ''دھیاں نمانیاں'' تھی۔

سرائیکی زبان بولنے اور سمجھنے والوں کا طبقہ خاصا بڑا ہے۔ پہلی سرائیکی فلم بنانے کا خیال فلم ساز ندیم عباس اور ہدایت کار عنایت حسین بھٹی کو آیا۔ انہوں نے ندیم پکچرز کے نام سے فلم ساز ادارہ بنایا اور اس فلم کا کام شروع کر دیا۔ کہانی لکھنے کی ذمہ داری سید رضا زیدی کو سونپی مکالمے قیصر ملک نے لکھے۔ موسیقی کے لیے ماسٹر عاشق حسین اور نغمہ نگاری کے لیے وارث لدھیانوی کا انتخاب کیا جب کہ موسیقار نے حضرت خواجہ غلام فرید کے بھی کچھ اشعار شامل کیے۔

مصنف نے ایک تعمیری موضوع پر کہانی لکھی یہ ان رسومات کے خلاف تھی جس کی آڑ میں بیٹیوں کی معصوم زندگیوں کو داؤ پر لگا دیا جاتا ہے۔ انہیں میں ایک رسم وٹہ سٹہ کی ہے۔ اس قبیح رسم کی بھینٹ چڑھنے والی بیٹیاں ساری زندگی اذیت ناک حالات کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس فلم کا موضوع چونکہ بہت نازک تھا اس لیے عنایت حسین بھٹی نے اپنے ساتھ سینئر ہدایت کار سید رضا زیدی کو بھی رکھا۔ فلم کی تکمیل میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کیونکہ فلم میں اداکاری کرنے والے سارے ہی آرٹسٹ منجھے ہوئے اور تجربہ کار تھے۔ اس پہلی سرائیکی فلم ''دھیاں نمانیاں'' کی کاسٹ میں عنایت حسین بھٹی، خانم، صاعقہ، رخسانہ ملتانی، ننھا، افضال احمد، تاج ملتانی اور اسد بخاری شامل تھے۔ فلم بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ مکمل کر لی گئی اور ملتان میں 7 دسمبر

دیوجانس کلبی

دیوجانس کلبی 412 تا 323 قبل مسیح میں ترکی میں بحر اسود کے ساحلی شہر سائنوپ میں پیدا ہوا۔ یونان کے شہر ایتھنز میں تعلیم کی غرض سے گیا جہاں وہ اینٹی ستھینز کا شاگرد بنا۔ اینٹی ستھینز، سقراط کا شاگرد تھا جس نے سقراط کی وفات کے بعد کلبیہ مکتب فکر کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ خلوت نشین نہیں تھا مگر دنیا کے ہنگاموں میں نہ پڑتا۔ اس کا کہنا ہے کہ دنیاوی خوشیوں کو حاصل کرنے سے تو پاگل ہو جانا بہتر ہے۔ دیوجانس اپنے استاد سے بہت متاثر رہا۔ اسی کے مکتب فکر کا نمائندہ رہا۔ استاد کی بہ نسبت کہیں زیادہ مشہور ہوا۔ اس شہرت کی بنا پر بعض حضرات سے کلبیہ مکتب فکر کا باوا آدم سمجھ بیٹھے۔

مرسلہ: عابدہ زاہد، ملتان

آگرہ فورٹ

تاج محل کے سامنے دریائے جمنا کے دوسری طرف آگرہ کا معروف قلعہ ہے۔ آگرہ فورٹ جسے اکبر اعظم نے 1685ء میں بنوایا تھا، آگرہ کا قلعہ دلی کے لال قلعے سے زیادہ بڑا اور خوب صورت ہے۔ اس کی فصیل بہت چوڑی ہے جیسا کہ قلعوں کی ہوتی ہے تاکہ کوئی آسانی سے اندر نہ آنے پائے۔ فصیل کے ساتھ گہری کھائیاں بھی تھیں، جن میں پانی بھرا ہوتا تھا۔

مرسلہ: ارشد سکھیرا، لاہور

1973ء کو ریلیز ہوئی اور 50 ہفتے چلی جب کہ کراچی میں 27 دسمبر 1974ء کو تاج سینما میں نمائش پذیر ہوئی اور 12 ہفتے تک چلی۔

پہلی انگریزی فلم "بیانڈ دی لاسٹ ماؤنٹین" تھی۔

انگریزی زبان کی پاکستانی فلم پر چونکیے نہیں چونکہ یہ زبان بھی ہمارے ملک کے طول و عرض میں پڑھے لکھے لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں اس لیے اس زبان میں ہماری فلم انڈسٹری میں فلم، بنانا کوئی انوکھی بات نہیں۔ پاکستان کی یہ پہلی انگریزی فلم "بیانڈ دی لاسٹ ماؤنٹین" بھی ایک پڑھے لکھے انگریزی داں شخص نے بنائی تھی۔ جن کا نام جاوید جبار ہے۔ ان کی سوچ تھی کہ اگر ہمارے ہاں دیگر زبانوں کی فلمیں بنائی جاتی ہیں تو ہم انگریزی زبان میں فلم بنا کر کیوں نہ اپنی ثقافت اور روایت کو سامنے لائیں کہ پاکستان سے باہر بھی ان کی شناخت ہو سکے۔

بڑے لوگوں کی بڑی سوچ ہوتی ہے۔ جاوید جبار صاحب نے اس مقصد کے لیے اپنا فلم ساز ادارہ ایم این جے کمیونی کیشن کے نام سے بنایا اور بطور فلم ساز و ہدایت کار اس کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ اس کی کہانی بھی خود ہی لکھی اور اسکرپٹ بھی تیار کیا اور اس میں ہماری ثقافت کی کچھ اصلی روایات کو ہماری فلموں میں کچھ نئے تصورات اور ایک نئے انداز میں پیش کیا۔ اس کہانی کے کردار ترقی پسندانہ اور حقیقی زندگی کے عکاس تھے اور جدت اور تازگی لیے ہوئے تھے۔ اس فلم کی شوٹنگ انہوں نے حقیقی مقامات پر کی۔ پاکستان کی یہ پہلی انگریزی فلم کراچی میں 20 اگست 1976ء کو کیپٹل سینما میں ریلیز ہوئی۔

اس انگریزی فلم کی موسیقی سہیل رعنا نے ترتیب دی تھی اور عکاسی اشتیاق احمد نے کی تھی۔ چونکہ فلم انگریزی زبان کی تھی اس لیے ایسے ہی اداکاروں کا انتخاب کیا گیا جو آسانی سے انگریزی بول سکتے تھے اور اس مقصد کے لیے ٹی وی کے آرٹسٹوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہ عثمان پیرزادہ، شمیم احمد، مریانہ حق، مرزا غضنفر بیگ، منیرا ہاشمی، انوشکا، سبحانی بایونس، ظہور احمد اور امتیاز احمد تھے۔ اس انگریزی فلم کو بعد میں اردو ورژن میں بھی "مسافر" کے نام سے پیش کیا گیا۔ "بیانڈ دی لاسٹ ماؤنٹین" بھرپور پبلسٹی اور دیگر خوبیوں کے باوجود عوامی پسندیدگی حاصل نہ کر سکی جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس میں عوامی پسندیدگی کا مال مصالحہ نہیں تھا۔ جاوید جبار نے ایک صاف ستھری اور حقائق پر مبنی فلم بنائی تھی۔ اس فلم کی باکس آفس پر ناکامی کے بعد انہوں نے پھر کوئی انگریزی فلم نہیں بنائی۔

پہلی ہندکو فلم "قصہ خوانی" تھی۔

ہندکو بھی ہمارے ملک کے کچھ علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ ہمارے نامور شاعر اور فلمی نغمہ نگار قتیل شفائی بھی اس زبان کے بولنے اور سمجھنے والے تھے۔ ایک بار ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ میں ایک ہندکو فلم بناؤں اور انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے۔ ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ قتیل شفائی وہ شخصیت تھے جنہوں نے پاکستان کی پہلی اردو فلم "تیری یاد" سے اس فلمی دنیا کی خدمت کی تھی۔ وہ کامیاب نغمہ نگار تھے مگر انہوں نے کبھی فلم بنانے پر توجہ نہیں دی تھی مگر ہندکو زبان میں فلم بنانے کا خیال آیا تو قتیل پروڈکشنز کے نام سے اپنا فلم ساز ادارہ قائم کیا اور ہدایت کاری کے لیے اپنے صاحبزادے تنویر قتیل کا انتخاب کیا۔ کہانی اور مکالمے فارغ بخاری سے لکھوائے۔ موسیقی کا شعبہ عنایت حضروی کو سونپا۔ گیت خود لکھے۔ عکاسی کے لیے اے غنی کو مقرر کیا۔ اداکاری کے لیے یاسمین خان، جلال، وحیدہ خان، آصف خان، وحیدہ گل، صابر دیم، عشرت چوہدری، بشیر جعفری، اقبال بخاری، طالش، شوکت خٹک، رنگیلا اور سلطان راہی کو کاسٹ کیا۔

چونکہ اس پہلی ہندکو فلم کے فلم ساز قتیل شفائی خود تھے۔ ان کا فنانسر کوئی نہیں تھا اس لیے وہ اپنے وسائل سے ہی سست رفتاری کے ساتھ فلم بنانے پر مجبور تھے اس لیے اس کی تکمیل میں کئی سال لگ گئے اور جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو اپنی کشش کھو چکی تھی۔ پہلی ہندکو فلم "قصہ خوانی" پشاور میں بروز بدھ 13 اگست 1980ء کو عیدالفطر کے موقع پر کیپیٹل سینما میں ریلیز ہوئی اور صرف تین ہفتے ہی چل سکی اور قتیل شفائی صاحب کو پہلی ہندکو فلم بنانے کے اعزاز کے علاوہ اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

مشرقی پاکستان میں بننے والی پہلی بنگالی فلم "مکھ او مکھوش" تھی۔

آج کی نئی نسل کو سب سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ آج جس خطے کو بنگلہ دیش کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا وہ 14 اگست 1947ء سے 16 دسمبر 1971ء تک مشرقی پاکستان کہلاتا تھا یعنی ہمارے پاکستان کا ہی ایک حصہ ایک بازو تھا۔ وہاں آبادی کی اکثریت بنگالیوں کی تھی جن کی

مادری زبان بنگالی تھی وہاں ہندوستان سے ہجرت کر کے اردو بولنے والے لوگ بھی بڑی تعداد میں آبسے تھے۔ وہاں سنیما گھر بھی تھے جن میں لاہور اور کراچی کی بنائی ہوئی اردو فلمیں اور کلکتے کی بنگالی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔

ایک صاحب جن کا نام عبدالجبار خان تھا جو شوقیہ اسٹیج ڈراموں میں اداکاری بھی کرتے تھے ایک بار انہوں نے سوچا۔ اگر ہمارے ہاں بنگالی زبان کے اسٹیج ڈرامے دیکھے اور پسند کیے جاتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اگر ہمارے ہاں بنگالی زبان میں فلم بنائی جائے تو وہ بھی دیکھی اور پسند کی جائے گی۔ اس خیال نے انہیں ہر وقت بنگالی فلم بنانے کا خواب دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ گزرتے ہوئے ہر دن کے ساتھ ان کا عزم پختہ ہوتا گیا۔ ''ہاں یہ کام میں ہی کروں گا۔ میں ہی اس دیش میں پہلی بنگالی فلم بناؤں گا۔'' ان دنوں وہاں فلم سازی کا کوئی ساز و سامان موجود نہیں تھا۔ عبدالجبار خان کی سادہ لوحی کا یہ عالم تھا کہ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں مگر ان کا ارادہ بڑا پختہ تھا۔ لہٰذا اس کے سر و سامانی کے باوجود شکست نہیں مانی اور کلکتہ کی فلم انڈسٹری کے کچھ لوگوں سے رابطہ کیا۔ ان میں اس انڈسٹری کے ایک اسسٹنٹ کیمرا مین کیو ایم زمان بھی تھے۔ ان کو راضی کیا کہ وہ ان کی مدد کریں۔ نہ صرف کلکتے سے ڈھاکے تشریف لائیں بلکہ کوئی پرانا سیکنڈ ہینڈ کیمرا بھی اپنے ساتھ لائیں۔

بھرا میلہ چھوڑنے کا کس کو جی چاہتا ہے مگر انہوں نے کلکتے کی پائیدار اور مستحکم فلم انڈسٹری چھوڑ کر ڈھاکے آنے اور یہاں نئی فلم انڈسٹری کی داغ بیل ڈالنے والے کا ساتھ دینا ضروری خیال کیا۔

''آپ کو میری پہلی بنگالی فلم کی عکاسی بھی کرنی پڑے گی۔'' عبدالجبار خان نے کیو ایم زمان سے کہا۔

''آپ نے اب تک اور کیا تیاریاں کر لی ہیں؟''

''میں نے اپنا فلم ساز ادارہ اقبال فلمز لمیٹڈ قائم کر لیا ہے۔ اس کی کہانی بھی تقریباً مکمل کر لی ہے۔ یہ ایک بنگالی ناول سے ماخوذ ہے۔ یہ ناول ''چہرہ اور نقاب'' کے نام سے ہے۔ لہٰذا میں نے بھی اپنی فلم کا نام ''مکھ او مکیش'' رکھا ہے۔ یہ ایک ڈاکو کی کہانی ہے جو شریف لوگوں کی بستی میں شریف ابن شریف بن کر رہتا ہے مگر راتوں کے اندھیرے میں نقاب پوش ڈاکو بن کر بندگان خدا کو لوٹتا ہے۔ اس کے ڈاکو ساتھی اور کارندے جنگل میں رہتے ہیں اور وہیں ان کی آماجگاہ ہے۔''

''یعنی آپ کی زیادہ تر شوٹنگ آؤٹ ڈور میں ہو گی؟''

''جی ہاں۔''

کیمرا تو کیو ایم زمان لے آئے تھے۔ اب ساؤنڈ ریکارڈنگ کا دوسرا بنیادی مسئلہ تھا۔ عبدالجبار خان نے اس کا حل فلپس کمپنی کا گھریلو ٹیپ ریکارڈر سے نکالا۔ اسکرپٹ مکمل کرنے کے بعد اس کے کرداروں کو پرفارم کرنے کے لیے آرٹسٹوں کا چناؤ کیا گیا جو ان دنوں اسٹیج ڈراموں سے وابستہ تھے کچھ نئے بھی تھے۔ کاسٹ ان لوگوں پر مشتمل تھی۔ سیف الدین، پرنیا، جوہر آراء، جبار خان، سونا میاں، انعام احمد خان اور بلقیس بانو جب کہ موسیقی ترتیب دینے کے لیے بیل داس کا انتخاب کیا گیا۔

پوری ٹیم نے بڑی محنت، لگن اور دیانتداری سے اپنا اپنا کام کیا مگر ساز و سامان کی عدم دستیابی اور فلم ساز ہدایت کار عبدالجبار کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے فلم فنی طور پر کمزور ترین تھی۔ آؤٹ ڈور میں فلمائے گئے مناظر میں آرٹسٹوں کی آوازوں میں پرندوں کی اور دوسری آوازیں بھی شامل ہو جاتی تھیں۔ ایڈیٹنگ اور پروسیسنگ کا معیار بھی بے حد ناقص تھا۔ بہرحال فلم جیسی بھی تھی مکمل ہونے کے بعد 3 اگست 1956ء کو روپ محل سنیما ڈھاکا میں ریلیز کر دی گئی اور بنگالی فلم بینوں نے تمام تر خرابیوں کے باوجود مشرقی پاکستان کی پہلی بنگالی فلم ''مکھ او موکش'' بڑی تعداد میں دیکھی اور سراہی گئی۔ عبدالجبار خان نے اس فلم کے چار پرنٹس تیار کروائے جن میں تین چٹا گانگ، کھلنا اور نرائن گنج میں اور ایک ڈھاکے میں ریلیز کی گئی۔

یہ فلم زیادہ کامیاب تو نہیں ہوئی مگر اس فلم کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں فلم سازی کا دروازہ کھل گیا اور فلم سازی کو فروغ دینے کے لیے مشرقی پاکستان کی حکومت نے بھرپور سپورٹ کیا اور جدید ساز و سامان سے آراستہ ایک اسٹوڈیو قائم کیا جس نے فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن (ایف ڈی سی) کے نام سے ڈھاکا فلم انڈسٹری کو زندہ کیا۔

کیمرا مین کیو ایم زمان ایف ڈی سی اسٹوڈیو کے نگراں اعلیٰ قرار دیے گئے۔ یہ کیو ایم زمان وہی ہیں جنہوں نے بعد میں اداکارہ سلطانہ زمان سے شادی کی اور ڈھاکے کی متعدد بنگالی اور اردو فلموں کی عکاسی کی۔

پہلی بلوچی فلم ''ھمل و ماہ گنج'' تھی۔

بلوچی زبان بلوچستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

بلوچوں کی بڑی آبادی لیاری کراچی کے علاقے میں رہتی ہے۔ یہ اپنے رنگ روپ اور معاشرت کے حوالے سے بڑے تند و تیز لوگ ہوتے ہیں۔ بلوچی پڑھے لکھے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں پوزیشنوں میں بھی موجود ہیں مگر ان کی بڑی تعداد محنت مزدوری کرتی ہے۔ کچھ پڑھے لکھے بلوچوں کو خیال آیا کہ کوئی بلوچی زبان کی فلم بھی بنائی جانی چاہیے۔ ان میں کچھ اداکاری کے شعبے سے بھی وابستہ تھے اور ڈراموں وفلموں میں کام کرتے تھے۔ انور اقبال، شکیل لاسی، نور محمد لاشاری اور ساقی بھی تھے اور کچھ پڑھے لکھے صحافی جیسے نادر شاہ عادل۔ رمضان بلوچ۔ اختر بلوچ۔

بلوچی زبان میں فلم بنانے کا خیال اچھا تھا۔ چند پڑھے لکھے بلوچی ساتھیوں کے صلاح مشوروں اور تعاون سے پہلی بلوچی فلم ''ھمل وماہ گنج'' کی فلم سازی کی ابتدا کر دی گئی۔ فلم سازی کی ذمہ داری اداکار انور اقبال نے لی۔ ہدایت کاری کے لیے اسلم بلوچ کو منتخب کیا گیا۔ اسکرپٹ نادر شاہ عادل سے مکمل کروایا گیا۔ موسیقی فتح محمد نذیر نے دی، عکاسی ظاہر شاہ کی۔ کاسٹ ان لوگوں پر مشتمل تھی، انور اقبال، انیتا گل، شکیل لاسی۔ عشرت ناز، نور محمد لاشاری، نادر شاہ عادل، اے آر بلوچ اور ساقی۔

یہ فلم تھوڑے دنوں میں مکمل ہو گئی مگر افسوس صد افسوس کہ اسے سینما گھروں کی زینت بننا نصیب نہ ہوئی۔ بلوچ بھائیوں کی بڑی تعداد نے اس فلم کے خلاف احتجاج کیا کہ یہ فلم ریلیز کی گئی تو ہم سینما گھروں کو آگ لگا دیں گے۔ انہوں نے اپنی ناراضی کی وجہ یہ بتائی کہ کسی فلم کے ذریعے ہم اپنے بلوچی کلچر، اپنی بلوچی تہذیب و تمدن میں عریانی اور فحاشی پھیلانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ ہم اپنے بلوچ معاشرے میں فلموں کی گند پھیلانے کی ہرگز حوصلہ افزائی نہیں کریں گے۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ بلوچی فلم بنانے والے بھی بلوچی اور اس کے خلاف احتجاج کرنے والے بھی بلوچی تھے۔

☆......☆

اب ایک اور ایسی بات جو عام لوگوں کی زندگی کی طرح فلم والوں کی زندگی میں رونما ہوتی ہے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔ یعنی چٹ شادی پٹ طلاق۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ میں تو ایک خوشگوار پہلو ہوتا ہے کہ دو چاہنے والوں نے ایک دوسرے کو اپنانے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس پر فوری عمل درآمد کیا اور نئی پیار بھری زندگی کا آغاز کر دیا لیکن جب دو چاہنے والوں کے پیار کا بندھن ٹوٹنے کی اچانک خبر آتی ہے تو بڑا دکھ ہوتا ہے اور جب وہ نیا نویلا جوڑا ہو تو اور بھی دکھ ہوتا ہے۔

فلم دیکھنے والے تماشائی فلم والوں سے محبت بھی کرتے ہیں اور انہیں ہمیشہ شاد اور آباد دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک وقت تھا جب برصغیر پاک وہند کی فلموں میں کام کرنے والے فنکار اپنی حقیقی شادیوں کو خفیہ رکھتے تھے کہ ان کے پرستاروں کو ان کی شادی کی خبر ملے گی تو ان کا دل ٹوٹ جائے گا اور اس طرح ان کی مقبولیت میں کمی آئے گی مگر اب زمانہ بدل گیا ہے۔ پرستار اپنے فنکار کو ان کی ذاتی خوشیوں میں سرشار دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی شادی بیاہ پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں لیکن جب کسی دو فنکاروں کے درمیان پیار کا بندھن ٹوٹنے کی اطلاع ملتی ہے تو انہیں دکھ بھی ہوتا ہے۔

فلمی اداکاروں اور اداکاراؤں کو جب فلم بین اسکرین پر محبت کرتے دیکھتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں اور جب اس پیار کے نتیجے میں وہ ازدواجی بندھن میں بندھ جاتے ہیں تو انہیں اور بھی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کامیڈی اینڈ والی فلمیں زیادہ پسند کی جاتی ہیں اور کامیاب ہوتی ہیں مگر جب انہیں (تماشائیوں کو) خبر ملتی ہے کہ فلاں اداکار اور فلاں اداکارہ نے اپنی حقیقی زندگی میں علیحدگی اختیار کر لی ہے طلاق کی چھری ان کے پیار بھری زندگی کے گلے پر چل گئی ہے تو انہیں بڑا دکھ ہوتا ہے۔

فلموں کی کہانی کی ڈیمانڈ کے مطابق ایک دوسرے سے محبت کرتے کرتے اکثر ہیرو ہیروئن ایک دوسرے سے سچی مچی کی محبت میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں اور حقیقی زندگی میں بھی ایک دوسرے کے ہیرو ہیروئن بن جاتے ہیں۔ جیسے لالہ سدھیر اور شمی، شاہد اور بابرہ شریف، سنگیتا اور ہمایوں قریشی، نغمہ اور حبیب، جاوید شیخ اور سلمیٰ آغا، مشتاق چنگیزی اور چکوری، سونیا اور بابر، عمر شریف اور شکیلہ قریشی، تماشائیوں کا بڑا طبقہ ایسی خوشگوار خبر پر خوش ہوتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ یہ دونوں پریم بندھن میں بندھنے والے زندگی بھر ایک دوسرے کے جیون ساتھی بنے رہیں مگر جب وہ یہ بری خبر سنتے ہیں کہ یہ پریمی جوڑا چٹ نکاح پٹ طلاق کا شکار ہو گیا ہے تو ان پر گویا بجلی گر پڑتی ہے۔ چٹ نکاح اور پٹ طلاق کی سب سے افسوسناک خبر اداکارہ شمیم آرا اور ہدایت کار فرید احمد کی تھی۔ کل کے اخباروں میں ان کی شادی خانہ آبادی کی خبر شائع ہوئی اور آج صبح جب

اخبارات آئے تو ان میں شمیم آراء اور فرید احمد کی علیحدگی کی خبر چھپی ہوئی تھی۔ حیران بلکہ پریشان ہونے والوں میں، میں بھی تھا۔ یا اللہ یہ کیا ماجرا ہو گیا۔ اس قدر چٹ شادی اور پٹ طلاق کے بارے میں نہ کبھی سنا تھا نہ دیکھا تھا۔ ہفتوں، مہینوں بعد ہونے والے سانحات کے متعلق تو سنا تھا مگر یہ دلہن اور دولہا محض ایک رات کے۔ العجب، ثم العجب، ثم العجب!! کچھ دنوں تک فرید احمد لوگوں سے چھپتے چھپاتے پھرے کہ لوگوں کے سوالوں کا جواب نہ دینا پڑے مگر جب کچھ دنوں بعد یہ واقعہ بھول گئے تو فرید احمد نے دوسری شادی کر لی اور بچے وچے پیدا کر کے اپنے متعلق شکوک و شبہات ختم کر دیئے۔

شاہد ماضی کے اچھے اداکار ہی نہیں چٹ شادی اور پٹ طلاق کے چیمپئن بھی تھے۔ انہوں نے ساتھی اداکارہ زمرد سے شادی کی مگر یہ شادی خانہ آبادی کی بجائے خانہ بربادی پر جلد ہی ختم ہو گئی اور تھوڑے ہی دنوں بعد اخباروں میں خبر شائع ہوئی کہ خوبرو اداکار نے اداکار عشرت چوہدری کو اپنی شریک حیات بنالیا ہے۔ خبر پڑھنے والوں نے کہا۔ خدا کرے یہ جوڑی سدا سلامت رہے مگر جہاں شاہد ہو وہاں دلہن کی سلامتی کی کوئی گارنٹی نہیں اور وہی ہوا جو شاہد نے چاہا۔ جلد ہی عشرت چوہدری اپنی قسمت پر ماتم کر رہی تھی کہ کس ہرجائی سے دل لگایا تھا، اپنا بنایا تھا۔ دل لے کے مکر گیا ہائے بجن بے ایمان نکلا۔

سنگی ساتھیوں نے شاہد کو بہت سمجھایا۔ ”یار! یہ تیری ادا سمجھ میں نہیں آتی؟ شادی ایک مقدس فریضہ ہے تو اس کی ایسی تذلیل کیوں کرتا ہے؟“

مگر مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر۔ ایک دن اخباروں میں خبر چھپی کہ ایک فلم کی شوٹنگ میں اداکاری کرنے والے دو آرٹسٹ شاہد اور بابرہ شریف شوٹنگ کرتے کرتے سیٹ سے باہر گئے تو لوٹ کر نہیں آئے۔ کئی روز بیت گئے ہیں۔ ان کا کوئی اتا پتا نہیں۔ ان کے لیے تلاش گمشدہ کا اشتہار اس لیے نہیں دیا گیا کہ متعلقین کو یقین تھا کہ دونوں جائیں گے کہاں؟ لوٹ کر واپس آئیں گے اور چند دنوں کے بعد ایسا ہی ہوا۔ دونوں ہنستے مسکراتے وارد ہو گئے اور یہ خوش خبری سنائی کہ ہم اب غیر نہیں ایک دوسرے کے شریکِ حیات ہیں۔

کچھ سہیلیوں نے بابرہ شریف سے کہا۔ ”یہ تو نے کیا کیا؟“

”شادی کی ہے کوئی گناہ تو نہیں کیا۔“

”مگر کس سے شادی کی؟ وہ جو کبھی کسی کا نہیں ہوا۔“

”لیکن اب وہ کسی اور کا نہیں ہوگا۔ اس کو اپنی زلفوں کے بندھن میں اس طرح باندھ کر رکھوں گی کہ......“

مگر الٹی ہو گئیں سب تدبیریں۔ چند راتوں اور چند دنوں تک تو بھنورا صفت شاہد، بابرہ شریف کی پھول جیسی جوانی سے فیض یاب ہوتا رہا اور پھر اپنی تلون مزاجی کے باعث بائی بائی اور ٹاٹا کہتے ہوئے بابرہ شریف کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور چٹ بیاہ اور پٹ طلاق کی ایک اور مثال سامنے آگئی۔

اداکاروں اور اداکاراؤں کی آپس کی شادیاں یوں بھی پائیدار نہیں ہوتیں۔ خاص طور پر ایسے حالات میں جب دونوں اداکاری سے وابستہ رہیں۔ ان کے ازدواجی رشتے میں کسی نہ کسی بات پر دراڑیں پڑ جاتی ہیں اور طلاق کے بعد دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال سدھیر اور زیبا کی شادی اور طلاق ہے۔ لالہ سدھیر شادی شدہ تھے اس کے باوجود زیبا سے شادی کے بندھن میں بندھ گئے مگر یہ شادی خانہ آبادی نہیں بن سکی۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد یہ رفاقت، تفاوت میں بدل گئی۔ دونوں طلاق کے بعد ایک دوسرے کے نہ رہے۔

زیبا کی طرح زیبا بختیار بھی چٹ شادی اور پٹ طلاق کی مثال ہیں۔ بھارتی فلم ”حنا“ میں کام کرنے کے بعد وہ بہت بڑی اداکارہ بن گئی تھیں اور ان سے شادی کے خواہاں کئی بڑے لوگ تھے مگر وہ ایک فلم ”سرگم“ کی شوٹنگ کے دوران گلوکار و اداکار عدنان سمیع کے عشق میں ایسی گرفتار ہوئیں کہ ان کے بہت سے چاہنے والوں کی آہ نکل گئی۔

”ہائے زیبا بختیار! تم نے یہ کیا کیا! ہمارے بجائے اس گول گپے کو جیون ساتھی بنالیا جو اس قابل تو ہرگز نہیں تھا کہ تم اس پر اپنا تن من نچھاور کر دو۔“

شاید اس بات کا احساس زیبا بختیار کو جلد ہی ہو گیا کہ اس کا انتخاب غلط تھا اور پھر ان کا سنگم زیادہ دنوں برقرار نہیں رہا علیحدگی ہو گئی۔ عدنان سمیع اسے چھوڑ کر اپنی گائیکی کی چادر اوڑھ کر ممبئی چلا گیا۔ بس اس کی ایک نشانی اس کی کوکھ میں رہ گئی۔ یہ اذان تھا۔ اس کا بیٹا جو آج بھی ماں کے پاس باپ کی یادگار کے طور پر موجود ہے۔

جاوید شیخ نے بھی کئی اداکاراؤں سے ملنے کے بعد

جھٹ فیصلہ کیا۔ چٹ شادی کی اور پٹ طلاق دے دی۔ پہلی بیوی زینت منظمی نے تو اس کے لیے یہ قربانی تک دی کہ شوبز سے کنارہ کش ہو کر ہاؤس وائف کی طرح زندگی بسر کرنا شروع کر دی مگر ایسی وفا شعار بیوی کو جاوید نے گھر کی مرغی سمجھ کر اس میں دلچسپی لینا ہی ترک کر دی اور فلم انڈسٹری میں نو وارد اداکارہ سلمٰی آغا سے پینگیں بڑھانا شروع کر دیں (تفصیل جاننے کے لیے جاوید شیخ پر میری تحریر پڑھیں جو سرگزشت اکتوبر 2017ء میں شائع ہو چکی ہے) اور جلد ہی اسے اپنی پُرفریب باتوں کے جال میں پھنسا کر دو بول پڑھا کر بیوی بنا کر اپنے بستر کی زینت بنا لیا لیکن سلمٰی آغا کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ شخص ایسا نہیں ہے جیسا خود کو ظاہر کر کے اس نے مجھے اپنایا۔ شادی ایک مقدس فریضہ ہے۔ یہ بندھن جتنا مضبوط ہوتا ہے اتنا ہی نازک بھی ہوتا ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کے جذبات واحساسات کا خیال رکھنا پڑتا ہے جس کے لیے کچھ ایثار بھی کرنا پڑتا ہے کچھ قربانی بھی کرنی پڑتی ہے مگر یہ شخص...... یہ شخص تو میرے جسم و جان کا مالک بننے کے بعد بالکل بدل گیا ہے۔ مجھ پر توجہ دینے، میری نئی زندگی کی ترقی وترویج پر توجہ دینے، کوئی تعمیری کام کرنے کی بجائے۔ اپنے ساتھ کام کرنے والی دوسری اداکاراؤں میں دلچسپی لینے لگا ہے۔

عاشق جب شوہر بن جاتا ہے تو محبوبہ بیوی کے روپ میں اچھی نہیں لگتی۔ جس کے نتیجے میں وہی ہوتا ہے جو جاوید شیخ نے سلمٰی آغا کے ساتھ کیا۔ اسے چھوڑ کر نئی اداکارہ نیلی کے چکر میں پڑ گیا۔ بھنورے کو نیا پھول چاہیے۔ بنارس بنا شہد چاہیے۔ نیلی میں اسے یہ سب کچھ نظر آیا اور وہ اس کی طرف کھنچا چلا گیا۔ کچھ دنوں تک دونوں ایک دوسرے کے قریب نظر آئے مگر نیلی نے غالباً یہ سوچ کر کسی کو یہ سوچنے کا موقع نہیں دیا کہ اس نے شادی کر لی ہے۔ وہ اپنی ابھرتی ہوئی فنی ساکھ کو متاثر نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے کبھی یہ ظاہر ہونے نہیں دیا کہ جاوید شیخ سے اس نے شادی کر لی ہے۔ جاوید نے بھی اس مسئلے پر اپنی شیخی کا مظاہرہ نہیں کیا مگر فلمی پنڈتوں کا کہنا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ بھنورا جس پھول کے گرد منڈلائے۔ اس کا رس نہ چوسے۔ ان دونوں کی دوستی کچھ دنوں تک برقرار رہی پھر جاوید شیخ اداکارہ ثناء کی طرف مائل دیکھے گئے۔ جس کا یہی نتیجہ نکالا گیا کہ نیلی سے وہ رشتہ باقی نہیں رہا ہے جواب تک خفیہ رکھا گیا تھا۔

کچھ اور بھی فلمی جوڑوں کی شادی اور طلاق کے کیسز سامنے آئے مگر وہ چٹ شادی اور پٹ طلاق کے زمرے میں نہیں آتے اور ان طلاقوں کی کوئی منفی وجہ تھی مثلاً کرکٹر محسن حسن خان اور بھارتی اداکارہ رینا رائے کی شادی اور طلاق۔ ان دونوں میں محبت ہوئی تو انہوں نے شادی کر کے اس محبت کو پائیدار بنانے کا عزم کیا۔ رینا نے اپنے اثر ورسوخ سے محسن حسن خان کو فلموں کا ہیرو بھی بنا دیا۔ دونوں فلموں میں کام بھی کرنے لگے اور خوشگوار ازدواجی زندگی بھی بسر کرنے لگے۔ کچھ دنوں کے بعد محسن حسن خان کو اپنے گھر اور وطن کی یاد ستانے لگی تو انہوں نے رینا رائے سے کہا۔

''بہت دن میکے میں رہیں اب سسرال چلو۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اب میں اپنے وطن پاکستان میں رہنا چاہتا ہوں۔ تم میری بیوی ہو اس لیے وہ تمہاری سسرال ہے۔ چلو پاکستان چلیں۔''

''مگر سویٹ خان! میں اپنے میکے کا بھرا میلہ کیسے چھوڑ دوں؟ دیکھو نا میں انڈین فلم انڈسٹری کی ایک کامیاب اداکارہ ہوں۔ ہوں ناں؟''

''ہاں وہ تو ہو۔''

''میں یہ سب کچھ یہیں چھوڑ کر پاکستان چلی جاؤں گی تو......''

واقعی یہ مسئلہ رینا رائے کے لیے اہم تھا محسن حسن خان کو معلوم تھا کہ رینا پاکستان جا کر یا وہاں کی فلموں میں کام کر کے خوش نہیں رہ سکے گی۔ دونوں نے شریف النفس ہونے کے ناتے بغیر کسی تنازعے یا تلخی کے ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر لی۔ محسن حسن خان پاکستان آ گئے اور رینا رائے وہیں ممبئی میں رہ گئیں۔

ایک اور شریف جوڑے کا ملاپ اور جدائی بھی بڑی خوش اسلوبی سے ہوا اور توپ تلوار چلائے بغیر انجام کو پہنچا۔ یہ جوڑی اداکار حبیب اور اداکارہ نغمہ کی تھی۔ کئی فلموں میں دونوں ہیرو ہیروئن کے روپ میں پیار محبت کا سوانگ رچایا تو جھوٹی محبت نے ان کے دلوں میں سچی محبت کے روپ میں گدگدی پیدا کر دی اور ایک دن حبیب نے نغمہ سے کہا۔

''جس طرح فلموں میں ہماری شادی ہو جاتی ہے اسی طرح ہم سچی مچی کی شادی کیوں نہ کر لیں۔''

''اس جھوٹی محبت اور جھوٹی شادی کرنے کے تو ہمیں پیسے ملتے ہیں۔ سچی مچی کی شادی سے ہمیں کیا ملے گا؟''

''نئی زندگی ملے گی۔ ازدواجی زندگی کی بے پایاں

خوشی ملے گی۔“

نغمہ بھی اکثر سوچتی تھی کہ اس فلمی ہیرو کو اپنی زندگی کا حقیقی ہیرو بنالوں تو...... جب اس نے دیکھا کہ حبیب بھی یہی چاہتا ہے تو دونوں حقیقی زندگی میں بھی ایک دوسرے کے ہیرو ہیروئن بن گئے۔ کچھ دنوں تک بہت خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کی مگر پھر وہی ہوا جو عام میاں بیوی کے درمیان ہوتا ہے۔ یعنی دونوں کی دلچسپیاں ایک دوسرے سے کم ہونے لگیں۔ اکثر بات بے بات آپس میں نوک جھونک ہونے لگی۔ تلخی اور بدمزگی بڑھی تو دونوں ایک دوسرے کو ناقابل برداشت سمجھنے لگے اور پھر ایک دن وہ رشتہ جو پیار محبت سے جوڑا گیا تھا ٹوٹ گیا۔ دونوں نے علیحدگی اختیار کرلی۔

سنگیتا جو نوخیز اداکارہ کے روپ سے ہدایت کارہ سنگیتا کی حیثیت اختیار کر کے نمایاں شخصیت کی حامل بن گئی تھیں۔ ایک دن خبر آئی کہ وہ بھی رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئی ہیں۔ انہوں نے منفی کرداروں میں پیش ہونے والے اداکار ہمایوں قریشی کو اپنا جیون ساتھی بنا لیا ہے۔ فلم انڈسٹری اور انڈسٹری سے باہر ان کے متعدد چاہنے والوں کو ان کے اس فیصلے سے بڑی مایوسی ہوئی۔ اس بات پر نہیں کہ انہوں نے ان کو قابل اعتنا نہیں سمجھا اور کسی اور کو شریک حیات منتخب کرلیا بلکہ انہیں اس بات کا دکھ تھا کہ آخر ہمایوں قریشی میں انہیں کیا نظر آیا؟ اپنی پسند کی کوئی بات تو دیکھی ہو گی سنگیتا نے ہمایوں قریشی میں۔ یہ شادی ہو تو گئی مگر کامیابی کی فہرست میں اپنا نام نہ لکھوا سکی۔ کچھ دنوں کے بعد خبر آئی کہ ان کے راستے جدا ہو گئے ہیں۔ دونوں کے موڈ مزاج میں آسمان زمین کا فرق تھا۔ سنگیتا کے معیار پر وہ ایک دو بات پر تو پورا اترا ہو گا مگر باقی معاملات میں وہ بطور شوہر فیل ہوگیا۔

عمر شریف اور شکیلہ قریشی بھی اپنی ازدواجی تعلقات زیادہ دنوں تک برقرار نہ رکھ سکے۔ یہاں بھی دونوں کی سوچ اور ان کے انداز ایک دوسرے سے متصادم رہے۔ شادی کے بعد عشق محبت کا بخار جب پانی بن کر بہہ جاتا ہے تو ان کی آپس کی دلچسپی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ ایسے میں اکثر دونوں ایک دوسرے سے پیچھا چھڑا لیتے ہیں۔ عمر شریف اور شکیلہ قریشی نے بھی یہی کیا مگر یہ سب کچھ پٹ طلاق کے طور پر نہیں ہوا۔

ایسی ہی شادی اور طلاق کی ایک مثال سندھی اداکار مشتاق چنگیزی اور اداکارہ چکوری کی بھی ہے۔ دونوں فلموں میں محبت اور شادی کے کردار کرتے کرتے خود بھی ایک دوسرے کی حقیقی محبت میں گرفتار ہو گئے اور ایک دن خبر آئی کہ ایک اور فلمی جوڑا حقیقی ہیرو ہیروئن بن گیا ہے۔ مشتاق چنگیزی اور چکوری نے شادی کرلی ہے اور پھر ایک دن یہ اطلاع بھی ملی کہ دونوں کی ازدواجی زندگی کو طلاق کی چھری نے دو لخت کر دیا ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کرلی ہے۔

پٹ طلاق نہ ہونے کے زمرے میں کچھ اور جوڑوں کے نام بھی شامل ہیں۔ ان میں اعجاز درانی کا نام بھی نمایاں ہے۔ اعجاز درانی نئے نئے اداکار بنے تھے اور کامیابی کا خواب دیکھتے ہوئے لاہور پہنچے تھے۔ اس وقت آتش بھرپور جوان تھا۔ ہر لحاظ سے گبرو جوان دکھتا ہی نہیں حقیقتاً تھا بھی۔ ان پر سب سے پہلے توجہ دینے والی مادام نور جہاں تھیں۔ انہوں نے حال ہی میں سید شوکت حسین رضوی کی زوجیت سے نجات حاصل کی تھی اور بڑی شدت سے کسی دوسرے شوہر کی تلاش میں تھیں۔

”یہ کیسا رہے گا؟“ انہوں نے خود سے سوال کیا۔

”زبردست۔“

”مگر مجھ جیسی کو کیا قبول کرے گا؟“

”آزمائش شرط ہے۔ کوشش کرو اگر جیت گئیں تو کیا کہنا......“

نور جہاں جہاندیدہ تھیں۔ کس کو کس طرح قابو میں کیا جاسکتا ہے کس طرح شکار کیا جاسکتا ہے۔ ان کی آواز کا جادو ہی نہیں چلتا تھا۔ ان کی اداکارانہ صلاحیتیں بھی بلا کی تھیں۔ ان کی زلفوں کے بچھائے ہوئے دام سے کوئی بھی ہو اس کا بچنا محال ہوتا تھا۔

دوسری طرف ایک اناڑی اور ناتجربہ کار بندہ تھا۔ مادام کو زیادہ جدوجہد کی ضرورت نہیں پڑی۔ جلد ہی وہ زیر دام آگیا۔ مادام کو ڈر تھا کہ کہیں وہ میری عمر کو پیش نظر رکھ کر انکار نہ کردے مگر ایسا نہیں ہوا۔ اعجاز نے کسی طرح بھی کسی نظر سے اونچ نیچ کے فرق کو نہ دیکھا۔ بس یہی سوچا کہ لاہور فلم انڈسٹری میں قدم جمانے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور سہارا یا سپورٹ نہیں مل سکتا۔ بھلا کس کی مجال ہے کہ مادام کسی فلم ساز یا ہدایت کار کو کہیں اور وہ انکار کردے۔

اور ایسا ہی ہوا۔ یہ فلم انڈسٹری کی بہت بڑی خبر تھی۔ ملکہ ترنم مادام نور جہاں نے ابھرتے ہوئے خوبرو اداکار

اعجاز درانی کو اپنا نیا شریکِ حیات بنالیا ہے۔ اس کے بعد اعجاز درانی کے لیے پاکستانی فلمی صنعت کے سارے دروازے کھل گئے۔ ایک طرف وہ بطور اداکار اپنی کامیابی کے جھنڈے لہراتے رہے تو دوسری طرف مادام طمانیت سے سرشار ہوتی رہیں۔ ان کی ازدواجی زندگی بہت شاندار طریقے پر گزرتی رہی۔ اس کا ثبوت ان کی تین صاحبزادیاں تھیں اعجاز درانی جن کے باپ تھے۔ خاصے طویل عرصے تک دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوشگوار زندگی بسر کرتے رہے پھر وہی ہوا جو اکثر فلمی جوڑوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب دونوں کا ایک دوسرے سے دل بھر جاتا ہے یا ایک دوسرے میں دلچسپی نہیں رہتی ہے تو تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے اور ایک دن طلاق کی دیوار دونوں کے درمیان کھڑی ہو جاتی ہے۔ اخبارات میں یہ بڑی اور بری خبر شائع ہوئی کہ ’’مادام نور جہاں اور اعجاز درانی میں علیحدگی ہوگئی ہے۔‘‘

کچھ دنوں کے بعد یہ خوش خبری، خبروں کی زینت بنی کہ اعجاز درانی نے اداکارہ فردوس کو اپنی رانی بنالیا ہے۔ اعجاز اور فردوس کے پرستاروں کے لیے یہ واقعی بڑی اچھی خبر تھی۔ دونوں کی فلم ’’ہیر رانجھا‘‘ نے جو فقید المثال کامیابی حاصل کی تھی اس میں ان دونوں کی حقیقت سے قریب ترین اداکاری کا بہت بڑا حصہ تھا۔ ایسی اداکاری اسی وقت دیکھنے کو ملتی ہے جب ہیرو کو ہیروئن سے اور ہیروئن کو ہیرو سے ذاتی طور پر بھی اندرونی طور پر بھی، ایک دوسرے کی طرف کھنچاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ کہانی کی ڈیمانڈ پوری کرتے وقت ان کی کچھ نجی ڈیمانڈ بھی شامل ہو جاتی ہے۔ فلمی پنڈتوں نے فرمایا۔ ’’اس فلم میں ایسی اداکاری کرنے والوں کے درمیان، پیار تو آخر ہونا ہی تھا، پیار ہوا اور انہوں نے وہ کام انجام دے دیا جو فلم میں نہیں دے سکے تھے۔ یعنی شادی کرلی۔ ہم جیسوں نے بھی اطمینان کا سانس لیا کہ چلو اچھا ہوا اعجاز کی تنہائیاں ختم ہوئیں۔ ان کی بے قراری کو قرار آگیا۔ انہیں پیار کرنے والا ایک ساتھی مل گیا مگر یہ ساتھ زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہ سکا۔ ان کی محبت کو جانے کس کی نظر لگ گئی کہ حقیقی زندگی میں بھی دونوں بچھڑ گئے۔ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ فلم جیسا ٹریجڈی اینڈ نجی زندگی میں بھی ہوگیا۔

شادی اور طلاق کے مرحلے سے اور بھی کئی فلم والے گزرے جن میں اداکار بابر اور اداکارہ سونیا بھی شامل ہیں۔ شادی کے بعد ان کی خانہ آبادی زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہ سکی اور خانہ بربادی کے روپ میں ظاہر ہوگئی اور دو ہنسوں کا جوڑا بچھڑ گیا رے!! دوسرا جوڑا جن ہنسوں کا تھا وہ اداکار شمعون عباسی اور اداکارہ جویریہ عباسی کا تھا۔ بڑے چاؤ سے، بڑی محبت سے دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما تھا اور کہا تھا۔ ’’تیرے بنا کیا جینا۔‘‘ مگر تھوڑے ہی دنوں میں ان کی محبت پسینا بن کر بہہ گئی۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے اس قدر ناقابلِ برداشت ہو گئے کہ ان کو طلاق کا سہارا لینا پڑا۔ کچھ دنوں کے بعد خبر ملی کہ شمعون عباسی نے اپنی تنہائیاں دور کرنے کے لیے عائمہ ملک کا تعاون حاصل کرلیا ہے۔

طلاق ایک قبیح فعل ہے جو نہ اللہ کو پسند ہے نہ اللہ کے حبیب کو۔ اس کے باوجود عام لوگوں کی طرح شوبز سے وابستہ افراد بھی اس گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس جرم میں ملوث ایک اور جوڑی کی داستان بھی بہت افسوس ناک ہے۔ ٹی وی ڈائریکٹر جواد بشیر نے اداکارہ حنا سے پیار کی پینگیں بڑھائیں اور دوسری طرف سے مثبت رسپانس ملنے کے بعد اس کیوٹ سی اداکارہ کو حنا جواد بنا دیا۔ ان کے دوستوں نے انہیں مبارک باد دی۔ ’’اچھا کیا تم نے اپنے پیار کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا۔ ہماری دعا ہے سدا شاد اور آباد رہو، پھولو پھلو اور ایک دوسرے کا ساتھ نبھاؤ۔‘‘ ان سے متعلق اس خبر نے بھی ان کے بہی خواہوں کی خوشیوں میں اضافہ کیا کہ دونوں نے اپنی پہلی فلم ’’مایا‘‘ میں ایک ساتھ کام کیا ہے۔ انہیں یقین ہوگیا تھا کہ یہ دونوں کامیاب اور خوشگوار زندگی بسر کر رہے ہیں اور اللہ نے چاہا تو دونوں اسی طرح ہمیشہ ایک دوسرے کی محبت میں سرشار رہیں گے۔ ان کے چاہنے والوں کو ان کی فلم ’’مایا‘‘ کی نمائش کا شدت سے انتظار تھا مگر یہ کیا ہوا؟ جس دن مایا ریلیز ہوئی اسی دن دونوں کی محبت کا سرمایہ لٹ گیا۔ برباد ہو گیا۔ یہ خبر ان کے چاہنے والوں پر بجلی بن کر گری کہ بشیر جواد اور حنا جواد کے درمیان طلاق کی دیوار حائل ہوگئی ہے۔

شوبز کی دنیا میں جہاں بہت سی انہونی باتیں بھی ہو جاتی ہیں وہاں کبھی کبھی ایسی طلاقیں بھی ہو جاتی ہیں جن پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک طویل عرصے تک ساتھ نبھانے والے جب ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کرلیتے ہیں تو حیرت ہوتی کہ اپنی عمر کے آخری حصے میں انہوں نے یہ فیصلہ کیوں کیا!!

مثالی میاں بیوی کے طور پر زندگی گزارنے کے بعد طلاق کا طوق گلے میں ڈالنے والوں میں سید شوکت حسین رضوی اور ملکہ ترنم نور جہاں کے علاوہ جمال شاہ اور فریال گوہر، نعیم بخاری اور طاہرہ سید کے نام کے بہت نمایاں ہیں۔

سید شوکت حسین رضوی نے انڈیا میں اپنی بنائی جانے والی فلم ''جگنو'' میں اپنی فلم کی ہیروئن نور جہاں کو اپنی شریک حیات بنایا تھا اور دونوں نے میاں بیوی کی حیثیت سے ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہا۔ سید صاحب نے ممبئی سے ہجرت کر کے پاکستان آنے کا فیصلہ کیا تو نور جہاں بھی خوشی خوشی ان کے ساتھ لاہور آگئیں۔ ممبئی کے بھرپا میلہ چھوڑ کر پاکستان آنے کا فیصلہ اگرچہ حیران کن تھا کیونکہ یہاں کی فلم انڈسٹری نئے سرے سے زندہ کی جارہی تھی۔ شاہ جی نے بھاگ دوڑ کر کے ایک تباہ حال فلم اسٹوڈیو اپنے نام کروایا اور اس کا نام نور جہاں کے نام سے ملا کر شاہ نور اسٹوڈیو رکھا۔ ان کی محبت کی طرح یہ نگار خانہ بھی پھولتا پھلتا رہا۔ ان کی محبت کے نتیجے میں وہ صاحب اولاد بھی ہوتے رہے۔ نور جہاں نے پاکستانی فلموں میں بھی اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے جب کہ شاہ جی نے خوب صورت فلمیں پروڈیوس اور ڈائریکٹ کیں۔ پھر ڈھلتی ہوئی عمر کی وجہ سے میڈم نور جہاں نے گلوکاری جاری رکھی مگر اب بھی وہ فلم انڈسٹری کی ایک اہم ستون تصور کی جاتی تھیں۔ ان کے چاہنے والے یہی سمجھتے تھے کہ دونوں کو اب موت ہی ایک دوسرے سے جدا کر سکتی ہے مگر اسے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ ایک دن جانے کیا ہوا کہ ایسا مضبوط بندھن ٹوٹ گیا۔ اخباروں میں یہ منحوس خبر شائع ہوئی کہ ملکہ ترنم مادام نور جہاں نے سید شوکت حسین رضوی سے علیحدگی اختیار کرلی ہے۔ وہ رشتہ جس کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ کبھی نہ ٹوٹے گا، وہ ٹوٹ گیا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔

اس سپریشن کی اصل وجہ کیا تھی یہ تو وہی دونوں جانتے تھے مگر کچھ سیانوں کا گمان ہے کہ مادام کی حد سے زیادہ من مانیاں کرنے کی عادت شاہ کو پسند نہیں تھیں مگر اب وہ ملکہ (ملکہ ترنم) تھیں۔ حکمرانی کرتی تھیں۔ کسی کی بھی زیر نگرانی کیسے رہ سکتی تھیں؟ شاہ جی کی روک ٹوک بھلا انہیں کیسے برداشت ہوتی؟ انہوں نے اپنی راہیں جدا کرلیں۔ ان کو نجات حاصل کرنے کی اتنی ضرورت تھی کہ انہوں نے حق مہر میں بھی بہت کچھ معاف کر دیا۔ کچھ لوگوں کو اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں شاہ نور اسٹوڈیو پر بھی اس سپریشن کا ناخوشگوار اثر نہ پڑے مگر ایسا نہیں ہوا۔

جمال شاہ ان فنکاروں میں شمار ہوتے ہیں جو بہت پڑھے لکھے ہی نہیں، اپنی سوچ، فکر اور وژن کے لحاظ سے اہل دانش میں شمار ہوتے ہیں۔ بے حد شریف، بڑے بردبار، فریال گوہر کے ساتھ ان کی ازدواجی زندگی بھی مثالی تھی۔ طویل عرصے تک دونوں کامیاب میاں بیوی کی حیثیت سے ساتھ رہے مگر جانے کس کی نظر بد لگی کہ ان کا بسا بسایا گھر اجڑ گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ دیا اور لوگوں کی حیرانگی میں اضافہ کر دیا کہ ہائے یہ کیسے ہوگیا۔

نعیم بخاری جو ایک نامور قانون داں ہیں اور ساتھ ہی ایک کامیاب ٹی وی اینکر بھی۔ اپنی خوش مزاجی، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کی وجہ سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں۔ گلوکارہ طاہرہ سید کو بھی شاید اپنی ان ہی خوبیوں کی وجہ سے متاثر کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوں گے، طاہرہ عام گلوکاراؤں سے قدرے مختلف ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی حامل۔ نعیم بخاری نے انہیں اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے سوچا۔ اس شخص سے بہتر مجھے شریک زندگی نہیں مل سکتا۔ دونوں کی ایک دوسرے سے انڈر اسٹینڈنگ محبت میں تبدیل ہوئی اور پھر محبت نے دونوں کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا۔ اس شادی پر بہت سے لوگ حیران بھی ہوئے اور پریشان بھی۔ ان کی حیرانگی کی وجہ یہ تھی کہ کہاں ایک وکیل، ایک ایڈووکیٹ اور کہاں ایک گانے والی!! ایک مشرق تو دوسرا مغرب۔ ان کا ملاپ کیسے ہوگیا! شاید عشق نہ پچھے ذات، کی نوعیت کی کوئی کڑی ہے۔ لوگ پریشان اس لیے تھے کہ یہ بے تکی جوڑی کتنے دنوں چلے گی؟ اللہ خیر کرے۔ یوں بھی شوبز سے تعلق رکھنے والے لوگ متلون مزاج ہوتے ہیں۔ طاہرہ سید کہیں قانون داں کی قانونی موشگافیوں سے تنگ نہ آجائے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دونوں بڑے مزے میں ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارتے رہے پھر جب ان کی متوقع جدائی کا ڈر خوف لوگوں سے دور ہوگیا۔ وہ مطمئن ہو گئے کہ ہنسوں کا یہ جوڑا ہمیشہ ساتھ رہے گا تو ایک دن ان کے اطمینان کا یہ شیش محل ٹوٹ کر کرچی کرچی ہوگیا۔ اتنے طویل عرصے تک ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے بعد ندی کے دو کناروں کی طرح ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔ ایک دوسرے سے

سارے رشتے ناتے توڑلیے۔
میاں بیوی کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والی طلاق کا ایک مرحلہ مہر کی ادائیگی بھی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں نکاح کے وقت نکاح نامے میں لکھوالیا جاتا ہے کہ مہر کی رقم فوری ادا کی جائے گی یا بعد میں۔ جو لوگ فوری ادائیگی کرنا چاہتے ہیں وہ سہاگ رات کو ہی رجوع کرنے سے پہلے ادا کردیتے ہیں۔ بصورت دیگر مہر کی ادائیگی علیحدگی اور طلاق کے بعد ہوتی ہے۔
مسلمانوں کی طرح انگریزوں کو بھی طلاق کے بعد اگریمنٹ کے تحت جو مہر شادی کے وقت مقرر کی جاتی ہے ادا کرنا پڑتی ہے۔
اس سلسلے میں شوبز سے وابستہ فنکاروں کی طلاق اور مہر کی رقم کی ادائیگی خاصی دلچسپ ہوتی ہے۔ جن میں چند مشہور طلاقوں اور مہر کی رقم کی ادائیگی کا ذکر اس موقع پر نامناسب نہیں ہوگا۔
ہالی ووڈ اداکار بین ایفلک اور اداکارہ جنیفر گارنر شادی کے بعد دس سال تک خوشگوار ازدواجی زندگی گزارتے رہے مگر اس کے بعد دونوں گویا ایک دوسرے سے اکتا گئے اور بالآخران دونوں نے اس رشتے کو ختم کردیا اور پھر اداکار موصوف کو معاہدے کے مطابق جنیفر گارنر کو ڈیڑھ سوملین ڈالر ادا کرنا پڑا جو تقریباً ڈیڑھ ارب روپے کے برابر ہے۔ بظاہر یہ ایک مہنگی طلاق لگتی ہے لیکن یہ ہالی ووڈ میں ہونے والی دیگر طلاقوں کے مقابلے میں زیادہ مہنگی نہیں تھی۔ اس سے پہلے اداکار و ہدایت کار میل گبسن اور روبن ڈینس مور کے درمیان طلاق کی ڈیل 425 ملین ڈالر میں ہوئی تھی۔ واضح رہے کہ یہ میل گبسن کی کل جائیداد کی تقریباً نصف رقم تھی۔ یہ تاحال ہالی ووڈ کی مہنگی ترین طلاق کہی جاتی ہے۔ ایک اور ہالی ووڈ اداکار آرنلڈ شواز ینگر اور ان کی اہلیہ ماریہ شریور کے درمیان پچیس سالہ ازدواجی بندھن جب ٹوٹا تو اداکار موصوف نے مہر کی رقم کے طور پر اڑھائی سوملین سے پونے چار سوملین ڈالر ادا کیے۔ اسی طرح مائیکل جورڈن اور جونیتا جورڈن کے درمیان 168 ملین ڈالر میں طلاق کی ڈیل فائنل ہوئی۔ ایک اور طلاق نیل ڈائمنڈ اور ماریا مرفی کے درمیان ہوئی تو اس طلاق کے عوض 150 ملین ڈالر ادا کیے گئے جب کہ اسٹیون اسپیل برگ نے ایمی آئرونگ کو 100 ملین ڈالر ادا کر کے اس ازدواجی رشتے کو منقطع کیا۔
شادی کے بعد شادی کے بندھن کو جذبات کی عینک سے نہیں بلکہ عقل کی آنکھ سے دیکھنا چاہیے۔ ویسے بھی جب اس رفاقت کے نتیجے میں دونوں صاحب اولاد ہو جائیں تو انہیں اپنی اولاد کے لیے ہی جینا چاہیے۔ ان کی بہتری اور شاندار مستقبل کی تعمیر کے لیے اپنی خوشیوں اور جذبات سے زیادہ بچوں کی پرورش و پرداخت کو ترجیح دینی چاہیے۔ وہ جوڑے جو اپنی اولاد پر توجہ دینے کی بجائے اپنی ترجیحات کو اہمیت دیتے ہیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑتے جھگڑتے ہیں اگر چہ یہ شکر رنجیاں تو ازدواجی زندگی کا حسن ہیں، لڑائی کے بعد پھر صلح صفائی ہو جاتی ہے۔ بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر مگر جب صلح صفائی کی بجائے بات بڑھتی جائے اور نوبت علیحدگی اور طلاق تک پہنچ جائے تو ان کی زندگی میں جو انتشار پیدا ہوتا ہے وہ الگ ہے۔ بچوں کی زندگی پر بہت برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ نیچرل طور پر ان کی گرد تھم نہیں ہوتی۔ ماں باپ کی سپریشن کے بعد بچے نہ اِدھر کے رہتے ہیں نہ اُدھر کے اس لیے تمام شادی شدہ جوڑوں کو ہمارا ایسی مخلصانہ مشورہ ہے کہ ازدواجی زندگی بہت ہوش مندی کے ساتھ بسر کریں۔ شوہر بیوی اور بیوی شوہر کے جذبات واحساسات کی پاسداری کرے اور جب ماں باپ بن جائیں تو ان کے لیے اپنے آپ کو وقف کردیں۔ ہمارے مذہب میں تو حقوق العباد کو عبادت کا درجہ دیا گیا ہے جب کہ طلاق کو انتہائی ناپسندیدہ اور قبیح عمل قرار دیا گیا ہے۔

☆......☆

عیدالفطر اور عیدالاضحی ہمارے دو بڑے اور خوشیوں سے بھرے تہوار ہیں۔ اس دن کو بھرپور انداز میں منانے کے سب ہی خواہاں ہوتے ہیں۔ اس خواہش میں نئی فلمیں دیکھنے کی خواہش بھی ہوتی ہے۔ عید کی خوشیوں کو دوبالا کرنے کی غرض سے ہی فلم سازنئی نئی فلمیں عید ین کے موقع پر ریلیز کرتے ہیں۔ عید، بقرعید کے موقع پر نئی فلمیں ریلیز کرنے کا سلسلہ ابتدا ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ عیدالاضحیٰ کے دن ریلیز ہونے والی پہلی پاکستانی فلم "دو آنسو" تھی جو 1950ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ پاکستان میں فلم انڈسٹری کے قیام کے بعد کامیابی کے حصول کے لیے روز و شب محنت کی گئی جس کے نتیجے میں 1960ء کے عشرے میں داخل ہوتے ہی کامیابیوں کا سلسلہ تیز ہو گیا اور ہماری فلموں نے سلور جوبلی کے ساتھ گولڈن جوبلی منانے کی روایت قائم کی اور پھر اسی عشرے میں فلموں نے پلاٹینم

جوبلی منانے کی منزل طے کی تو ڈائمنڈ جوبلی کا بھی قابل فخر اعزاز حاصل کیا اور شاہکار فلم ''زرقا'' نے پاکستان کی پہلی ڈائمنڈ جوبلی فلم کا اعزاز حاصل کیا۔ 1970ء میں پاکستانی فلمی صنعت اپنے نقطۂ عروج پر تھی۔ اس عشرے میں فلموں نے بہت بڑی تعداد میں ڈائمنڈ جوبلی منانے کا سنگ میل عبور کیا پھر عیدین کے موقع پر ریلیز ہونے والی فلموں نے بھی ڈائمنڈ جوبلی منانے کے اعزازات حاصل کیے۔

اس وقت ہم ان ہی فلموں کے بارے میں بتائیں گے جو بڑی عید (عیدالاضحیٰ) کے دن ریلیز ہو کر ڈائمنڈ جوبلی منانے میں کامیاب رہیں۔

اس سے پہلے کہ ان فلموں کا ذکر کروں، اپنے بہت سے پڑھنے والوں کو جوبلیوں کے بارے میں یہ بتادوں کہ جو فلم اپنی پہلی ریلیز کے موقع پر مسلسل 25 ہفتے چلتی ہے وہ سلور جوبلی فلم کہلاتی ہے۔ جو فلم 50 ہفتے مسلسل زیر نمائش رہتی ہے اسے گولڈن جوبلی فلم تسلیم کیا جاتا ہے جب کہ 75 ہفتے چلنے والی فلم پلاٹینم جوبلی کہلاتی ہے اور جو فلم 100 ہفتے تک چلتی رہے اسے ڈائمنڈ جوبلی کا اعزاز حاصل ہوتا ہے۔

اب ہم بڑی عید پر بڑی کامیابی حاصل کرنے والی فلموں کے بارے میں بتائیں گے۔ عیدالاضحیٰ کے دن ریلیز ہو کر ڈائمنڈ جوبلی کا اعزاز حاصل کرنے والی پہلی پاکستانی فلم ''دوستی'' ہے جو اتوار کے دن 7 فروری 1971ء کی عیدالاضحیٰ کے دن سینماؤں کی زینت بنی اور جس نے مسلسل چل کر ڈائمنڈ جوبلی کا درجہ حاصل کیا۔ یہ سدا بہار، نغمہ بار اور رومانوی شاہکار فلم تھی۔ اس کی کچھ عکسبندی پاکستان کے علاوہ لندن میں بھی کی گئی تھی۔ اس رنگین اور حسین فلم میں شبنم، اعجاز اور رحمان نے کلیدی کردار ادا کیے تھے۔ دیگر ستاروں میں حسنہ، رنگیلا، ساقی اور طالش بھی نمایاں تھے۔ اس فلم کے فلم ساز اعجاز درانی اور ہدایت کار شریف نیر تھے۔ ''دوستی'' کے مصنف علی سفیان آفاقی، موسیقار اے حمید اور نغمہ نگار قتیل شفائی، تنویر نقوی اور کلیم عثمانی تھے۔ اس فلم نے اپنی خوب صورت کہانی، پاورفل ہدایت کاری، انتہائی جاندار اداکاری کے علاوہ مسحور کن موسیقی اور ملکہ ترنم مادام نور جہاں کے گائے ہوئے گیتوں کی بدولت بے فقید المثال کامیابی حاصل کی تھی۔

''دلہن ایک رات کی'' دوسری ڈائمنڈ جوبلی پاکستانی فلم ہے جو عیدالاضحیٰ کے دن ریلیز ہوئی۔ اس کی نمائش کی تاریخ 14 دسمبر 1975ء ہے جب کہ یہ اتوار کا دن تھا۔ یہ مار دھاڑ سے بھرپور اور سدا بہار گیتوں سے آراستہ یادگار فلم تھی۔ شائقین فلم کے لیے یہ عیدالاضحیٰ کا بہترین تحفہ ثابت ہوئی۔ اس کی ڈائمنڈ جوبلی کامیابی کے بعد اسی سال اسے پشتو زبان میں ڈب کر کے پیش کیا گیا۔ پشتو ورژن کو ''ناوے دے بوشپے'' کے نام سے ریلیز کیا گیا۔ پشتو زبان میں ڈب کرنے کی یہ وجہ بھی تھی کہ اس کے فلم ساز و ہدایت کار ہی پختون نہیں تھے بلکہ مصنف اور کئی فنکار بھی پٹھان بھائی تھے۔ اس فلم کی کاسٹ اور کریڈٹ میں جو افراد پٹھان تھے ان میں فلم ساز و ہدایت کار ممتاز علی خان، شریک فلم ساز جہانہ خان، مصنف بدر منیر، عکاس تحسین خان جب کہ اس کی کاسٹ میں بدر منیر، آصف خان، مسرت شاہین، نمی اور نعمت سرحدی کا تعلق بھی پختون برادری سے تھا۔ غیر پختونوں میں موسیقار کمال احمد اور نغمہ نگار سعید گیلانی کے علاوہ آرٹسٹوں میں ساقی اور ناصرہ تھے۔

اگر اتنے ڈھیر سارے پٹھانوں کی اردو فلم بلاک بسٹر کامیابی حاصل کرے گی تو اسے وہ پشتو زبان میں پیش کر کے اپنے پٹھان شائقین کو کیسے اس سے مستفید نہیں کرتے؟ پشتو زبان میں بھی اس فلم نے متوقع کامیابی حاصل کی۔

اس فلم کی زبردست کامیابی کی وجہ اس کی کئی خوبیاں تھیں۔ اس فلم کا نام ''دلہن ایک رات کی'' تھا۔ جس میں تماشائیوں کے لیے بڑی جذباتی کشش تھی جب کہ اس کی کہانی مار دھاڑ سے بھرپور تھی اس کے بیشتر مناظر ویسٹرن طرز کی انگریزی فلموں کے انداز میں فلمائے گئے تھے۔ بدر منیر نے زبردست ایکشن کردار نگاری کی تھی جب کہ اس کی موسیقی اور سدا بہار گیت اس فلم کی اضافی خوبی شمار کی گئی۔ یہ گانے آج بھی پہلے کی طرح مقبول ہیں۔

☆ او جانے والے میں ترے قربان خدا حافظ۔ او میرے حسیں خواب کے مہمان خدا حافظ (آواز نور جہاں)

☆ وہ آگیا میرا سانوریا۔ ہوئی جس کے لیے میں باوریا (آواز نور جہاں)

☆ او دیکھو مانے نہ دلبر میرا۔ میں ہار گئی ہاتھ جوڑ کے (آواز ناہید اختر)

☆ آجا آجا کر لے پیار کہتی ہے سہانی شام (آواز مہناز)

☆ پیار کی شراب نگاہوں سے پلادوں۔ آجا میرے

پاس تیری پیاس بجھادوں (آواز مہناز)
☆ کہاں سے کہاں آگئی زندگانی۔ تری اے زمانے بڑی مہربانی (آواز مالا)
☆ کہتی ہے یہ رات بھیگی بھیگی۔ مستی میں جھومو دیوانو۔ (آوازیں احمد رشدی، ناہید اختر)
1979ء کی عید قربان کے موقع پر ریلیز ہونے والی ڈائمنڈ جوبلی فلم ''مس ہانگ کانگ'' تھی۔ اس بلاک بسٹرڈ فلم کی فلم ساز، ہدایت کارہ اور مصنف شمیم آراء تھیں۔ اس کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ یہ ایک مکمل تفریحی فلم تھی۔ یہ فلم مارشل آرٹ اور جوڈو کراٹے پر مبنی مار دھاڑ سے بھرپور متاثر کن فلم تھی جس کی فلم بندی ہانگ کانگ میں کی گئی تھی۔ جوڈو کراٹے کے تربیت یافتہ اداکار ناصر حسن نے اس فلم میں بہترین پرفارمنس کا مظاہرہ کیا تھا۔ مس ہانگ کانگ کا ٹائٹل رول بابرہ شریف نے ادا کیا تھا۔ اس فلم میں ان کا ڈبل رول تھا اور انہوں نے اپنے دونوں کرداروں میں لاجواب اداکاری کی تھی۔ اس دور میں اسے منفرد طرز کی فلم قرار دیا گیا تھا۔ جوڈو کراٹے اور مارشل آرٹ کے لحاظ سے اسے شائقین فلم نے بے حد پسند کیا جب کہ ہانگ کانگ کے لوکیشن میں فلمائے گئے مناظر بھی ''مس ہانگ کانگ'' کے ہائی لائٹس شمار کیے گئے۔ آصف رضا میر، ننھا، عثمان پیرزادہ، منور سعید اور طارق عزیز دیگر نمایاں ستارے تھے۔ عام روش سے قدرے مختلف کہانی، جاندار ڈائریکشن، شاندار اداکاری اور مسحور کن موسیقی نے اسے عیدالاضحیٰ کا بہترین تحفہ بنا دیا۔ یکم نومبر 1979ء کو نمائش پذیر ہونے والی اس فلم کے مکالمہ نگار علی سفیان آفاقی، موسیقار ایم اشرف اور نغمہ نگار مسرور انور تھے۔ اس فلم کا شمار خوب صورت تفریحی کمرشل فلموں میں ہوتا ہے۔ اس فلم کے کچھ گیتوں نے اپنے دور میں بے حد مقبولیت حاصل کی۔
☆ دیوانہ تمہیں بنادوں گی۔ میں کون ہوں کیا ہوں بتادوں گی۔ تمنا میرا نام۔ (آواز ناہید اختر)
☆ دو پھول کھلے دو نین ملے۔ پھر بن گیا پیار کا افسانہ (آوازیں ناہید اختر، اے نیرّ)
☆ گیت نیا گاتی ہیں دیکھ کے مجھ کو بہاریں۔ جدھر جدھر سے گزروں مجھ کو لوگ پکاریں (آواز ناہید اختر)
☆ یہ موسم ہوتا ہے نین سے نین ملانے کا۔ کچھ کھونے کا کچھ پانے کا (آوازیں مہدی حسن، مہناز)
☆ کوئی بہانہ کر کے تجھے ستانا ہے۔ میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے (آواز مہناز)
عیدالاضحیٰ کے مبارک دن ریلیز ہوکر ڈائمنڈ جوبلی کا اعزاز حاصل کرنے والی ایک اور فلم ''یہ زمانہ اور ہے'' بھی ہے۔ یہ فلم ساز و ہدایت کار شباب کیرانوی کی ایک مکمل تفریحی فلم تھی جو 9 اکتوبر 1981ء کے دن سینماؤں کی زینت بنی۔
یہ وہ دور تھا جب پاکستانی فلمی صنعت بام عروج پر تھی۔ عیدین کے موقع پر ریلیز ہونے والی نئی فلموں کا ایک میلہ سا لگ جاتا تھا اور فلم بین فلم دیکھنے کے لیے جوق در جوق سینما گھروں کا رخ کرتے تھے جس کے نتیجے میں عام اور معمولی فلم بھی کامیاب ہو جاتی تھی جب کہ وہ فلمیں جو زیادہ معیاری اور تفریحی ہوا کرتی تھیں وہ بڑی جوبلیاں بھی مناتی تھیں۔ ان میں ڈائمنڈ جوبلی کا اعزاز حاصل کرنا بڑی بات ہوتی تھی؛ جب کہ بڑی عید کے موقع پر یہ بڑی کامیابی حاصل کرنا کسی بڑے کارنامے سے کم نہیں ہوتا تھا۔
شباب کیرانوی جو اپنے دو فرزندوں نذر شباب اور ظفر شباب کے ساتھ ہر سال چار فلمیں پروڈیوس کرتے تھے ان کی اکثر فلمیں کامیابیاں حاصل کرتی تھیں جن میں عیدین کے موقع پر ریلیز ہونے والی فلمیں بھی تھیں۔
ایسی ہی فلموں میں ان کی فلم ''یہ زمانہ اور ہے'' بھی تھی جو عیدالاضحیٰ کے دن ریلیز ہوئی اور جس نے بلاک بسٹرڈ کامیابی حاصل کر کے ڈائمنڈ جوبلی کا اعزاز حاصل کیا اور شائقین فلم کی عید کی خوشیوں کو دوبالا کیا۔ اس کی کاسٹ میں بابرہ شریف، فیصل، ایاز، تانی، جمیل فخری، تمنا، ساقی شامل تھے اور سب ہی نے اپنے اپنے کردار بڑی خوبی سے ادا کیے تھے۔ ایم اشرف کی کمپوز کی ہوئی موسیقی پر اس فلم کے کچھ گانے مقبول ہوئے۔
☆ موسم کوئی آئے کوئی جائے۔ میں نہ بھولوں گا تجھ کو۔ یہ وعدہ ہے میرا (آواز اے نیر)
☆ اللہ جھوٹ نہ بلوائے۔ میری زندگی میں تیرے جیسا۔ کوئی آیا ہے نہ آئے (آواز ناہید اختر)
☆ چپ چپ کیوں ہو ساجنا۔ میری بات سنو نا (آواز ناہید اختر)
''بیوی ہو تو ایسی'' عید قرباں کی ایک اور ڈائمنڈ جوبلی فلم ہے جو 28 ستمبر 1982ء میں عیدالاضحیٰ کے خوشیوں بھرے دن نمائش پذیر ہوئی۔ شائقین فلم نے اس فلم کا والہانہ استقبال کیا جب کہ اس فلم میں خواتین کی دلچسپی

نے اس فلم کی کامیابی میں چار چاند لگا دیئے اور اسے ڈائمنڈ جوبلی کے مرتبے تک پہنچا دیا۔

اس فلم کے اچھوتے موضوع، خوب صورت کہانی اور آرٹسٹوں کی لاجواب کردار نگاری کی وجہ سے اسے فقید المثال کامیابی حاصل ہوئی تو انڈیا میں اسی نام سے اس کا چربہ بنایا گیا اور مثالی بیوی کا جو رول شبنم نے ادا کیا تھا وہ بھارتی فلم میں اداکارہ ریکھا نے ادا کیا مگر وہ شبنم کی طرح شائقین فلم کو متاثر نہ کرسکی۔

پاکستانی فلم کے فلم ساز غضنفر علی تھے۔ ڈائریکشن زاہدہ شاہ نے دی تھی۔ موسیقار نثار بزمی تھے۔ کاسٹ میں شبنم، شفیع محمد، فیصل، آرزو، لہری، کمال ایرانی نمایاں فنکار تھے۔ ''بیوی ہو تو ایسی'' کے گیتوں نے بھی بڑی مقبولیت حاصل کی۔ کچھ تو آج تک مقبول عام ہیں۔

☆سچا تیرا نام تو ہی بگڑے بنائے کام (آواز مہناز)

☆اس کے سوا میں اور کہوں کیا جاناں۔ تیرے پیار میں تیرے جیسا۔ کوئی نہیں ہے سارے پاکستان میں (آواز مہدی حسن)

☆میرے ساجن باہر آجا۔ میں لے کر آئی ہوں بینڈ باجا (آواز مہناز)

☆میں نے تجھ کو دیر سے جانا (آوازیں اے نیر، ناہید اختر)

عیدالاضحیٰ کے موقع پر ریلیز ہونے والی اب تک کی آخری ڈائمنڈ جوبلی فلم ''بوبی'' ہے جو 7 ستمبر 1984ء بکے عید قرباں کے دن نمائش پذیر ہوئی تھی۔ اس فلم نے 140 ہفتے چل کر عیدالاضحیٰ کی ڈائمنڈ جوبلی فلموں میں بیسٹ فلم کا اعزاز حاصل کیا جب کہ عام دنوں میں ڈائمنڈ جوبلی منانے والی فلموں میں ''آئینہ'' اور ''ہم دونوں'' کے بعد ہفتوں کے اعتبار سے ''بوبی'' تیسری فلم ہے۔ نذر آرٹ کے بینر تلے بنائی جانے والی فلم ''بوبی'' کے فلم ساز و ہدایت کار نذر شباب تھے۔ اس کے مصنف مشترکہ طور پر جلیل افغانی اور سید نور تھے۔ مکالمے بھی سید نور نے لکھے تھے جب کہ مسرور انور کے گیتوں نے بھی ''بوبی'' کی کامیابی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ ''بوبی'' کی عظیم الشان کامیابی سے متاثر ہو کر بھارت میں اسے چربہ کیا گیا اور اس کا نام ''دادا گیری'' رکھا گیا جس میں محمد علی والا کردار دھرمیندر نے کیا مگر محمد علی کی طرح متاثر نہ کرسکے۔ ''بوبی'' میں محمد علی کی کردار نگاری بے حد متاثر کن تھی۔ سیما اور جاوید شیخ کی پرفارمنس بھی لاجواب تھی۔ شاہدہ منی، فردوس جمال، سکندر شاہین، تمنا، ننھا، رنگیلا اور ہمایوں قریشی دیگر نمایاں فنکار تھے۔ ''بوبی'' زبردست تفریح سے بھرپور ایک نغماتی فلم تھی جس نے شائقین فلم کی عید کی خوشیوں کو دوبالا کردیا تھا۔ یہ محمد علی کے کیریئر کی پہلی اور آخری ڈائمنڈ جوبلی فلم تھی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ گلوکارہ سلمیٰ آغا کی پاکستان میں یہ پہلی فلم تھی جس میں ان کے گائے ہوئے گانوں نے دھوم مچادی۔ ''بوبی'' میں ان کے گائے ہوئے گیت۔

☆اک بار ملو ہم سے تو سو بار ملیں گے
ہم جیسے کہاں تم کو طلب گار ملیں گے

☆جہاں آج ہم ملے ہیں یہ مقام یاد رکھنا
میرا نام ہے محبت میرا نام یاد رکھنا

بہت مقبول ہوئے اور یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ''بوبی'' کی عظیم الشان کامیابی سے سلمیٰ آغا کو پاکستانی فلمی دنیا میں اپنے قدم جمانے کا سنہری موقع مل گیا۔ انہوں نے بطور گلوکارہ ہی نہیں بطور اداکارہ بھی پاکستانی فلموں میں پرفارم کیا۔

موسیقار امجد بوبی اور نغمہ نگار مسرور انور کی تخلیقی کاوشوں سے ''بوبی'' کے دیگر گانے بھی مقبول اور مشہور ہوئے۔

☆اک بار ملو ہم سے تو سو بار ملیں گے (یہ گیت غلام عباس کی آواز میں بھی صدا بند ہوا)

☆جب شام کے سائے ڈھلتے ہیں اور چلتی ہے پاگل پروائی (آواز سلمیٰ آغا)

☆دھڑکنوں کا ایک ہی پیغام ہے۔ زندگی دل کی خوشی کا نام ہے (آوازیں ٹرپل سسٹرز)

☆آج تمہارے ظلم و ستم کا ہم کو قرض چکانا ہے (آواز ناہید اختر)

ڈائمنڈ جوبلی کا اعزاز اور بھی کئی فلموں نے حاصل کیا ہے مگر وہ عام دنوں میں ریلیز ہونے والی فلمیں ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کرچکا ہوں کہ ہمارے ہاں عیدین کے موقع پر خصوصی طور پر فلمیں ریلیز کی جاتی ہیں کہ انہیں اچھا رسپانس ملے۔ اس حوالے سے بڑی عید کے موقع پر ریلیز ہونے والی بڑی فلموں کے بارے میں آپ کی معلومات میں اضافہ کیا۔

ہم یہ تحریر یہیں تک لکھ پائے تھے کہ ہمارے ایک عزیز ہمارے گھر آگئے۔ عید ملنے کے بعد بولے۔

''کیا کر رہے ہیں؟''

''مزدوری کر رہا ہوں۔''

''عید کے دن بھی؟''

''ہاں بھائی! ہماری قسمت میں تو لکھنا، لکھنا مدام لکھنا، یہی لکھا ہے لکھوں گا نہیں تو......''

''اس وقت کیا لکھ رہے ہیں؟''

''عیدالاضحیٰ کی ڈائمنڈ جوبلی فلموں کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔''

''پلاٹینیم اور گولڈن جوبلی فلموں کو کیوں نظر انداز کردیا۔ وہ بھی اس عید (عید قرباں) پر ریلیز ہوئی ہوں گی۔''

''ہاں ہوئی تو ہیں مگر......''

''کوئی زور زبردستی نہیں اگر ہو سکے تو ہماری یہ خواہش بھی پوری کردیجیے اس تحریر میں۔''

''ٹھیک ہے کوشش کرتا ہوں۔''

اور اس کوشش میں کئی دن لگ گئے۔ کئی روز بعد کچھ معلومات حاصل ہوئیں اور عیدالاضحیٰ پر ریلیز ہونے والی پلاٹینیم جوبلی اور گولڈن جوبلی فلم کے بارے میں بھی متذکرہ فرمائش کی تکمیل کر رہا ہوں۔

عیدالاضحیٰ کی پہلی پلاٹینیم جوبلی پنجابی فلم ''انورا'' تھی جو 1970ء میں عیدالاضحیٰ کے موقع پر ریلیز ہوئی تھی۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ اس موقع پر ''انورا'' کے ساتھ جو دیگر فلمیں ریلیز ہوئیں وہ بھی بڑے بڑے ہدایت کاروں کی بڑی فلمیں تھیں۔ ہدایت کار لقمان کی فلم افسانہ، ہدایت کار اسلم ڈار کی فلم ''آخری چٹان'' ہدایت کار نذر شباب کی فلم ''سجن بیلی'' اور ہدایت کار افتخار خان کی فلم ''سجناں دور دیا'' مگر ''انورا'' نے ان تمام بڑی فلموں کے دنگل میں سب کو پچھاڑ دیا۔ سب سے بڑی کامیابی حاصل کی۔ یہ ایک خوب صورت اور نغمہ بار فلم تھی ساتھ ہی ایکشن سے بھرپور بھی۔ یہ فلم 17 فروری 1970ء کو عیدالاضحیٰ کے دن ریلیز ہوئی اور اس نے کراچی میں 78 ہفتے اور لاہور میں 82 ہفتے مسلسل چل کر پلاٹینیم جوبلی کا پرچم لہرایا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ''انورا'' نے کراچی کے مین تھیٹر رینو پر مسلسل چل کر سلور جوبلی کی یعنی ایک سینما میں 25 ہفتوں تک چلتی رہی۔

اس فلم کے پیش کار خلیفہ نذیر، ہدایت کار خلیفہ سعید احمد، مصنف و مکالمہ نگار سکے دار، موسیقار طافو، نغمہ نگار خواجہ پرویز تھے جب کہ اداکاری کے شعبے میں اعجاز، نغمہ، اقبال حسن، سلونی، چنگیزی، سکے دار، منور ظریف، رضیہ، خلیفہ نذیر، تانی، پروین، شاہنواز جونیئر، سلطان راہی، خیام سرحدی، سیما بیگم، مظہر شاہ اور کیریکٹر ایکٹر ساون شامل تھے۔ ساون نے انورا کا ٹائٹل کردار کر کے اس فلم کو یادگار بنا دیا تھا۔ اس فلم کی موسیقی اور گانوں نے بھی فلم کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس فلم میں 8 گیت تھے جنہیں ملکہ ترنم مادام نور جہاں، نسیم بیگم، آئرن پروین اور خلیفہ نذیر کی آوازوں میں صدا بند کیا گیا تھا۔ کئی گیتوں کی مقبولیت تو آج تک برقرار ہے۔ مثال کے طور پر

☆ سن وے بلوری اکھ والیا

ویسے تو سارے ہی گیت ہٹ ہوئے۔ ریڈیو پر دن بھر ''انورا'' کے گانے ان دنوں فرمائشی طور پر نشر کیے جاتے تھے۔ طافو صاحب کی مدھر دھنوں اور خواجہ پرویز صاحب کے پُراثر بولوں نے ہر طرف دھوم مچادی تھی۔ اس فلم کی نمائش اور مقبولیت کے بعد طافو اور خواجہ پرویز کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ کریکٹر ایکٹر ساون جنہوں نے انورا کا ٹائٹل رول کیا تھا، ان کی اداکاری کی وجہ سے ان کے فنی کیریئر کی یہ یادگار اور شاندار فلم تسلیم کی گئی۔ اس پرفارمنس کی بدولت ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوا اور وہ صفِ اوّل کے کیریکٹر ایکٹر مانے گئے۔ ''انورا'' کی زبردست کامیابی میں خلیفہ سعید احمد کی پاورفل ہدایت کاری کا بڑا حصہ ہے۔ انہوں نے فلم کے پہلے سین سے آخری منظر تک اپنی گرفت مضبوطی سے قائم رکھی۔ آرٹسٹوں سے بہترین کام لیا۔ خاص طور پر ساون (مرحوم) سے جو کام لیا وہ کوئی دوسرا ہدایت کار ان سے نہ لے سکا۔

عیدالاضحیٰ کے دن ریلیز ہو کر گولڈن جوبلی کا اعزاز حاصل کرنے والی پہلی اردو فلم ''تلاش'' ہے۔ جی ہاں شبنم اور رحمٰن کی فلم جو ڈھاکے میں بنی تھی اور جس کے ہدایت کار شفیق تھے۔ جو ڈھاکے اور کراچی میں 3 مئی 1963ء بیک وقت ریلیز کی گئی۔ کراچی میں اس کا مین تھیٹر نشاط سینما تھا۔ جوبلی سینما میں بھی تلاش دکھائی گئی۔ اس طرح مشترکہ طور پر اس نے 51 ہفتے پورے کیے۔ عجیب اتفاق ہے کہ عید قرباں کے موقع پر ریلیز کی جانے والی اس فلم کی کہانی بھی قربانی کے جذبے سے متعلق تھی۔ ایک باپ کی قربانی اپنے لختِ جگر کے لیے۔

اس فلم کے کریڈٹ میں بطور مصنف اس کے ہدایت کار مستفیض ہی کا نام درج ہے۔ دراصل دونوں بھائیوں

(احتشام اور مستفیض) کی جانے کیا مصلحت تھی کہ وہ اپنی فلموں (بنگالی اور اردو دونوں) میں اوریجنل کہانی نویسوں کے نام نہیں دیتے تھے۔ مصنف کے خانے میں، یا اپنے نام دیتے یا اپنی بیگموں کے نام درج کرتے۔ ہاں مکالمے لکھنے والوں کا نام ضرور دیتے تھے۔ ''تلاش'' میں بھی مکالمہ نویس کے طور پر سرور بارہ بنکوی کا نام موجود ہے۔ اگرچہ مجھے ذاتی طور پر بخوبی علم ہے کہ پورا اسکرپٹ سرور صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ البتہ اس بات کا امکان ہے کہ کہانی کا موضوع اور تھیم مستفیض یا احتشام کا ہو۔ دونوں بھائی اور ان کی بیگمات اردو بول تو لیتے تھے مگر اردو لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ ان کی تقریباً تمام ہی اردو فلموں میں بحیثیت مصنف ان کا یا ان کی بیگمات کا نام درج ہے۔ بطور مصنف سرور بارہ بنکوی، شاعر صدیقی، زین العابدین اور تقی مصطفیٰ نے جو کہانیاں لکھیں ان میں مکالموں کے خانے میں تو ان کا نام دیا گیا۔ مصنف کا کریڈٹ ان کے اپنے گھر کے لوگوں کو تفویض کیا گیا۔

''تلاش'' کے بارے میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ابتداء میں اس کا نام ''رکشے والے کی تلاش'' رکھا گیا تھا لیکن پھر اسے کمرشل لیول پر غیر موزوں خیال کر کے صرف ''تلاش'' کر دیا گیا۔

جس زمانے میں یہ فلم بنائی گئی تھی اس دور میں ڈھاکے اور مشرقی پاکستان کے بڑے شہروں میں سائیکل رکشے چلا کرتے تھے۔ سائیکل رکشا چلانا ایک نہایت مشقت طلب کام تھا اس کے باوجود غربت اور بے روزگاری کے سبب بہت سے لوگ اس روزگار سے وابستہ تھے۔ مستفیض نے جو اپنے بھائی احتشام کے مقابلے میں زیادہ بہتر سوجھ بوجھ کے مالک تھے اور تکنیکی طور پر زیادہ باصلاحیت تھے انہوں نے اپنی پہلی اردو فلم کا موضوع سائیکل رکشا چلانے والے ہی کو بنایا۔ اس کی کہانی ایک سائیکل رکشا چلانے والے کے گرد گھومتی ہے۔ اس کردار کو اداکار شوکت اکبر نے پرفارم کیا تھا۔ رکشا چلانے سے پہلے وہ گاؤں میں اپنی بیوی (رانی سرکار) اور بیٹے کے ساتھ رہتا تھا اور بہتر زندگی گزارنے کے لیے شہر آتا ہے۔ ڈھاکے پہنچتے ہی اس کا بیٹا بیمار ہو جاتا ہے۔ وہ بیوی بچے کو ایک جگہ بٹھا کر ڈاکٹر سے دوا لینے جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد کچھ غنڈے ایک عورت کو تنہا دیکھ کر اس کے پاس آتے ہیں اور زبردستی اسے ٹیکسی پر بٹھا کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ بیوی مدد کے لیے چیخ چلاتی ہے۔ اس وقت ایک کار آ کر رکتی ہے اور

ابجد

ابتدائی حروف تہجی اب ج د کا مرکب ہے جن سے کسی زبان کے حروف مراد ہوتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں فن تحریر کے رواج سے پیشتر اظہار مطلب کا واحد ذریعہ تصویریں ہوا کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ ان تصاویر کو مختصر کر کے حروف بنائے گئے۔ ابجد کی ایجاد کا سہرا فونیقی قوم کے سر ہے جس نے سب سے پہلے حروف تہجی مرتب کیے۔ بعد میں ماسوائے چین اور جاپان کے تمام دنیا نے انہیں اپنی ضرورت کے مطابق اپنایا۔ یورپ میں جو لاطینی حروف تہجی رائج ہیں وہ اسی قدیم فونیقی تہجی سے اخذ کیے گئے ہیں اور ان کا نام Alphabet ہے۔ جو ''الفا'' اور ''بیٹا'' کا مرکب ہے۔ یہ لاطینی زبان کے ابتدائی دو حروف ہیں اور فونیقی الف اور ب کے ہم آواز ہیں۔ موجودہ عربی حروف تہجی بھی فونیقی ہی کی ایک صورت ہیں، کیونکہ فونیقی قوم بھی عربوں کی طرح سامی النسل تھی۔ جس رسم الخط میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ حبش کو خط تحریر کیا تھا، اس میں اور فونیقی رسم الخط میں ایک عجیب مشابہت نظر آتی ہے۔ عربی ابجد: (دائیں سے بائیں) اب ت ث ج ح خ د ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک ل م ن و ہ ی۔

اردو ابجد: (دائیں سے بائیں) اب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ی ے۔

یاد رہے کہ ہندی رسم الخط آرامی سے اخذ کیا گیا ہے اور آرامی رسم الخط بھی فونیقی رسم الخط ہی کی پیداوار ہے۔ اردو خط عربی رسم الخط کی ایک صورت ہے جس کو نستعلیق کہتے ہیں۔ اس میں 37 حروف ہیں۔ اس کے مقابلے پر فارسی کے 32 اور عربی کے 29 حروف ہیں۔ عربی تحریر نسخ میں ہوتی ہے۔

مرسلہ: نعمان اشرف، لاہور

اس سے شہر کے ایک نامور جج جلیل افغانی اترتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر غنڈے بھاگ جاتے ہیں تو رانی سرکار اپنی بپتا سناتی ہے۔ جج صاحب کہتے ہیں یہاں تنہا بیٹھ کر تم شوہر کا انتظار کروگی تو پھر کسی مصیبت میں پڑ جاؤ گی۔ میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ تمہارے شوہر کو ہم سب ڈھونڈ نکالیں گے تو ان کے ساتھ چلی جانا۔

جب شوکت اکبر بچے کی دوائی لے کر آتا ہے تو بیوی بچے کو موجود نہ پا کر پریشان ہو جاتا ہے..... جب پریشانی کے عالم میں اپنی قسمت کو رو رہا ہوتا ہے تو ایک سائیکل رکشا چلانے والا (شمعاش دتہ) اس کے پاس آکر پوچھتا ہے۔ ”کیا بات ہے بھائی! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

مصیبت کا مارا شوکت اکبر اپنی بیوی اور بچے کی گمشدگی کی بات بتاتا ہے۔ ”یہاں شہر میں تمہارا کوئی جاننے والا، کوئی عزیز رشتے دار ہے؟“ شمعاش دتہ اس سے پوچھتا ہے۔

”نہیں بھائی! کوئی نہیں ہے۔“

”پھر تم کہاں رہو گے۔ کہاں جاؤ گے؟“

”پتا نہیں اب تو میرے لیے جینا... مشکل ہوگا۔ اب میرے لیے مرجانا ہی بہتر ہے۔“

رکشا والے کو اس کے حال پر رحم آجاتا ہے اور وہ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آتا ہے اور چند دنوں بعد اسے بھی ایک سائیکل رکشا دلوا دیتا ہے اور شوکت اکبر بھی رکشا چلانے لگتا ہے اور ساتھ ہی اپنی بیوی اور بچے کی تلاش بھی جاری رکھتا ہے۔ ایک دن جہان سے اس کی بیوی بچے غائب ہو گئے تھے۔ اسے ایک عینی شاہد نے بتایا۔

”میں نے چند روز پہلے یہاں .... ایک عورت کو کچھ غنڈے اغوا کر کے لے جانے کا منظر دیکھا تھا۔“

”اوہ! میرے خدا! کیا وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے؟“

وہ اسے کھینچ تان کر ٹیکسی میں بٹھانے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ عورت اپنی مدد کے لیے چلا رہی تھی کہ اچانک ایک کار ان کے قریب آکر رکی۔ اس گاڑی سے ایک صاحب اترے ان کے ساتھ کچھ مسلح گارڈ بھی تھے۔ ان کے ڈرانے دھمکانے کی وجہ سے غنڈے عورت کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور پھر موٹر سے اترنے والا آدمی اس عورت کو اپنے ساتھ لے کر چلا گیا۔

”کیا اس عورت کے ساتھ کوئی بچہ بھی تھا؟“

”ہاں! شاید ایک بچہ تھا۔“

”یہ تو مجھ بدقسمت ہی کے بیوی بچے تھے۔ وہ موٹر والا شخص کون تھا؟“

”یہ تو مجھے نہیں معلوم۔“

غریب سائیکل رکشا چلانے والے شوکت اکبر نے جب یہ ساری باتیں اپنے دوست شمعاش دتہ کو بتائیں تو اس نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

”اللہ پر بھروسا رکھو۔ ایک دن تمہیں اس شخص کا نام پتا بھی معلوم ہو جائے گا۔“ اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے اپنی بیوی اور بچے کو دیکھ لیا۔ ایک بچے کو اسکول لے جانے کے لیے اس کے رکشے کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو پہچان لیا جو اب ایک جج کے گھر میں رہ رہا تھا۔ اسے بیٹے کو پا کر بہت خوشی ہوئی مگر اس نے اپنے سینے پر صبر کی سل رکھ کر سوچا اگر میں اسے اپنا بیٹا ظاہر کر کے اپنے ساتھ لے جاؤں گا تو اسے بھی میری طرح غربت کی زندگی بسر کرنی پڑے گی اور بڑا ہو کر اسے بھی شاید میری طرح سائیکل رکشا چلانا پڑے گا۔ نہیں...... نہیں میں اپنے جگر کے ٹکڑے کو یہ مشقت طلب کام نہیں کرنے دوں گا۔ رکشے والا نہیں بناؤں گا۔ وہ اور اس کی ماں اگر جج صاحب کے گھر میں خوش حال زندگی بسر کر رہے ہیں تو انہیں اس آرام دہ زندگی سے نکال کر غربت کے اندھیرے میں نہیں لاؤں گا۔“

اس طرح شوکت اکبر نے اپنے جذبات کی قربانی دے کر اپنے بیوی بچے سے اپنے آپ کو چھپایا اور اپنے رکشے والے دوست شمعاش دتہ کے ساتھ ہی تنہا زندگی گزاری۔

اس فلم میں شوکت اکبر نے ینگ ٹو اولڈ کیریکٹر کیا۔ وہی ”تلاش“ کا مرکزی کردار تھا۔ اس نے اس کردار کی مناسبت سے بہت عمدہ اداکاری کی۔ یوں بھی شوکت اکبر کو ڈھاکا فلم انڈسٹری میں وہی حیثیت حاصل تھی جو یہاں علاؤ الدین کو حاصل تھی۔ ہر طرح کی کردار نگاری وہ بہت عمدہ طریقے پر کرتا تھا۔ رانی سرکار اور اس کے بیٹے کی جوانی کا رول اداکار رحمٰن نے ادا کیا تھا۔ شبنم اس فلم میں رحمٰن کی ہیروئن کے روپ میں نمودار ہوئی تھی۔ جو شہر کے ایک رئیس نارائن چکرورتی کی بیٹی ہوتی ہے۔ جلیل افغانی نے بھی اپنا کردار بڑی خوبی سے ادا کیا تھا۔ انہوں نے کہانی کے مطابق رانی سرکار کو اپنی منہ بولی بہن بنا کر اس کی اور اس

کے بیٹے کی پرورش و پرداخت احسن طریقے پر کی۔ محفوظ نے ولن کا کردار کیا تھا جو رحمٰن اور شبنم کی محبت کا دشمن بن جاتا ہے اور رحمٰن کو اپنے راستے سے ہٹانے کی نیت سے اسے ایک حادثے کا شکار کردیتا ہے شمماش دتہ نے بھی اس فلم میں ینگ ٹو اولڈ کردار نگاری کی اور مزاحیہ اور سنجیدہ دونوں طرز کی اداکاری میں کامیاب رہا۔

مستفیض کی بطور ہدایت کار یہ پہلی اردو فلم تھی۔ اس سے پہلے ان کے بھائی احتشام نے ''چندا'' نامی فلم بنا کر مشرقی پاکستان میں اردو فلموں کی ابتداء کی تھی۔ تلاش، چندا سے بہتر فلم تھی جس نے کراچی میں گولڈن جوبلی کا اعزاز حاصل کیا۔ اس فلم کی سپرہٹ کامیابی سے اس سے متعلقہ آرٹسٹ اور ہنرمند ملک گیر شہرت کے حامل ہوگئے۔ مستفیض کی دوسری گولڈن جوبلی فلم ''چھوٹے صاحب'' تھی۔

''تلاش'' کی کامیابی میں اس کے گیتوں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ روبن گھوش ''تلاش'' کے موسیقار تھے جنہوں نے کہانی کی مناسبت سے بڑی عمدہ موسیقی کمپوز کی تھی جب کہ تین نغمہ نگاروں سرور بارہ بنکوی، امین اختر اور عشرت کلکتوی نے اس کے گیت لکھے تھے۔ اس فلم کے دوگانے اسٹریٹ سونگ قرار پائے۔ یہ دونوں گیت بشیر احمد نے گائے تھے۔

☆ کچھ اپنی کہیے کچھ میری سنیے۔ یہ شام یہ تنہائی یوں چپ تو نہ رہیے

☆ رکشے والا متوالا۔ رکشے والا دل والا

بشیر احمد کی یہ پہلی فلم بطور گلوکار تھی۔ انہیں روبن گھوش نے ان کی خوب صورت آواز کی وجہ سے گانے کا چانس دیا تھا۔ ''تلاش'' کے پانچ گانے ان کی آواز میں ریکارڈ کیے گئے تھے۔ بشیر احمد کی سفارش پر ہی عشرت کلکتوی سے اس فلم کے کچھ گیت لکھوائے گئے۔ عشرت صاحب بشیر احمد کے بہنوئی تھے اور بہت اچھے شاعر تھے۔ بعد میں انہوں نے روشن علی عشرت کا نام اختیار کیا۔ ان کا انتقال کراچی میں ہوا۔

''تلاش'' کے گیتوں کی تفصیل یوں ہے۔

☆ میں ہوں رکشے والا متوالا (آواز بشیر احمد، فلمبند، شمماش دتہ)

☆ میں نے آج پی لی تو کیا؟ آج میں نشے میں ہوں تو کیا؟ (آواز بشیر احمد، عکسبند، شمماش دتہ)

☆ میں نے کہا السلام علیکم۔ میرے متوالے ہیں سب دل والے (آواز فردوس بیگم، فلمبند نرگس)

☆ کچھ اپنی کہیے کچھ میری سنیے۔ یہ شام یہ تنہائی یوں چپ تو نہ رہیے (آواز بشیر احمد، پکچرائزیشن رحمٰن)

☆ کچھ اپنی کہیے کچھ میری سنیے (آواز فردوس بیگم، فلمبند، شبنم)

☆ جان گئی رے چپکے سے دل میں ترے کون آیا رے (آوازیں فردوسی بیگم، نینا، ملکہ پروین، عکس بندی شبنم، شبانہ، ثریا)

☆ ہائے کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی۔ دل تو کسی سے لگاؤ گے (آوازیں بشیر احمد، انجمن آراء، فلمبند، شبنم رحمٰن)

☆ تم بھی حسیں دل بھی جواں۔ ہائے یہ رنگین سماں، اس پر سہانی یہ رات (آوازیں بشیر احمد، انجمن آرا، فلمبند شبنم رحمٰن)

☆ موسم رنگیلا نشیلی ہوا۔ ایسے میں دل ہے نہ جانے کہاں (آواز فردوسی بیگم، عکسبند شبنم)

☆ رکشے والا بے چارہ۔ ٹوٹ گیا ہر ایک سہارا (آواز قاضی انور۔ فلمبند، شوکت اکبر)

نئی نسل کے قارئین کے لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ گلوکارہ انجمن آراء، میلوڈی کوئن رونا لیلیٰ کی کزن تھیں۔ جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ اسی طرح قاضی انور ایک ادیب تھے اور گلوکارہ فریدہ یاسمین کے شوہر بھی تھے۔

''تلاش'' کے فلم ساز انیس دوسانی اور احتشام تھے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مشرقی پاکستان کے سب سے بڑے اور ماڈرن سنیما ''گلستان'' سے انیس دوسانی کا تعلق تھا۔ ان کے والد ایف اے دوسانی اور انیس دوسانی گلستان سنیما کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنا تقسیم کار ادارہ بھی بنالیا تھا اور پھر فلم پروڈکشنز میں بھی سرمایہ کاری کرنے لگے تھے۔ خاص طور پر انہوں نے احتشام اور مستفیض کی فلموں کے لیے سرمایہ کاری کی۔ بعد میں انیس دوسانی نے کراچی میں بھی اپنا ڈسٹری بیوشن آفس قائم کرلیا تھا۔ احتشام اور مستفیض کا فلم ساز ادارہ لیو فلمز کے نام سے تھا۔ دونوں بھائی پہلے بنگالی زبان کی فلمیں بناتے تھے پھر چندا اور تلاش کی کامیابی کے بعد اردو فلمیں پروڈیوس کرنے لگے۔

آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے کچھ ایسی پس پردہ باتیں بھی شیئر کرتا چلوں جیسے ڈھاکے کی بنی پہلی اردو فلم ''چندا'' ایک لاکھ روپے کی لاگت سے بنائی گئی تھی جس نے 20 لاکھ کما کر دیے۔ ''چندا'' نے بھی گولڈن جوبلی کامیابی کا اعزاز حاصل کی تھی۔ اس دور میں سنگل سنیما اسکرین میں

بہت کم فلمیں گولڈن جوبلی تک رسائی حاصل کرتی تھیں۔ مستنفیض جن کی پہلی اردو فلم ''تلاش'' کے بارے میں ذکر ہو رہا ہے اور جس نے گولڈن جوبلی عیدالاضحیٰ کے موقع پر ریلیز ہو کر کی اس کے کامیاب و کامران ہدایت کار کے بارے میں بھی یہ جانکاری حاصل کیجیے کہ ان کا پورا نام مستنفیض الرحمٰن تھا۔ ان کی پیدائش 1930ء کی ہے۔ ان کے والد کا نام پروفیسر محمد یوسف تھا۔ وہ اپنے بھائی احتشام الرحمٰن کو دیکھ کر فلم میکنگ کے شعبہ میں آئے۔ ابتداء میں انہوں نے کیپٹن احتشام کو اسسٹ کیا پھر 1961ء میں باقاعدہ ہدایت کار کے طور پر پہلی بنگالی فلم ''ہارا نو ون'' (گمشدہ دن) بنائی جس نے شاندار بزنس کر کے ڈھاکے میں پہلی سلور جوبلی فلم کا اعزاز حاصل کیا۔ اسی فلم میں انہوں نے پہلی بار شبنم اور رحمٰن کی جوڑی متعارف کرائی۔ عام زندگی میں بھی احتشام اور مستنفیض میں مماثلت نظر آتی تھی۔ مثلاً ان کی بیٹیوں کے نام بھی ملتے جلتے ہیں، احتشام کی صاحبزادی کا نام فرزانہ ہے تو مستنفیض کی بیٹی کا نام فرحانہ ہے۔

تلاش کے ہدایت کار مستنفیض کی دیگر ریلیز شدہ فلمیں پیسے، ڈاک بابو، مالا، چھوٹے صاحب، قلی، اناڑی اور پائل ہیں۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد وہ تو وہیں ڈھاکے میں رہے جب کہ احتشام بنگلہ دیش بننے کے وقت اپنی بیٹی اور داماد (ندیم) کے پاس لاہور میں تھے اس لیے خاصا وقت لاہور میں گزار کر واپس ڈھاکے گئے۔ مستنفیض کا انتقال 4 اگست 1992ء میں ڈھاکے میں ہوا۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ''تلاش'' کو بنگالی زبان میں ڈب کر کے بھی سنیماؤں کی زینت بنایا گیا۔ ایسا اس وقت کیا گیا جب بنگلہ دیش بن گیا تھا۔ یہ واقعہ 1977ء کا ہے۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد اردو فلموں کی نمائش نہیں کی جاتی تھی۔ صرف ڈھاکے میں بننے والی بنگالی زبان کی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ ہدایت کار مستنفیض نے بھی دوبارہ بنگالی فلمیں بنانا شروع کر دیں۔ اسی دور میں انہوں نے تلاش کو بنگالی زبان میں ڈب کر کے بھی ریلیز کر دیا۔

عیدالاضحیٰ کے موقع پر ریلیز ہونے والی پہلی فلم ''تلاش'' آج سے 55 سال پہلے ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں پڑھنے والے میرے بہت سے قارئین کی اتنی عمر بھی نہیں ہوگی۔ جن لوگوں نے تلاش کو اس کی نمائش کے بعد دیکھا اور وہ حیات ہیں تو میری عمر کے یا کچھ کم و بیش کے ہوں گے۔ میں اس وقت اسی برس کا ہوں۔ ''تلاش'' کی تخلیق میں حصہ ڈالنے والوں میں اس وقت اداکارہ شبنم، گلوکارہ فردوسی بیگم اور اداکارہ شبانہ اور چیف اسسٹنٹ ڈائریکٹر عزیز الرحمٰن زندہ ہیں جب کہ اس کے فلم ساز انیس دوسانی، احتشام ہدایت کار مستنفیض مکالمہ اور نغمہ نگار سرور بارہ بنکوی موسیقار روبن گھوش، نغمہ نگار عشرت تلکنوی، گلوکار بشیر احمد، گلوکارہ انجمن آراء، ڈانس ڈائریکٹر دیو کمار، عکاس کیو ایم زمان، مدوین کار بشیر حسین کے علاوہ اداکار رحمٰن، جلیل افغانی، نرائن چکرورتی، شمعاش دتہ، شوکت اکبر، محفوظ اور اداکارہ رانی سرکار اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

''تلاش'' کی سپرہٹ کامیابی کے بعد ڈھاکا فلم انڈسٹری میں باضابطہ اردو فلموں کا دور شروع ہو گیا اور سارے بڑے چھوٹے فلم میکرز بنگالی فلموں کی بجائے اردو فلمیں بنانے لگے۔ فلموں کا گویا ایک سیلاب آ گیا اور وہاں کی بنی اردو فلمیں مغربی پاکستان میں بھی دیکھی اور دکھائی جانے لگیں۔ تلاش کی کاسٹ اور کریڈٹ میں جو لوگ شامل تھے ان میں سے کئی نے بڑی عزت شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ سرور بارہ بنکوی اسکرپٹ رائٹنگ اور نغمہ نگاری سے ترقی کر کے فلم ساز و ہدایت کار بن گئے۔ رحمٰن نے بھی اپنی ٹانگ ٹوٹنے کے باوجود اداکار، ہدایت کار اور فلم ساز کی حیثیت سے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ کیو ایم زمان نہ صرف مستند عکاس کی حیثیت سے ابھرے بلکہ ایف ڈی سی کے چیف کیمرا مین مقرر کیے گئے۔ اداکارہ شبنم اور شبانہ نے صفِ اوّل کی اداکارہ کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ بشیر احمد نے بطور گلوکار نغمہ نگار اور موسیقار اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ فردوسی بیگم نے برصغیر کی نامور گلوکارہ کا اعزاز حاصل کیا۔ جلیل افغانی نے کیریکٹر ایکٹنگ میں ممتاز مقام حاصل کرنے کے بعد لاہور میں سپرہٹ کہانی لکھنے والے کی حیثیت سے بھی مقبولیت حاصل کی۔ روبن گھوش نے پاکستانی فلموں کے صفِ اوّل کے موسیقاروں میں اپنی جگہ بنائی اور سپرہٹ گیتوں کے تخلیق کار بنے۔ ہدایت کار مستنفیض نے اپنی اردو فلموں کی وجہ سے پاکستان کے صفِ اوّل کے ہدایت کاروں میں اپنے آپ کو شامل کیا۔

قصہ مختصر یہ کہ ''تلاش'' ایک ایسی کامیاب فلم تھی جس نے بہت سے فنکاروں اور ہنرمندوں کو کامیابی و کامرانی کے عروج پر پہنچایا۔

موت کا ہرکارہ

سید احتشام

کہتے ہیں کہ اونٹ اور ہاتھی کینہ پرور ہوتے ہیں۔ انتقام پر اتر آئیں تو اپنے مالک کو بھی بخشتے نہیں ہیں۔ بنگال کے جنگلوں میں بھی ایک ہاتھی انسانوں سے انتقام پر اتر آیا تھا۔ اس نے آس پاس کی آبادیوں میں قیامت مچا دی تھی۔ ایسے کینہ پرور ہاتھی کو مارنا آسان نہیں تھا انسانی ہلاکتوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی،اسی بات نے اسے مجبور کردیا کہ وہ گاؤں والوں کی خاطر اس ہاتھی کا شکار کرے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کے پاس اپنی بندوق تک نہ تھی پھر بھی اس نے کمر کس لی۔

شکاریات پڑھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ تحریر

ان دنوں میں کلکتہ میں اپنے دوست الفریڈ کے گھر پر آرام کررہا تھا۔ ایک منٹ پہلے میں اپنا مختصر تعارف کرا دوں۔ میرا تعلق جنوبی افریقا سے ہے۔ والدین جوہانسبرگ کے رہنے والے تھے۔ میرے والد ڈونالڈر یمنگٹن کا اسٹیل کا کاروبار تھا اس لیے معاشی اعتبار سے پُرآسائش زندگی گزاری۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ہائی اسکول پاس کر کے میں ایک مقامی سفاری میں ملازم ہوگیا۔ وہاں مجھے جس جانور سے سب سے زیادہ واسطہ پڑا تھا، وہ جنوبی افریقا کے دیوہیکل اور خونخوار ہاتھی تھے۔ آئے دن یہ غریب افریقی کسانوں کی املاک اور کھیتوں کو اپنے پیروں تلے روندتے

رہتے تھے۔ میں اس خاص شکاری دستے میں شامل تھا جو خطرناک اور انسانوں کے لیے باعثِ آزار بن جانے والے ہاتھیوں کا شکار کرتا تھا۔ تین سال کے عرصے میں میں نے کوئی دو درجن ہاتھی شکار کیے۔ یہ 1938ء کا ذکر ہے۔ اس زمانے میں ہاتھی کے شکار اور اس کے دانت کے کاروبار پر پابندی نہیں تھی اس لیے میں نے جب دو درجن ہاتھیوں کے دانت جوہانسبرگ میں لاکر فروخت کیے تو مجھے خاصی بڑی رقم مل گئی۔ چنانچہ میں نے دوبارہ تعلیمی سلسلہ شروع کیا اور زولوجی میں ماسٹر کیا۔ کچھ عرصے میں کیپ ٹاؤن میں پڑھاتا بھی رہا۔

دوسری جنگ عظیم کے آخری دنوں میں رضا کار کے طور پر سنگاپور اور ہانگ کانگ میں رہا۔ جنگ کے بعد میں تھکن اتارنے کے لیے ہندوستان چلا آیا، جو ان دنوں آزادی کی تحریک میں گھرا ہوا تھا۔ مجھے سیاست سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی اس لیے میں اپنے تاجر دوست الفریڈ کے گھر آرام کر رہا تھا۔ ہانگ کانگ میں کچھ عرصہ پہلے مجھے اپنے بائیں گھٹنے میں فریکچر کی تکلیف سہنا پڑی تھی اور چار ہفتے میں اسپتال میں داخل رہا تھا۔ اس وقت تو یہ تکلیف ٹھیک ہو گئی تھی مگر ادھر میں نے کلکتے کی سرزمین پر قدم رکھا اور ادھر گھٹنے کی تکلیف نے پھر سر اٹھایا۔ میں الفریڈ کی دعوت پر ہندوستان آیا تھا۔ اس کا آسام میں چائے کے باغات کے مالکان سے کاروباری تعلق تھا اور اسی وجہ سے وہ آئے دن آسام کے دورے کرتا رہتا تھا۔ وہ وہاں سے چائے حاصل کر کے انگلینڈ بھیجا کرتا تھا۔ اسے میری تکلیف کا پتا چلا تو اس نے فوراً مجھے معروف سرجن ڈاکٹر ولیم بروک سے ملوایا۔ اس نے میرے گھٹنے کا معائنہ کیا۔

”مسٹر جوئی، کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے۔“ وہ بولا۔ ”تم تین ہفتے آرام کرو، بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

ڈاکٹر بروک نے مجھے ایک ایسی پٹی دی جو گھٹنے کو سختی سے جکڑ لیتی تھی۔ ”جب گھر سے باہر جاؤ تو اسے باندھ لیا کرنا لیکن کوشش کرنا کہ اس کی نوبت کم سے کم آئے اور اگر درد زیادہ ستائے تو یہ گولیاں پانی سے نگل لینا۔“ اس نے مجھے ایک شیشی بھی تھما دی۔

میں نے سکون کی سانس لی کہ اس نے مجھے انجکشن لگانے کی کوشش نہیں کی۔ بچپن ہی سے مجھے انجکشن سے خوف آتا تھا۔ جنوبی افریقا میں سفاری کی ملازمت کے دوران بارہا زخمی ہونے کے باوجود علاج کے دوران میں نے کبھی انجکشن نہیں لیا تھا۔ البتہ ہانگ کانگ میں آپریشن کے وقت مجھے بے ہوشی کا انجکشن لگایا گیا تھا۔ انجکشن کا یہ خوف آج بھی برقرار ہے۔

☆......☆

الفریڈ کا گھر کلکتہ میں دریائے ہگلی کے ساتھ واقع تھا۔ اس کے خوب صورت بنگلے کے لان سے دریا کا نظارہ بے حد دل پذیر تھا۔ میں شام کو عام طور سے لان میں کرسی ڈلوا کر بیٹھ جاتا اور دریا میں آتی جاتی کشتیوں کو دیکھا کرتا۔ جب اس مشغلے سے اکتا جاتا تو کوئی کتاب پڑھنے لگتا۔ سورج غروب ہوتے ہی الفریڈ کا مقامی ملازم باغ میں لگے برقی قمقمے روشن کر دیتا تھا، ساتھ ہی میرے لیے میز پر وہسکی کی بوتل، گلاس اور برف کے ٹکڑوں کا پیالا لاکر رکھ دیتا۔ ان دنوں چائے سے بھری کشتیاں اس کے دریائی بندرگاہ کے گوداموں میں آ رہی تھیں اور وہ ان کو انگلینڈ بھیجنے کے انتظامات کر رہا تھا جہاں سے یہ ڈبوں میں پیک ہو کر واپس ہندوستان بکنے آتی تھیں۔ الفریڈ نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ جو چائے ڈبے کی صورت میں پانچ یا چھ روپے کلو بکتی تھی وہ چند پیسے کلوگرام کے حساب سے خریدتا تھا۔ الفریڈ جب گھر آتا تو میرے ساتھ ہی ڈنر کرتا۔ اس کی جوان بیوی کا بیشتر وقت کلکتہ میں انگریزوں کی اعلیٰ سوسائٹی میں گزرتا تھا۔ وہ گھر پر کم ہی نظر آتی تھی۔ چند ہی دنوں میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ الفریڈ اور اس کی بیوی کے درمیان تعلقات کشیدہ تھے اور الفریڈ اس صورتِ حال سے کبیدہ خاطر تھا۔ وہ بہت ہی نیک انسان تھا۔ اس سے میری ملاقات سنگاپور میں ہوئی تھی۔ وہ عمر میں مجھ سے بڑا تھا لیکن عمروں کے اس فرق کے باوجود جلد ہی ہماری دوستی مضبوط ہو گئی تھی اور جب وہ سنگاپور سے جانے لگا تو اس نے مجھے کلکتہ آنے کی دعوت دی۔ میں دو سال کے بعد اس کی میزبانی کا شرف حاصل کر سکا تھا۔

کلکتہ کا موسم گرم تھا۔ خاص طور سے دن میں بے پناہ گرمی ہوتی تھی اور میں سارا دن پنکھے کے نیچے نیکر پہن کر بیٹھا رہتا تھا۔ اس کے باوجود پسینا پانی کی طرح جسم پر بہتا تھا۔ گرمی کے دنوں میں جنوبی افریقا میں بھی خاصی گرمی پڑتی ہے، پھر سنگاپور بھی گرم ملک ہے لیکن کلکتہ جیسی گرمی میں نے کہیں نہیں دیکھی تھی۔ اس کے باوجود میں وہاں کے قیام سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ الفریڈ کا باورچی مجھے خاص مشرقی کھانے بنا کر کھلاتا تھا جن کا ذائقہ انوکھا اور منفرد تھا۔ اس کا

کے علاوہ الفریڈ کی لائبریری بڑی شاندار تھی اور اس میں بے شمار موضوعات پر مبنی کتابیں تھیں۔ شام کے وقت لان میں بہت اچھا وقت گزرتا تھا۔ باغ کے ایک گوشے میں الفریڈ نے رنگا رنگ پرندے پال رکھے تھے۔ میں ان سے بھی دل بہلاتا تھا۔

ایک شام میں مقامی نسل کے ایک ہرے طوطے کو انگریزی کے کچھ الفاظ سکھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے دریا کی جانب سے چیخ و پکار کی آواز سنائی دی۔ میں بھاگ کر لان کے سامنے والے حصے کی طرف آیا۔ سامنے ایک خوف ناک منظر تھا۔ عورتوں اور بچوں سے بھری ہوئی ایک کشتی دریا میں الٹ گئی تھی۔ پچاس کے قریب عورتیں اور بچے دریا کے پانی میں غوطے کھا رہے تھے۔ کشتی چلانے والے دو ملاح کچھ بچوں کو سہارا دے کر کنارے کی طرف لا رہے تھے مگر بچانے والے دو تھے اور جن کو مدد چاہیے تھی، ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ کشتی کنارے سے کوئی تیس گز دور تھی۔ میں نے چلا کر عبدل باورچی کو آواز دی اور خود بھی دریا کی طرف دوڑا۔ کئی دن مسلسل آرام کرنے کے بعد میرے گھٹنے میں درد نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا لیکن جب کنارے پر پہنچ کر میں نے دریا میں چھلانگ لگائی تو میرے گھٹنے میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ چند لمحوں تک تو میں پاؤں کو حرکت بھی نہ دے سکا، پھر میں نے ہمت کر کے تیرنا شروع کر دیا۔ کچھ عورتیں بھی پیرا کی جانتی تھیں لیکن بیشتر عورتیں صحیح طرح تیرنے سے قاصر تھیں۔ دو عورتوں کو میں نے پانی میں غائب ہوتے دیکھا۔ سب سے پہلے میں ایک عورت تک پہنچا جس نے اپنے شیر خوار بچے کو سینے سے چمٹا رکھا تھا اور اسے ڈوبنے سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اسے بازوؤں سے پکڑا اور اپنی پشت پر لاد کر کنارے کی طرف تیرنا شروع کر دیا۔ اس دوران عبدل بھی آ گیا تھا۔ وہ بنگال کا رہنے والا تھا اور بے حد مشاق پیراک تھا۔ میں جب تک اس عورت اور بچے کو کنارے تک پہنچا کر آیا، اس نے کئی عورتوں کو بچا لیا تھا۔ ملاح بھی مدد کر رہے تھے۔ ٹانگ میں ہونے والے درد کے باوجود میں نے کئی عورتوں اور بچوں کو بچا کر کنارے تک پہنچایا۔ جب عبدل بچ جانے والی آخری عورت کو لا رہا تھا تو میں پانی سے نکل کر کنارے پر آیا۔ اس ذرا سی مشقت سے میری ٹانگ میں درد کی شدت میں کئی گناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ میرے لیے یہ ذرا سی مشقت تھی کیونکہ جنوبی افریقا کے بپھرے ہوئے دریاؤں میں، میں نے پیراکی کی خوب مشق کی تھی۔

کشتی کے حادثے میں چار بچے اور دو عورتیں ڈوب کر ہلاک ہو گئی تھیں مگر بیشتر عورتیں اور بچے بچا لیے گئے تھے۔ عبدل نے رات کو الفریڈ کے آتے ہی میرا کارنامہ جوش و خروش سے سنایا، پھر میں نے الفریڈ کو بتایا ساتھ ہی مطلع کیا۔ ”شاید کل مجھے ڈاکٹر بروک کے پاس جانا پڑے۔ اب میں چلتا ہوں تو گھٹنے میں ٹیس سی اٹھتی ہے۔“

”یہ اچھی علامت نہیں ہے۔“ الفریڈ بھی فکر مند ہو گیا تھا۔ ”کل میں تمہیں ڈاکٹر بروک کے پاس لے چلوں گا۔“

اگلے دن الفریڈ مجھے ڈاکٹر بروک کی کلینک لے گیا۔ اس نے میری ٹانگ کا معائنہ کیا اور کسی قدر مایوسی سے کہا۔ ”تم نے بے احتیاطی کر کے اپنا کیس بگاڑ لیا ہے۔ اب تمہیں مزید دو ہفتے آرام کرنا ہوگا۔“

یہ سن کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ خدا خدا کر کے تین ہفتے پورے ہونے کو آئے تھے اور اس کے بعد میرا ارادہ الفریڈ کے ساتھ آسام جانے کا تھا۔ وہ کچھ نئے کاروباری معاہدے کرنے آسام جا رہا تھا۔ اس کی روانگی پانچ دن کے بعد تھی، اگر میری ٹانگ اس مشقت میں نہ پڑتی تو میں پانچ دن کے بعد الفریڈ کے ہمراہ آسام جا رہا ہوتا۔ الفریڈ نے مجھے بھوٹان اور تبت کے پاس واقع اس علاقے کے بارے میں اتنا بتایا تھا کہ مجھے بھی اسے دیکھنے کا اشتیاق ہو گیا تھا ورنہ پہلے میرا ارادہ تھا کہ کچھ ہفتے الفریڈ کے پاس گزار کر وطن کی راہ لوں گا مگر آسام کے تذکروں نے مجھے روک لیا تھا۔ میری مایوسی دیکھ کر الفریڈ نے مجھے تسلی دی۔

”فکر مت کرو جونی۔ میں اپنی روانگی کچھ دن کے لیے ملتوی کر دیتا ہوں۔ تم میرے ساتھ ہی چلو گے۔“

میں خوش ہو گیا تھا لیکن ابھی تین دن گزرے تھے کہ آسام سے الفریڈ کے منیجر کا ٹیلی گرام ملا، جس میں اس نے بعض کاروباری معاملات میں گڑبڑ کی نشاندہی کرتے ہوئے اس سے فوری آسام آنے کا کہا تھا اس لیے الفریڈ کو مجبوراً میرے بغیر ہی روانہ ہونا پڑا۔ میں ایک بار پھر مایوس ہو گیا تھا کیونکہ اگلے مہینے الفریڈ کو انگلینڈ جانے والے جہاز پر سوار ہونا تھا اور اس کے پاس دوبارہ آسام جانے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ گھٹنے کا درد ٹھیک ہوتے ہی میں وطن کا قصد کروں گا۔ مجھے گھر سے دور ہوئے پورے تین سال ہونے کو آئے تھے۔

☆......☆

الفریڈ کو گئے ہوئے ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ اب میری ٹانگ کا درد اچھی حالت میں تھا اور اس دن تیز بارش کے بعد میں لان میں ٹھنڈی ہواؤں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ عبدل نے ایک ٹیلی گرام لاکر دیا۔ یہ الفریڈ کی طرف سے تھا اور خاصا تفصیلی تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''پیارے دوست جونی، میری درخواست ہے کہ اگر تم میرے پاس آسکتے ہو تو فوراً آجاؤ، یہاں ایک ہاتھی نے انسانوں پر قیامت ڈھا رکھی ہے۔ ہدایات کے لیے البرٹ سے رجوع کرو۔''

رابرٹ، الفریڈ کے کلکتہ کے دفتر کا مینیجر تھا۔ مجھے اس سے رابطہ کرنا تھا۔ اس خط میں میری دلچسپی کا سب سے اہم نکتہ ہاتھی کا ذکر تھا جو لوگوں کے لیے خطرہ بن گیا تھا۔ الفریڈ جانتا تھا کہ میں ہاتھی کے شکار کا ماہر تھا۔ خاص طور سے ایسے ہاتھیوں کے شکار کا جو انسانوں کے لیے خطرے کا باعث بن جائیں۔

کیا الفریڈ چاہتا تھا کہ میں وہاں آکر اس ہاتھی کا شکار کروں؟ اس وقت میں واپس جنوبی افریقا جانے کا بڑی حد تک فیصلہ کر چکا تھا بلکہ میں نے اپنا خاصا سامان پیک بھی کرلیا تھا۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ الفریڈ کی اس درخواست کا کیا جواب دوں کہ شام کو الفریڈ کا دوسرا تار ملا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''جونی...... خدا کے لیے...... جس حال میں ہو چلے آؤ ورنہ یہ ہاتھی مجھے ضرور تباہ کردے گا۔ اس کے خوف سے لوگوں نے چائے کے باغات میں جانے سے انکار کردیا ہے۔''

الفریڈ کے اس تار نے مجھے مجبور کردیا۔ الفریڈ میرا میزبان تھا، پھر ٹانگ کی اس تکلیف کے وقت اس نے جس طرح میری دیکھ بھال کی تھی میں اس کا احسان مند تھا۔ انکار کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اگلی صبح اپنے چند جوڑے ایک سوٹ کیس میں رکھے اور الفریڈ کے مینیجر رابرٹ سے رابطہ کیا۔ الفریڈ پہلے ہی اسے ہدایت دے چکا تھا۔ اس نے میرے لیے ریل میں ایک سیٹ بک کرائی اور میں اسی شام ٹی اسٹیٹ روانہ ہوگیا جہاں ایک ہاتھی انسانوں کے لیے خطرہ بن گیا تھا۔

☆......☆

ٹرین کا یہ سفر بے حد بور ثابت ہوتا اگر میں اپنے ساتھ چند کتابیں نہ لے جاتا کیونکہ میرے ساتھ اس ڈبے میں چند بیزار قسم کے انگریز سوار تھے جو سوائے خاموش رہنے کے کچھ نہیں کر رہے تھے اور چند ایک مقامی تھے جو اچھے طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود ان انگریزوں سے دبے دبے نظر آرہے تھے۔ ٹرین ایک دن اور ایک رات چلتی رہی۔ اگلی رات میں ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر اترا، جہاں تاریکی کا راج تھا مگر اسٹیشن ماسٹر کو میرے بارے میں بتا دیا گیا تھا۔ اس نے مجھے پرانے ماڈل کی ایک ملٹری جیپ میں بٹھا دیا جسے ایک مقامی لڑکا بے حد مہارت سے چلا رہا تھا۔ اس نے معمولی درجے کی انگریزی میں کہا۔ ''صاحب میرا نام سامو ہے۔''

''اچھا تو سامو ابھی ہمیں کتنا سفر کرنا ہے؟''

''صاحب! یہاں سے کوٹھی تک پہنچنے میں دو گھنٹے لگیں گے۔ وہاں سے ہم پیٹرول لیں گے اور ڈنر کریں گے۔ اس کے بعد مزید تین گھنٹے سفر کرنے کے بعد ہم رسائی تک پہنچیں گے۔ یہ ایک چھوٹا سا اہل اسٹیشن ہے۔ آپ وہاں محکمہ جنگلات کے ریسٹ ہاؤس میں آرام کرسکیں گے۔ باقی راستہ ہم صبح طے کریں گے۔''

دو گھنٹے تک دشوار گزار اور خطرناک راستوں سے گزر کر ہم برطانوی فوج کے ایک گیریژن ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ جنگ عظیم میں اسے جاپانیوں سے لڑنے والی فوج کے لیے تعمیر کیا گیا تھا مگر جنگ کے بعد یہاں کی چہل پہل نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ راشن ڈپو سے سامو نے جیپ میں پیٹرول ڈلوایا۔ اس دوران میں نے میس میں ڈنر کیا۔ ایک برطانوی میجر سے گپ شپ رہی۔ اتفاق سے وہ بھی ایشیائی ہاتھی کا شکار کھیل چکا تھا۔ اس نے اپنے تجربات چند الفاظ میں بیان کردیے۔ ''بے حد شریف اور امن پسند جانور ہے لیکن اگر دشمن ہوجائے تو اس سے زیادہ خطرناک جانور کوئی اور نہیں ہے۔''

مجھے معلوم تھا کہ ہاتھی عام طور سے ملاپ کے دنوں میں مست ہوجاتے ہیں اور ایسے وقت پر بہت خطرناک ہو جاتے ہیں۔ اپنی تنہائی میں مخل ہونے والے کو نقصان پہنچانے سے دریغ نہیں کرتے لیکن یہ ملاپ کا موسم نہیں تھا اور پھر ملاپ کے دنوں میں ہاتھی عام طور سے اپنے گوشۂ عافیت میں محدود رہتے ہیں۔ باہر نکل کر انسانی آبادیوں تک نہیں آتے۔ برطانوی میجر سے بات چیت اور لذیذ ڈنر سے شکم سیر ہو کر میں سامو کے ساتھ روانہ ہوا۔ اس بار راستہ پہلے سے بھی دشوار اور خطرناک تھا۔ ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ اسٹیشن جہاں میں اترا تھا، وہ سطح سمندر

سے کوئی چھ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ اس وقت ہم کوئی سات ہزار فٹ کی بلندی پر تھے مگر ہوا بہت مرطوب تھی اور کسی قدر گرم تھی۔ اس خطے سے مشرق بعید کے مشہور برساتی جنگلات کا آغاز ہوتا تھا جو جنوب مشرق میں ہانگ کانگ تک اور شمال مشرق میں وسط چین تک چلے جاتے تھے۔ یہ برساتی جنگلات ایشیائی ہاتھی کا گھر تھے۔

اس وقت ہم مشرقی ڈھلان پر سفر کر رہے تھے۔ اس لیے ہوا زیادہ گرم اور مرطوب تھی۔ رات بارہ بجے کے بعد ہم نے چوٹی والا حصہ عبور کر کے شمالی مغربی ڈھلان پر سفر شروع کیا۔ یہاں پر خشک اور خنک ہوا نے استقبال کیا تھا۔ انڈیا آنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میرا خنک اور خشک ہوا سے واسطہ پڑا تھا۔ ان پیچیدہ ترین پہاڑی راستوں پر سامو اتنی مشاقی اور مہارت سے ڈرائیونگ کر رہا تھا کہ جیپ ایک جگہ بھی راستے سے نہیں اتری تھی۔ سامو نے مجھے بتایا کہ وہ اکثر اس راستے پر آتا جاتا رہتا ہے اور اس سے اپنی ہتھیلی کی لکیروں کی طرح واقف ہے۔ وہ الفریڈ کے آسام کے نمائندے رومیس اسپیڈن کے ساتھ ہوتا تھا۔ کئی سال کے بعد جب رومیس نے مجھے خط لکھا تو اس نے یہ افسوس ناک خبر سنائی تھی کہ سامو آسام میں جیپ کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا ہے۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ جیپ اس وقت سامو ڈرائیو نہیں کر رہا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ اگر جیپ سامو ڈرائیو کر رہا ہوتا تو شاید زندہ ہوتا۔

رات دو بجے ہم ساسوتی پہنچے جو سطح سمندر سے تقریباً سات ہزار فٹ کی بلندی پر ایک چھوٹا سا ہل اسٹیشن تھا۔ اس کی آبادی اس وقت بہ مشکل چند سو نفوس پر مشتمل تھی جو وہاں بنے امراء کے بنگلوں اور ریسٹ ہاؤس میں کام کر کے روزی کماتے تھے۔ جنگلات کا یہ گیسٹ ہاؤس خاصا بڑا تھا۔ یہاں پر محکمۂ جنگلات کا ایک دفتر بھی تھا۔ وہاں ٹھہرنے کے لیے مجھے ایک آرام دہ کمرا اور گرم گرم بستر مل گیا۔ سامو کو بھی ایک کمرا مل گیا تھا۔

☆......☆

صبح سویرے ہم ٹی اسٹیٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔ جیپ اب نشیب میں اتر رہی تھی۔ ذرا دیر بعد جیپ چائے کے تاحد نگاہ پھیلے ہوئے باغات سے گزر رہی تھی۔ عورتیں چائے چن چن کر اپنی کمر سے بندھی ٹوکریوں میں ڈال رہی تھیں۔ سب سے اگلا گروپ پودے کی نازک اور نفیس پتیاں چن رہا تھا جس سے اعلیٰ درجے کی چائے بنتی ہے۔

پیسا کے مینار کی کہانی دلچسپی کی حامل ہے۔ یہ عجوبۂ عالم اٹلی کے مشہور شہر "پیسا" میں نصب ہے۔ اٹلی کے باشندے کہتے ہیں یہ مینار ایک لاغر اور بوڑھی عورت ہے جس کا سانس کسی وقت بھی رک سکتا ہے اور وہ دم توڑ سکتی ہے، اسی چیز نے اسے حیران کن بنا دیا ہے۔ گزشتہ آٹھ سو برس سے مینار مسلسل جنوب کی طرف جھکتا چلا جا رہا ہے لیکن آج تک کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ مینار کے گنبد میں سات گھنٹیاں لٹک رہی ہیں۔ ان میں سے ایک گھنٹی ساڑھے تین ٹن وزنی ہے۔ یہ گھنٹیاں وقفوں کے بعد بجتی رہتی ہیں۔ ایک بار کسی فنی خرابی کی وجہ سے یہ بڑے زور سے بجنے لگیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا مینار ابھی گر جائے گا۔ ان کے شور سے مردے بھی جاگ اٹھے لیکن اس کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ اس خوف سے کہ کہیں یہ آناً فاناً زمین بوس نہ ہو جائے، ٹرک اور اسکوٹر وغیرہ اس طرف جس جانب مینار جھک رہا ہے، جانے سے گریز کرتے ہیں۔ 1911ء سے اب تک ہر سال 19 جون کی صبح پانچ بجے اس مینار کا جھکاؤ ناپا جاتا ہے۔ رپورٹ سے پتا چلتا ہے کہ کم و بیش ایک انچ سالانہ ضرور جھک جاتا ہے۔ 1964ء تک یہ 179 فٹ اونچا مینار کشش ثقل کے مرکز سے 15 فٹ 10 انچ باہر نکل چکا تھا۔ اس کی بنیاد 1174ء میں "بوناتو پیانو" نامی معمار نے رکھی۔ 1185ء تک وہ صرف تین منزلیں تعمیر کر پایا تھا کہ موت کا بلاوا آ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی موت اس خوف سے ہوئی کہ مینار میں اس وقت بھی جھکاؤ موجود تھا۔ 90 برس بعد ایک اور معمار نے اسے گرایا، بنیادیں کھودیں اور ازسرِنو تعمیر شروع کی۔ وہ بھی سات منزلیں بنانے کے بعد دنیائے فانی سے رخصت ہو گیا۔ 80 سال تک تعمیر پھر التوا میں پڑی رہی، پھر ایک تیسرے انجینئر نے اس کی آٹھویں منزل اور اس کے اوپر گنبد بنایا اور اس میں سات گھنٹیاں لگائیں، گویا یہ مینار دو صدیوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بوناتو نے یہ جھکاؤ خود رکھا تا کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہو لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ یہ سرزمین پیسا کی اس مٹی کا قصور ہے جس میں اسفنج کی طرح مٹی اور ریت کے علاوہ ساٹھ فیصد پانی بھی موجود ہے۔ اگرچہ مینار کی بنیاد تیرہ فٹ چوڑی اور نو فٹ گہری ہے، اس کے باوجود مینار کا جھکاؤ مسلسل بڑھ رہا ہے۔

مرسلہ: ضیاء الدین بٹ، ساہیوال

باغات کے درمیان سرخ کھپریل کی چھتوں والے بنگلے تھے جن میں ان باغات کے مالکان آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ سامو پچھلی رات زیادہ تر خاموشی سے سفر کرتا رہا تھا۔ راستے کی دشواری کے پیش نظر میں بھی خاموش رہا تھا تاکہ سامو پوری توجہ سے ڈرائیونگ کر سکے مگر اس آسان اور ہموار راستے پر سفر کرتے ہوئے وہ خوب بول رہا تھا۔ اس نے مجھے ہاتھی کے بارے میں بتایا۔

''بہت بڑا اور خوف ناک ہاتھی ہے۔ میں نے اسے دیکھا تھا۔ اب تک چھ آدمی مار چکا ہے۔''

''میرے خدا۔'' میرے منہ سے نکلا۔ ''کیا اسے انسانی خون بہانے کی عادت ہوگئی ہے؟''

''صاحب، وہ ہاتھی ایک بلا ہے، جن چھ آدمیوں کو اس نے مارا ہے ان میں دو شکاری بھی تھے۔ وہ اسے مارنے گئے تھے خود اس کا شکار ہو گئے۔''

پھر سامو نے وہ واقعہ سنایا جس میں ہاتھی سے اس کا آمنا سامنا ہوا اور اس کا مقدر تھا جو وہ اس کا شکار ہونے سے بچ گیا۔ وہ اپنے صاحب کا ایک پیغام لے کر برابر والی ٹی اسٹیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ رومیس جو الفریڈ کا مینیجر تھا اس کی ذاتی ٹی اسٹیٹ بھی تھی، سامو جیپ لے کر دوپہر کے وقت نکلا تھا۔ برابر والی ٹی اسٹیٹ بھی کوئی چھ میل کے فاصلے پر تھی اور راستہ بے حد گھنے جنگل سے ہو کر گزرتا تھا۔ صدیوں سے انسانوں نے سفر کر کے اس کے بیچ میں ایک راستہ بنا دیا تھا جس پر گاڑیاں بھی گزرتی تھیں۔ سامو اس راستے سے جیپ لے کر گیا تھا۔ ان دنوں اس ہاتھی نے اپنی تباہ کاریاں شروع کی تھیں اور چائے کے باغات میں چائے کی پتیاں چنتی عورتوں پر حملہ کیا تھا۔ افراتفری میں بھاگتے ہوئے ایک ادھیڑ عمر عورت گر پڑی اور ہاتھی نے اسے اپنے پیروں تلے روند ڈالا۔ اس پر بھی اس کی وحشت کم نہ ہوئی تو وہ سونڈ میں دبا کر عورت کی لاش اپنے ساتھ جنگل میں لے گیا۔ اگلے دن جب مسلح افراد عورت کی لاش تلاش کرنے جنگل میں گئے تو انہیں وہاں اس کے جسم کی بوٹیاں اِدھر اُدھر بکھری ملی تھیں۔ درختوں پر لگے خون اور گوشت کے لوتھڑوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہاتھی نے لاش کو اٹھا اٹھا کر درختوں پر مارا تھا۔ وہ سب دل گردے والے لوگ تھے لیکن لاش کا یہ حشر دیکھ کر وہ بھی کانپ گئے تھے۔ یہ کوئی مہینا بھر پہلے کی بات تھی۔

سامو اس واقعے کے تیسرے دن روانہ ہوا تھا۔ اسے خوف نہیں تھا کیونکہ علاقے کے دوسرے لوگوں کی طرح اس کا بھی یہی خیال تھا کہ ہاتھی نے کسی وقتی اشتعال کے تحت حملہ کیا تھا۔ عام طور سے ہر دوسرے تیسرے سال ہاتھیوں کے اس طرح حملے کرنے کا کوئی نہ کوئی واقعہ پیش آتا ہی رہتا تھا۔ اسے بھی ایسے ہی واقعات میں شمار کیا گیا تھا۔ اس وقت سامو گھنی گھاس کے جنگل سے گزر رہا تھا۔ اچانک اسے ہاتھی کی خوف ناک چنگھاڑ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، ایک ہاتھی کو اپنی طرف لپکتے دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ ہاتھی جیپ سے بہ مشکل تیس گز کے فاصلے پر تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ راستہ نہایت تنگ تھا اور بار بار مڑتا بھی تھا اگر ایک بار جیپ اس دیو قامت گھاس (اسے ہاتھی گھاس بھی کہتے ہیں اور اس کی لمبائی بعض اوقات دس فٹ سے بھی زیادہ ہوتی ہے) میں گھس جاتی تو چند قدم سے زیادہ آگے نہیں جا سکتی تھی۔ عقب سے ہاتھی پوری رفتار سے چلا آ رہا تھا۔ ایشیائی ہاتھی رفتار میں افریقی ہاتھی سے زیادہ تیز ہوتا ہے اگر اسے کھلا میدان مل جائے تو یہ تقریباً پینتیس میل فی گھنٹا کی رفتار سے کئی میل تک دوڑ سکتا ہے جب کہ اس راستے پر جیپ بیس میل فی گھنٹا کی رفتار سے زیادہ نہیں دوڑائی جا سکتی تھی۔

سامو نے اپنے اوسان بحال رکھے اور ہر ممکن رفتار سے جیپ آگے بڑھانے لگا، ساتھ ہی وہ دعا کر رہا تھا کہ اس سال خوردہ جیپ میں کوئی خرابی نہ پیدا ہو جائے۔ اس صورت میں وہ ہاتھی سے نہیں بچ سکتا تھا۔ کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل سے وہ جیپ ڈرائیو کر رہا تھا اور موت کا ہرکارہ پوری رفتار سے اس کے نزدیک آتا جا رہا تھا۔ سامو نے دوبارہ مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا کیونکہ لمحاتی غفلت جیپ کو راستے سے اتار دیتی مگر عقب سے آتی وحشی ہاتھی کے پیروں کی دھمک اور اس کی چنگھاڑ اسے بتا رہی تھی کہ وہ ہر لمحہ اس کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی عقبی آئینے میں اس کی شکل نظر آتی تھی۔ سامو کا مارے خوف کے برا حال تھا لیکن اس نے اپنے اوسان خطا نہیں ہونے دیے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ ذرا دیر بعد گھاس کے درمیان یہ راستہ ایک چوڑی کچی سڑک پر جا نکلے گا۔ جہاں وہ پوری رفتار سے جیپ بھگا کر اس عفریت سے پیچھا چھڑا سکے گا مگر یہ کچی سڑک ابھی دور تھی اور ہاتھی خاصا قریب آ گیا تھا۔ اس نے اپنی سونڈ فضا میں بلند کر لی تھی اور ہاتھی نے اپنی سونڈ اس کے عقبی حصے پر ماری تھی۔ سامو نے بہ مشکل جیپ کو قابو کیا۔ اب وہ بلند آواز سے

بھگوان سے پرارتھنا کر رہا تھا کہ وہ اسے اس وحشی اور خونخوار ہاتھی سے محفوظ رکھے۔ اس تنگ راستے پر وہ ہر ممکن تیزی سے جیپ دوڑا رہا تھا۔

پھر اچانک اس نے خود کو پکی سڑک پر پایا۔ اس نے پوری طاقت سے ایکسیلیٹر دبایا ورنہ اس بار ہاتھی نے جیپ کا عقبی حصہ پکڑ لیا تھا۔ جھٹکے سے جیپ آگے بڑھی اور ہاتھی کی سونڈ میں جیپ کے عقبی جنگلے کا ایک ٹکڑا رہ گیا۔ جیپ کو آگے نکلتے دیکھ کر ہاتھی سمجھ گیا کہ اس کا شکار اب ہاتھ نہیں آئے گا اور یہ سامو کی بہت بڑی خوش قسمتی تھی کیونکہ محض نصف کلومیٹر آگے جا کر جیپ کا انجن بند ہو گیا اور پھر کسی طرح بھی اسٹارٹ نہیں ہوا۔ باقی راستہ سامو نے اپنے پیروں پر بھاگتے ہوئے طے کیا تھا۔ اسے سارے راستے دھڑکا لگا رہا کہ وہ وحشی جانور دوبارہ اس کے تعاقب میں نہ آ جائے۔

اگلے ایک ہفتے میں ہاتھی نے مزید دو افراد مار دیے تھے۔ وہ دونوں جنگل کی ڈھلانی سطح پر ہاتھی گھاس کاٹ رہے تھے۔ مقامی افراد گھاس سے اپنے جھونپڑے بناتے ہیں۔ سخت موسمی حالات کی بنا پر انہیں ہر سال ہی جھونپڑے نئے سرے سے بنانے پڑتے تھے۔ ہاتھی گھاس ان کے لیے ہلکا اور مفت میں ملنے والا مضبوط میٹریل تھا۔ میں نے اس ہاتھی گھاس کو افریقا میں اگنے والی ہاتھی گھاس سے زیادہ مضبوط اور لمبا پایا تھا۔ وہ اس گھاس کے گٹھے کاٹ کاٹ کر بنا رہے تھے کہ اچانک ہاتھی نے ان پر حملہ کر دیا۔ وہ مکار جانور اتنی خاموشی سے آیا کہ انہیں خبر تک نہ ہوئی۔ اس نے ایک شخص کو عقب سے سونڈ مار کر ہلاک کر دیا۔ دوسرا جب تک ہوشیار ہوتا، ہاتھی نے اسے بھی زمین پر گرا کر پیروں تلے روند ڈالا۔ اس کے بعد اس نے حسب سابق ان کی لاشوں کو کچلنا شروع کر دیا۔ بعض افراد جو قریب ہی گھاس کاٹنے میں مصروف تھے، انہوں نے یہ لرزہ خیز منظر دیکھا اور وہ اپنی درانتیاں سنبھال کر بھاگے۔ انہوں نے واقعے کی اطلاع مقامی پولیس اسٹیشن میں دی۔ پولیس پارٹی نے مسلح افراد کے ساتھ جا کر ان دو افراد کی لاشیں اٹھائیں جو اس جگہ پڑی تھیں لیکن ہاتھی نے ان کا اتنا برا حال کر دیا تھا کہ دیکھنے والوں کی چیخیں نکل گئیں۔

اگلے روز دیہاتیوں نے تحصیل دار کے دفتر جا کر ہاتھی کی شکایت کی اور درخواست کی کہ اس وحشی ہاتھی کو ٹھکانے لگایا جائے جو اب تک تین افراد کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ تحصیل دار نے اعلیٰ حکام سے رابطہ کر کے انہیں ہاتھی کی کارستانیوں سے آگاہ کیا اور ہاتھی کے شکاری بھیجنے کی درخواست کی۔ اتفاق سے دو شکاری دستیاب تھے۔ وہ علاقے میں آئے۔ اس دوران ہاتھی نے انسان دشمنی پر کمر باندھ لی تھی۔ وہ روز ہی چائے کے باغات تک چلا آتا اس نے کئی کھیت اجاڑ دیے تھے اور کئی فارم ہاؤس تباہ کر دیے تھے۔ مقامی ٹی اسٹیٹ کے مالک کنور سنگھ کی نئی کار اس نے پرزے پرزے کر کے رکھ دی تھی۔

دونوں شکاری محکمۂ جنگلات کے ملازم تھے اور ان کا تعلق آسام ہی سے تھا۔ علاقے میں آنے کے فوراً بعد وہ ہاتھی کی تلاش میں جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ مقامی افراد نے شہادت دی کہ مست ہاتھی آخری بار جنوبی ترائی میں ہاتھی گھاس میں دیکھا گیا تھا۔ یہ سن کر اصولاً ان شکاریوں کو جنگل کا رخ نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ اس گھاس میں گھس کر ہاتھی کو تلاش کرنا اتنا خطرناک تھا کہ بڑے بڑے شکاری اس سے کتراتے تھے۔ یہ اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ یہ گھاس قدرتی طور پر ہاتھیوں کے لیے پناہ گاہ تھی۔

ان دونوں شکاریوں کے ہمراہ ایک مقامی گائیڈ بھی تھا جو جنگل اور اس کے راستوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کی رہنمائی میں وہ ترائی کی طرف روانہ ہو گئے جو چائے کے باغات سے خاصا نشیبی علاقہ تھا مگر چالاک ہاتھی جب چائے کے باغات پر حملہ کرتا تھا تو وہ ترائی کی طرف آنے کی بجائے اس کے اوپر واقع گھنے جنگل کی طرف سے آتا تھا۔ جنگل اور باغات تقریباً ملے ہوئے تھے اس لیے ہاتھی کے حملے کا اس وقت پتا چلتا تھا۔ جب وہ باغات میں داخل ہو چکا ہوتا۔ دو افراد کو ہلاک کرنے کے بعد اس مکار جانور نے خطرہ محسوس کیا تھا اور ترائی کی گھاس میں روپوش ہو گیا تھا۔ وہیں سے ہر دوسرے تیسرے دن نکل کر وہ باغات اور فارم ہاؤس پر حملے کرتا تھا۔ مقامی افراد کی خوش قسمتی تھی کہ علاقے کا واحد گاؤں ٹی اسٹیشن کے عین وسط میں واقع تھا اور یہاں تک ہاتھی کی رسائی مشکل تھی لیکن وہ افراد جو کسی وجہ سے گاؤں سے باہر یا جنگل کے پاس رہا کرتے تھے، ہاتھی کے ڈر سے انہوں نے اپنے گھر خالی کر دیے تھے اور گاؤں چلے آئے تھے۔

شکاری مقامی گائیڈ کے ہمراہ ہاتھی گھاس کی پٹی تک پہنچے۔ یہ تقریباً دس کلومیٹر لمبا اور ایک کلومیٹر چوڑا قطعہ تھا۔ دراصل یہ جگہ ایک نشیبی نالے کے ساتھ تھی۔ جب مون سون کی بارشیں ہوتیں تو یہ ساری زمین زیر آب آ جاتی اور جب

پانی اترتا تو اس پر ہاتھی گھاس اُگ آتی تھی۔ چند مہینے تک رہنے والی یہ گھاس مقامی آبادی کے لیے نعمت تھی۔ اس سے وہ اپنے گھر بناتے تھے، اس کی نرم شاخیں اپنے جانوروں کو کھلاتے تھے اور اس کے ٹکڑے خشک کر کے آنے والی سردیوں میں جلاتے تھے اور یہ انہیں مفت ملتی تھی۔ بے چارے دیہاتی اس خبیث جانور کی وجہ سے گھاس سے بھی محروم ہوگئے تھے۔

شکاری جب ہاتھی گھاس تک پہنچے تو ان کی ہمت جواب دے گئی۔ مقامی گائیڈ بھی گھبرا رہا تھا۔ اس نے شکاریوں کو مشورہ دیا کہ گھاس میں جانے کے بجائے ہاتھی کے باہر آنے کا انتظار کیا جائے مگر ہاتھی کا انتظار ممکن نہیں تھا۔ اوّل تو اس لمبی گھاس کی پٹی میں ہاتھی کہاں سے نمودار ہوتا، یہ کہنا ناممکن تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن تھا کہ ہاتھی ترائی کی طرف سے آنے کی بجائے اوپر جنگل کی طرف نکل جاتا۔ گائیڈ نے مشورہ دیا کہ شکاری گھاس کی پٹی سے ذرا ہی فاصلے پر واقع ایک ننھی سی جھیل کے کنارے ہاتھی کا انتظار کریں۔ اس علاقے میں یہ جھیل پانی کا واحد ذریعہ تھی جسے اوپر کر کے ایک نالے سے پانی ملا کرتا تھا۔ سردیوں کے دنوں میں یہ جھیل تقریباً خشک ہوجاتی تھی اور جنگل کے جانور پانی کے لیے نشیبی علاقوں کا رخ کرتے تھے۔ گائیڈ کی بات مان کر شکاریوں نے جھیل کے کنارے ڈیرا ڈال دیا۔ وہاں زمین پر قدموں کے نشانات سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہاتھی وہاں پانی پینے آتا تھا۔ یہاں بالائی علاقوں میں خاصے ہاتھی پائے جاتے تھے لیکن وہ صرف سردی کے موسم میں نیچے آتے تھے۔ جب اوپر خوراک کی کمی ہوجاتی تھی اور وہاں پانی بھی ملنا محال ہوجاتا تھا تو اس وقت ہاتھی آکر ہاتھی گھاس والی پٹی میں قیام کرتے تھے اور جیسے ہی بہار کا موسم آتا یہ واپس چلے جاتے تھے۔

قاتل ہاتھی ایک تو خلافِ توقع ترائی کی طرف آیا تھا۔ دوسرے اس نے خلافِ معمول انسان دشمنی شروع کردی تھی۔ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ اس نے انسانوں پر حملے کیوں شروع کیے۔ پھر اس نے جس طرح تین افراد کو مارنے کے بعد ان کی لاشوں کو کچلا تھا اس سے اس کی شدید نفرت اور انسانوں کے لیے بغض واضح تھا۔ ہاتھی اس معاملے میں بے حد کینہ پرور ہے۔ بعض اوقات اسے کسی دوسرے جانور کی معمولی سی حرکت بھی ناگوار گزرتی ہے اور یہ ان کے درپے ہوجاتا ہے۔ جنوبی افریقا سفاری میں ملازمت کے دوران میرے مشاہدے میں ایک ہاتھی آیا جو گیدڑوں کا دشمن ہوگیا تھا۔ شاید گیدڑوں نے ہاتھی کے بچے کو نقصان پہنچایا ہو اور اس کے بعد ہاتھی ان کا دشمن بن گیا ہو۔ اس ہاتھی کی وجہ سے سفاری کے بیشتر گیدڑ وہاں سے فرار ہوگئے تھے۔

بات دور نکل گئی ہے۔ شکاریوں سے بنیادی غلطی ہوئی تھی۔ انہوں نے کسی فرد سے رابطہ نہیں کیا اور نہ ہی ہاتھی کے بارے میں معلومات حاصل کیں ورنہ وہ اتنی بے پروائی نہ برتتے۔ جھیل کے بانسوں کا ایک مختصر جھنڈ تھا۔ انہوں نے اس میں پناہ لی اور ہاتھی کا انتظار کرنے لگے۔ انہیں اپنی طاقتور رائفلوں پر بھروسا تھا کہ وہ چند فائر کر کے ہاتھی کو ڈھیر کردیں گے۔ اس چکر میں انہیں یہ خیال بھی نہ رہا کہ ہوا ان کی طرف سے ترائی کی طرف جارہی تھی۔ ہاتھی کی قوتِ شامہ بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ خاصی دور سے بو محسوس کرلیتا ہے۔ ہاتھی نے بانسوں میں چھپے انسانوں کی بُو پالی تھی۔ قدرتی طور پر یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ جو جانور انسان دشمنی پر آمادہ ہوجاتا ہے، چاہے وہ ہاتھی ہو یا شیر یا کوئی اور جانور، وہ اپنے ہم نسلوں سے بڑھ کر سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔ یہ ہاتھی بھی عام ہاتھیوں سے کہیں زیادہ چالاکی دکھا رہا تھا۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ اس طرح چھپ کر رہنے والے اس کے لیے خطرناک ہوسکتے ہیں اس لیے وہ سامنے سے آنے کی بجائے چپکے سے چکر کاٹ کر بانسوں کے اس جھنڈ کے عقب میں آگیا۔ شکاری احمقانہ حرکت کرتے ہوئے آپس میں گفتگو بھی کررہے تھے۔ اس طرح ہاتھی کو اپنا ہدف تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے یکایک ایک خوف ناک چنگھاڑ ماری۔ شکاری جو آپس میں محوِ گفتگو تھے، گھبرا کر رائفلیں سنبھالنے لگے اور اس دوران ہاتھی نے بانس کے جھنڈ کو گرانا شروع کردیا۔ مقامی گائیڈ عقل مند تھا۔ وہ پہلے ہی جھنڈ سے نکل بھاگا۔ اس نے سیدھے ایک اونچے اور مضبوط تنے والے درخت کا رخ کیا اور اس پر چڑھ گیا مگر دونوں شکاری بانس کے جھنڈ تلے پھنس گئے۔ وہ نکلنے کی کوشش کرتے کہ ہاتھی خود بھی جھنڈ پر چڑھ گیا۔

ہاتھی نے شکاریوں کو بانسوں تلے دبا دیا اور پھر ان پر چڑھ کر کودنے لگا۔ بانسوں کا بوجھ ہی کم نہیں تھا، ہاتھی بھی چڑھ گیا تو نیچے دبے شکاریوں کا کچومر نکل گیا۔ چند منٹ تک ان کی چیخیں سنائی دیتی رہیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ جس

میں صرف ہاتھی کی دھما دھم اور کبھی کبھار فاتحانہ چنگھاڑ سنائی دیتی تھی۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ بانسوں تلے انسان مر چکے ہیں تو اس نے تیسرے شکاری کا رخ کیا۔ گائیڈ اس بلند درخت پر بیٹھا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ہاتھی نے نیچے آکر اتنی زبردست چنگھاڑ ماری کہ وہ گرتے گرتے بچا۔ اپنا یہ حربہ ناکام دیکھ کر مشتعل ہاتھی نے درخت کو ٹکر ماری اور پھر اس کے تنے کو سونڈ سے پکڑ کر ہلانے کی کوشش کرنے لگا مگر گائیڈ کی خوش قسمتی کہ یہ بے حد مضبوط تنے والا درخت تھا اس لیے ہاتھی اسے ہلانے میں ناکام رہا۔ جلد ہی ہاتھی کو بھی اندازہ ہوگیا کہ وہ اس طریقے سے اپنے تیسرے شکار کو حاصل نہیں کرسکے گا۔ کچھ دیر تک درخت کے نیچے غصے سے چنگھاڑنے کے بعد اس نے تالاب کا رخ کیا اور پانی پی کر واپس جنگل کی طرف چلا گیا۔ گائیڈ ساری رات درخت پر بیٹھا خوف سے کانپتا رہا تھا۔

صبح جب روشنی ہوئی اور اس نے چاروں طرف دیکھ کر اطمینان کرلیا کہ قاتل ہاتھی دور دور تک نہیں ہے تو اس نے درخت سے چھلانگ لگائی اور سیدھے گاؤں کی طرف بھاگا۔ بانسوں کے جھنڈ کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ایک شکاری کی لاش دیکھی جو کچی زمین سے بالکل پیوست ہوگئی تھی۔ اس کی رائفل پاس پڑی تھی اور ہاتھی نے اسے بھی کئی ٹکڑوں میں تقسیم کردیا تھا۔ گائیڈ نے نظر آنے والے پہلے فارم ہاؤس پہنچ کر دم لیا اور اس نے وہاں موجود افراد کو ہاتھی کی دہشت کا آنکھوں دیکھا حال سنایا تو ان میں بھی خوف کی لہر دوڑ گئی۔ دوپہر تک یہ اطلاع تحصیل دار کے دفتر پہنچ گئی تھی اور محکمۂ جنگلات کو اس کے شکاریوں کی ہلاکت سے آگاہ کردیا گیا تھا۔ مقامی افراد میں سے کوئی جائے وقوع جاکر شکاریوں کی لاشیں لانے کو تیار نہیں تھا، اس لیے اگلے روز تحصیل دار کی طرف سے ایک پارٹی آئی اور اس نے بانسوں تلے دبی شکاریوں کی لاشیں نکالیں۔

☆......☆

ٹی اسٹیٹ میں ہاتھی کا خوف اس بری طرح پھیل گیا تھا کہ لوگوں نے چائے کے باغات میں کام کرنے سے انکار کردیا تھا۔ خاص طور سے جو باغات ترائی کے جنگل سے جا ملتے تھے، ان کے مالکان یا منیجر وغیرہ بھی فارم خالی کر گئے تھے۔ علاقے کے واحد گاؤں کے مکینوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر حفاظتی انتظامات شروع کردیئے تھے۔ اگرچہ گاؤں جنگل سے خاصے فاصلے پر تھا لیکن اس بات کا خدشہ بہرحال تھا کہ ہاتھی گاؤں تک نہ آجائے اس لیے انہوں نے گاؤں کے چاروں طرف نوکدار بانسوں کی باڑھ لگانی شروع کردی جس کے ساتھ خشک گھاس کا ڈھیر جمع کیا گیا تھا تاکہ ہاتھی اس طرف آئے تو اسے آگ دکھادی جائے۔ ہر جانور کی طرح ہاتھی بھی آگ سے ڈرتا ہے۔ اس کے علاوہ گاؤں میں جتنا بھی اسلحہ تھا، ہاتھی کے مقابلے کے لیے نکال لیا گیا۔ اس اسلحے میں ایک اعشاریہ تین کی رائفل جو گاؤں کے نمبردار کے پاس تھی اس کے علاوہ دو پرانی ساخت کی بارہ بور کی رائفلیں تھیں۔ اس اسلحے سے کسی وحشی ہاتھی کا مقابلہ ممکن تو نہیں تھا لیکن کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر تھا۔

سامو جیپ چلاتے ہوئے مجھے ہاتھی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس وقت ہم گاؤں سے کچھ ہی فاصلے پر تھے جس سے ذرا آگے لسنیڈن کا فارم ہاؤس تھا۔ سامو نے بتایا کہ ہاتھی نے آخری حملہ چار دن پہلے کیا تھا۔ اس نے ایک فارم ہاؤس پر حملہ کیا اور وہاں سوئے ہوئے نگراں کو بے خبری میں مار ڈالا۔ چالاک ہاتھی پودوں کو تیز ہوا سے بچانے کے لیے لگائے گئے اونچے درختوں کی آڑ لے کر آیا اور بوڑھے کو ہلاک کردیا۔

☆......☆

دن کا وقت تھا اس لیے گاؤں میں ذرا چہل پہل تھی۔ کچھ بچے جیپ کے پیچھے دوڑ پڑے۔ سامو نے گاؤں کے پاس سے گزر کر جیپ کو اوپر واقع فارم ہاؤس کی طرف موڑ دی۔ ”یہ اسنیڈن صاحب کا فارم ہاؤس ہے۔“ سامو نے بتایا۔

یہ دو منزلہ مکان تھا جس کے اوپر حسب روایت سرخ کھپریل کی چھت تھی۔ اس کی بنیادیں پتھر سے بنی تھیں۔ جب جیپ احاطے سے گزر کر بنگلے کی طرف بڑھی تو سامنے کئی افراد نظر آئے۔ سامو کے چہرے سے تشویش جھلکنے لگی۔ اس نے جیپ روکتے ہوئے کہا۔ ”کیا کوئی گڑبڑ ہے؟“

سامنے کھڑے افراد میں دو سفید فام اور باقی مقامی تھے۔ مجھے الفریڈ نظر نہیں آیا۔ میری چھٹی حس خبردار کرنے لگی۔ مجھے دیکھ کر ایک سفید فام میری طرف لپکا۔ ”مسٹر جونی ریمنگٹن، میں رومیس اسنیڈن ہوں۔ یہاں ایک اور حادثہ ہوگیا ہے۔“

میں جیپ سے اتر آیا۔ ”کیسا حادثہ مسٹر اسنیڈن...... الفریڈ کہاں ہے؟“

اسٹیڈن کا منہ لٹک گیا تھا۔ ”حادثہ الفریڈ کے ساتھ پیش آیا ہے۔ میرے منع کرنے کے باوجود کل صبح گواسی گیا تھا۔ یہ ٹی اسٹیٹ یہاں سے بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن شام تک وہ وہاں نہیں پہنچا۔“

”یہ کیسے پتا چلا کہ الفریڈ وہاں نہیں پہنچا؟“

”کیونکہ شام تک وہ شخص خود یہاں آگیا تھا جس سے ملنے الفریڈ کو جانا تھا۔ اس کے مطابق الفریڈ دوپہر تک گواسی نہیں پہنچا تھا۔ وہ یہاں سے دس بجے روانہ ہوا تھا۔ پانچ گھنٹے میں تو آدمی پیدل وہاں پہنچ جاتا ہے۔“

خبر واقعی تشویش ناک تھی۔ میں اسٹیڈن کے ساتھ اندر آیا۔ اس کے ایک ملازم نے میرا سامان اتار کر ایک آرام دہ اور سجے سجائے کمرے میں پہنچا دیا۔ اس سے ملحق غسل خانے میں میرے لیے پانی رکھا تھا۔ نہا دھو کر جب میں باہر آیا تو کھانا میز پر سجا ہوا تھا۔ میرا میزبان اسٹیڈن باہر گیا ہوا تھا۔ کھانا کھا کر میں نے باہر نکل کر دیکھا۔ ایک ملازم نے بتایا کہ مسٹر اسٹیڈن، الفریڈ کی تلاش میں مقامی حکام سے بات کرنے گئے ہیں کیونکہ کوئی شخص ان کی تلاش میں جنگل میں جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ایک گھنٹے کے بعد اسٹیڈن واپس آیا۔ اس نے بتایا۔

”مقامی حکام نے ایک مسلح دستہ روانہ کیا ہے جو گواسی جانے والے راستے پر الفریڈ کی گاڑی تلاش کرے گا۔“

”اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے ایک مسلح ملازم الفریڈ کے ساتھ بھیجا تھا۔“ اسٹیڈن نے جواب دیا۔

الفریڈ کے ساتھ جانے والا ایک نیپالی گورکھا تھا۔ یہ لوگ پیدائشی جنگجو ہوتے ہیں۔ اس کے پاس طاقت ور رائفل تھی۔

شام کے چار بجے تک مسلح پولیس والوں کا ایک دستہ آگیا۔ ان کے پاس تین اعشاریہ تین کی رائفلیں تھیں۔ میں نے اسٹیڈن سے کہا۔ ”میں بھی اس دستے کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ظاہر ہے تم اس ہاتھی کی سرکوبی کے لیے آئے ہو۔ تمہارا اس علاقے سے واقف ہونا ضروری ہے۔ میں ابھی دستے کے انچارج سے بات کرتا ہوں۔“

دستے کا انچارج انسپکٹر رام کمار نامی ایک نوجوان شخص تھا۔ اس کے ساتھ پانچ سپاہی تھے۔ اسٹیڈن نے اسے میرے بارے میں بتایا تو وہ خوش ہوگیا۔

”یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہاتھی کے شکار کا ایک ماہر ہمارے ساتھ چلے گا۔“

”میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔“ میں نے وضاحت کی۔ ظاہر ہے میں تفریحی سفر پر انڈیا آیا تھا، ہاتھی کا شکار کرنے نہیں اس لیے کوئی رائفل بھی ساتھ نہیں تھی۔ ہانگ کانگ سے میں اپنا سامان براہ راست جنوبی افریقا روانہ کر چکا تھا۔ اسٹیڈن نے کہا کہ اس کے پاس ایک رائفل ہے۔ اس نے مجھے ونچسٹر کا ایک پرانا ماڈل دیا۔ اس میں تین گولیوں کا کلپ پڑتا تھا۔ میں نے سفاری کی ملازمت کے دوران دو تین بار اسے استعمال کیا تھا مگر مجھے یہ رائفل پسند نہیں آئی۔ اس کا وزن زیادہ تھا اور نشانے میں زیادہ درستی بھی نہیں تھی مگر کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔

پولیس جیپ میں زیادہ افراد کی گنجائش نہیں تھی اس لیے ایک پولیس مین کو وہیں چھوڑا گیا۔ اسٹیڈن نے کہا کہ وہ سامو کے ساتھ جیپ میں آئے گا لیکن انسپکٹر نے اسے منع کر دیا۔

”جناب ایسا کرنا خطرناک ہوگا۔“ وہ بولا۔ ”ہاتھی نہ جانے کہاں ہے، اس لیے کوئی بھی شخص بلاوجہ جنگل یا گھاس پٹی کی طرف نہ جائے۔“

پولیس کی طرف سے جنگل یا گھاس والے حصے کی طرف جانے کی ممانعت لاؤڈ اسپیکر پر کی جارہی تھی تاکہ گاؤں اور علاقے کے لوگ جان جائیں۔ میں انسپکٹر کمار کی برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔ جیپ خود انسپکٹر کمار چلا رہا تھا۔ وہ رواں انگریزی میں بات کرتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا اس علاقے میں پہلے بھی ہاتھیوں نے انسانوں پر حملے کیے ہیں؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ہر دوسرے تیسرے سال ہاتھی حملہ کرتے ہیں لیکن ایک آدھ بار ہی، ابھی تک کسی ہاتھی نے اتنے تواتر سے حملے نہیں کیے تھے۔ یہ پہلا موقع ہے جب اس علاقے میں ہاتھی انسانوں کے درپے ہوا ہے۔“

باغات کے درمیان سے گزر کر ہم جنگل والے حصے تک پہنچے۔ گواسی جانے والا راستہ اوپر جنگل سے گزرتا تھا۔ اس لیے ہم نے گھاس کی پٹی کی طرف جانے کی بجائے جنگل کا رخ کیا۔ کچا راستہ سرخ مٹی سے بنا تھا اور گزشتہ کچھ عرصے سے بارش نہ ہونے کی وجہ سے زمین خشک ہوگئی تھی۔

جیپ چلنے سے مٹی اڑ رہی تھی۔ ہوا ساکت تھی۔ یہ اچھی بات تھی۔ اگر ہوا چل رہی ہوتی تو ہوا میں بو ہونے سے ہاتھی ہوشیار ہو سکتا تھا۔ جنگل کی حدود میں داخل ہوتے ہی ہم ہوشیار ہو گئے۔ میں نے انسپکٹر سے کہا۔ ”اپنے آدمیوں کو سمجھاؤ اگر ہاتھی سے سامنا ہو جائے تو کوئی عجلت میں فائر نہ کرے ورنہ ہاتھی مشتعل بھی ہو سکتا ہے۔ تین اعشاریہ تین کی گولی اس پر اتنی موثر ثابت نہیں ہوگی۔“

انسپکٹر نے سر ہلایا اور اپنی زبان میں سپاہیوں کو سمجھانے لگا۔ جنگل کے وسط سے گزرنے والی یہ سڑک کوئی بارہ کلومیٹر طویل تھی لیکن گواسی جانے والا راستہ بیچ سے گھوم جاتا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی وادی تھی جس کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں چائے کی کاشت کے لیے بے حد موزوں تھیں۔ ہم گواسی جانے والے راستے تک پہنچ گئے لیکن الفریڈ کی گاڑی کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔

انسپکٹر نے مجھ سے کہا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ ان کی گاڑی کسی کھائی میں گر گئی ہے۔“

یہ سن کر میرا دل شدت غم سے جکڑتا ہوا محسوس ہوا۔ میرا پیارا دوست اور مہربان الفریڈ اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ اس لمحے مجھے برابر سے گزرتی جھاڑیوں میں سفید رنگ کی کسی شے کی جھلک نظر آئی۔ میں نے چلا کر کمار سے کہا۔ ”گاڑی روکو...... اس طرف جھاڑیوں میں کچھ ہے۔“

انسپکٹر کمار نے بریک لگائے۔ میں جیپ سے کود کر اس طرف جھپٹا۔ میرا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ یہ سفید رنگ کی فورڈ کار تھی اس کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ اس پر کیا گزری ہے۔ بونٹ پچک گیا تھا۔ چھت بیٹھ گئی تھی۔

”ہاتھی کے پیر کے نشان۔“ انسپکٹر کمار نے چلا کر کہا۔ آگے راستے پر ہاتھی کے پیر کے نشان واضح تھے۔ تباہ شدہ کار خالی تھی۔ الفریڈ یا اس کے گورکھا محافظ کا کہیں پتا نہیں تھا۔ کار سے آگے گھاس اور جھاڑیاں بری طرح مسلی ہوئی تھیں۔ ہم اس مسلی ہوئی جھاڑیوں پر آگے بڑھنے لگے۔ میرا اندازہ تھا کہ الفریڈ کا سامنا اچانک ہاتھی سے ہوا اور بدحواسی میں اسٹیئرنگ مڑ گیا اور کار سڑک سے اتر کر جھاڑیوں میں جا گھسی۔ کار کے رکتے ہی ہاتھی اس پر حملہ آور ہوا تھا۔ جان بچانے کے لیے وہ کار سے نکل بھاگے تھے اور کار پر غصہ اتارنے کے بعد ہاتھی ان کے تعاقب میں گیا تھا۔ ایک پانچ سو رائفل کار کے اندر پڑی تھی۔ گورکھے کو اسے استعمال کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ وہ اسے کار ہی میں چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔

میں خود کو کسی اندوہناک منظر کے لیے تیار کرنے لگا۔ مسلی ہوئی گھاس اور جھاڑیوں کی رہنمائی میں گزرتے ہوئے سپاہی بے حد خوف زدہ تھے۔ ان کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ آپس میں بات نہ کریں اور چلتے ہوئے کوشش کریں کہ کم سے کم آواز پیدا ہو۔ اس لیے وہ اور بھی محتاط تھے۔ سب سے آگے میں تھا۔ ذرا پیچھے انسپکٹر کمار تھا۔ میں نے اسے دائیں طرف نظر رکھنے کو کہا اور خود بائیں طرف کا خیال رکھ رہا تھا۔ سپاہیوں سے کہا تھا کہ وہ عقب میں دیکھتے رہیں کیونکہ ہاتھی مکاری سے حملہ کرنے میں ماہر تھا۔ اپنے بے پناہ جثے اور وزن کے باوجود یہ اتنی خاموشی سے اور انسان کی بے خبری میں آتا ہے کہ جب تک خود ہوشیار نہیں کرتا پتا نہیں چلتا ہے۔

جلد میرا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ ایک ذرا کھلی جگہ گورکھے کی لاش پہلے نظر آئی۔ ہاتھی نے صرف پاؤں رکھ کر اس کا سینہ پچکا دیا تھا۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ لاش کی حالت سے لگ رہا تھا کہ گورکھے کو مرتے وقت زیادہ تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ پسلیاں ٹوٹ کر پھیپھڑوں اور دل میں گھس جانے سے اس کی فوری موت واقع ہوئی تھی۔ وہ کچلے جانے سے یوں بچ گیا تھا کہ اس سے آگے ہاتھی الفریڈ کے تعاقب میں روانہ ہو گیا تھا۔ الفریڈ کو اس نے اونچی گھاس کے ایک چھوٹے ٹکڑے میں جا لیا تھا۔ الفریڈ غلطی سے اس میں جا چھپا تھا۔ اگر وہ ذرا سی عقل سے کام لیتا تو کبھی اس گھاس میں نہ گھستا۔ اس میں جا کر آدمی پھنس جاتا ہے۔ اس غلطی کی وجہ سے ہاتھی نے اسے جا لیا تھا ورنہ اس سے ذرا آگے اونچے اور گھنے درختوں کا ایسا جھنڈ تھا جس میں ہاتھی نہیں گھس سکتا تھا۔ گھاس کے ٹکڑے سے یہ جھنڈ مشکل سے دس گز کے فاصلے پر تھا۔

الفریڈ کی کچلی مسلی لاش گھاس کے عین وسط میں تھی۔ اپنے دوست کی لاش دیکھ کر میری آنکھوں تلے چند لمحے کو اندھیرا سا چھا گیا تھا، پھر اس قاتل ہاتھی کے لیے میرے اندر غم و غصے کی لہر دوڑنے لگی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ رائفل لے کر جنگل میں گھس جاؤں اور اسے تلاش کر کے ہلاک کر ڈالوں۔ یہ صرف جذباتی سوچ تھی۔ اس مکار درندے کو ہلاک کرنے کے لیے ایک مکمل منصوبے کے ساتھ ہوشیاری اور مستعدی کی ضرورت بھی تھی۔ میں الفریڈ کی لاش کے پاس سے ہٹ گیا۔ اس بے چارے کے جسم کا شاید ہی کوئی

اثرؔ لکھنوی

حسین علی خاں نام۔ اثرؔ تخلص۔ ان کے والد نواب امیر الدولہ مرزا حیدر بیگ خاں، نواب آصف الدولہ کے نائب تھے۔ اثرؔ لکھنوی کے بڑے بھائی مرزا اکبر علی خان مقبلؔ بھی مشہور شاعر و مرثیہ گو تھے۔ اثرؔ، نواب امیر الدولہ کے چھوٹے فرزند تھے۔ شاعری میں ناسخ کے شاگرد تھے اپنے گھر میں محفل مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے۔ مصحفیؔ ان کے بڑے مداح تھے۔ کہتے ہیں جنت آرام گاہ کہ جوانی سے ہی خوش تقریر، مہذب الاخلاق تھے، ابتدائے عمر سے ہی کئی صفات کے حامل تھے۔ دو تین بار مجلس مشاعرہ ان کے مکان پر منعقد کی گئی۔ آخر جذبۂ کامل شوق یہاں تک پہنچا کہ خود ہی اصناف سخن کو موزوں کرنا شروع کر دیا اور اپنی شاعری کو شیخ امام بخش ناسخ کہ جنھوں نے معنی بندی میں نیا نیا استادی کا علم بلند کیا تھا اور مجھ فقیر سے بھی دوستی ہے، نظر سے کلام گزراہے، ناسخ کے سامنے پیش کرتے اور اصلاح لیتے تھے اور چونکہ اثرؔ نے اس زمانے میں آئمہ معصومین سے محبت زیادہ کر رکھی تھی اور شیعہ عقائد کی بے حد تعریف کیا کرتے تھے ان کا پسندیدہ کلام منقبت ہوتا تھا بعد میں نعتیہ اشعار و مرثیہ وسلام کہنا بھی شروع کر دیا تھا، عقیدہ تھا کہ سعادت ابدی حاصل ہوگی چنانچہ اپنے آپ کو ان کاموں میں مشغول رکھا کرتے تھے۔ ان کی عمر چالیس سال سے زائد تھی۔ مصحفیؔ کے قول کے مطابق اثرؔ نعت، سلام اور مرثیہ کہنا سعادت ابدی سمجھتے تھے۔ اثرؔ مرثیے کہتے تھے اور مرثیہ نگار شعراء کے قدردان بھی تھے۔ منیرؔ شکوہ آبادی کا بیان ہے کہ ”نواب حسین علی خاں اثرؔ بڑے مالدار نواب، قدردان و دستگیر اہلِ کمال شعراء میں تھے...... اکثر شعراء کو انعام دیتے

ایسا حصہ ہو جو وحشی ہاتھی کے پیروں تلے روندے جانے سے محفوظ رہا ہو۔ انسپکٹر کی ہدایت پر سپاہی جا کر جیپ سے چادر لے آئے اور پھر اس میں الفریڈ کی لاش لپیٹ کر لے گئے۔ اس کے گورکھے ملازم کی لاش بھی اٹھالی گئی تھی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ لاشوں کے بعد جیپ میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ سب سما سکتے اسی لیے انسپکٹر نے دو سپاہیوں سے کہا کہ وہ یہاں رک کر انتظار کریں۔ وہ لاشیں چھوڑ کر آئے گا اور انہیں واپس لے جائے گا۔ یہ سن کر سپاہیوں کے چہرے سفید پڑ گئے۔ ہاتھی کے خوف سے وہ رکنے کو تیار نہیں تھے۔ میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے انسپکٹر کمار سے کہا۔ ”میں ایک سپاہی کے ساتھ رک جاتا ہوں۔“

پہلے تو انسپکٹر کمار نے انکار کیا لیکن پھر میرے اصرار پر وہ مان گیا۔ تین میں سے ایک سپاہی بھی رکنے کو تیار ہو گیا تھا۔ انسپکٹر کمار لاشیں لے کر روانہ ہو گیا اور میں نے دوبارہ نچلے حصے کا رخ کیا۔ سب سے پہلے اس جگہ کو دیکھا جہاں گورکھے کی لاش پڑی تھی۔ اس جگہ نرم زمین پر ہاتھی کے قدموں کے نشان واضح تھے۔ پہلی بات میں نے یہ نوٹ کی کہ اس ہاتھی کے پاؤں غیر معمولی بڑے تھے۔ ان کا قطر بارہ انچ کے قریب تھا۔ بہت بڑے جثے کے ہاتھی کا پاؤں ہی اتنا بڑا ہو سکتا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ہاتھی کوئی گیارہ فٹ اونچا اور چھ سے سات ٹن وزنی ہو گا۔ یہ سب پیمانے ایک عام ہاتھی سے زیادہ تھے۔

☆......☆

داستان کو آگے بڑھانے سے پہلے میں قارئین کو ذرا ہاتھی کے بارے میں بتا دوں۔ ہاتھی دودھ پلانے والے جانوروں کی نسل سے ہے۔ اس کی اوسط عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ ہوتی ہے یعنی انسان کی اوسط عمر کے برابر۔ مگر بعض ہاتھی اسّی برس تک بھی زندہ رہتے ہیں۔ ہاتھی اس لحاظ سے خوش قسمت جانور ہے کہ اسے شاذ ہی کوئی بیماری ہوتی ہے۔ ہاں، آخری عمر میں اسے دل کی بیماری ہو جاتی ہے۔ دراصل ہاتھی ان جانوروں میں سے ہے جو ساری عمر بڑھتے رہتے ہیں اسی لیے ان کے دل کے لیے بھی کام بڑھتا رہتا ہے اور بالآخر دل جواب دے دیتا ہے۔ انسان کے علاوہ ہاتھی کو بھی ہارٹ اٹیک ہوتا ہے۔ ایک ہاتھی دن بھر میں پچاس سے نوّے کلو گرام چارہ کھاتا ہے۔ اس کی خوراک میں پتے اور نرم شاخیں شامل ہیں۔ یہ جنگلی پھل اور گھاس بھی شوق سے کھاتا ہے۔ اگرچہ ایشیائی ہاتھی کو خوراک کے وافر ذرائع میسر ہیں لیکن افریقی ہاتھی نسبتاً زیادہ کھاتا ہے۔ دراصل اسے اپنی خوراک کے لیے زیادہ چلنا پھرنا پڑتا ہے۔ اس لیے بھوک بھی زیادہ لگتی ہے اور وہ زیادہ کھاتا ہے۔ ہاتھی کئی دن پیاسا رہ سکتا ہے اور جب پانی پینے کا موقع ملے تو ایک وقت میں سو لیٹر سے زیادہ پانی پی جاتا ہے۔ یہ سونڈ

تھے۔ ناسخ صرف ان کے یہاں مرزا دبیر کو سننے آتے تھے۔ ناسخ کے مرنے کے بعد جب میر انیس فیض آباد سے آ کر لکھنو میں پڑھے تو میر خلیق نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ جب ایک دن میر انیس دوسرے دن مرزا دبیر چہلم بھر ان کے یہاں پڑھتے تھے۔ یہ ہزاروں روپے نذرانہ دیتے تھے۔" سعادت خان ناصر نے بھی اثر کی بہت تعریف کی ہے لکھتے ہیں: "امیر باکرم رئیس باچشم، سخنور، شعر پرور...... کلام ان کا مضبوط اور راسخ، کون ساہفتہ تھا کہ شاعروں کی صحبت ان کے دولت خانہ میں نہ ہوتی تھی۔ اسی میں دولت ان کی صرف ہوئی۔" محسن لکھنوی نے انہیں صاحب دیوان لکھا ہے اور دیوان میں قصائد و مثنوی کا ذکر بھی کیا ہے۔ نساخ نے لکھا ہے۔ "شعر خوب کہتے ہیں...... کلکتہ بھی آئے تھے۔" کریم الدین کا بیان ہے کہ 1261ھ مطابق 1845ء میں اثر کا بانوے برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ اس کی تصدیق سعادت خان ناصر کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ خوش معرکہ زیبا 1262ھ میں مکمل ہوا، ناصر لکھتے ہیں "افسوس کی بیک چشم زدن، گردش کہن نے اس مغتنم روزگار کو عدم کر دیا اور شوق شاعری کو کم۔ یہ چند شعر کہ اس مغفور و مرحوم سے یادگار ہیں۔" گویا اسی زمانے میں ان کا انتقال ہوا تھا جب ناصر تذکرہ لکھ رہے تھے؛ اسی لیے 1261ھ سن وفات صحیح ہے۔ اس حساب سے اثر کا سال پیدائش 1169ھ قرار پاتا ہے۔ سفارش حسین نے لکھا ہے کہ اثر کے مرثیے کا نمونہ نہیں ملتا (اردو مرثیہ صفحہ 201) (خم خانہ جاوید جلد اوّل صفحہ 131) اثر کی غزلوں کا انتخاب تو تذکروں میں مل جاتا ہے لیکن مرثیے ان کے کہیں شائع نہیں ہوئے۔

مرسلہ: نظیر احمد۔ کراچی

سے پانی نہیں پی سکتا لیکن سونڈ ہی سے پانی پیتا ہے۔ وہ اس طرح کہ سونڈ میں پانی بھر کر منہ میں ڈالتا ہے۔ اس کی سونڈ میں بیک وقت کئی گیلن پانی آ جاتا ہے۔ مادہ ہاتھی دو سال تک بچے کو پیٹ میں رکھ کر جنم دیتی ہے۔ اس کا بچہ پیدائش کے وقت سو کلوگرام کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ یوں ہاتھی کو بلیو ویل کے بعد سب سے وزنی بچہ دینے کا اعزاز حاصل ہے۔ ہاتھی کا بچہ چند مہینوں میں کھانا پینا شروع کر دیتا ہے کیونکہ مادہ ہاتھی اپنے بے پناہ جثے کے باوجود دودھ دینے کے معاملے میں کسی بھی ممالیہ سے گئی گزری ہوتی ہے۔ ہاتھی کی مادہ وزن کے اعتبار سے سب سے کم دودھ دینے والا جانور ہے۔ اتنے دودھ میں اس کے بچے کا بھلا نہیں ہوتا اس لیے اس بے چارے کو خاصی کم عمری میں کھانا پینا شروع کرنا پڑتا ہے۔

ڈائنا سارس کے زمانے کے ایک جانور رینو سار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ہاتھی کے آباؤ اجداد تھے۔ ان کی صورت ہاتھی سے نہیں ملتی تھی اور یہ جسامت میں بھی آج کے ہاتھی سے کہیں بڑے ہوتے تھے۔ موجودہ ہاتھی کے آثار ہمیں رکاز کی صورت میں تین لاکھ سال پہلے کے ملتے ہیں گویا ہاتھی نے ارتقائی منازل طے کر کے موجودہ صورت کوئی تین لاکھ سال قبل اختیار کی تھی۔ اس کی ایک درمیانی کڑی میں ہاتھی موجودہ ہاتھی سے ملتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کے موجودہ دو دانتوں کی جگہ ایک واحد بیلچہ نما دانت تھا جس سے یہ اپنے دشمن کو خود سے دور رکھتا تھا مگر اس بیلچہ نما دانت کی وجہ سے اسے کھانے پینے میں بے حد دشواری پیش آتی تھی۔ قیاس ہے کہ ضرورت کے تحت یہ بیلچہ نما واحد دانت ہاتھی کے باہر کی طرف نکلے ہوئے دو دانتوں میں بدل گیا۔ اس طرح اسے نہ صرف کھانے پینے میں آسانی ہونے لگی بلکہ یہ دو نوکیلے دانت دشمنوں کے خلاف اس کا موثر ہتھیار بن گئے۔

جدید دور میں ہاتھی کی دو اقسام پائی جاتی ہیں۔ ایک افریقی ہاتھی اور دوسرا ایشیائی ہاتھی۔ افریقی ہاتھی تقریباً پوری مشرقی ساحلی پٹی میں گھاس کے میدانوں اور برساتی جنگلات تک پایا جاتا ہے۔ ایک زمانے میں افریقا میں ان کی تعداد بیس لاکھ سے بھی زیادہ تھی لیکن بے پناہ شکار کی وجہ سے ان کی تعداد گھٹ کر محض ساٹھ ہزار رہ گئی ہے۔ دوسری قسم یعنی ایشیائی ہاتھی تعداد میں اور بھی کم رہ گئے ہیں۔ ایک زمانے میں یہ ویت نام سے لے کر انڈیا میں ہمالیہ کی ترائی تک بکثرت پائے جاتے تھے۔ برما اور آسام ان کا گھر تھے لیکن بڑھتی ہوئی انسان آبادیوں نے ان کی قدرتی مسکن تباہ کر دیئے اور انہیں پکڑ کر مختلف کاموں کے لیے استعمال کیا جانے لگا جس کے بعد ان کی تعداد میں خاصی کمی آئی ہے۔ افریقی اور ایشیائی نسلوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

ایشیائی ہاتھی کے کان اور دانت چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ گھنے جنگلات میں رہتے ہیں جہاں بڑے دانت اور کان مسئلہ بن جاتے ہیں اسی لیے ارتقائی مراحل میں ان کے کان اور دانت افریقی ہاتھی کی بہ نسبت چھوٹے رہ گئے۔ جنہیں افریقا کا کھلا اور وسیع ماحول ملا تھا۔ اوسط وزن اور قد و قامت میں، میں نے افریقی ہاتھی کو نسبتاً بڑا پایا ہے لیکن بعض ایشیائی ہاتھی اچھی خوراک اور طویل عمر کی وجہ سے بہت قد و قامت حاصل کر لیتے ہیں۔

ان دو نسلوں کے علاوہ آج سے چند ہزار سال پہلے تک ہاتھی کی ایک اور قسم بھی پائی جاتی تھی جسے میمتھ (بال دار ہاتھی) کہتے ہیں۔ زمین پر ہر دس سے بارہ ہزار سالوں میں برفانی دور آتا ہے جس میں پورا نصف شمالی کرہ برف سے ڈھک جاتا ہے اور بے پناہ سردی پڑتی ہے۔ یہ دور بعض اوقات بارہ ہزار سال تک جاری رہتا ہے۔ صرف افریقا اور آسٹریلیا کی سرزمین اس برفانی دور سے محفوظ رہتی ہے۔ افریقا میں پائے جانے والے ہاتھی اس آفت سے محفوظ رہے لیکن شمال میں پائے جانے والے میمتھ اس برف باری سے محفوظ نہ رہ سکے۔ بے پناہ سردی اور برف نے ان کی خوراک کے سارے ذرائع ختم کر دیے اور چند ہی برسوں کے اندر شمال پر راج کرنے والا یہ دیو قامت جانور صفحۂ ہستی سے نابود ہو گیا تھا۔ آج سائبیریا میں اس کے بچے کھچے آثار ملتے ہیں جہاں یہ ہزاروں سال سے برف میں دبے محفوظ رہے۔ ان کے پورے پورے سالم جسم بھی برآمد ہوئے، جو آج کل دنیا کے کئی زولوجیکل میوزیم میں رکھے ہوئے ہیں۔ میمتھ حیرت انگیز طور پر بیس سے پچیس فٹ اونچے ہوا کرتے تھے۔ ان کے جسم پر دو فٹ سے بھی زیادہ لمبے گھنے بال ہوتے تھے جو انہیں شمال کی بے پناہ سردی سے محفوظ رکھتے تھے۔ اپنے زمانے میں یہ زمین پر پایا جانے والا سب سے بڑا جانور تھا۔ اس کے کئی میٹر طویل دانت ایک ٹن سے بھی زیادہ وزنی ہوا کرتے تھے۔ ایک عام میمتھ کا وزن پچیس سے تیس ٹن ہوا کرتا تھا یعنی آج کے ایک عام ہاتھی سے سات آٹھ گنا زیادہ۔ برف باری کے دور کے خاتمے پر اندازاً آج سے بارہ ہزار سال پہلے صرف افریقی ہاتھی باقی بچے تھے، پھر یہ ہاتھی نسل بڑھاتے ہوئے ایشیا تک آ گئے۔ بعد میں جغرافیائی تبدیلیوں کی وجہ سے ایشیا اور افریقا کے موسموں میں تبدیلی آتی رہی جس کی وجہ سے دونوں نسلیں جداگانہ خصوصیات کی حامل ہو گئیں۔

☆......☆

میرے ساتھ رہ جانے والا سپاہی گہرے سانولے رنگ کا ایک نوعمر لڑکا تھا۔ وہ خوف زدہ تھا لیکن بے خوف نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ ارد گرد نظر رکھے اور کوئی خطرہ محسوس کرے تو بے آواز طریقے سے مجھے خبردار کر دے۔ میں ہاتھی کے پیروں کے نشان دیکھ رہا تھا۔ آخر ایک جگہ مجھے مطلوبہ نشان نظر آ گئے۔ میں ہاتھی کے چاروں پیروں کے نشان ایک جگہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اس جگہ ہاتھی کے چاروں پیروں کے نشان بالکل واضح تھے۔ یہ چاروں نشان یکساں تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہاتھی کو ایسا کوئی زخم نہیں آیا تھا جس سے اس کی چال متاثر ہوتی۔ عام طور سے سر اور سونڈ کے علاوہ ہاتھی کے جسم پر کہیں زخم آ جائے تو اس کی چال میں فرق آ جاتا ہے کیونکہ چلتے ہوئے ہاتھی کا پورا جسم حرکت کرتا ہے۔ میں نے اس کے دوڑتے قدموں کے نشان دیکھے۔ دوڑتے ہوئے ہاتھی کے پچھلے قدموں کے ناخن زمین میں گہرے لگتے ہیں اور ان کے نشانات واضح ہو جاتے ہیں۔ قدموں کے درمیان فرق سے واضح تھا کہ ہاتھی جوانی کی عمر میں تھا۔ بوڑھا ہو جانے پر ہاتھی زیادہ بڑے قدم نہیں اٹھا پاتا ہے۔

میرا اندازہ تھا کہ انسپکٹر کمار کو الفریڈ اور گورکھے کی لاشیں چھوڑ کر آنے میں کم سے کم ایک گھنٹا لگے گا۔ اس وقت پانچ بج رہے تھے اور چھ بجے تک سورج غروب ہو جاتا اور اس کے بعد پہاڑی علاقوں میں بڑی تیزی سے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ روشنی میں اتنا خطرہ نہیں تھا۔ ہاتھی زیادہ تر سورج ڈوبنے کے بعد ہی اپنے ٹھکانے سے باہر آتا تھا۔

اچانک میرے سپاہی نے دبی آواز میں پکارا۔ ''صاحب، لک ہیئر۔''

میں نے دیکھا۔ دور جھاڑیاں اس طرح ہل رہی تھیں جیسے کوئی بڑا جانور اوپر کی طرف آ رہا ہو۔ میں نے اندازہ لگایا یہ وہی ہاتھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اشارے سے سپاہی کو اپنے پیچھے آنے کو کہا اور خود تیزی سے درختوں کے اس جھنڈ کی طرف بڑھا جس میں پناہ لینے کے لیے الفریڈ بھاگا تھا۔ گھاس کے قطعہ کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے الفریڈ کے خون کے دھبے نظر آئے تو مجھے ہاتھی پر طیش آنے لگا۔ الفریڈ کی یاد ہوک بن کر دل میں اٹھنے لگی۔ ایک مہینے کے بعد اسے انگلینڈ جانا تھا جہاں اس کے ماں باپ تھے۔ نہ جانے ان کے دل پر کیا گزرے گی۔ الفریڈ کی بیوی کا

بارے میں مجھے یقین تھا کہ اسے اپنے شوہر کی موت سے کوئی خاص دکھ نہیں ہوگا۔

جلد ہی ہم درختوں کے اس جھنڈ تک جا پہنچے۔ قریب جا کر اندازہ ہوا کہ یہ اتنے محفوظ درخت بھی نہیں تھے۔ اگر ہاتھی آجاتا تو وہ ان درختوں میں بھی گھس سکتا تھا۔ اپنی لمبی سونڈ سے بھی کام لے سکتا تھا۔ میں نے ایک بلند، مضبوط اور آسانی سے چڑھ جانے والے درخت تک کا انتخاب کیا اور نوعمر سپاہی کو اس پر چڑھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے بڑی پھرتی دکھائی اور ایک منٹ سے پہلے ہی پندرہ سولہ فٹ بلند ایک شاخ پر پہنچ گیا۔ میں خود ایک تنے کی آڑ میں ہو کر ہلتی جھاڑیوں کو دیکھنے لگا جہاں سے کبھی کبھی ہاتھی کے سر اور اس کے ہلتے کانوں کی جھلک نظر آرہی تھی۔ میں نے ایک بار زمین سے مٹی اٹھائی اور اسے ہاتھ بلند کر کے آہستہ آہستہ چھوڑنے لگا۔ مٹی ہلکی سی جنوب سے شمال کی طرف گر رہی تھی اور ہاتھی بھی جنوب سے نمودار ہو رہا تھا یعنی اس بات کا امکان کم ہی تھا کہ ہاتھی ہماری بو پا سکے۔ ہاتھی کی نظر کمزور ہوتی ہے پھر بھی میں ایک ایسے درخت کی آڑ میں ہو گیا جو اوپر سے بے حد گھنا تھا اور اس کے نیچے نیم تاریکی تھی۔ جھاڑیاں اس جھنڈ سے کوئی سو گز کے فاصلے پر تھیں۔ درمیان میں ہلکی گھاس اور چھوٹے پودوں کا ایک علاقہ تھا۔ میں نے رائفل چیک کی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر ہاتھی سے دو دو ہاتھ کرنے ہی پڑے تو یہ رائفل کس قدر کارآمد رہے گی جواب حوصلہ افزا نہیں تھا۔ اس رائفل کی گولی زیادہ وزنی نہیں تھی اس لیے یہ بڑے جانوروں کے شکار کے لیے زیادہ کارآمد نہیں تھی۔

معاً سامنے والی جھاڑیاں پھٹیں اور ان میں سے ایک قوی ہیکل ہاتھی برآمد ہوا۔ بلاشبہ گیارہ فٹ اونچا تھا۔ اس کے چھوٹے کان مسلسل پنکھے کی طرح ہل رہے تھے اور سرخ آنکھیں بے چینی سے ہر طرف نگراں تھیں۔ اس کے دانت بے حد سفید اور لمبائی میں افریقی ہاتھی سے کم تھے لیکن ایک ایشیائی ہاتھی کی بہ نسبت لمبے تھے۔ اس وقت میں ذرا جذباتی ہو گیا تھا۔ میں نے خطرہ مول لیتے ہوئے ہاتھی کو رائفل سے شکار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب میں ہاتھی کے ذرا آگے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ پچاس گز کی دوری سے میں اس کی آنکھ میں گولی اتار سکتا تھا لیکن وہ آگے آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ بدستور جھاڑیوں سے جھانک رہا تھا۔ غالباً اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا تھا کہ یہاں اس کے لیے خطرہ ہے۔

پطرس مزاح

پطرس بخاری کے ایک عزیز کی شادی تھی۔ نکاح پڑھانے کے لیے مولوی درکار تھا۔ تلاش بسیار کے بعد ایک مولوی ڈھونڈ کر لایا گیا جو بہت دبلا پتلا تھا۔ اسے دیکھ کر پطرس صاحب کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی، بولے ''نکاح کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، نکاح خواں اور چھوہارے! ماشاء اللہ! مولوی صاحب میں دونوں صفات موجود ہیں۔''

مرسلہ: عنایت اللہ، فیصل آباد

اچانک وہ مڑا اور واپس جھاڑیوں میں جا گھسا۔ اس بار وہ جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا شمال کی طرف جا رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ کیا اس نے ہماری بو محسوس کر لی تھی مگر کیسے؟ جب کہ ہوا اس کے رخ سے ہمارے رخ پر چل رہی تھی۔ زولوجیکل کی ڈگری لیتے وقت میں نے ایشیائی ہاتھی کے بارے میں تفصیل سے پڑھا تھا۔ یہ ہوا کے رخ پر تین میل دور سے آنے والی بو سونگھ لیتا ہے۔ اب مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ اگر مکار جانور ہماری موجودگی بھانپ گیا تھا تو اب کسی اور زاویے سے حملہ کرنے جا رہا تھا۔ عقب سے آکر بے خبری میں ہمیں گھیرنا چاہتا تھا۔ ذرا سی دیر میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس طرف ٹیلے تھے اور گھنے درخت بھی۔ ہاتھی کسی بھی طرف سے نمودار ہو سکتا تھا۔ میں نے سپاہی کو اشارہ کیا کہ وہ بلندی سے ذرا عقبی سمت نظر رکھے۔ اسی لمحے ہاتھی کی زبردست چنگھاڑ سنائی دی۔ یہ چنگھاڑ پاس ہی سے آئی تھی جس طرف سے ہم آئے تھے۔ اس کی چنگھاڑ میں غصہ اور نفرت تھی۔ غالباً اس نے ہماری بو محسوس کر لی تھی۔ فوراً اس کے قدموں کی دھمک سنائی دی۔ میں درخت کی طرف بھاگا۔ جب میں تنے پر چڑھ رہا تھا تو ہاتھی نمودار ہوا۔ وہ ست انداز میں دوڑتا ہوا درختوں کے اس جھنڈ کی طرف آرہا تھا۔ سپاہی چلا چلا کر مجھے جلدی سے اوپر آنے کو کہہ رہا تھا۔ حالانکہ مجھے فوری خطرہ نہیں تھا۔ یہ درخت اندر کی جانب تھا اور ہاتھی کا وہاں پہنچنا آسان نہیں تھا۔ یہ بات ہاتھی نے بھی محسوس کر لی تھی۔ وہ درختوں کے جھنڈ کے پاس آکر رکا۔ اس نے ایک زبردست چنگھاڑ ماری اور جھنڈ میں گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس وقت تک میں اوپر چڑھ چکا تھا۔ رائفل میرے شانے سے ٹنگی ہوئی

تھی۔ ابھی میں خود کو شاخوں کے درمیان سیٹ کر رہا تھا کہ فائر کی آواز سن کر اچھل پڑا اور نیچے گرتے گرتے بچا۔ سپاہی نے اپنی رائفل سے ہاتھی پر فائر کر دیا تھا۔ گولی اس کے جسم کے اگلے حصے میں لگی تھی۔ تکلیف سے بلبلا کر ہاتھی نے ایسی چنگھاڑ ماری کہ کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے پھر اس نے شدت سے درخت کو ٹکر ماری۔ درخت ہل کر رہ گیا۔ میں ایک بار پھر گرتے گرتے بچا۔ سپاہی دہشت کے عالم میں ایک کے بعد ایک فائر کرتا رہا اور اس نے ہاتھی کے جسم میں تین سو تین کی کئی گولیاں اتار دیں۔ گولیاں کھا کر وہ چنگھاڑتا ہوا پیچھے ہٹا اور جھنڈ سے نکل گیا۔ میں کفِ افسوس ملتا رہ گیا۔ اتنے پاس سے ہاتھی پر فائر کرنے کا سنہری موقع ملا تھا جو خوف زدہ سپاہی نے اپنی حماقت سے گنوا دیا تھا۔ اس نے مجھے سنبھلنے اور رائفل آزمانے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ جب تک میں سنبھلتا، ہاتھی جھنڈ سے باہر جا چکا تھا تاہم اس کی کرب اور غصے میں ڈوبی ہوئی چنگھاڑیں بخوبی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ جھنڈ کے آس پاس ہی تھا۔ میں دعا کر رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر جھنڈ میں گھسنے کی کوشش کرے اور میں اسے اپنی رائفل سے نشانہ بناؤں۔

اچانک مجھے خیال آیا۔ انسپکٹر کمار کے آنے کا وقت ہو گیا تھا اور اگر وہ اس وقت آ جاتا تو ہاتھی اس کے پیچھے پڑ جاتا۔ تین سو تین کی گولیوں نے اسے زخمی تو کر دیا تھا لیکن کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا سکی تھیں۔ یہ میرا بارہا کا تجربہ رہا ہے، جہاں ہاتھی کو کوئی کاری زخم لگتا ہے، وہ فوراً پسپائی کر کے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس ہاتھی کے گولی کسی نازک جگہ لگی ہوتی تو یہ اپنے ٹھکانے کا رخ کر چکا ہوتا۔ وہ بدستور یہیں چنگھاڑ رہا تھا لیکن تمام تر غصے کے باوجود اس نے دوبارہ جھنڈ میں گھسنے کی کوشش نہیں کی۔ بلندی سے اور دوسرے درختوں کی وجہ سے وہ نظروں سے غائب تھا۔ کبھی کبھی اس کی ایک جھلک ہی نظر آتی تھی لیکن اسے نشانہ بنانے کے لیے یہ جھلک ناکافی تھی۔ دس پندرہ منٹ تک وہ جھنڈ کے آس پاس اودھم مچاتا رہا، پھر اس کی چنگھاڑیں بتدریج نشیب کی طرف جاتی محسوس ہوئیں اور پھر بالکل ہی معدوم ہو گئیں۔ اس کے باوجود ہم خاصی دیر تک اپنی اپنی جگہ دبکے رہے۔ پھر سپاہی لڑکا ہمت کر کے نیچے اترا۔ اس نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا.... اشارے سے مجھے نیچے بلایا اور اپنی زبان میں سمجھانے لگا کہ ہاتھی جا چکا ہے۔ اس وقت سورج غروب ہونے کو تھا۔

اگرچہ ہاتھی کے آثار دور دور تک نظر نہیں آ رہے تھے مگر اس مکار جانور کا کوئی بھروسا بھی نہیں تھا کہ کہیں کسی جگہ چھپ کر ہمارے جھنڈ سے باہر آنے کا انتظار نہ کر رہا ہو، میں نے سپاہی سے کہا کہ وہ یہیں رکے، میں کچی سڑک تک جاتا ہوں اور اس دوران اگر ہاتھی کو آتا دیکھے تو ہوائی فائر کر کے مجھے خبردار کر دے۔ زبان کے مسئلے کی وجہ سے اسے اپنی بات سمجھانے میں ذرا مشکل پیش آئی تھی۔ میں اوپر کچی سڑک کی طرف گیا۔ خوش قسمتی سے انسپکٹر کمار ذرا تاخیر سے آیا تھا ورنہ اس کا سامنا مشتعل ہاتھی سے ہو جاتا تو کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کیا صورتِ حال پیش آتی۔ جھنڈ میں چھپے سپاہی کو لے کر ہم واپس گاؤں آ گئے۔ الفریڈ اور گورکھے کی لاش ضروری کارروائی کے لیے نزدیکی اسپتال کی طرف روانہ کی جا چکی تھی۔ اسٹیڈن اپنے باس کی موت پر بے حد آزردہ تھا۔

رات کھانے پر اس نے مجھ سے کہا کہ وہ ہر صورت اس عفریت کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہے۔

اس دوران میں یہ طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے اسٹیڈن سے کہا۔ ”مسٹر اسٹیڈن مجھے خود بھی مسٹر الفریڈ کی موت کا بے حد دکھ ہے اور میں اس ہاتھی کو مارنے کی پوری کوشش کروں گا۔ اس مقصد کے لیے مجھے دو عدد چار سو یا پانچ سو کی رائفلیں چاہئیں اور ایک اسلحے کا ماہر اور دو آدمی درکار ہیں۔“

”بس، یہ چیزیں؟“ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ”ان کا انتظام میں کل ہی کر دوں گا۔“

☆......☆

اگلے روز جب میں ناشتے سے فارغ ہو کر نیچے آیا تو اسٹیڈن ایک شخص کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس شخص کے نقوش کچھ چینی تھے میں نے اسٹیڈن سے رائفلوں کا پوچھا۔ اس نے کہا۔ ”رائفلیں آج دوپہر تک آ جائیں گی۔ ان سے ملو، یہ ہے راجا بہادر...... میں نے خاص طور سے اس مہم پر تمہارا ساتھ دینے کے لیے بلایا ہے۔“

راجا بہادر گورکھا تھا۔ عمر چالیس سال تھی، جسم دبلا لیکن گٹھا ہوا اور چہرے پر تجربہ تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے لگا کہ مجھے اس کی تلاش تھی۔ مزید اچھی بات یہ تھی کہ وہ انگریزی زبان سے واقف تھا۔ راجا بہادر اس سے پہلے بھی شکاریوں کے ہمراہ جاتا رہا تھا اور اسے جانوروں سے نمٹنے کا خوب تجربہ تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ اس مہم میں میرا پورا

ساتھ دے گا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا تم رائفلیں تیزی سے لوڈ کر سکتے ہو؟''

''صاحب! ابھی رائفلیں آجائیں تو میں آپ کو عملی طور پر دکھاتا ہوں۔''

اسپیڈن نے شہر سے رائفلیں منگوائی تھیں جو دوپہر تک اس کے فارم پہنچ گئیں۔ اس کے اہل خانہ ہاتھی کے حملوں کے بعد شہر چلے گئے تھے اس لیے میں نے بے فکری سے مکان کے عقبی حصے میں ان رائفلوں کی جانچ کی۔ یہ طاقت ور رائفلیں شاندار حالت میں تھیں اور ان کی گولی کی طاقت اتنی تھی کہ فٹ بھر موٹی کنکریٹ کی دیوار کے آر پار ہو جاتی تھی۔ ہاتھی جیسے بڑے جانور کے لیے یہ نہایت موزوں تھی۔ پھر میں نے راجا سے کہا کہ وہ رائفل لوڈ کر کے دکھائے۔ اس نے محض دس سیکنڈ میں اَن لوڈ رائفل لوڈ کر لی لیکن ہاتھی کے شکار کے جاں گسل لمحات میں یہ وقت بھی زیادہ تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''اپنی رفتار تیز کرو اور ہاتھ میں اتنی صفائی لاؤ کہ رائفل لوڈ کرتے وقت ذرا سی بھی غلطی نہ ہو۔''

''آپ مجھے صرف دس گھنٹے دیں۔'' اس نے پورے اعتماد سے کہا۔ ''کل میں آپ کو بالکل تیار ملوں گا۔''

وہ پورا دن اور پھر آنے والی رات میں بھی راجا بہادر رائفلوں کے ساتھ لگا رہا تھا۔ اگلی صبح اس نے صرف سات سیکنڈ میں ایک رائفل لوڈ کر کے دکھائی۔ مسلسل مشق سے اس کے ہاتھوں میں ایسی مشاقی آگئی تھی کہ اس کی انگلیاں رائفل کے ساتھ رقص کرتی معلوم ہوئی تھیں۔ اپنے نشانے، راجا کی پھرتی اور رائفلوں سے مطمئن ہو کر میں نے دس بجے گھاس والے میدان کا رخ کیا۔

سامو جیپ ڈرائیو کر رہا تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ دو دن گزرنے کے بعد ہاتھی ضرور گھاس سے باہر آئے گا۔ سامو کو میں نے اس ہدایت کے ساتھ باغات کے کنارے پر چھوڑا کہ وہ خطرہ دیکھے تو فوراً واپس چلا جائے۔ اس نے کہا۔ ''صاحب، میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔''

میں اور بہادر رائفلیں لیے ترائی کی طرف روانہ ہوئے۔ میں جان بوجھ کر کھلے علاقوں سے گزر رہا تھا تاکہ ہاتھی اگر اس طرف نگراں ہو تو دیکھ لے۔ یہ حربہ اگرچہ بے حد خوف ناک تھا۔ اس میں خود میری اور راجا بہادر کی جان کو خطرہ ہو سکتا تھا مگر اس ہاتھی کو جلد از جلد کیفر کردار تک پہنچانے کا یہ واحد راستہ تھا۔ ہماری بو پا کر یا ہمیں دیکھ کر وہ گھاس سے باہر آتا۔ اس صورت میں ہم اسے شکار کر سکتے تھے۔ ہاتھی کے خوف سے جنگل اور گھاس والی پٹی میں لوگوں کی آمد و رفت بالکل بند تھی اس لیے ہاتھی کے بارے میں کسی قسم کی کوئی اطلاع بھی نہیں تھی۔ ترائی میں گھاس کی پٹی کے ساتھ خشک ندی کا کنارہ تھا۔ تقریباً سو گز طویل اس پٹی پر زیادہ تر ریت تھی یا معمولی درجے کے پودے تھے جو دور تک دیکھنے میں رکاوٹ نہیں بن رہے تھے۔ میں اور راجا بہادر اسی پٹی پر جا رہے تھے۔ ساتھ ہی ہم اونچی آواز میں بات کرتے جا رہے تھے تاکہ ہاتھی پاس ہو تو ہماری آواز سن لے۔ ہاتھی کی سماعت گینڈے جتنی تو نہیں ہوتی ہے لیکن یہ خاصی دور کی آوازیں بھی سن لیتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہاتھی وہ آواز بھی سن لیتا ہے جو انسانی کان نہیں سن پاتے۔

بظاہر بے پروائی سے بلند آواز سے باتیں کرتے جاتے ہوئے ہم پوری طرح چوکس تھے۔ میں سامنے اور راجا بہادر عقب میں نظر رکھے ہوئے تھا۔ ہم ایسی جگہ سے دور رہنے کی کوشش کر رہے تھے جہاں ہاتھی جیسے جثّے کے کسی جانور کے روپوش رہنے کی گنجائش ہو۔ میری نظر زمین پر بھی تھی۔ کئی جگہوں پر مجھے ہاتھی کے پیروں کے نشان نظر آئے تھے لیکن یہ کئی دن پرانے تھے۔ تازہ نشان کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہاتھی زخمی ہونے کے بعد اپنی پناہ گاہ سے باہر نہیں آیا تھا لیکن پانی کے لیے اسے جلد یا بدیر باہر آنا ہی تھا۔ اوپر جنگل میں پانی کے سارے ذرائع خشک ہو گئے تھے۔ صرف ترائی کی جھیل تھی جہاں ہاتھی جیسا بڑا جانور اپنی پیاس بجھا سکتا تھا۔

میں نے راجا بہادر سے کہا۔ ''میرا خیال ہے، ہمیں جھیل کی طرف جانا چاہیے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔'' اس نے میری تائید کی۔ ''زخمی ہو کر وہ پیاس محسوس کر رہا ہو گا۔ پانی کے لیے اسے لازماً جھیل کا رخ کرنا پڑے گا۔''

مگر جب ہم جھیل کے کنارے پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہاتھی رات یا صبح سویرے کسی وقت وہاں آکر جا چکا ہے۔ اس کے پیروں کے نشانات بالکل واضح تھے۔ گزشتہ روز ہاتھی نے چائے کے باغات کا رخ نہیں کیا تھا یعنی وہ اپنے زخم کے مندمل ہونے کا انتظار کر رہا تھا تاکہ دوبارہ اپنی غارت گری کا آغاز کر سکے۔ ہاتھی عام طور سے دوپہر یا سہ پہر کے وقت پانی پیتا ہے لیکن یہ مکار جانور صبح سویرے اپنی

پیاس بجھا کر واپس چلا گیا تھا۔ اب اُمید تھی کہ ہاتھی گھاس کے میدان سے باہر آئے گا۔ اس کے باوجود ہم خاصی دیر تک گھاس کی پٹی کے ساتھ سفر کرتے رہے مگر ہاتھی نے اپنی جھلک تک نہیں دکھائی تھی۔

شام تک ہم واپس آ گئے۔ سامو، باغات کے کنارے پر ہمارا انتظار کر رہا تھا وہ ہمیں لے کر اسٹیڈن کے فارم ہاؤس آ گیا۔ سارے دن کی تھکان اور گرمی سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ میں نے پہلے غسل کیا۔ پھر چائے پی اور اسی دوران اسٹیڈن کو سارے دن کی روداد سناتا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''وہ آج صبح پانی پی کر چلا گیا۔ اب اسے کل سے پہلے پانی پینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اگر کل بھی ایسی گرمی رہی تو وہ لازماً رات کے وقت جھیل پر آئے گا۔''

''رات کے وقت۔'' اسٹیڈن پریشان ہو گیا۔ ''لیکن رات کے وقت وہاں جانا بہت خطرناک ہو گا۔ نہ جانے وہ کس طرف سے آ جائے۔''

''یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔'' میں نے چائے کی چسکی لی۔ ''میں سوچ رہا ہوں، ایک آدمی اور دو سرچ لائٹس بھی لے کر جاؤں۔ رات میں اس کی ضرورت پڑے گی۔''

اسٹیڈن نے میری مخالفت کی لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا۔ اس وقت ہاتھی زخمی تھا، لہٰذا اس میں چستی اور برق رفتاری کا فقدان لازمی تھا۔ ایسے میں اس کا شکار نسبتاً آسان ہوتا، بہ نسبت اس وقت کے جب اس کے زخم بھر جاتے اور وہ پہلے کی طرح چست اور جارح ہو جاتا۔ بادل نخواستہ اسٹیڈن نے میرے فیصلے سے اتفاق کر لیا۔ اس کے پاس آرمی کے لیے بنائی جانے والی کئی طاقتور دستی سرچ لائٹس موجود تھیں۔ میں نے ان میں سے دو کا انتخاب کیا۔ رات کو تاریکی میں ان کے عملی تجربے سے مجھے ان کی افادیت کا پتا چلا۔ یہ تقریباً پچاس گز تک ہر شے کو بے حد صاف دکھا رہی تھیں۔ میں خوش ہو گیا۔ اب ضرورت تیسرے آدمی کی تھی جو یہ دستی سرچ لائٹس استعمال کرتا۔ میں نے اسٹیڈن سے کہا کہ ایک شخص کا انتظام کرے جو رضا کارانہ یہ کام کرنے کو تیار ہو۔ اس نے کوشش کی لیکن اس کے ملازمین اور گاؤں کے لوگوں میں سے کوئی بھی تیار نہ ہوا۔ مجھے مایوسی ہونے لگی۔ تیسرے شخص کے بغیر یہ کام بے حد مشکل تھا۔

جب اگلے روز دن کے بارہ بجے تک کوئی شخص دستیاب نہ ہوا تو میں مایوس ہو گیا۔ آج بھی ہاتھی کا شکار ممکن نہ تھا۔ راجا بہادر نے پیشکش کی۔ ''صاحب، لائٹ بھی میں سنبھال لوں گا۔''

میں نے انکار کر دیا۔ ''نہیں راجا...... تمہارا کام رائفل لوڈ کرنا ہے۔ اگر تم نے اپنا کام احسن طریقے سے نہ کیا تو ہم سب کی زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی۔''

راجا بہادر نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''ادھر کوئی اور جانے کو تیار نہیں۔ سب ہاتھی سے ڈرتے ہیں۔''

آج رات موقع گنوا دینے کی صورت میں ہاتھی پھر پرسوں ہی آتا اور اگر اس دوران بارش ہو جاتی تو ہاتھی پھر شاید ہی جھیل کا رخ کرتا۔ اسے پہلے بھی اس جگہ گھات لگا کر ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس لیے وہ جھیل کا رخ کرتے ہوئے محتاط ہو گا اور کوشش کرے گا کہ نیچے نہ آئے کیونکہ کھلے میں اسے آسانی سے شکار کیا جا سکتا تھا۔ سہ پہر کے وقت میں فارم ہاؤس کے باغ میں درخت کی چھاؤں تلے آرام کرسی پر سستا رہا تھا۔ لنچ کے بعد ذہن پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔ سامو کل سے کہیں گیا ہوا تھا۔ اچانک وہ دروازے کی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ اس نے پاس آ کر سلام کیا۔

''صاحب، کیا حال ہے؟''

میں نے گہری سانس لی۔ ''میرا حال تو اچھا ہی ہے لیکن یہ ہاتھی مجھے مسئلہ بنتا نظر آ رہا ہے۔ دو تین دن میں اس کے زخم بھر جائیں گے اور وہ دوبارہ انسانوں پر حملے شروع کر دے گا۔''

میں نے سامو کو بتایا کہ آج رات ہاتھی کے جھیل پر آنے کا قوی امکان ہے۔ شدید گرمی میں وہ زیادہ دیر اپنی پیاس پر قابو نہیں رکھ سکے گا۔ سامو نے میری بات سن کر جوش سے کہا۔ ''یہ تو اچھا موقع ہے صاحب آپ اسے شکار کر سکتے ہیں۔''

''لیکن کوئی ایسا شخص نہیں مل رہا جو سرچ لائٹس استعمال کرے۔ اس کے بغیر ہاتھی کا شکار ممکن نہیں ہے۔ میری اور راجا کی جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔''

''صاحب اگر میں آپ کے ساتھ چلوں۔'' سامو نے ہچکچا کر کہا۔

میں خوشی سے اچھل پڑا۔ ''سامو، تم نے تو مسئلہ حل کر دیا۔''

وہ بھاگ کر اندر سے سرچ لائٹس اٹھا لایا۔ میں نے اسے ان کے استعمال کی تربیت دی۔ بیٹری چار گھنٹے سے

لیے کارآمد تھی اس لیے فکر کی بات نہیں تھی۔ سامو بے حد ذہین لڑکا تھا۔ اس نے ذرا سی دیر میں سرچ لائٹس کے سارے فنکشن استعمال کرنا سیکھ لیے۔ اس دوران انسپکٹر کمار آگیا۔ اسے اپنی کاغذی کارروائی مکمل کرنا تھی۔ اس نے میرا بیان لیا۔ ساتھ ہی اپنے اس سپاہی کی حماقت پر دبی زبان میں معذرت کی۔

''سر! اگر آپ اس واقعے کا ذکر نہ کریں تو مہربانی ہو گی۔ ورنہ مجھے اس کے خلاف رپورٹ کرنا پڑے گی اور اس کی نوکری چلی جائے گی۔''

میں نے انسپکٹر کو تسلی دی۔ ''میں نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی ہے اور تم بھی اس غریب سے کچھ مت کہنا۔ اس نے گھبرا کر فائرنگ کی تھی بلکہ اس نے ہاتھی کو زخمی کر کے اسے کچھ دنوں کے لیے محدود ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔''

''شکریہ سر!'' انسپکٹر خوش ہو گیا۔ ''اس نے کچھ دیہاتیوں سے سنا ہے کہ انہوں نے گھاس کی پٹی سے ہاتھی کی چنگھاڑنے کی آوازیں سنی ہیں۔ اس کی آواز سے کرب جھلک رہا تھا۔''

''وہ لوگ وہاں کیا کرنے گئے تھے؟'' میں پریشان ہو گیا۔

''وہ چرواہے ہیں اگر وہ جانور چرانے نہ لے جائیں تو ان کے جانور بھوکے مر جائیں۔'' انسپکٹر کمار بولا۔ ''سر! یہ غریب لوگ ہیں۔ ان کے لیے ذریعہ معاش زندگی سے بھی زیادہ اہم ہے۔''

''ممکن ہے، آج رات ہی اس ہاتھی کا کام تمام ہو جائے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے بعد علاقے کے لوگ آزادی سے جنگل اور گھاس میں جاسکیں گے۔ تم ایک بار ان لوگوں کو منع کر دو کہ وہ اس طرف نہ جائیں۔ زخمی ہاتھی مشتعل ہے اور زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔''

''میں ایک بار پھر دیہاتیوں کو ہدایت کر دیتا ہوں کہ کوئی جنگل کی طرف نہ جائے۔'' انسپکٹر کمار اٹھتے ہوئے بولا۔

اس کے جانے کے بعد میں سامو کو سمجھانے لگا کہ اسے کس طرح سرچ لائٹ استعمال کرنی ہے۔ میں نے نمبر طے کر دیے کیونکہ سرچ لائٹس تین موڈز پر کام کرتی تھیں۔ پہلے موڈ پر یہ عام سرچ لائٹ کی طرح روشن ہوتی تھی۔ دوسرے موڈ میں یہ سرچ لائٹ بن جاتی تھی۔ تیسرے موڈ میں یہ اسپاٹ لائٹ بن جاتی تھی۔ میں نے سامو سے کہا۔

کاروں کی بات نکلی ہے تو یہ بات بتانا ضروری ہے کہ اس وقت کی کاریں ان سے بالکل مختلف ہوتی تھیں، جیسی اب ہوتی ہیں۔ والد صاحب نے 1928ء میں ایک فورڈ کار خریدی۔ فورڈ کار کمپنی نے دنیا میں پہلی کاریں بنائیں۔ یہ کارخانہ امریکا کے شہر ڈیٹرائٹ میں ہے۔ مجھے حال ہی میں وہاں جانے اور رہنے کا موقع ملا۔ میرے چھوٹے بھائی جمیل احمد وہاں رہتے ہیں۔ ان کی بیوی غزالہ برنی ڈاکٹر ہیں اور وہاں پریکٹس کرتی ہیں۔ ان کا تعلق فورڈ اسپتال سے بھی ہے۔ وہاں یہ انکشاف ہوا کہ فورڈ اپنے کارخانے میں کام کرنے کے لیے بڑی تعداد میں عربوں کو لاتے تھے۔ وہ لوگ وہیں بس گئے ہیں اور بعض علاقوں میں ان کی اچھی خاصی آبادی ہے۔ ڈیربورن ان علاقوں میں سے ایک ہے۔ جمیل اور غزالہ مجھے اور میری بیوی فرزانہ کو اس علاقے میں لے گئے۔ سڑکوں کے نام عربی میں لکھے ہوئے ہیں، دکانوں کے بورڈ بھی اکثر عربی اور انگریزی دونوں میں ہیں۔ لبنانی مٹھائیوں کی ایک بڑی دکان ہے جس کا نام شتیلا ہے۔ اس کی مٹھائی سے دوسرے شہروں کے لوگ بھی واقف ہیں اور منگواتے رہتے ہیں۔ یہ مٹھائیاں بڑے خوب صورت ڈبوں میں پیک کر کے تحفتاً بھی دی جاتی ہیں۔

اقتباس: ڈوبتے جہاز کے عرشے سے
از: فضا اعظمی

''میں جو نمبر پکاروں تم اس موڈ میں سرچ لائٹ آن کر دینا اور رخ کا خاص خیال رکھنا میں جس طرف رائفل کروں روشنی اسی طرف کرنا۔''

پھر سامو، راجا اور میں نے ایک بار پھر ریہرسل کی تاکہ عین موقع پر کوئی گڑبڑ نہ ہو۔

پانچ بجے کے کچھ دیر بعد ہم روانہ ہو گئے۔ اسٹیڈن نے ہمیں جیپ میں باغات کے کنارے تک پہنچا دیا وہاں سے ہم درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں جھیل کی طرف روانہ ہو گئے۔ پچھلے دنوں مارے جانے والے اناڑی شکاریوں کا انجام ہمارے سامنے تھا اس لیے ایک اور بندوبست کیا۔ میں جو قمیص پچھلے دنوں سے پہن رہا تھا، وہ میں نے ساتھ لے لی اور جب جھیل کے پاس پہنچے تو قمیص گھاس کی پٹی کی طرف سے جھیل کی جانب آنے والے ایک راستے پر اُگی ہوئی جھاڑیوں پر پھیلا دی۔

جھیل کے اطراف میں زیادہ تر بانس کے جھنڈ تھے۔ ان میں چھپنا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا اس لیے ہم جھیل سے ذرا فاصلے پر اُگی خاردار جھاڑیوں میں چھپ گئے مگر ذرا ہی دیر میں اندازہ ہوگیا کہ ہم غلط جگہ پھنس گئے ہیں۔ جھاڑیوں کی جڑوں میں سرخ چیونٹیوں کے بل تھے۔ ہماری مداخلت پر وہ ہمارے کپڑوں میں گھس گئیں اور ہمیں کاٹنے لگیں۔ میں نے اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے، کسی اور پناہ گاہ کے بارے میں غور کیا۔ راجا بہادر نے مشورہ دیا۔

"صاحب، بانس میں چھپ جائیں۔"

میں نے مشورہ رد کردیا۔ "بانس میں گھس کر ہماری حرکت محدود ہوجائے گی اور ہم ہاتھی پر نظر بھی نہیں رکھ سکیں گے۔ وہ بے خبری میں ہمیں آلے گا۔"

آخر میں جھیل کے کنارے اُگی گھاس کا انتخاب کیا گیا۔ یہ ترائی کے علاقے سے مخالف سمت میں تھی یعنی دوسرے کنارے پر لیکن مکار ہاتھی کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ وہ پہلے بھی شکاریوں کو دھوکا دے کر آیا تھا اور اس نے انہیں ہلاک کردیا تھا مگر خطرہ مول لیے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں کسی بھی صورت بانس میں نہیں گھسنا چاہتا تھا۔

راجا بہادر نے درانتی سے گھاس کاٹ کر جگہ صاف کی۔ یہاں پر گھاس کی اونچائی چار فٹ کے لگ بھگ تھی یعنی اگر ہم بیٹھ جاتے تو ہاتھی کی نظروں سے اوجھل رہتے۔ اس کے باوجود اس کی قوتِ شامہ اسے ہمارے بارے میں خبر دے سکتی تھی۔ اس کے علاج کے لیے میں اپنے ساتھ ایک تیز بو والا تیل لایا تھا۔ اس سے ہمارے جسموں کی بو دب جاتی۔ میں نے یہ تیل اپنے جسم پر لگایا اور ان دونوں سے بھی کہا کہ وہ تیل لگائیں۔ اس کی ناگوار بُو سے اردگرد اڑنے والے کیڑے بھی ہم سے دور ہوگئے تھے۔ میں نے رائفلیں چیک کیں۔ دونوں بھری ہوئی تھیں اور دونوں میں چار چار گولیاں تھیں۔ اضافی گولیاں میرے اور راجا بہادر کے پاس تھیں۔ سامو کو صرف سرچ لائٹس سنبھالنی تھیں۔ گھاس میں چھپ کر ہم اب سوائے ہاتھی کے انتظار کے اور کچھ نہیں کرسکتے تھے۔

بو والا تیل لگانے کے باوجود میرے ذہن میں کچھ خدشات تھے۔ اوّل تو یہ کہ ہاتھی کی قوت شامہ بہت تیز ہوتی ہے۔ ممکن ہے وہ تیل کی بو میں ہماری بو شناخت کرلے۔ اس کے علاوہ اس چالاک جانور سے بعید نہیں تھی کہ وہ تیل کی نامانوس بو سے چوکنا ہوجائے۔ آج ہوا جھیل کی طرف سے گھاس کی پٹی کی طرف چل رہی تھی اور ہماری بو لازماً ہاتھی کی ناک تک جاتی۔ میں ایک دوربین بھی لایا تھا جس سے وقفے وقفے سے چاروں طرف کا جائزہ لے رہا تھا لیکن یہ مشاہدہ بھی سورج ڈوبنے تک جاری رہا۔ اس کے بعد تاریکی بہت تیزی سے پھیلی۔ آج آسمان پر چاند بھی نہیں تھا اس لیے چار سو تاریکی تھی۔ بانس کے درختوں کے مدھم ہیولے ہلکی ہوا کے ساتھ جھوم رہے تھے۔ پھر کیڑوں نے اپنے راگ رنگ کا پروگرام شروع کردیا۔ اندھیرا ہونے کے بعد ہم ہاتھی کی طرف سے دیکھ لیے جانے کے خطرے سے بے نیاز ہوگئے تھے۔ تاریکی میں ہاتھی تقریباً اندھا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ صرف سننے اور سونگھنے کی حس سے کام چلاتا ہے۔

ذرا دیر بعد تارے نکلے تو کسی قدر روشنی ہوئی۔ اب ہم چاروں طرف پچاس ساٹھ گز کے فاصلے تک نظر رکھ سکتے تھے۔ میں نے سامو اور راجا بہادر کو سختی سے ہدایت کردی تھی کہ بلاوجہ بات نہیں کرنی ہے اور نہ ہی کوئی آواز پیدا کرنی ہے۔ ہاتھی کا شکار کرنے والے شکاری اس وجہ سے ہاتھی کا شکار ہوگئے تھے کہ وہ اس کی طرف سے بالکل بے نیاز ہوکر آپس میں باتیں کررہے تھے۔ ہم خاموشی سے انتظار کرتے رہے۔ لمحے آہستہ آہستہ گزر رہے تھے گویا ہمارے صبر کا امتحان لے رہے ہوں۔ رات آٹھ بجے تک کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ ماحول سوائے کیڑوں کی آواز کے بالکل خاموش تھا۔ ہم نے رات کا کھانا کھانے کا فیصلہ کیا۔ اسٹیڈن کے باورچی نے ہمارے لیے لذیذ چکن سینڈوچ بنا کر ساتھ کیے تھے۔ تھرماس میں کافی تھی۔ ہم نے سینڈوچز کھا کر کافی پی اور تازہ دم ہوگئے۔ سامو کسی قدر پُرجوش تھا۔ ظاہر ہے وہ ایک نوجوان اور نہ تجربے کار لڑکا تھا۔ جب کہ راجا بہادر پرانے شکاری کی طرح پُرسکون تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کچھ ہوگا یا نہیں ہوگا اس لیے اضطراب سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

نو بجے سامو نے رفع حاجت کے لیے بانسوں کی طرف جانے کی اجازت مانگی چونکہ اس وقت ہاتھی کی آمد کے قطعی کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے اس لیے میں نے اجازت دے دی۔ سامو خاموشی سے نزدیکی بانسوں کے جھنڈ کی طرف چلا گیا۔ اسے گئے ہوئے دس پندرہ منٹ ہوئے تھے کہ اچانک شاخ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ آواز جھیل کے دوسری طرف سے آئی تھی۔ شاخ ٹوٹنے کی آواز سے لگ رہا تھا وہ کسی وزنی شے کے زیر اثر ٹوٹی تھی۔ میں اور راجا

چوکنا ہو گئے مگر پوری کوشش کے باوجود ہمیں کچھ نظر نہ آیا۔ اب سوال ہم دونوں کے ذہن میں تھا کہ کیا ہاتھی آ گیا تھا۔

میں سامو کے لیے مضطرب تھا۔ اگر ہاتھی آ گیا تو اسے ہمارے پاس ہونا چاہیے تھا۔ اس کی مدد کے بغیر ہم ہاتھی سے نہیں نمٹ سکتے تھے۔ لمحے جیسے رک رک کر گزر رہے تھے۔ ایک بار میرے دل میں آیا کہ خود سرچ لائٹ روشن کر کے دیکھوں مگر یہ سراسر ہاتھی کو حملے کی دعوت دینے والی بات ہوتی اور فی الوقت میں اسے چھیڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے راجا سے کہا کہ وہ عقب میں نظر رکھے اور خود سامنے جھیل کے پار دیکھنے لگا۔ میری یہ احتیاط کام آئی۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا جا رہا تھا۔ سامو کو گئے نصف گھنٹا ہونے کو آ رہا تھا اور اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ مجھے اس کی فکر بھی تھی۔ یہ بات تو طے تھی کہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا ورنہ اس کی آواز ضرور آتی۔ وہ جن بانسوں میں گیا تھا وہ ہم سے کوئی بیس یا بائیس قدم کے فاصلے پر تھا۔ میں اسے آواز بھی نہیں دے سکتا تھا ورنہ ہاتھی پاس ہوتا تو سامو سے پہلے وہ سن کر اِدھر آ جاتا۔ ابھی میں سامو کی فکر کر رہا تھا کہ عقب سے راجا بہادر نے ٹہوکا دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھا اور پھر اشارے سے ایک طرف دیکھنے کو کہا۔ اس طرف بانسوں کا جھنڈ تھا۔ وہی جھنڈ جس میں سامو گیا تھا۔ بغور دیکھنے پر مجھے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے راجا بہادر کی طرف دیکھا۔ اس نے دوبارہ جھنڈ کی طرف دیکھا اور اشارہ کیا۔ میں نے پھر غور سے دیکھا اور اس بار میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جھنڈ کے ساتھ ایک سیاہ دیوار تھی اور پھر ہاتھی نے کان ہلایا تب مجھے اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ نہ جانے کب اور کیسے وہ خاموشی سے وہاں تک آ گیا تھا اور ہمیں کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔ گویا شاخ ٹوٹنے کی آواز ہاتھی کی وجہ سے ہی آئی تھی مگر وہ جھیل سے گھوم کر اس طرف کیسے اور کب آیا۔ مجھے یا راجا کو بالکل خبر نہیں ہوئی تھی۔ اب سمجھ میں آیا کہ سامو کیوں بانسوں میں دبکا ہوا تھا۔ اس نے بھی ہاتھی کو دیکھ لیا تھا۔ میرا جسم پسینا اگلنے لگا تھا۔ ہاتھی اسی طرف کیوں آیا تھا۔ کیا اسے شک ہو گیا تھا کہ ہم یہاں پر ہیں۔ میں نے سوچا مگر ہاتھی کا ساکت رہنا اس بات کی دلیل تھی کہ ابھی اسے انسانوں کی موجودگی کا یقین نہیں آیا تھا ورنہ وہ حملہ کر چکا ہوتا۔ میں نے اشارے سے راجا بہادر کو پیچھے ہونے کو کہا۔ ہاتھی کا رخ ہماری طرف ہی تھا اور مجھے شک تھا کہ وہ ہماری طرف سے کسی حرکت کا انتظار کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس نے حملہ کر دیا تو ہم کیا کریں گے۔ سامو تھا نہیں جو روشنی کرتا۔ فی الوقت دونوں رائفلیں بھری ہوئی تھیں۔ اس لیے میں نے راجا بہادر کو سرچ لائٹ اٹھانے کو کہا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے راجا بہادر کو بھی سرچ لائٹس کے استعمال کی تربیت دے دی تھی۔

ہاتھیوں سے نمٹنے کے دوران میں نے کبھی ایسی ہچکچاہٹ اور خوف محسوس نہیں کیا تھا جیسا کہ اس قاتل ہاتھی کے سامنے محسوس ہو رہا تھا۔ بس میری نگاہیں اس کے ساکت کان پر مرکوز تھیں۔ عام طور سے ہاتھی چپ کھڑے ہو کر اپنے کان اس وقت ساکت رکھتا ہے جب وہ دشمن کی سن گن لینے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے اپنی رائفل ہاتھ میں لے لی تھی اور میں دس سیکنڈ میں فائر کرنے کے لیے تیار تھا۔ ہاتھی کوئی دس منٹ اس پوزیشن میں ساکت کھڑا رہا۔ حتیٰ کہ مجھے شبہ ہونے لگا کہ وہاں کوئی ہاتھی بھی تھا یا یہ ہیولا ہماری نظر کا دھوکا تھا۔ اچانک بانسوں کے جنگل کی طرف سے چھینکنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی ہاتھی کی چنگھاڑ سے ماحول میں زلزلہ سا آ گیا۔ اس نے وحشیانہ انداز میں بانس کے درخت گرانا شروع کر دیے۔ سامو کی چھینک نے ہاتھی کے شبہے کی تصدیق کر دی تھی۔ میں نے چلا کر راجا بہادر سے سرچ لائٹ جلانے کو کہا اور رائفل سے ہاتھی کا نشانہ لینے لگا۔ بدحواسی میں راجا بہادر نے سرچ لائٹ کو اسپاٹ کے بجائے عام موڈ پر جلا دیا۔ بہرحال اس کی روشنی میں ہاتھی صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ بھورے رنگ کا عظیم الجثہ ہاتھی تھا جو اب تک آٹھ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔

ہاتھی بانس گرا کر سامو کو کچلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کے شانے کا نشانہ لیا۔ گولی اس کی شہ رگ میں لگتی تو وہیں اس کا کام تمام ہو جاتا مگر طاقت ور گولی ذرا نیچے اس کی گردن میں لگی۔ ہاتھی نے دل دہلا دینے والی چنگھاڑ ماری اور بانس کا پیچھا چھوڑ کر زمین دہلاتا، ہماری طرف لپکا۔ میں نے پے در پے تین فائر کیے اور رائفل رکھ کر دوسری اٹھالی۔ میں نے چیخ کر راجا سے رائفل لوڈ کرنے کو کہا۔ گولیاں کھا کر ہاتھی کی رفتار میں کمی آ گئی تھی لیکن وہ بدستور ہماری طرف آ رہا تھا۔ راجا نے سرچ لائٹ زمین پر رکھ دی اور خود رائفل لوڈ کرنے لگا۔ میں نے ہاتھی کی رفتار توڑنے کے لیے اس

کے اگلے پیروں کا نشانہ لیا مگر نہ جانے گولی لگی نہیں یا اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ جھومتا ہوا وہ ہم سے بہ مشکل دس گز کے فاصلے پر تھا۔ اس نے حملے کے لیے سونڈ اٹھالی تھی۔ میں نے چلاّ کر راجا بہادر سے بھاگنے کو کہا اور ہم پاس واقع بانسوں کی طرف بھاگے۔ اس دوران راجا بہادر رائفل لوڈ کر چکا تھا۔ میں نے جھپٹ کر رائفل لی اور مڑ کر ہاتھی کو دیکھا جو ابھی وہاں پڑی ہوئی چیزوں کو پیروں تلے روند رہا تھا پھر اسے احساس ہوا کہ ہم تو بھاگ رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر ہمارے پیچھے لپکا۔ ہم بانسوں کے عقب میں گئے تو وہ بھی گھوم کر آیا۔ راجا بہادر آگے آگے بھاگتے ہوئے مجھ سے لی ہوئی رائفل لوڈ کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ اسی لمحے مجھے ٹھوکر لگی اور میں زمین پر گر گیا۔ اٹھنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ ہاتھی لمحے بھر میں میرے سر پر آچکا تھا۔ جب اس نے سونڈ بلند کی تو میں جان گیا کہ میرا آخری وقت آگیا ہے۔ ہاتھی رائفل بلند کرنے سے پہلے مجھ پر سونڈ کا وار کرچکا تھا۔ اب کوئی معجزہ ہی مجھے بچا سکتا تھا اور پھر معجزہ ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ ہاتھی مجھ پر وار کرتا، اچانک اس پر تیز روشنی پڑی۔ یہ اسپاٹ لائٹ تھی جو براہ راست ہاتھی کی آنکھوں پر پڑ رہی تھی۔ روشنی نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے تیزی سے رائفل بلند کی اور اس کے کھلے منہ میں گولی داغ دی۔ گولی اس کے تالو سے گزر کر دماغ پھاڑتی ہوئی سر پر سے نکل گئی۔ میں نے دوسری اور پھر تیسری گولی بھی اسی طرح چلادی۔ ہاتھی پیچھے کی طرف لڑکھڑایا اور پھر ایک پُرشور دھماکے سے زمین پر پہلو کے بل گرا۔ میں اچھل کر پیچھے لڑھک گیا کہ کہیں اس دم توڑتے وحشی جانور کی زد میں نہ آجاؤں۔ اس کا جسم بری طرح لرز رہا تھا۔ میں نے اپنے محسن کی طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ راجا بہادر ہوگا لیکن سرچ لائٹ سامو کے ہاتھ میں تھی۔ بلاشبہ اس نے انتہا درجے کی دلیری کا ثبوت دیا تھا اور بھاگ کر میری مدد کو آیا تھا ورنہ ہاتھی مجھے ہلاک کرچکا ہوتا۔ میں نے بے اختیار اسے گلے لگالیا۔

ایک منٹ کے اندر ہاتھی کا لرزتا جسم سرد ہوگیا تھا۔ بے انتہا تھکن کے باوجود سکون کا ایسا احساس تھا جو میں آج بھی یاد کرتا ہوں تو روح تک سرشار ہوجاتی ہے۔ ہم نے ٹھنڈی ہوجانے والی کافی پی کر ہاتھی کی ہلاکت کا جشن منایا پھر ہم نے واپس فارم ہاؤس کا رخ کیا۔ رات سرد ہوچلی تھی۔ پہلے فارم ہاؤس کے چوکیدار نے ہمیں گرم چائے اور بسکٹ پیش کیے۔ جب میں نے اسے ہاتھی کی ہلاکت کے بارے میں بتایا تو وہ دیوانہ وار یہ خبر دوسروں کو سنانے کے لیے روانہ ہوگیا۔

☆......☆

اگلے روز ساری خلقت ہاتھی کی لاش کا دیدار کرنے امڈ آئی تھی۔ مقامی لوگوں نے اس کے دانت نکال کر مجھے تحفے میں دیئے۔ یہ کوئی گز بھر لمبے اور بے حد شفاف، بے داغ سفید دانت تھے۔ یہ دانت آج بھی نشانی کے طور پر میرے گھر کے لیونگ روم میں آتش دان کے اوپر سجے ہوئے ہیں۔ میں نے ہاتھی کی ہلاکت اپنے دوست الفریڈ کے انتقام میں کی تھی لیکن جب میں وہاں سے واپس آنے لگا تو ٹی اسٹیٹ کے مالکان نے مجھے پانچ ہزار روپے کی خطیر رقم بطور انعام پیش کی۔ میں نے انہیں ہاتھی کی آفت سے نجات دلا دی تھی مگر میں نے وہ رقم خود لینے کے بجائے سامو اور راجا بہادر میں مساوی تقسیم کردی تھی کیونکہ اس مہم میں ان کا بھی برابر کا حصہ تھا۔

ایک اور اہم بات جس کا تذکرہ ضروری ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ ہاتھی محض دشمن کی جیت کے زیر اثر انسان دشمنی پر اتر آیا ہے۔ اگلے روز جب ہاتھی کے دانت نکالے جارہے تھے تو میں نے اس کی لاش کا بغور معائنہ کیا تھا۔ خاص طور سے اس کے پیروں کا لیکن مجھے کہیں کوئی زخم نظر نہیں آیا اور جب میں معائنہ ترک کررہا تھا تو مجھے اس کی گردن میں ایک سیاہ رنگ کا چھوٹا سا سوراخ نظر آیا تھا جو اپنے سیاہ رنگ کی وجہ سے پہلے مجھے نظر نہیں آیا تھا۔

میں نے اس سوراخ کا بغور مشاہدہ کیا۔ مجھے شک ہوا کہ یہ سوراخ قدرتی نہیں تھا۔ میں نے تیز دھار چاقو سے اس سوراخ کو چیرا۔ شروع میں تو کچھ نظر نہیں آیا مگر ذرا گہرائی میں جانے پر مجھے لکڑی کا ایک نوکیلا اور بے حد نرم ہو جانے والا ٹکڑا ملا۔ یہ کسی تیر کی نوک تھی۔ کسی مقامی قبائلی نے بلاوجہ اپنے تیر کو اس دیوہیکل ہاتھی پر آزمایا تھا۔ تیر تو اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا لیکن اس کے بعد ہاتھی انسانوں کا دشمن ہوگیا تھا۔ مقامی قبائلی بے حد امن پسند تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ ہاتھی آسام کے کسی ایسے علاقے سے آیا تھا جہاں جنگجو قبائل آباد تھے۔ یعنی دوسروں کا کیا دھرا اس علاقے کے بے گناہ لوگوں نے بھگتا تھا جس میں میرا عزیز دوست بھی شامل تھا۔

ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سفر کہانی کا اکتیسواں حصہ

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

یہ اعزاز صرف سرگزشت کو حاصل ہے کہ اس نے سفر ناموں کے انداز کو بالکل بدل دیا۔ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ سفر نامہ نگاری میں ایک نئے عہد کا اضافہ کیا اور ان خرافات کو یکسر نظر انداز کردیا جو خشک تھے۔ سفر نامہ پر کہانی کا گمان ہو اس جانب مکمل توجہ رکھی۔ سفر نامے میں تاریخ و جغرافیہ اور دیگر معلومات بھی ہوں۔ اس کا بھی خیال رکھا۔ ندیم اقبال کے سفر نامے میں بھی ایسا سب کچھ نظر آتا ہے۔

ذوقِ مطالعہ کی خاطر بالکل الگ انداز کا سفر نامہ

نسرین نے جب یہ کہا کہ مجھ سے شادی کرلو تو میں حیران رہ گیا۔ ہم جس راستے پر بڑھ رہے تھے اس کی منزل یہی تھی۔ ہمیں ایک ہو جانا تھا مگر اس نے یک دم یہ کہا کہ مجھ سے شادی کرلو تو میں حیران رہ گیا مگر فوراً ہی بولا کہ صحیح ہے جب بھی تم کہو میں تم سے شادی کرلوں گا مگر فوراً ہی اس نے کہا۔ ''مگر ایک شرط ہے۔''

شرط کا سن کر میں حیران پریشان رہ گیا۔ ابھی میں کچھ بولتا کہ اس نے کہا۔ ''میری شرط یہ ہے کہ تم اپنے بیوی بچوں کو سیدھے یہاں بلواؤ، ان کے آنے کے ایک دو ماہ بعد ہم شادی کرلیں گے۔''

اس بات نے مجھے مزید حیران کر دیا۔ میں نے پوچھا کہ یہ شرط کیوں رکھی تو وہ مسکرا کر بولی۔ ”تم کو لوٹ جانے کا چانس دے رہی ہوں۔ ان کے آنے کے بعد بھی اگر تم شادی کے وعدے پر ڈٹے رہے تو مجھے یہ تسکین ملے گی کہ میری جگہ تمہارے دل میں بہت زیادہ ہے اور اگر اپنے وعدے سے پھر گئے تو میں یہ سوچ کر خوش ہو جاؤں گی کہ تم اس میں ہی خوش ہو اور تمہاری خوشی سے زیادہ مجھے کوئی خوشی عزیز نہیں۔“

اس کی اس عجیب منطق نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ چاہتی کیا ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ”تمہیں معلوم بھی ہے کہ میں اپنی بات سے نہیں پھروں گا۔ پھر بھی عجیب شرطیں رکھ رہی ہو۔ لگتا ہے کہ تم مجھے آزمانا چاہتی ہو۔“

”تم اپنی جانب سے مجھے آزمائش کے پھندے میں ڈال رہی ہو مگر یہ بھول رہی ہو کہ اس پھندے سے گزر کر ہی تو تم کو شادی کی آفر دی ہے۔ پھر بھی تم اگر یہی چاہتی ہو تو بچوں کو سیدھا ٹورنٹو بلا لیتا ہوں۔ وہ آجائیں تب ہی میں تم کو مانوں گا۔“ وہ میرے لہجے کی استقامت کو پرکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کا جائزہ لے کر میں نے اس سے کہا۔ ”چلیں بیچ پر بیٹھتے ہیں۔“

اس وقت چند بچے نہاتے نظر آرہے تھے۔ ہم اسی جانب چل دیے۔

بیچ پر پہنچ کر ہم ریت پر ٹانگیں پھیلا کر... بیٹھ گئے۔ شام کے سائے لمبے ہوئے تو جھیل کا پانی مچلنے لگا۔ لہریں ایسے اٹھتیں جیسے نیند سے انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی ہوں۔ ڈاؤن ٹاؤن کے اسکائی اسکریپر کا عکس پانی پر منعکس ہو رہا تھا جو کبھی دور جاتے محسوس ہوتے اور کبھی ہماری جانب کھسکنے لگتے۔ وہ تو وہیں تھے مگر اب لہریں چل پڑی تھیں۔ پانیوں میں تندی در آئی تو ساحل سے سر پٹخنے لگیں۔ وہ ہم پر حملہ آور ہونے آتیں مگر پاؤں سے ذرا پرے دم توڑ کر لوٹ جاتیں۔ ہوائیں پانیوں کا لمس لیے ہم سے ٹکراتیں، اور ہم اپنے آپ کو جیکٹوں میں جکڑنے لگتے۔

کیا خوب صورت اور منفرد لمحے تھے۔ کیا مسرت انگیز ساعتیں تھیں۔ منفرد چیزیں ہمیشہ سے مجھے اچھی لگتی ہیں۔ منفرد راستہ ہو یا ساتھ۔ منفرد لوگ ہوں یا بولیاں۔ منفرد صبحیں ہوں یا شامیں۔ منفرد ادائیں ہوں یا انداز۔ منفرد رنگ ہوں یا بو، منفرد شکلیں ہوں یا لہجے۔ منفرد تنہائیاں ہوں یا محفلیں، منفرد زندگی ہو یا پھر موت، منفرد چیزیں ہمیشہ سے مجھے اچھی لگتی ہیں۔

نسرین پر کوئی انوکھی کیفیت طاری تھی۔ سوچوں میں بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ ڈھلتے سورج کی سنہری کرنیں اس کے چہرے کے نقوش نمایاں کر رہی تھیں۔ میں جھیل کی موجوں پر کرنوں کا رقص دیکھ رہا تھا۔ سنہرا رقص جس میں ایک خاص ردھم تھا۔ ہواؤں اور موجوں نے مل کر نئے سر تال شروع کر دیے تھے۔ لہریں تھرتھرانے لگیں، پانیوں کے اوپر پرواز کرتے سیکڑوں پرندے مست ہو گئے۔ گویا کسی نشے میں ڈوب کر بے خودی میں آسمان سے گرتے چلے آتے اور پانیوں کے پاس پہنچ کر ہوش میں آتے تو دوبارہ اونچی پرواز بھر لیتے۔ سارا نظام قدرت متحرک تھا کیونکہ شام ہو رہی تھی۔ جب نسرین سے پوچھا کہ کیا سوچ رہی ہو تو جیسے وہ گہری نیند سے اچانک بیدار ہو گئی اور چونک کر میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ میں نے سوال دہرایا تو نیلے شفاف آسمان کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کاش یہ وقت یہیں تھم جائے۔ یہ اڑتے پرندے ساکت ہو جائیں۔ یہ چلتی کشتیاں پتھر ہو جائیں۔ یہ مناظر ٹھہر جائیں، نہ کوئی آواز ہو اور نہ کوئی آہٹ، نہ کوئی آرزو ہو نہ کوئی دعا۔ نہ کوئی خوشی ہو نہ کوئی غم، نہ کوئی خواہش ہو اور نہ کوئی حسرت۔ میں اکیلی بھی ہوں تب بھی مطمئن۔ تم ساتھ ہو تو مزید مطمئن اور خوش۔ کتنا خوب صورت خواب ہے کاش ایسا ہو جائے۔“

میں اس کی باتیں سن کر مسکرانے لگا۔

وہ مجھے مسکراتے دیکھ کر بولی۔ ”میں وہی کہنے لگی ہوں جو تم کہتے چلے آرہے ہو۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا مطلب؟“

وہ بولی۔ "Now I speak your words."

اس نے اپنے جوتے اور جرابیں اتار دی تھیں۔ اسکارف کھولا تو بال اس کے پَر بن کر اڑنے لگے۔ نرم ریت میں آدھے پاؤں اس نے دھنسائے ہوئے تھے۔ خنکی سے کپکپانے لگی تو اپنی جیکٹ اتار کر اس کو ڈھانپ لیا۔ کپکپی نہ تھمی تو بازوؤں کے حصار نے اسے میرے کندھے سے لگا دیا۔ میرے بازوؤں میں آتے ہی جیسے سو گئی۔ کپکپی تھم گئی۔ پگھل کر وہ موم ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے کان میں آہستگی سے کہا۔ ”شادی تو کرو گی ناں؟“

بڑے اعتماد سے بولی۔ ”ہاں کروں گی مگر پہلے اپنی فیملی کو سیدھا اپنے پاس بلاؤ۔ اب بھی تمہاری ہوں اور تب

بھی تمہاری بن کر رہوں گی۔‘‘

’’تم سے شادی اسی طرح کروں گا جس طرح ایران میں ہوتی ہے۔ بتاؤ وہاں شادی کی کیا رسمیں ہوتی ہیں۔‘‘

وہ آہستگی سے بولی۔ ’’میری شادی پر تو کوئی رسم نہیں ہوئی تھی۔ چند لوگ وہ لے کر آیا تھا اور بھائیوں نے میرا نکاح پڑھوا دیا۔‘‘

’’اس کا کوئی نام بھی تو ہوگا، تم نے اپنے شوہر کا نام آج تک نہیں بتایا۔‘‘ میں نے پوچھا۔

اچانک اسے چپ لگ گئی۔ کچھ دیر خاموش رہی۔ آنسو اس کے گالوں پر بہنے لگے۔ میں نے شاید غلط سوال پوچھ لیا تھا۔ سابقہ شوہر کے ساتھ اس کی تلخ یادیں وابستہ تھیں۔ بیس اکیس سال کی عمر میں بھائیوں نے اپنے ایک ملازم کے ساتھ اس کی شادی کردی تھی۔ شوہر کو دولت چاہیے تھی۔ اس نے بیوی کے ساتھ مار پیٹ شروع کردی تھی کہ بھائیوں سے جائیداد کا حصہ مانگو۔ ادھر بھائیوں نے اسے تنہا چھوڑ دیا۔ بڑی مشکل سے طلاق لی اور کسی طرح کینیڈا اپنے بیٹے کے ساتھ آ پہنچی۔ بڑا بھائی ایکسیڈنٹ میں ریڑھ کی ہڈی تڑوا کر بستر سے جا لگا۔ وہ اب بہن کو بلا رہا تھا کہ جائیداد سے اپنا حصہ لے کر اسے معاف کردے مگر یہ واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔ اپنے بیٹے کا مستقبل یہیں سنوارنا چاہتی تھی۔ بیٹا نو سال کا تھا۔ ماضی نے اس کی روح پر گہرے زخم لگائے تھے۔ اسی لیے وہ مایوس اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ کھوئی کھوئی اور افسردہ رہتی تھی۔ میرے ہمدردی کے چند بول اس کی روح پر لگے زخموں پر مرہم کا کام کر گئے۔ وہ میرے قریب ہونے لگی۔ میں اس سے جتنا دور جاتا وہ ہر موڑ پر سامنے نظر آتی۔ میں بے رخی برتتا تو وہ غمگین ہو جاتی۔ میں کینیڈا میں شدید تنہائی اور ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔ اپنا وطن اور اپنے بچے پاکستان میں چھوڑ آیا تھا پھر ہم ایک دوسرے کو تسلیاں دے کر جینے لگے اور جیتے جیتے قریب ہوتے گئے۔ اس کے قریب ہونے میں میرا کسی ارادے کا عمل دخل نہ تھا۔ بس ایک دن اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ میرے دل میں گھر کر بیٹھی ہے۔ اپنے پیار سے اس نے مجھے بے بس کر دیا ہے۔

میری کسی بات پر اداس ہو کر وہ رونے لگتی تو میں محبت کی چند باتیں کر لیتا اور وہ کھل اٹھتی۔ شکل، کردار اور کئی دوسری صلاحیتوں سے مالا مال تھی۔ ان سب خوبیوں کی بناء پر اس نے مجھے اپنا بنالیا۔

میں نے شوہر کا نام پوچھا تو اب بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ اس کو بچوں کی طرح چپ کرایا۔ کئی دلاسے دیئے تو بولی۔ ’’اس کا ذکر میرے سامنے مت کیا کرو۔ مجھے اذیت ملتی ہے۔ مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔‘‘

میں نے اپنی انگلیوں سے اس کے آنسو صاف کیے تو مسکرانے لگی۔ اپنا غم چھپانے لگی۔ ساحل کی ریت پر انگلیوں سے لکیریں کھینچتے ہوئے بولی۔

’’میں سترہ سال کی تھی تو میری ایک کزن کی شادی ہوئی تھی، ماں باپ زندہ تھے۔ وہ وقت بہت حسین تھا۔ ہر چیز خوب صورت ہوا کرتی تھی جیسے آج کل ہے۔ اس شادی میں بہت مزہ آیا تھا۔‘‘

میں اب چپ بیٹھا اسے سن رہا تھا۔ اس کے پاس کے سب رنگ اس کے رنگ تھے۔ نمی اس کی آنکھوں میں ٹھہری تھی اور مسکراہٹ لبوں پر تھی۔ چہرہ دل کی حالت عیاں کر رہا تھا۔ کچھ چھپا رہی تھی اور کچھ بتا رہی تھی۔ جو بتا رہی تھی وہ میں سمجھنا نہیں چاہتا تھا اور جو چھپا رہی تھی وہ سمجھ رہا تھا۔

مجھے محبت سے تکتے دیکھا اور بولی۔ ’’مجھے اس طرح سے نہ دیکھو ورنہ پھر سے رو پڑوں گی۔‘‘

میں بولا۔ ’’مجھے ایرانی شادی کا بتاؤ تو ساری رسمیں میں پوری کروں گا وعدوں سمیت۔‘‘

’’ایران میں شادی کی رسمیں پاکستانی شادی سے ملتی جلتی ہیں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔‘‘

وہ پاکستان کی شادی سے تقابل اس لیے کر رہی تھی کہ میں اپنی شادی کے بارے میں سب کچھ اسے بتا چکا تھا۔ وہ میری شادی کی تصاویر کے علاوہ ویڈیو بھی دیکھ چکی تھی۔ اسے مہندی کی رسم بہت اچھی لگی تھی۔ وہ بتا رہی تھی۔ ’’ایران کے شہروں میں اب داماد اپنی عروس کو خود پسند کرتا ہے مگر چھوٹے قصبوں میں ابھی تک داماد کے گھر والے عروس پسند کرتے ہیں۔‘‘

مجھے عروس کی تو سمجھ آگئی تھی کہ دلہن کو کہتے ہیں مگر داماد کا لفظ مجھے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ داماد وہاں دولہا کو کہتے ہیں۔

’’رشتہ طے ہو جاتا ہے اور پھر شادی سے چند دن پہلے داماد اپنی عروس کو شاپنگ کے لیے لے جاتا ہے۔ عروس کے ہمراہ اس کی کوئی رشتہ دار ہوتی ہے۔ عروس کے لیے سونے کی انگوٹھی داماد پسند کرتا ہے۔ وہ اپنے لیے شادی کا لباس پسند کرتی ہے جو عموماً سفید گاؤن ہوتا ہے۔‘‘

"آخر سفید اور سادہ سا گاؤن ہی کیوں ہوتا ہے؟ کشیدہ کاری کیوں نہیں ہوتی؟ سونے سے لدی پھندی کیوں نہیں ہوتیں؟" میں نے پوچھا۔

"پاکستان میں سونے کے زیورات، لہنگے اور آرائشی لباس پہنے جاتے ہیں۔ ایران میں بس ایک انگوٹھی اور سفید گاؤن پہنا جاتا ہے۔ والدین تحائف میں سونے کے سکے اور دوسری اشیاء دیتے ہیں مگر اس کی تشہیر نہیں ہوتی۔"

وہ میری جانب کچھ دیر دیکھتی رہی کہ شاید کوئی اور سوال پوچھوں گا مگر مجھے خاموش دیکھ کر بات بڑھاتے ہوئے بولی۔ "میری کزن کی شادی تھی۔ میں سترہ سال کی تھی اور بمشکل بھائیوں نے مجھے وہاں دو رات گزارنے کی اجازت دی تھی۔ تنبک لڑکیاں بجا رہی تھیں۔ سب مل کر ڈانس کر رہے تھے۔ مجھے میری کزن نے ڈانس سکھانے کی کوشش کی تھی مگر مجھ سے نہ ہو سکا۔ میں اچھا گالیتی تھی۔ رات گئے دیر تک ہم گاتے اور ناچتے رہے۔"

میں نے تنبک کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ ڈھولکی جیسے ساز کو وہاں تنبک کہتے ہیں۔

میں نے اس کی تصاویر دیکھی تھیں جب وہ اٹھارہ سال کی تھی۔ شرمائی اور ڈری ڈری جیسے کوئی ہرنی ہو۔ بارہ سال سے پہلے کی تصویروں میں وہ کسی نہ کسی لڑکی کے کندھے کے پیچھے چھپی بیٹھی ہوتی تھی۔ اس کی کزن اس کو جب خوب صورت کہتی یا کوئی اور اس کی شکل کی تعریف کرتا تو وہ رونے بیٹھ جاتی۔ حالانکہ لڑکیاں اپنی تعریف سن کر خوش ہوتی ہیں مگر یہ ڈر جاتی تھی۔

میں نے اس کی گردن کے پیچھے نرم ہاتھ رکھا اور چہرہ اپنی جانب کرتے ہوئے بولا۔ "کبھی کسی سے پیار بھی ہوا؟ کوئی اچھا لگا ہو؟"

"کب؟" اس نے میرے سوال کی وضاحت مانگی۔

"جب اٹھارہ بیس سال کی تھیں۔ ایران میں......!"

ریت پر انگلی سے لکیریں کھینچتے ہوئے بولی۔ "مجھے تو اپنے سائے سے بھی ڈر لگتا تھا۔ کسی لڑکے کے ساتھ مجھے بولنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ دودھ اگر کبھی ابل کر بہہ جاتا تو آنکھوں میں آنسو آجاتے کہ آج بڑے بھائی سے ڈانٹ پڑے گی۔ مرغیوں نے انڈے دیئے تھے، وہ ایک بار اٹھا کر لا رہی تھی کہ ٹوکری گر گئی۔ کچھ انڈے ٹوٹ گئے۔ سارا دن الماری کے پیچھے چھپ کر روتی رہی۔ ایک بار میری کلاس فیلو کے بھائی نے خط لکھ کر بہن کے ذریعے مجھے دیا۔ کئی دن تک میں سہمی سہمی پھرتی رہی جیسے مجھ سے کوئی جرم ہو گیا ہو۔"

پھر میری جانب نمی سے بھری سیاہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "کئی بار بتایا نا کہ میرا پیار، پہلا اور آخری صرف تم ہو۔ تم کو میرا یقین کیوں نہیں آتا؟"

میں اس کے ہاتھ تھامے ہوئے تھا اور انگلیوں کے عمدگی سے تراشے ناخن دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ "اس نیلی جھیل کا کتنا زیادہ پانی دیکھ رہا ہوں مگر تمہاری آنکھوں میں دو بوند پانی نہیں دیکھ سکتا۔ مجھ سے یقین دہانیاں مت مانگا کرو، ہم ان مراحل کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں جب قسمیں وعدے کھاتے تھے۔ اب مجھے کس چیز کا خدشہ اور تمہیں کن چیزوں کا خوف؟"

خوشی سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کے ہونٹ مسکرائے تو اس کی آنکھوں میں آنسو ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "اب یہ بتاؤ کہ ایران میں نکاح کی کیا رسمیں ہوتی ہیں؟"

"عقد قانون کے دن عروس اپنی سہیلیوں کے ہمراہ ایک کمرے میں موجود ہوتی ہے۔ اس نے سفید گاؤن زیب تن کیا ہوتا ہے۔" وہ بتانے لگی۔

"یہ عقد قانون کیا ہوتا ہے؟" میں نے پھر اسے بیچ میں ٹوکا۔

وہ بری طرح سے زچ ہو کر بولی۔ "کتنے سوالات کرتے ہو، بات کرنا مشکل ہو جاتی ہے۔"

بات جاری رکھتے ہوئے مجھ سے بولی۔ "واقعی عقد قانون کا معلوم نہیں تمہیں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا تو جو اس نے بتایا تو معلوم ہوا کہ نکاح کو کہتے ہیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ایسا کہو کہ نکاح کو کہتے ہیں۔"

بھنویں سکیڑ کر بولی۔ "یہ نکاح کیا ہوتا ہے؟"

میں بولا۔ "عقد قانون......!"

اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں چلتی ہوں تم اب تنگ کرنے لگے ہو۔"

ہاتھ سے پکڑ کر زبردستی میں نے اسے دوبارہ بٹھا دیا۔ بولا "تم بتاؤ، اب کوئی سوال نہیں پوچھوں گا۔"

وہ تنبیہہ کرتی نظروں سے مجھے دیکھ کر بولی۔ "عروس کی والدہ اور دوسری بزرگ عورتیں بھی اس کمرے میں موجود ہوتی ہیں۔ شیرنی اور نقل بھی ان کے پاس ہوتی ہے۔"

"ہمارے ہاں تو ڈھولک بجانے اور گانا گانے والیوں کو میراثی (میراثن) کہا جاتا ہے۔ آپ لوگ شیرنی اور نقل کہتے ہیں؟" میں نے پوری سنجیدگی سے پوچھا۔

وہ بری طرح سے بگڑ گئی۔ اسے خفا ہو کر جانے سے روکنے کے لیے میں نے اس کا بازو پہلے ہی سے پکڑ لیا تھا۔ بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "اب تمہیں ایک لفظ بھی نہیں بتاؤں گی۔ تم نے تو مجھے چکرا کر رکھ دیا ہے۔"

میں منت کرتے ہوئے بولا۔ "جھوٹ نہیں بول رہا۔ مجھے معلوم نہیں کہ شیرنی اور نقل کیا ہوتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے تم مجھے ستا رہے ہو۔ آپ کے ہر دیسی اسٹور میں دونوں موجود ہوتی ہیں۔"

میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کون؟ میراثن؟"

اب کی بار وہ ہنس پڑی۔ اپنے اسکارف سے میری شرٹ پر سے ریت جھاڑتے ہوئے بولی۔ "تمہاری بیوی پر مجھے ترس آ رہا ہے۔ کتنا غیر سنجیدہ شوہر اسے ملا ہے۔"

شیرنی مٹھائی کو کہتے ہیں اور نقل بھی ایک قسم کی مٹھائی ہی ہوتی ہے جس میں چاکلیٹ کے اندر بادام بھرے ہوتے ہیں۔

میں نے اس سے کہا۔ "اس غیر سنجیدہ انسان سے تم بھی تو شادی کرنا چاہتی ہو؟"

"نہیں تو حتمی فیصلہ تو میں نے ابھی نہیں کیا۔ شادی کے لیے تمہارے اندر مثبت پہلو بھی بہت ہیں۔" اس نے اٹھلا کر کہا۔ پھر اپنے سر کے اوپر سے پرواز کرتے پرندوں کو دیکھ کر بولی۔ "اب مثبت پہلو مجھ سے مت پوچھنا۔ تم کو اپنی تعریف سننے کا شوق بھی بہت ہے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب آگے بتاؤ۔ ایک کمرے میں عروس ہے اور دوسرے میں ظاہر ہے داماد ہوگا، اپنے رشتے داروں کے ہمراہ پھر عقد قانون کیسے ہوتا ہے؟"

وہ بولی۔ "داماد کے ہمراہ ملا بھی بیٹھا ہوتا ہے یعنی عقد قانون پڑھانے والا۔"

"ادب سے نام لو۔ ملا نہیں کہتے مولوی صاحب کہتے ہیں۔ میں نے تو اپنے نکاح کے وقت مولوی صاحب کی داڑھی پر ہاتھ رکھا ہوا تھا کہ کہیں کسی بات پر خفا نہ ہو جائے۔" میں بولا۔

"ہم بھی ادب کرتے ہیں۔ ملا کو ملا ہی تو کہیں گے۔ مولوی تو تمہارے ہاں کہتے ہیں۔ چھوڑو اب آگے سنو۔" اس نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ملا پھر قرآنی آیت پڑھتا ہے اور با آواز بلند لڑکی سے سوال کرتا ہے کہ دوشیزہ بانو آیا شما قبول می کنید نمرہ۔ یعنی کیا تم مجھے داماد کی جانب سے وکیل قبول کرتی ہو؟"

"پھر دلہن کی جانب سے اس کی کوئی ایک سہیلی جواب دیتی ہے کہ عروس مشغول گل چیدن، یعنی دلہن کسی باغ میں پھول چن رہی ہے۔"

"عروس کے سر پر نیٹ ہوتا ہے۔ کوئی دوسری سہیلی چینی کی دو ڈلیوں کو عروس کے سر پر رگڑتی ہے تو چینی سر کے اوپر نیٹ پر گرتی ہے۔ چینی مٹھاس اور محبت کی نشان بھی جاتی ہے۔ ملا پھر اپنا سوال دہراتا ہے اور وہی ایک جواب آتا ہے کہ وہ پھول چننے میں مصروف ہے۔"

"پھر ملا کہتا ہے کہ یہ پراپرٹی داماد تمہیں حق مہر میں دے رہا ہے۔ اب کیا مجھے وکیل قبول کرتی ہو۔ جواب وہی ہوتا ہے کہ وہ پھول چن رہی ہے۔ ملا پھر پراپرٹی کے ساتھ گولڈ اور دوسرے تحائف شامل کرتا جاتا ہے پھر آخر کار عروس اسے وکیل قبول کر لیتی ہے۔ اس پر سب لوگ خوشی سے تالیاں بجاتے ہیں اور ملا نکاح کا صیغہ پڑھتا ہے اور دونوں کو میاں بیوی کے رشتے میں باندھ دیتا ہے۔"

"پھر داماد اور عروس کو اکٹھے بٹھایا جاتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو شیرنی کھلاتے ہیں۔ ان کے درمیان آئینہ رکھا جاتا ہے جس میں دونوں ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھتے ہیں۔ مہمان نوٹ نچھاور کرتے ہیں۔ اس طرح سے دونوں کی نئی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔"

میں یہ سب بڑے اشتیاق سے سن رہا تھا۔ وہ مجھے بتا رہی تھی اور نظریں آس کے آسمانوں میں کہیں گم تھیں۔ کوئی کسک کوئی آرزو، کوئی تازہ خواہش اس کے لہجے میں پنہاں تھی۔ میں اسے سن بھی رہا تھا اور والہانہ پن سے دیکھ بھی رہا تھا۔ اس کا درد مجھ سے پوشیدہ نہ تھا۔ وہ کئی سوچوں میں ڈوبی نیلا آسمان دیکھ رہی تھی۔ وہ پرندے دیکھ رہی تھی جو غوطہ زن ہو کر جھیل کے پانیوں میں ڈوب کر مچھلیاں شکار کر رہے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں تھکے ہارے سورج نے افق کے آس پاس پناہ لینے کی ٹھانی۔ ایک سرخ گولا ہمارے بائیں جانب کہیں اتر رہا تھا اور اپنے پیچھے گلابی، سرخ، نارنجی اور پیلے رنگ چھوڑتا جا رہا تھا پھر وہ سارے رنگ مل کر جھیل کی نیلی سطح پر منڈلانے لگے۔ پرندے اب جھیل کی جانب لپکتے۔ قریب آ کر رنگوں کی قوس وقزح کو لہراتے دیکھتے تو واپس

لوٹ جاتے۔ پانی میں متحرک کشتیاں ٹھہر گئی تھیں۔ ڈاؤن ٹاؤن کی سب عمارتیں اپنی ساری روشنیاں جلا کر ان قوس قزح جیسے رنگوں کو خراج تحسین پیش کرنے لگیں۔ جزیرے کے درخت ہرے کچوچ ہوتے گئے۔ ہوائیں بے تحاشا چلنے لگیں تو درخت بھی مستی میں ڈولنے لگے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو ساری کی ساری میری بانہوں میں چلی آئی جیسے اب کہیں نہیں جائے گی اور کچھ جیت کر ہی چھوڑے گی۔

ہم واپس پہنچے تو سرجی سراسیمہ ہو کر ہمارا انتظار کررہے تھے۔ سعد کسی کھیل میں اکیلا مشغول تھا۔ شام کے سائے سیاہ پڑ رہے تھے۔ آخری فیری ہمیں پار اتارنے کے لیے تیار تھی۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد اسے اس کے اپارٹمنٹ تک پہنچایا۔ میرے واپس جاتے جاتے سرگوشیوں میں کئی بار کہہ چکی تھی کہ بیوی بچوں کو سیدھا ٹورنٹو بلاؤں اور میں بھی کئی بار اسے یہی کہہ چکا تھا کہ مجھے معلوم ہے ان کے آنے کے بعد ہی تم ہمیشہ کے لیے میری بن سکو گی۔

واپسی پر میں سارا راستہ خاموش رہا۔ ایسا ہر بار ہوتا رہا تھا۔ جب بھی اس سے مل کر آتا تو خاموشی پورے جسم میں بیٹھ جاتی۔ سنتا بھی خود سے تھا اور کہتا بھی خود سے۔ کتنی کہانیاں میرے اندر جمع ہو گئی تھیں۔ اپنے آپ کو انہیں سنانے کا موقع بھی کم ملتا تھا۔ سفر مختصر ہو یا طویل۔ جتنا بھی وقت ملتا ہے اپنے آپ سے گفتگو میں کٹ جاتا ہے۔

اس مختصر سفر میں کچھ اپنی سناتے اور کچھ ان کی سنتے وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ بس اپارٹمنٹ کے سامنے رکی تو سرجی نے میرا کندھا پکڑ کر ہلایا اور بولے۔ ''واپس آجائیں۔ معلوم نہیں کس کو یاد کررہے ہیں۔ بھابی کو یا نسرین باجی کو؟''

پندرہ دن بعد مجھے اپنا اپارٹمنٹ ملنے والا تھا۔ میرا اپارٹمنٹ چودھویں فلور پر تھا اور بارھویں فلور کے میرے سب ساتھی بھی میرے ساتھ یہاں سے جا رہے تھے۔ مفتی نے اس اپارٹمنٹ کو چھوڑنے کا نوٹس دے رکھا تھا۔ میں اس کے در و دیوار کو دیکھ رہا تھا جس کے ساتھ میری کئی یادیں وابستہ ہو گئی تھیں۔ اس اپارٹمنٹ میں میرے قہقہے بھی گونجے تھے اور تکیے میں منہ دے کر کئی بار گھٹ گھٹ کر رویا بھی تھا۔ برف میں گھرے جاڑے بھی دیکھے تھے اور کئی ہفتوں میں پھیلی بہار کا لطف بھی اٹھایا تھا۔ یہاں کی سردی دیکھ کر اندازہ بھی ہوتا تھا کہ یہاں گرمی نہیں پڑتی ہو گی مگر اب گرمی بھی

دیکھ رہے تھے۔

شمشال وادی کا ٹرپ کر کے جب میں نے ٹورنٹو لینڈ کیا تھا تو یخ بستہ ہواؤں سے گھرا وہ دن میں کبھی نہیں بھول سکتا، جب میں ایئرپورٹ سے باہر آیا تو بے یقینی سے کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ واقعی میں ٹورنٹو کو دیکھ رہا ہوں۔ کسی مغربی ملک کی زمین پر قدم رکھنے کا احساس میرے اندر خوشی بھرتا تھا پھر مفتی اور شہباز مجھے اس اپارٹمنٹ میں لائے تھے۔

مجھے میری پہلی رات یاد ہے جب میں اچانک آدھی رات کو اٹھ بیٹھا تھا۔ کمرے میں قبر کی مانند گھپ اندھیرے، خاموشی اور تنہائی نے مجھے میری جڑوں سے اکھاڑ دیا تھا۔ اس رات اتنا رویا کہ اندر آنسو کی ایک بوند بھی نہ بچی تھی۔ طارق بن زیاد نے کشتیاں جلا کر دشمن سے جنگ لڑی تھی۔ میں جگر جلا کر اپنے آپ سے نبرد آزما ہوا تھا۔ پاکستان میں ایک شاندار نوکری چھوڑ کر یہاں فیکٹریوں میں مزدوری ڈھونڈ رہا تھا۔ بسوں کے کرائے بچانے کے لیے پیدل ایک فیکٹری سے دوسری فیکٹری پر دستک دیتا تھا۔ کڑاکے دار سردیوں میں اپنا منہ اور سر لپیٹے، کندھے جھکائے چلتا رہتا تھا۔ شام کو تھکا ہارا جسم اپارٹمنٹ واپس آتا تو بھوک سے نڈھال بندے کو ابلے آلو کھانے پڑتے۔ ہر صبح منہ اندھیرے برف باری میں نئی اُمید لے کر گھر سے نکلتا اور ہر شام مایوسی میں نچڑا اپارٹمنٹ میں واپس آتا۔ لوگ ٹھیک کہتے ہیں، دکھوں کے ساتھی بھی نہیں بھولتے، یہ اپارٹمنٹ بھی میرے دکھوں کا ایک ساتھی تھا۔ مارٹن گرو روڈ پر پارک کے بیچوں بیچ کھڑا تنہا درخت بھی میرے دکھوں کا ساتھی تھا۔ اس اپارٹمنٹ کی تنہائی میں دوری کی کسک میں نے سہی اور غموں کی برسات کئی بار مجھ پر برسی۔ یہ اپارٹمنٹ اس کے در و دیوار میرے ساتھی تھے۔

شہباز، سرجی اور مفتی میرے دوست تھے۔ ہم سب کے غم ساجھے تھے۔ ہم سب کے اندر درد سے بھری جھیلیں تھیں۔ جب یہ جھیلیں لبالب بھر جاتیں تو موقع پا کر آنکھوں کے راستے ان کا پانی نکال دیتے اور پھر دوبارہ ان کے بھر جانے کا انتظار کرتے۔

پھر مجھے سیکیورٹی گارڈ کی جاب امیگریشن ہولڈنگ سینٹر میں مل گئی اور ساتھ ہی کین سینٹر میں جاب پانے کے لیے انٹرویو اور Resume بنانے کے طریقے سکھانے کی کلاس میں داخلہ مل گیا۔ صبح سات سے ایک بجے تک کین سینٹر میں اور وہاں سے سیدھا سیکیورٹی کی جاب پر تین سے گیارہ بجے رات تک جاب کرنے لگا۔ مطلب صبح سات

سے رات گیارہ تک مسلسل ایک چکی میں پستا رہتا۔ نہ کھانے کا ہوش اور نہ پہننے کا ڈھنگ۔ وزن گرتا چلا گیا مگر اسی دوران کیمن سینٹر میں میری کلاس میٹ نسرین کہیں سے آ ٹکرائی۔ مجھے اس نے اپنے بارے میں بتایا اور کچھ میں نے اپنا سنایا۔ کہانیاں مختلف مگر انجام ایک تھا یعنی دکھ، تنہائی اور ناامیدی۔

اس کی نظروں میں اپنے لیے مجھے چاہت نظر آنے لگی مگر اپنی عادت کی وجہ سے کم اور اپنے حالات کی وجہ سے زیادہ، میں اس سے دور رہتا تھا مگر جتنا میں اس سے دور جاتا تو اس کے پندار پر کوئی چوٹ پڑتی اور وہ میری جانب کھنچی چلی آتی۔ ایرانی نژاد نسرین کو اللہ نے خزانہ حسن سے خاصا نوازا ہوا تھا پھر ہم میں آہستہ آہستہ دوستی ہوتی چلی گئی۔ مجھے غم گسار ساتھی مل گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے دوستی کو بڑے قرینے سے پیار میں ڈھال لیا۔ میں خود شادی شدہ اور دو پیاری بیٹیوں کا باپ تھا مگر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پیار میں اسیر ہو گیا۔

ادھر میری فیملی میرے پاس آنے والی تھی اور ادھر نسرین کو اپنانے کا میں ارادہ کر چکا تھا۔ یہ فیصلہ کرتے ہوئے نہ میں نے گزرے کل کا سوچا اور نہ آنے والے کل کا۔ میں ان ماں بیٹے کو اکیلا اس دنیا کے حوالے نہ کر سکتا تھا اور اسی بنیاد پر میں یہ فیصلہ کر بیٹھا۔

اس دن میں اور میرے ساتھی اپنے اپارٹمنٹ میں بیٹھے تھے۔ وہ سب یعنی مطیع اللہ، شہباز اور سرجی کینیڈا کی زندگی کا مقابلہ پاکستان سے کر رہے تھے۔ مفتی بہت دیر سے ٹی وی کے چینل تبدیل کر رہا تھا مگر اسے اپنی پسند کا چینل نہیں مل پا رہا تھا۔ میں اپنی سوچوں میں غرق دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور پھر سرجی نے مجھے چونکا کر محفل میں گھسیٹ لیا۔

مطیع اللہ کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ جب کسی سے کوئی کام پڑتا ہے تو اس کی ہر بات کے جواب میں ان تین فقروں میں سے ایک فقرہ کہتا ہے۔ ”بالکل ٹھیک ہے۔“ ”ظاہر ہے“...... ”صحیح ہے۔“ گوروں کو فرنگی بولتا ہے مگر ان کے سامنے باادب ہو جاتا ہے۔ جہاں کہیں پھڈا ڈالنا ہو تو اس ہوشیاری سے تیلی جلاتا ہے کہ دیکھنے والے کو معلوم بھی نہیں پڑتا اور جب تک آگ لگ چکی ہوتی ہے۔

میں زبردستی محفل کے اندر لایا گیا تو غور کرنے پر معلوم ہوا کہ موضوع سخن یہ ہے کہ ہم نے پاکستان چھوڑ کر کینیڈا میں بسنے کا فیصلہ ٹھیک کیا یا پھر غلط۔

مفتی نے ٹی وی بند کیا اور خالی خالی نظروں سے ہمیں دیکھنے لگا۔

ہر ایک نے اپنی اپنی ملی جلی رائے دی جس میں کچھ یہاں کی خامیاں اور کچھ خوبیاں بیان کی گئی تھیں۔ ہم سب کو معلوم تھا کہ مفتی کی وہی ایک رائے ہو گی کہ کینیڈا سے بہتر جگہ دنیا میں کہیں نہیں ہے۔

کسی نے مفتی سے پوچھا کہ اپنے خیالات کو ایک بار پھر سے دہراؤ کہ پاکستان رہنے اور سوچنے کے قابل بھی نہیں ہے مگر آج مفتی کا چہرہ دھلے لٹھے کی طرح سفید پڑا تھا۔ کوئی تلاطم تھا اس کے اندر جو وہ کھویا کھویا لگ رہا تھا۔

شہباز بولا۔ ”مفتی پریشان ہے۔ اسے اپنی پسند کا چینل جو نہیں مل رہا۔“

وہ کچھ دیر سوچ میں ڈوبا رہا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولنے لگا۔ ”تم لوگ کیا سمجھتے ہو کہ میرے دل میں پاکستان کے لیے محبت نہیں، اپنے بچوں کے لیے محبت نہیں؟ میں بھی تم لوگوں کی طرح پاکستان کو یاد کرتا ہوں۔ اپنے بچوں کو یاد کرتا رہتا ہوں۔ میرا دل کوئی پتھر کا بنا ہوا نہیں ہے۔ جب بھی میں پاکستان کو برا بھلا کہتا ہوں تو اس لیے کہ اس کی محبت اپنے دل میں اتنی زیادہ جمع نہ کروں کہ یہاں رہنا بھی میرے لیے مشکل ہو جائے۔ میں اپنی فیملی کے آگے ایک کامیاب انسان کے طور پر آنا چاہتا ہوں۔ انہیں ساری آسائشیں دینا چاہتا ہوں جو انہیں پاکستان میں میسر ہیں۔ میں انہیں یہاں بلانے سے اس لیے کتراتا ہوں کہ اپنی اس تنخواہ میں انہیں کچھ نہیں دے پاؤں گا مگر کوئی میری بات کو نہیں سمجھتا۔ میرے دل کو کوئی نہیں سمجھنا چاہتا۔ ہر ایک مجھے برا بھلا کہتا ہے۔ آپ لوگ بھی اور میرے اپنے بھی۔ مجھے دیکھ کر آپ سب لوگ ایک دوسرے کو اشارے کر کے مسکراتے رہتے ہیں۔ آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔“

یہ کہہ کر وہ باقاعدہ رونے لگا۔ ہم سب اپنی جگہ پر پتھر ہو گئے۔ بڑی مشکل سے سرجی اٹھے اور اس کے پاس بیٹھ کر اسے چپ کرانے لگے۔

☆......☆

ایک دن میں ہیمو سال میں کمپیوٹر پر اپنی ای میل چیک کر رہا تھا کہ سمیعہ کے ماموں نے ای میل کر کے مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ تمہاری فیملی کے امیگریشن کے پیپرز آ گئے

ہیں۔

میں نے وہ چند لائنیں پڑھیں تو ایسے محسوس ہوا کہ مجھے دنیا جہان کے خزانے مل گئے ہوں۔ یہاں کس کو اپنی خوشی بتاتا کہ وہ میرے جذبات کو سمجھ سکے۔ فیکٹری میں ایسا کوئی نہ تھا۔ اس لمحے کا میں نے بڑی دیر تک انتظار کیا تھا۔ یہ وقت میں نے لمحہ لمحہ کاٹا تھا۔ میرے بچے میرے پاس یہاں آرہے تھے اور میں بے یقینی میں کھڑا یہ سوچ رہا تھا۔ میری بیٹی قندیل، میری بیٹی اریبہ اور میری بیوی سمیعہ اب میرے ساتھ ہوں گی؟ مجھے سب خواب لگ رہا تھا۔

پہلا فون میں نے فوراً نسرین کو کیا۔ اس سے بہتر کون میرے دل کو جانتا تھا۔ وہ یہ خبر سن کر ایسے خوش ہوئی کہ مجھے میری خوشی چھوٹی لگنے لگی۔ دل میں سوچنے لگا کہ یہ کیا چیز ہے۔ جس خبر پر اسے گم صم ہو جانا چاہیے مگر یہ میری خاطر اپنی خوشی کا اظہار کر رہی ہے۔ اسے اتنی مسرت میں محسوس کر کے میرے دل میں اس کے لیے قدر کئی گنا بڑھ گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے دل میں کئی اندیشے جاگ اٹھے ہوں گے مگر وہ مجھے آزردہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ فون بند کرنے سے پہلے مجھ سے بولی۔ ”میری شرط یاد ہے، فیملی کو سیدھا اپنے پاس بلوانا ہے۔“

وہ مجھے میری شرط نہیں بلکہ میرا وعدہ یاد دلا رہی تھی۔ یہ یاد دلا رہی تھی کہ اسے بھول نہ جاؤں۔ یہ یاد دلا رہی تھی کہ وہ بھی میرا اس طرح انتظار کر رہی ہے جس طرح میں اپنی فیملی کا انتظار کر رہا ہوں۔

میں نے اس سے کہا۔ ”تمہاری شرط تو مجھے میری سانسیں یاد دلاتی رہتی ہیں۔ نہ تم کو بھولا ہوں اور نہ تمہاری شرط کو۔ یہ وقت آنے پر ثابت کروں گا کہ تم میری زندگی میں کتنی اہمیت اختیار کر گئی ہو۔“

وہ سن کر رندھی آواز میں بولی۔ ”میں ہمیشہ سے تمہاری تھی اور رہوں گی۔ آخری سانس تک تمہارا انتظار کروں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔

میں نے تمنا بھابی کو فون کر کے بچوں کی امیگریشن ہونے کی خبر دی۔ ان کو بتایا کہ میں نے انہیں ہر حالت میں ٹورنٹو اپنے پاس بلوانا ہے۔ وہ نیویارک میری کسی بڑی مجبوری کے باعث نہیں آسکیں گے۔ میں نے خاموش ہو کر ان کا شور شرابہ جھڑکیں سنیں۔ وہ مجھ سے چھوٹی تھی مگر میری ماں بہن کی جگہ اس نے لی ہوئی تھی۔ اسے اصل وجہ بھی نہ بتا سکتا تھا اور جھوٹ بھی بولنا مشکل تھا، اسی لیے خاموش رہا۔ وہ میرے آہنی ارادے کے سامنے بے بس ہوئی تو خاموش ہو گئی۔ مجھے نصیحتیں کر کے فون بند کر دیا۔

مجھ سے ہیمو سال میں کام نہ ہو رہا تھا۔ ذہن متواتر خوشی سے مجھے کہیں سے کہیں لیے پھر رہا تھا۔ بچے، بیوی اور گھر کا ماحول بھی میں اپنے اندر محسوس کرنے لگا تھا۔ اپنی خوشی کے بھڑکتے جذبات پر کچھ دیر کے لیے قابو پا کر مجھے اب اپارٹمنٹ کے فرنیچر اور تمام ضروری اشیاء کا انتظام کرنا تھا۔ ہر کرائے کے گھر میں یا اپارٹمنٹ کے اندر بڑا فریج، کوکنگ رینج پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ سب سے اہم چیز گھر کا فرنیچر تھا جس میں بیڈ سیٹ، صوفے، ڈائننگ ٹیبل کے علاوہ ڈریسنگ وغیرہ لینی تھی۔ کپڑوں کی الماری سب سے ضروری جز تھا کیونکہ پورے اپارٹمنٹ میں صرف ایک الماری تھی۔

اتنے میں جین آتی نظر آئی۔ مجھے خوش دیکھا تو بولی۔ ”لگتا ہے ترقی ہو گئی ہے جبھی تو اتنے خوش نظر آرہے ہو۔“

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”کس قسم کی ترقی؟“

ترچھی آنکھوں سے مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولی۔ ”چھپا کیوں رہے ہو، مجھے پتا چل گیا ہے۔“

”میں نے اسے یقین دلایا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔“

وہ آنکھیں میچ کر بولی۔ ”پھر اتنے خوش کیوں پھر رہے ہو؟“

جب بتایا کہ فیملی کی امیگریشن ہو گئی ہے تو آنکھیں پھیلا کر بولی۔ ”واؤ، ایک دن میں دو دو خوشیاں۔“ اور پھر اپنے صحت مند بازوؤں میں مجھے جکڑ کر میرا اترا نکال دیا۔ پھر آہستگی سے بولی۔ ”اب تو پارٹی تمہاری جانب سے ہوگی اور وہ بھی میرے اپارٹمنٹ پر۔“

اتنے میں ہماری سپروائزر لورین اپنے آفس سے باہر نکلی۔ جین کو مجھ سے لپٹے دیکھا تو ہنس پڑی اور مجھ سے بولی۔ ”فارغ ہو جاؤ تو آفس میں آجانا۔“

جین کو علیحدہ کر کے لورین کے آفس میں گیا تو اس نے مجھے اپنے ساتھ کرسی پر بٹھایا۔ میری آنکھوں میں مسکرا کر دیکھتے ہوئے مجھے مبارک باد دی۔ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنے بائیں ہاتھ سے ایک سفید لفافہ مجھے پکڑا دیا۔

وہیں کھول کر پڑھا تو کمپنی نے مجھے Trained Trainer کی پوسٹ پر تنخواہ بڑھا کر ترقی دے دی تھی۔

دراصل پاکستان میں مجھے کیمیکل انسٹرومنٹس پر کام کرنے کا تجربہ تھا اور ساتھ میں یونیورسٹی میں ان آلات کی تھیوری بھی پڑھاتا تھا۔ یہاں آکر میں بڑی آسانی سے ان پر کام کرنے

لگا تھا اور ساتھ ہی تجزیاتی عمل میں اپنے مشورے بھی دیتا رہتا تھا جو کمپنی نے اپنے SOP کا حصہ بنا لیے تھے۔ اسی دوران کچھ نئے لوگ بھرتی ہوئے تو میں نے انہیں اسی انسٹرومنٹس پر تربیت بھی دی تھی اور یہی میرا کام میری ترقی کی وجہ بن گیا۔ ساتھ ہی تنخواہ بھی بڑھ گئی۔

اللہ کے کام اپنی ترتیب سے ہو رہے تھے۔ ادھر فیملی کی امیگریشن کی خبر آئی اور ادھر پرموشن ہو گئی۔ میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔ لورین کا شکریہ ادا کیا اور آفس سے باہر نکل آیا۔

یہ میری زندگی کا اہم دن تھا۔ مجھے ایک ہی دن میں دو دو خوشیاں ملی تھیں۔ نسرین کو کیسے میں اس خوشی سے دور رکھ سکتا تھا۔ اسے دوبارہ فون کر کے اپنی پرموشن کا بتایا تو وہ بہت خوش ہوئی، بولی۔ ''اگلے ویک اینڈ پر میں تمہارا انتظار کروں گی۔ یہ خوشیاں ہم اکٹھے منائیں گے۔''

میں نے اگلے ہفتے آنے کا وعدہ کیا اور فون رکھ دیا۔

مجھے اب سب کے ٹکٹ خریدنے تھے۔ سیٹیں بک کروائی تھیں۔ میرے حساب سے پی آئی اے ان کے لیے بہتر تھی۔ میری طرح سمیعہ بھی پہلی بار ملک سے باہر جا رہی تھی۔ پی آئی اے کی فلائٹ مانچسٹر میں رک کر پھر ٹورنٹو آتی تھی۔

میری عادت رہی ہے کہ جو کام بھی کروں گا تو مطمئن ہرگز نہ ہوں گا جب تک میرا اپنا ذہن مطمئن نہ ہو۔ کسی اور کا کام ہو تو بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ آگے والا بھلے مطمئن ہو جائے مگر میں اسے ادھورا سمجھتا رہوں گا۔ یہاں تو میرے بیوی بچے آ رہے تھے اور ہر مرحلے پر ان کی رہنمائی کرنی تھی۔ روابط صرف فون پر تھے اور فون بھی مہنگا تھا۔ انٹرنیٹ پر فیس بک انسٹراگرام واٹس اپ وغیرہ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ پاکستان ابھی انٹرنیٹ کو سمجھ رہا تھا۔ مجھے بہت سے کام کم دنوں میں نمٹانے تھے۔

اپارٹمنٹ پہنچا تو ابھی دوپہر تھی۔ اپارٹمنٹ خالی تھا۔ میں اپنے کاموں کی لحہ وار فہرست بناتا رہا۔ اپنا بینک اکاؤنٹ دیکھا۔ سوچوں میں اندازے لگائے کہ تین ٹکٹ، فرنیچر، ٹی وی، مائیکروویو، پورے ماہ کی گروسری وغیرہ پر کتنا خرچ آسکتا ہے۔ سوچ رہا تھا کہ بچوں کے آنے سے پہلے کوئی گاڑی بھی لے لوں۔ میری سیونگ اتنی نہ تھی کہ اچھی گاڑی خرید سکتا۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ فیملی آنے کے بعد اتنی سیونگ ہونی بھی نہ تھی جو میں پہلے کر چکا تھا۔ مجھے فون بھی لگوانا تھا۔ کوئی ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر بھی خریدنا تھا۔ ان دنوں جتنے میں ڈیسک ٹاپ آتا تھا آج کل اسی رقم سے پانچ بہترین لیپ ٹاپ مل جاتے ہیں۔ مجھے کمپیوٹر کی فکر اسی لیے نہ تھی کیونکہ ہیموسال کمپیوٹر خریدنے کے لیے قرضہ دیتی تھی اور ہر ماہ ایک تھوڑی سی رقم تنخواہ میں سے کاٹ لیتی تھی۔

ایک ہی دن میں مجھ پر گھرداری کی ذمہ داری آ پڑی تھی۔ اتنے مہینوں سے تو میں ایک طرح سے آوارہ گرد بنا پھر رہا تھا۔ پاکستان میں شادی کے بعد بڑے بھائی نے بہت سے معاملات سنبھال رکھے تھے اور میں آزاد پھر رہا تھا مگر یہاں ہر قدم پر مجھے ہی اپنے آپ کو آگے رکھنا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ بیوی بچوں کو کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہو۔

شام ہوئی تو میرے سب دوست تھکے ہارے پرندوں کی طرح آرام کی غرض سے اپنے گھونسلے یعنی اپارٹمنٹ میں اترنے لگے۔ جو ایک دو ہفتوں بعد اپنے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہونے والے تھے۔ جتنا سامان ان کے پاس تھا اس کی پیکنگ ایک دن میں ہو جاتی تھی اور اسی لیے وہ سب بڑے اطمینان سے ٹانگیں پھیلائے بیٹھے تھے۔ وہ سب کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے اب چائے پی رہے تھے۔

ہمارا ایک خوب صورت ساتھ ختم ہونے والا تھا۔ مشکل سے مشکل وقت بھی ہم سب نے مل کر آسان بنا دیا تھا۔ شہباز اور سرجی کی نوک جھونک ہمیں تھکنے نہ دیتی پھر ہم تینوں ایک ساتھ ہی ہر جگہ جاتے۔ جاب ڈھونڈتے، انٹرویو دیتے اور لڑتے جھگڑتے اسی اپارٹمنٹ میں آکر پھر سے شیر و شکر ہو جاتے۔

سرجی تو اپنی طبیعت میں ایک طرح سے نونہال تھے۔ انہیں برف باری میں بھی برف باری کا شوق ہوتا۔ ہم نہ روکتے تو یہ برف باری کو گھنٹوں بیٹھ کر تکتے رہتے۔ کہیں بھی ساتھ چلنے کا کہیں تو پہلے تیار ہو کر آتے اور پھر پوچھتے۔ ''کہاں جانا ہے؟'' اتنی ثقیل اردو اور محاورے بولتے کہ اردو زبان کے ماہر بھی چکرا جاتے۔ ایسے برجستہ اور موقع محل کے بارے میں محاورے ارشاد کرتے کہ دل سے واہ وا نکل جاتی۔ ایسے کھرے اور سچے پاکستانی کہ جیسے مٹی کا قرض اٹھائے پھرتے ہوں۔

شہباز دو کام عمدگی سے کرتا تھا۔ ایک زرد پڑنا اور دوسرا کاہلی سے لیٹ جانا اور جو کام نہایت عمدگی سے کرتا ہے وہ یہ کہ پسینے پسینے ہو کر بھی مسلسل کھاتے رہنا۔ شہباز فخری ہمارے پاکستان کے لیجنڈ اداکار جمیل فخری مرحوم کا بیٹا

ہے۔ اس کا دوسرا بھائی اپنی پھوپی کی بیٹی سے بیاہ کر نیویارک آیا اور نہایت پُراسرار طریقے سے قتل ہوگیا تھا۔

شہباز کی ایک خوبی جو کمال ہے وہ یہ کہ پنجابی میں ہر وقت بات کرتا ہے اور موڈ میں ہو تو ہنسا ہنسا کر بے حال کر دیتا ہے۔ کچن میں کھانا بنانا ہو یا اپارٹمنٹ کی صفائی ستھرائی کرنی ہو تو اسے موت آجاتی ہے۔ لیٹ جائے گا، کروٹیں کراہ کراہ کر بدلتا رہے گا۔ مفتی کو نہ کھانے پینے سے غرض ہے اور نہ سوشل ہونے سے۔ اس کا بھی شوق لاجواب ہے کہ انگریزی کے وہ نائٹ نائٹ شو دیکھے جن کی گفتگو ہر کوئی ایک کان سے سن کر دوسرا کان فوراً بند کر دیتا ہے کہ کہیں باہر نکل کر پھیل گئی تو نری بدنامی ہوگی۔ اپارٹمنٹ کی صفائی کے معاملے میں بہت سخت مزاج ہے۔ پورے اپارٹمنٹ کو چمکتا ہوا رکھے گا۔

مطیع اللہ کو ہمیں بعد میں آن ملا مگر آتے ہی ماحول کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اچھی طرح سے وہ جانتا ہے کہ کس کو کہاں تنگ کرنا ہے اور کس کو کس طرح سے خوش رکھنا ہے۔ نہایت ٹھنڈے ٹھار مزاج کا، دھیرے سے سوچ سوچ کر فقرے ادا کرتا ہوا، وہ خالصتاً سوات کا پٹھان ہے۔

ایک بار مطیع اللہ کا مفتی سے کسی بات پر جھگڑا ہوگیا تھا۔ وہ کئی دن تک اپنی چھوٹی اور بھوری مونچھوں کو تاؤ دیتا یہ سوچتا رہا کہ مفتی سے کس طرح سے بدلہ لے۔ ایک دن سب بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ یہ کہہ بیٹھا کہ وینکوور سے اس کا دوست ٹورنٹو شفٹ ہو رہا ہے اور اس کے پاس کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ لہٰذا مطیع اللہ اسے اسی اپارٹمنٹ میں رکھے گا۔ گو مطیع اللہ کو یہ معلوم تھا کہ اس کے لیے بھی ہم نے بمشکل جگہ نکالی تھی۔

میں بھی اس کی یہ بات سن کر چونک گیا کہ وہ کس طرح سے دوسرے کے اپارٹمنٹ میں بغیر اجازت کسی کو ٹھہرا سکتا ہے اور اس میں واقعی اب تل دھرنے کی جگہ بھی نہ تھی۔ اس سے پہلے میں اپنا کوئی ردِعمل دیتا کہ مجھے اس کی آنکھوں میں چھپی کوئی شرارت نظر آگئی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور اس کا کوئی دوست نہیں آرہا۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ مفتی کو صرف تنگ کرنا چاہتا ہے۔

مگر مفتی کے ہاتھ سے چائے کا کپ کارپٹ پر گرتے گرتے بچا۔ اس پر تو غصے سے لرزہ طاری ہوگیا۔ آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور منہ سے صرف ”کیا...... کیا......“ نکل رہا تھا۔ اب جو جھگڑا شروع ہوا تو تھمنے کا نام بھی نہ لیتا تھا۔ سرجی کے لطیفے اس جھگڑے کو ٹھنڈا کرنے کے بجائے مزید بھڑکا رہے تھے۔ مفتی آخر میں یہ کہتا پایا گیا۔ ”تمہارا دوست تو میری لاش پر سے گزر کر اس اپارٹمنٹ میں آئے گا۔“

بڑے دھیمے انداز سے مطیع اللہ ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”یہ بھی کرلیں گے۔“

سرجی اور شہباز نے مطیع اللہ سے کہا۔ ”اسے یہاں مت بلواؤ کیونکہ ایک بار آگیا تو شرم سے اسے یہاں سے جانے کا کہہ بھی نہیں سکیں گے۔“

مگر مطیع اللہ اپنی ضد پر اڑا یہ کہتا رہا کہ اب تو زبان دے چکی ہوں۔

مفتی مجھ سے بولا کہ تمہارے کہنے پر مطیع اللہ کو رکھا ہے اور یہ معاملہ اب تمہیں ہی دیکھنا پڑے گا۔ میں مفتی سے بولا کہ یہاں کوئی اور بندہ نہیں آئے گا، فکر نہ کرو۔

مگر مفتی یہ کہتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا کہ جب تک اس کا فیصلہ نہ ہو جائے مجھے رات کو نیند بھی نہیں آئے گی۔

میں نے مطیع اللہ کو سمجھایا کہ وہ کہہ دے کہ میں مذاق کر رہا تھا مگر اس نے تو گویا قسم اٹھالی تھی۔

اس جھگڑے کو شروع ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ ہمارے اپارٹمنٹ کے اندر کا شور باہر تک جا رہا تھا۔ ہم سب کو سونا بھی تھا مگر مفتی تہیہ کیے بیٹھا تھا کہ نہ کوئی یہاں سے اٹھے گا اور نہ کوئی سوئے گا جب تک فیصلہ نہیں ہو جاتا۔

جب مطیع اللہ نے قسم کھائی تو مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں اس سے بولا۔ ”ابھی تمہارا سامان سڑک پر باہر رکھتے ہیں اور تم بھی یہاں سے چلو۔ جانے سے پہلے...... اپنے دوست کو فون کر دو کہ تم تو یہاں سے کہیں جا رہے ہو اور وہ تمہاری جگہ یہاں آجائے۔“

یہ سن کر مطیع اللہ کے علاوہ سب تائید سے سر ہلانے لگے اور وہ مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تو مچھی (مفتی) کو تنگ کر رہا تھا۔ اس میں تو تکے کا بھی حوصلہ نہیں ہے۔“

یہ ہے مطیع اللہ، باقی رہا میں، میرے میں کوئی خاص اچھائی اس کے علاوہ نہ تھی کہ میں یونیورسٹی میں ٹیچر تھا اور اس بناء پر وہ سب میری عزت کرتے تھے اور میں نے بھی اسی عزت کو پلو سے باندھ کر سنجیدگی اختیار کر رکھی تھی۔

اب یہ سب ساتھی مجھ سے جدا ہونے جا رہے تھے۔ اس دن ہم بیٹھے چائے پی رہے تھے اور پھر میں نے اپنی فیملی

کی امیگریشن ہونے کی خوش خبری سنائی تو سب کو ایکدم سکتہ ہو گیا۔ سب کو یہ ادراک ہو گیا کہ اب اکٹھے رہنے کا وقت تمام ہوا چاہتا ہے۔ سب نے مجھے آہستگی سے مبارک باد دیں اور سب میری طرح سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

ہم لوگوں نے خاموشی سے کھانا کھایا اور میں کمرے میں جا کر پاکستان فون کرنے لگا۔

فون میری بیوی نے اٹھا لیا۔ بہت خوش تھی بولی۔

"اب میں آ رہی ہوں، مجھے پاکستان میں بٹھا کر خود وہاں معلوم نہیں کیا کرتے پھر رہے تھے۔ آ کر ٹھیک کر دوں گی آپ کو......"

میں نے مسکرا کر پوچھا۔ "یہاں کی بری خبریں تم کو کون دیتا ہے؟"

تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ "کون سی خبریں؟"

"وہی جن پر مجھ سے جھگڑا کرنا ہے۔"

"میں تو مذاق کر رہی تھی۔ چار سال سے ہم اکٹھے ہیں مجھ سے بہتر کون جانتا ہو گا کہ آپ صرف میرے ہیں اور میرے ہی رہیں گے۔"

"یہ مت کہو صرف تمہارا ہی رہوں گا، یہ کہو کہ ہمیشہ تمہارا رہوں گا۔" میں نے کچھ لمحوں کے بعد جواب دیا۔

شاید وہ میری بات کا مطلب نہیں سمجھی تھی بولی۔ "میری بھی یہی اللہ سے دعا ہے کہ آپ ہمیشہ میرے رہیں۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے۔"

میں نے پھر اس کو ساتھ لانے کے لیے سامان کے بارے میں مختصر طور پر بتایا اور پھر کہا کہ ٹکٹ کا انتظام ہونے کے بعد پوری تفصیل خط میں لکھوں گا۔

میں نے سوچا کہ کیوں نہ اپنا وہ اپارٹمنٹ دیکھ لوں جس میں مجھے شفٹ ہونا تھا۔

کمرے سے باہر آیا تو سب خاموش بیٹھے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ سب دلگیر ہیں کیونکہ ہمارے اچھے ساتھ کا اختتام ہو رہا تھا۔ میں نے تمہید باندھی اور اپنی دیرینہ جگہ ڈور وال سے ٹیک لگا کر بیٹھنے کے بعد کہنے لگا۔ "ہم ایک دوسرے سے دور تو نہیں ہو رہے، نزدیک ہی بلڈنگ میں رہ رہے ہوں گے۔ میں چودھویں فلور پر ہوں تو آپ بارھویں پر ہوں گے۔ آنا جانا تو لگا رہے گا۔ ہر روز شام کو آپ لوگوں کے پاس بیٹھ کر چائے پیا کروں گا۔"

"ایک تو ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ ہر روز دوستوں کی محفلیں لگیں۔ جو وقت تم کو ملے گا وہ تو بچوں کو اور گھر کو دینا ہو گا۔ مجھے معلوم ہے کہ چند روز بعد سب اپنی روٹین میں آ جائیں گے۔ وہی بھاگم دوڑ جاری رہے گی جو ابھی بھی چل رہی ہے۔ بس جب کوئی ساتھی جدا ہو جائے تو محفلیں ٹوٹ جایا کرتی ہیں۔" سرجی نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "چلیں چل کر اپارٹمنٹ دیکھتے ہیں۔ کم از کم مجھے اندازہ تو ہو جائے کہ فرنیچر کس قسم کا خریدنا ہے جو اس میں قرینے سے سما جائے۔"

مفتی اپنے میٹرس پر بیٹھا رہا جبکہ باقی سب اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

ہم اپارٹمنٹ سے باہر آئے تو موسم خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہمیں گلاٹی اسٹور کے عین سامنے بیس منزلہ بلند بلڈنگ میں جانا تھا۔ وہاں اور بھی بہت سی بلند رہائشی عمارتیں تھیں۔ مارٹن گرو روڈ کے ایک کونے میں وہ عمارت تھی جس میں میرا اپارٹمنٹ تھا اور دوسرے کونے میں ایک وسیع پارک تھا جو پھیلتا ہوا ہمارے موجودہ اپارٹمنٹ کے قریب تک چلا آیا تھا۔ اسی پارک کے ایک کونے پر بچوں کا پرائمری اسکول تھا جو بلڈنگ کی پارکنگ کے عین سامنے نظر آ رہا تھا۔

شام کی سیاہی پھیل چکی تھی۔ ہم گلیوں سے گزرتے ہوئے جا رہے تھے۔ ہم مارٹن گرو روڈ کے بجائے گلیوں سے اس لیے جا رہے تھے کہ کبھی کبھار راستے بدل کر کسی مقام کو جانا بھی اچھا لگتا ہے۔

ہم سڑک کے بیچوں بیچ چل رہے تھے کہ اچانک کسی گھر سے سیاہ بلی لپک کر آ گئی اور سرجی پر غرانے لگی۔ سرجی نے اسے ڈرانا چاہا تو وہ شیر بن گئی۔ ہم رک گئے کیونکہ راستہ روکے وہ کھڑی تھی۔ مطیع اللہ بولا۔ "لگتا ہے کوئی بدروح ہے جو بلی بن کر ہمیں ڈرانے آ گئی ہے۔"

سرجی بولے کہ مفتی کی بہن کے گھر میں بھی بلا میرا دشمن بن گیا تھا اور یہاں بھی بلی مجھ پر غرا رہی ہے۔ اس نسل کا آخر میں نے بگاڑا کیا ہے؟"

اس دوران ایک لڑکی بھاگتی ہوئی کسی گھر سے نکلی، بلی کو گود میں لیا اور جہاں سے آئی تھی اسی جانب دوبارہ چلی گئی۔

مطیع اللہ کہنے لگا کہ اللہ خیر کرے بلی نے راستہ کاٹا ہے۔ شہباز نے اکتا کر کہا۔ "راستہ کاٹا نہیں بلکہ راستہ روکا ہے۔"

ہم یہی باتیں کرتے کرتے مطلوبہ عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔ مین ڈور کے آگے بہت بڑا لان تھا جس میں کچھ لوگ چہل قدمی کر رہے تھے۔ ہم مین ڈور میں داخل ہوئے تو ایک بوڑھی خاتون شیشے کے دروازے کا لاک کھول کر اندر جا رہی تھی تو ہم بھی اس کے پیچھے ہو لیے۔ لفٹ سے اوپر چودھویں فلور پر پہنچے تو ایک طویل راہداری میں کھڑے تھے جس پر نفیس کارپٹ بچھے تھے۔ سرجی نے آگے بڑھ کر اپارٹمنٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا اور ہم سب تمیز سے دیوار کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور پھر سامنے کھڑے سرجی کی فلک شگاف چیخ برآمد ہوئی۔

دراصل ہوا یہ تھا کہ اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا تو ایک آدمی سرجی کی ازلی دشمن، ایک بلی کو چمکارتا ہوا اپنی گود میں اٹھائے کھڑا تھا۔ سرجی دروازہ کھلنے سے پہلے مسکرا رہے تھے۔ اس بندے نے سرجی کے مسکرانے کا کوئی نوٹس نہ لیا مگر بلی نے معلوم نہیں کیا محسوس کیا کہ وہ حواس باختہ ہو گئی اور گھبرا کر سرجی کی جانب جھپٹی۔ بلی کا مالک اس سے پہلے کہ کوئی ناگزیر قدم اٹھاتا بلی اچھل کر سرجی کے سینے سے آٹکرائی۔ دونوں ہی ایک ساتھ فرش پر گرے، ہم نے سمجھا کہ بے ہوش ہو گئے ہیں مگر سرجی فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور بلی بھی دوڑ کر واپس مالک کی بانہوں میں آ گئی۔

بلی کے ساتھ جو بندہ اپارٹمنٹ سے برآمد ہوا تھا وہ گورا تھا اور لگاتار بلی سے باتیں کر کے اسے تسلی دے رہا تھا۔ ہم تینوں متعجب کھڑے یہی سوچ رہے تھے کہ سرجی اور بلیوں کا آپس میں کیا تنازعہ چل رہا ہے۔ آج دوسری بار یہ ہوا تھا کہ بلی سرجی کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے بھی مفتی کی بہن کے گھر میں بھی ان دونوں دشمنوں کا آمنا سامنا ہو چکا تھا پھر اس بندے نے سرجی سے معذرت کی اور بلی کی متعدد چمیاں لیں پھر اسے اندر چھوڑ کر واپس آیا اور پیچھے سے دروازہ بند کر کے ہماری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

میں نے اپنا اور ساتھیوں کا تعارف کروایا۔ اس کی نظروں میں کئی سوالات ٹھہرے تھے کہ ہم اس کے پاس آخر وارد کیوں ہوئے ہیں۔ میں نے بتایا کہ اگلے دو ہفتے میں اس اپارٹمنٹ کے اندر تم نہیں بلکہ میں ہوں گا اس لیے مجھے اپارٹمنٹ اندر سے دکھلا دو تاکہ مجھے اندازہ ہو سکے کہ کس قسم کا فرنیچر میں خریدوں۔

یہ سننے کے بعد وہ مسکرایا پھر اندر گیا اور بلی کو سینے سے لگائے واپس آیا۔ سرجی کی نظروں سے بلی کو چھپا کر ہمارے لیے دروازہ کھول دیا۔

ہم ایک کشادہ لیونگ روم میں کھڑے تھے جس کا لکڑی سے بنا فرش چمک رہا تھا۔ دائیں ہاتھ لیونگ روم اور سامنے صاف ستھرا کچن تھا۔ اس گھر کے اندر وہ اور بلی کے علاوہ تیسرا کوئی نہ تھا۔ ہم گھوم پھر کر لیونگ روم کا جائزہ لینے لگے۔ اس کے پاس صوفے کے علاوہ لیونگ روم میں کوئی اور فرنیچر نہ تھا۔ کچن کے پیچھے ڈائننگ ٹیبل کے لیے جگہ خالی پڑی تھی۔ وہیں شیشے کی کھڑکیاں اور ایک دروازہ تھا جو بالکونی میں کھلتا تھا، میں دوستوں کے ساتھ بالکونی میں آیا تو اونچائی سے نیچے مارٹن گرو پر گزرتی گاڑیاں کھلونوں کی طرح دکھ رہی تھیں۔ سامنے اسٹرپ مال پُر رونق تھی جس کے کونے پر گلائی ٹسپر اسٹور تھا۔ ٹورنٹو کی میلوں دور تک پھیلی روشنیاں جگمگ کرتی ہمیں بہت بھلی لگیں۔ بالکونی بہت بڑی تھی جہاں کئی لوگ کرسیاں ڈال کر بیٹھ سکتے تھے، باہر کا نظارہ کر سکتے تھے۔

بالکونی مشرق کی جانب تھی۔ میں اس اپارٹمنٹ میں تین سال رہا اور صبح جب میں جاب کے لیے نکلتا تو مشرق سے سورج طلوع ہو رہا ہوتا تھا۔ کبھی بڑی بڑی کھڑکیوں کے شیشوں کے پار اور کبھی بالکونی میں کھڑے ہو کر ابھرتے سورج کا منظر میں دیکھا کرتا۔ ادھر ایک ٹی وی چینل پر طلوع آفتاب کو لائیو دکھایا جاتا ہے۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا کہ کیمرے میری بالکونی میں لگے ہیں۔

ایک بیڈ روم تھا مگر بہت کھلا اور ہوادار، کھڑکی سے ہوا آ کر ہر وقت کمرے کو بھرا رکھتی تھی۔ اپارٹمنٹ میرے ساتھ سب کو پسند آیا تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ مجھے کس قسم کے فرنیچر کی ضرورت ہو گی۔ جانے سے پہلے اس بندے نے ہمیں بتایا کہ جس دن تم نے یہاں شفٹ ہونا ہے، وہ اسی صبح اپارٹمنٹ خالی کرے گا۔

یہاں ایسا ہی ہوتا ہے کہ گھر ہو یا اپارٹمنٹ سب ایک شام پہلے یا اسی دن خالی کرتے ہیں جس دن دوسرے کرایہ دار نے داخل ہونا ہوتا ہے۔ بلڈنگ کی انتظامیہ پھر اسے صاف کرتی ہے۔ پینٹ کے علاوہ بجلی اور پانی کے سارے کنکشن چیک کیے جاتے ہیں۔ یہ سب کر چکنے کے بعد ہی اپارٹمنٹ حوالے کیا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا ہے کہ آپ Move ہو جائیں اور بعد میں خرابیاں پا کر انتظامیہ کے پیچھے بھاگتے پھریں۔ بہت سی

عمارتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا مالک ایک ہی ہوتا ہے۔ اس بلڈنگ کی انتظامیہ ہوتی ہے اور بیسمنٹ میں بوائلر وغیرہ کے علاوہ ورکشاپ بھی ہوتی ہے۔ کوئی خرابی کسی نظام میں ہو جائے تو کرایہ دار فارم بھر کر دیتا ہے اور پھر ایک دو دن میں اس خرابی کو دور کر کے آپ سے دستخط لے لیے جاتے ہیں۔ ایسی بلڈنگ میں آپ کرائے کے اندر ہی سروس چارجز دے دیتے ہیں۔

کئی عمارتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے ہر اپارٹمنٹ کا علیحدہ کوئی مالک ہوتا ہے۔ اس میں آپ براہ راست مالک سے کرایہ وغیرہ طے کرتے ہیں۔ ایسی بلڈنگ کی بھی انتظامیہ ہوتی ہے مگر تین یا چار سو ڈالر سروس چارجز، مالک اس انتظامیہ کو ادا کرتا ہے۔ ان سروس چارجز میں ہیٹنگ بجلی اور پانی کا بل بھی شامل ہوتا ہے۔ اگر بلڈنگ سینٹرل ایئر کنڈیشنڈ ہے تو اس کا خرچا بھی شامل ہوتا ہے مگر ہماری یہ بلڈنگ ایئر کنڈیشنڈ نہ تھی۔

ہم اپارٹمنٹ سے باہر نکلے تو کوریڈور ویران تھا۔ یہاں کوئی بندہ آپ کو کوریڈور میں کھڑا نہیں ملے گا۔ سب آتے ہی اپارٹمنٹ میں گھس جاتے ہیں۔ جو بھی باہر نکلے گا تو وہ سیدھا پارکنگ سے اپنی گاڑی اٹھائے گا یا پھر سید ھا بس کے لیے اسٹاپ کی جانب بڑھے گا۔ اس بلڈنگ میں دیسی لوگ بہت رہتے تھے۔ ان کی خواتین آپس میں شام کو یا تو پارک میں بچوں کو لیے جمع ہوں گی یا بلڈنگ کے فرنٹ لان میں باتیں کرتی ملیں گی۔

اس بلڈنگ میں تقریباً ڈیڑھ سو اپارٹمنٹ تھے جن میں آدھے کے قریب اپارٹمنٹ پاکستانیوں اور بھارتیوں کے پاس تھے۔ کئی ایک سکھ بھی تھے۔ باقی مشرقی یورپ کے لوگ تھے۔ ایک قسم کا جنجال پورہ تھا۔ آہستہ آہستہ لوگ ان مسائل اور خوشیوں سے واقف ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ کوئی عید منا رہا ہے تو کوئی دیوالی اور کوئی کرسمس۔ چینی اپنا تہوار منا رہے ہیں اور دوسرے کوئی اور تہوار منا رہے ہیں پھر مذہب کے علاوہ ہر ایک کی اپنی قومیت بھی ہے۔ ہر کوئی اپنے ملک کے تہوار بھی منا تا مل جاتا ہے۔ اس طرح سے مشاہدے کے لیے بہت کچھ دیکھنے کو ملتا ہے۔ کئی زبانیں، کئی رسمیں اور کئی خدوخال، ایک ہی وقت میں آپ کے سامنے ہوتے ہیں۔

میں واپس آرہا تھا تو مطمئن تھا کیونکہ مجھے لوگوں کے مشاہدے کے علاوہ قدرت کی نیرنگیاں دیکھنے کا بھی موقع ملنے والا تھا۔

ہیمو سال میں سب مجھے فیملی آنے پر اور ساتھ ترقی کی مبارک باد دے رہے تھے۔ منظر اور مفتی کے ساتھ اختر بھی میری خوشی میں شامل تھا۔ منظر نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں اب کار لے لینی چاہیے۔''

اس وقت ہیمو سال کے لنچ روم میں سب دیسی بدیسی اکٹھے بیٹھے تھے۔

مفتی چونک کر بولا۔ ''ابھی تو مصیبتوں سے لائسنس لیا ہے۔ کچھ وقت تو گزرنے دو۔'' وہ منظر سے مخاطب تھا۔

''کچھ دنوں بعد کیا تبدیل ہو جائے گا جو انتظار کرے؟ گاڑی لینے سے جاب کے علاوہ کہیں بھی آنے جانے میں آسانی ہوگی۔'' پھر منظر مجھ سے بولا۔ ''وہ تمہارا سکھ دوست بھی تو اپنی ٹویوٹا کرولا بیچ رہا تھا۔''

منظر، گرنام سنگھ کی بات کر رہا تھا۔ گرنام سنگھ ہر دوسرے ہفتے اپنی گاڑی مجھے دکھاتا، تعریف کرتا ہوا گاڑی کے چاروں جانب کئی چکر بھی لگاتا تھا۔

میں نے منظر کو گاڑی کی قیمت اور ماڈل وغیرہ بتائے تو بولا۔ ''قیمت تو مناسب ہے اگر دو تین سو ڈالر کم کر دے تو سونے پر سہاگے والی بات ہوگی۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر سوچ کر میں ایک فیصلے پر پہنچا۔

پرتیک کمار ساتھ بیٹھا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟''

''گرنام سنگھ کا فون نمبر یاد کر رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''ایسا کرو سپروائزر کے دفتر جا کر نمبر مانگ لو۔'' پرتیک کمار نے مشورہ دیا۔

میں سپروائزر کے آفس میں گیا اور گرنام کو فون لگا دیا۔ لائن ملتے ہی میں نے دوسری بات بھی نہ کی اور پوچھا۔ ''گاڑی کی آخری قیمت بتاؤ؟''

''کب چاہیے؟'' وہ بولا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے آج ہی گاڑی چاہیے۔''

وہ ہنس کر بولا۔ ''باؤ گھر آجاؤ۔ وائن وغیرہ لیتے ہیں، بس گپ شپ کرتے ہیں گاڑی بھی مل جائے گی۔''

میں نے کہا۔ ''قیمت بتاؤ اور بات فائنل کرو۔''

اس نے جو قیمت پہلے بتائی تھی اس سے دو سو ڈالر کم بتائی۔ دو سو میں نے اور کم کی اور وہیں ڈیل پکی کر لی۔ اس

سے کہا کہ تین بجے میری چھٹی ہوتی ہے۔ تم آؤ یا بیٹے کو گاڑی سمیت بھیج دو۔ منسٹری آف ٹرانسپورٹ کے دفتر جا کر اسے آج ہی ٹرانسفر کرا لیں گے۔ اس نے بیٹے کو بھیجو سال بھیجنے کی ہامی بھر لی اور میں دوبارہ لنچ روم میں آ گیا، دوستوں کو بتایا۔ سب کے چہرے پر خوشی کی جھلک نظر آئی صرف مفتی حیران بیٹھا مجھے دیکھتا رہا۔

گرنام سنگھ کا بیٹا تین بجے باہر پارکنگ میں گاڑی سمیت موجود تھا۔ وہ گاڑی دھلوا لایا تھا۔ اسی دوران میں نے انشورنس کمپنی کو فون کر کے انشورنس سرٹیفکیٹ فیکس کروالی تھی۔ گاڑی کی انسپکشن بھی پاس تھی جس کی سرٹیفکیٹ گلوز باکس میں دوسرے کاغذات کے ساتھ رکھی تھی۔ ٹرانسفر کے لیے رجسٹریشن اور مالک کی اجازت چاہیے تھی اور وہ دونوں موجود تھیں۔

ہم منسٹری آف ٹرانسپورٹ کے دفتر گئے۔ چار بج رہے تھے۔ پندرہ منٹ میں گاڑی میرے نام ٹرانسفر ہو چکی تھی۔ گاڑی کے علاوہ سب سے اہم چیز اس کی نمبر پلیٹ ہوتی ہے۔ یہ گاڑی کے مالک کی ایک طرح سے شناخت ہوتی ہے۔ جو گاڑی بیچتا ہے وہ نمبر پلیٹ اتار کر اپنی نئی گاڑی پر لگا لیتا ہے۔ گرنام کے بیٹے نے نمبر پلیٹ اتاری اور میں نے وہیں آفس سے دوسری پلیٹ لے کر گاڑی کے پیچھے لگا دی اور کچھ ہی دیر میں گرنام کے بیٹے کو پسنجر سیٹ پر بٹھا کر اسے گھر چھوڑنے کے لیے چل پڑا۔

گرنام اپنی بیسمنٹ میں بیٹھا تھا وہ ... میز پر وائن کی بوتل اور گلاس رکھے میرا منتظر تھا۔ میں نے اسے چیک تھمایا اور اس نے گلاس بھرا۔

”سردار جی تمہیں معلوم بھی ہے میں نہیں پیتا۔“ میں نے کہا۔

وہ گلاس بھر کے چڑھاتے ہوئے بولا۔ ”بہت سے مسلے (مسلمان) تو پیتے ہیں۔“

میں نے گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”بہت سے سکھ شیو بھی تو کرتے ہیں۔ تم کیوں نہیں کرتے؟“

آنکھیں بند کر کے نشے میں ابھرتے ڈوبتے ہوئے بولا۔ ”تماشا نہ کر۔ اب نکل یہاں سے پھر بات کرتے ہیں۔“

میں نے قہقہہ لگایا اور باہر نکل آیا۔ احتیاط سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے ایئرپورٹ روڈ سے ہوتا ہوا اپنے اپارٹمنٹ پہنچا۔

جو خوشی پہلی گاڑی لینے پر ہوتی ہے وہ بعد میں نئی گاڑیاں لینے پر نہیں ہوتی۔ ایک سال سے کم عرصے پہلے میرے پاس پاکستان میں موٹر سائیکل تھی۔ میں نے پہلی بار موٹر سائیکل کراچی میں لی تھی۔ موٹر سائیکل لینے کی خوشی اس وجہ سے بھی تھی کہ کراچی میں بسوں کے دھکے کھانے اور ٹائم برباد کرنے سے بچ گیا تھا۔ ہر وقت اپارٹمنٹ کے باہر موٹر سائیکل چمکاتا رہتا تھا۔ گلشن اقبال بلاک 4 میں رہتا تھا اور جاب کے لیے کورنگی انڈسٹریل ایریا جاتا تھا۔ سفر چاہے جتنا لمبا ہو، مجھے اچھا لگتا ہے۔ موٹر سائیکل پر میں نے کراچی کو گھوم پھر کر دیکھا تھا پھر جب تک پاکستان میں رہا میں نے موٹر سائیکل ہی چلائی۔ گاڑی کا خواب بھی نہ دیکھا کیونکہ میری وسعت سے باہر تھی۔

پھر کینیڈا آیا اور جب گاڑی لی تو وہی کیفیت تھی جو بائیک لیتے وقت تھی۔ مجھے اب بسوں میں سفر نہیں کرنا تھا۔ جس جاب پر میں چالیس منٹ میں بس سے پہنچتا تھا، اب دس منٹ میں پہنچتا تھا۔ ٹورنٹو کے وہ مقامات میں با آسانی دیکھ سکتا تھا جس کو دیکھنے کی خواہش میرے اندر پل رہی تھی۔ میں بار بار اللہ پاک کا شکر ادا کرتا تھا۔ گاڑی میرے اسٹیٹس میں اضافہ نہیں بلکہ ضرورتوں کو پورا کرتی تھی۔

میں جس ماحول میں پلا بڑھا تھا اس میں گاڑی بہت بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ والد صاحب جب گھر میں فلپس کا ریڈیو لائے تھے تو ہر ایک اسے چھو کر دیکھتا تھا اور یہ سوال بھی کرتا تھا۔ ”اصلی ہے؟“

اس میں چند ابیٹری کے سیل ڈالے گئے۔ ایک ایک اسٹیشن کو ٹیون کر کے سنایا گیا۔ سب ریڈیو کے گرد بیٹھ کر اسے سنتے تھے۔ اس سے پہلے تو گھروں میں ایک کمرا ریڈیو والا کمرا کہلاتا تھا۔ یہ میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے کی بات ہے۔ اس کمرے میں سنا ہے، ریڈیو رکھا ہوتا اور سب کرسیوں پر بیٹھ کر ریڈیو کے پروگرام سنا کرتے تھے۔ میں چھوٹا تھا تو فرمائشی گانے سننے کا مجھے شوق تھا۔ رات دس بجے انڈیا ریڈیو پر تعمیل ارشاد فرمائشی پروگرام لگا کرتا۔ گرمیوں میں اس پر میں یہ گانا سنتا۔ سہانی رات ڈھل چکی۔ نہ جانے تم کب آؤ گے۔“

ان دنوں تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہ ”تم“ نہ جانے ہے کون؟ یہ تم کیا سب کا ایک ہی تم ہے یا پھر ہر ایک کا اپنا تم ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ”تم“ تو کبھی کسی کا تم بن کر رہا ہی نہیں۔ کبھی ”تم“ ہوا اور کبھی ”تم“ کا عنوان بن گیا۔

میں گاڑی پارک کرنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو مفتی نے سب کو پہلے ہی سے گاڑی کے بارے میں آگاہ کر رکھا تھا اور وہ میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔

"چپکے سے گاڑی لے لی۔ ماشاء اللہ! صبح جاتے وقت بھی نہیں بتایا کہ آج گاڑی لینی ہے۔" یہ سرجی فرما رہے تھے۔

مطیع اللہ بولا۔ "کیا دور تھا جب مسلمان گھڑ سوار ہوا کرتے تھے۔ پھر گوروں کی نقل کرتے کرتے ان کی گاڑیاں چلانے لگے۔" پھر کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔ "مسلمانی غیرت کا تو جنازہ نکل گیا ہے۔"

شہباز بولا۔ "گاڑی لینے کی خوشی میں آج کھانا کھلانا تو بنتا ہے۔ مسی ساگا میں ایک حلال چائنیز ہوٹل ہے۔ وہیں چلتے ہیں۔"

میں تھکا ہوا تھا۔ کارپٹ پر ڈھیر ہو گیا۔ کھانا کھلانے کی فرمائش اب سب مل کر کرنے لگے۔ تقاضا بڑھتا گیا تو مجبوری کے عالم میں یہ کہہ کر میں اٹھا۔ "شاور لے لوں، پھر چلتے ہیں۔"

کچھ دیر میں ہم ہائی وے 401 پر مغربی سمت مسی ساگا کی جانب چل رہے تھے۔ چار چار رویہ متوازی ہائی وے پر گاڑیاں دوڑی جا رہی تھیں۔ مسی ساگا کی جانب میرا جانا پہلے نہیں ہوا تھا۔ وہ ٹورنٹو کے مغربی سمت میں نیا شہر ہے۔ اس کی آبادی دیکھتے ہی دیکھتے پھیل رہی تھی۔ نئی نکور بلند عمارتیں ڈھلتے سورج کی کرنوں سے چمک رہی تھیں۔ گاڑیوں کا اژدحام رواں دواں تھا۔ گاڑی صاف ستھری تھی اس کے اسپیکر بہت عمدہ تھے۔ ہم مزے سے گانے سنتے جا رہے تھے۔ میں ڈرائیونگ میں ابھی پختہ نہ ہوا تھا اور محتاط ہو کر ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ مسی ساگا سے گزرنے لگے تو کسی نے کہا ابھی شام نہیں ہوئی۔ لانگ ڈرائیو پر چلتے ہیں۔"

لانگ ڈرائیو کے بارے میں صرف میں نے کہانیوں میں پڑھا تھا۔ مجھے اس لفظ میں ابھی تک کوئی سحر چھپا نظر آتا ہے۔ منزل کوئی نہ ہو اور صرف ایک راستہ ہو جس پر وقت کی قید سے آزاد ہو کر چلتے جائیں۔ ہر لحظہ بدلتے مناظر سے گزرتے ہوئے جانا مجھے نت نئے جہانوں میں لے جاتا ہے۔

گاڑی آٹو میٹک تھی، مجھے گیئر بدلنے کی ضرورت نہ تھی۔ محض ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھایا اور وہ گولی کی طرح مسی ساگا سے نکلتی چلی گئی۔ کچھ ہی دیر میں آبادی کم ہوتی گئی اور وہ کینیڈا میرے سامنے آتا چلا گیا جسے دیکھنے میں یہاں آیا تھا۔ ہائی وے آٹھ لائن سے سکڑ کر چار لائن رہ گئی۔ ارد گرد گھنے جنگلات تھے۔ میلوں دور تک پھیلے کھیت جہاں تاحد نظر سبزے کی مخملی چادر بچھی تھی۔ کہیں نیلگوں جھیلیں جو آنکھوں میں تازگی بھر رہی تھیں۔ شفاف چمکتا نیلا آسمان ہمارے اوپر تھا اور زمین پر بل کھاتی خوب صورت ہائی وے جس پر ہماری گاڑی دوڑی چلی جا رہی تھی۔ میں دل میں بہت خوش تھا کہ اب میں ان مقامات کو Explore کر سکوں گا جو لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھے۔

ہم ٹورنٹو سے بہت دور نکل آئے تھے اور اب ہم ایک چھوٹے سے شہر کے آگے سے گزر رہے تھے۔ میں نے گاڑی ہائی وے سے اتاری اور گھما کر اسے واپسی پر ڈال دیا۔ مجھے واپس جانے کی جلدی نہ تھی بلکہ جاتے ہوئے میں نے بائیں جانب ایک بورڈ دیکھ لیا تھا جس پر لکھا تھا "کیلسو لیک" اسٹیئرنگ میرے ہاتھ میں ہو اور راستے میں کوئی جھیل آئے تو یہ بہت مشکل ہے کہ میں گاڑی اس جانب نہ موڑوں۔

سب مجھ سے کہتے رہے کہ ابھی تو شام بھی نہیں ہوئی اور تم واپس کیوں جا رہے ہو۔

دور سے جب جھیل کا بورڈ دیکھا تو گاڑی آہستہ کر لی اور قریب پہنچ کر دائیں جانب ایک پتلی سڑک پر اسے لے آیا۔ ایک چھوٹی سی جھیل جس کو درختوں نے گھیر رکھا تھا خاموشیوں کی چادر اوڑھے وہ میری راہ تک رہی تھی۔ میرے سب ساتھی مجھے کوس رہے تھے کہ انہیں اس ویرانے میں کیوں لے آیا ہوں۔ اس جھیل کے گرد پھولوں بھرے سرسبز گھاس کے قطعے تھے جہاں کچھ خیمے لگے تھے۔ میں اپنا شمشال ٹرپ کا خیمہ اپنے ساتھ پاکستان سے کینیڈا لے آیا تھا۔ میرے خوابوں کی سرزمین سامنے تھی۔ میں جھیلوں اور تنہائیوں کی تلاش میں آیا تھا جہاں کی فضا میں میرا خیمہ لگے گا۔ اس خیمے کے پردوں سے جب ہوائیں سرسراتی گزریں گی تو آنکھیں بند کر کے ان کی سرگوشیاں سنوں گا۔ مجھے ان چلتی ہواؤں کی گونج سننی تھی۔ مجھے درختوں کی ٹہنیوں اور جھومتے پتوں کی باتیں سننی تھیں۔ ان خوش الحان پرندوں کی موسیقی سننی تھی جو منہ اندھیرے درختوں کی شاخوں پر بیٹھے مجھے جگاتے تھے۔ مجھے جھیل کنارے بیٹھ کر سورج کی کرنوں کو

اس کے پانیوں پر منعکس ہوتے دیکھنا تھا۔ میرے ساتھی دور پرے پارک کی گئی کار میں بیٹھے تھے اور میں جھیل کنارے بیٹھا اس کی تنہائی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ سورج ڈوب رہا تھا اور پانی سنہری ہو چلے تھے۔ یہ کینیڈا کی پہلی جھیل تھی جہاں میں خود ڈرائیو کر کے آیا تھا۔ میں اس لمحے کو یادگار بنا دینا چاہتا تھا مگر وہ لمحہ تو اپنے آپ کو خود ہی امر کر گیا۔ ہوا کے زور سے جھیل کنارے خود رو پھول جھومنے لگے تو میں، میں نہ رہا۔ نہ جانے کتنی دیر وہاں بیٹھا رہا کہ اتنے میں رنگ سیاہ پڑنے لگے۔ سائے معدوم ہوئے اور پرندوں نے بے تحاشا شور مچانا کر دیا۔ شہباز اور مطیع اللہ جو وہیں گاڑی میں بیٹھے رہ گئے تھے۔ مجھے ڈھونڈتے ہوئے آئے اور بازو سے پکڑ کر زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔

وہ سمجھے تھے کہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے ہیں مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ میں ہمیشہ کے لیے وہیں رہ گیا ہوں۔ جھیل کے پانیوں کے ساتھ جس کے کناروں پر ہوا سے خود رو پھول جھومتے تھے۔ وہاں سے چلا تو سیدھا ہوٹل پہنچا۔

ہم کھانا کھا کر اپارٹمنٹ پہنچے تو رات کافی ڈھل چکی تھی۔

ان دنوں زندگی میں کوئی کسک سی تھی۔ بہت ساری خوشیاں تھیں اور پُرامید دن رات تھے۔

اُمید بھی کیا خوب صورت چیز ہے۔ کامیابی ملنے سے پہلے کامیابی کا محسوس ہونا کتنا خوب صورت احساس ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ زیادہ امیدیں کسی سے مت رکھو۔ میں سوچتا ہوں کیوں نہ رکھوں۔ میں اس سے امیدیں کیوں نہ رکھوں جو پوری بھی کر سکتا ہے اور جس نے پوری بھی کی ہیں۔ رب سے اُمید ہو تو لوگوں سے وہ بھی اُمید جوڑ دیتا ہے۔ اُمید وہیں جوڑتا ہے جہاں سے وہ پوری کرواتا ہے۔ میں تو ہمیشہ بہت ساری امیدیں رکھتا ہوں۔ ان میں سے کچھ بھی پوری ہو جائیں تو میرا دامن بھر جاتا ہے۔ میں سپنے دیکھتا ہوں اور ان سپنوں میں بہت ساری خوشیاں پا لیتا ہوں۔ یہ نہیں کہ جدوجہد نہیں کرتا۔ جو نصیب سے مل گیا تو یہی سمجھتا ہوں کہ میرا سپنا بھی تو یہ ہی تھا۔ مجھے میرے اپنے انداز میں جینے سے بہت ملا ہے۔ سالوں پہلے کی بات ہے۔ میں نے ایف ایس سی کے پیپر دیئے تھے۔ والدین کو مجھے ڈاکٹر بنے دیکھنے کا شوق تھا۔ رزلٹ آیا تو میرا نتیجہ لیٹ تھا۔ بورڈ سے معلوم کروایا تو بولے کہ تمہارے پریکٹیکل کے نمبر ہمیں ممتحن سے نہیں ملے۔

مجھے معلوم تھا کہ رزمک کیڈٹ کالج سے کیمسٹری کے ٹیچر میرا پریکٹیکل لینے آئے تھے۔ ان کا نام بھی معلوم تھا اور یہ بھی مجھے پتا تھا کہ رزمک کہاں ہے۔

بنوں سے افغانستان کی جانب جائیں تو میرانشاہ آتا ہے۔ میرانشاہ سے پہلے ایک سڑک جنوبی سمت رزمک کو جاتی ہے اور وہی سڑک بعد میں جنوبی وزیرستان سے ملتی ہے۔

میں نے اپنے کزن راشد سے بات کی اور پھر ہم دونوں ایک شام بنوں جا پہنچے۔ بنوں میں میرے ایک دوسرے کزن رہتے تھے۔ ان کے پاس رات گزاری۔ وہ کزن بنوں میں ایک چوبارے پر دوستوں کے ہمراہ رہتے تھے۔ رات کو انہوں نے ڈیرہ کی مشہور ڈش ثوبت بنائی۔ میں اور راشد ایک کونے میں سہمے بیٹھے تھے کیونکہ سب ہمیں چونک کر دیکھتے جب انہیں معلوم ہوتا کہ ہم رزمک جا رہے ہیں۔

دوسرے دن صبح منہ اندھیرے ہمارا سفر شروع ہوا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ میر علی تک ٹریفک نظر آتی رہی۔ جب ویگن رزمک کی جانب مڑی تو سنگلاخ چٹانوں نے ہمیں چاروں جانب سے گھیر لیا۔ سڑک بلند ہوتی رہی اور چٹانیں بلند پہاڑوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ ویگن میں ہم دونوں کے علاوہ سب قبائلی لوگ تھے۔ ہر ایک نے گولیوں سے بھری بیلٹ باندھ رکھی تھیں۔ ان دیکھی اور انجان منزلوں کا سفر تھا۔ ویگن نے پہاڑی موڑ کاٹتے شام کر دی۔

رزمک ایک بلند سرسبز و شاداب پہاڑ پر واقع ہے۔ شام کے ملگجے اندھیرے میں قبائلیوں نے ہمیں عزت و احترام سے رزمک کے قلعے کے باہر اتارا۔ قلعے کے اندر کیڈٹ کالج تھا۔

یہاں سے افغانستان پہاڑوں کے پیچھے نظر آتا ہے۔ یہی علاقہ تورا بورا سے ملا ہوا ہے۔ پچھلی کئی دہائیوں سے یہاں خونریز جنگ جاری ہے۔ میں نے یہ علاقہ دیکھا ہوا ہے۔ یہاں پاک فوج نے دہشت گردوں سے اپنی جانوں کے نذرانے دے کر یہ علاقہ خالی کروایا ہے جو نہایت ہی قابل تحسین ہے۔

میں اور میرا کزن راشد ہونقوں کی طرح بلند و بالا پہاڑ دیکھ رہے تھے جہاں نیچے سے اوپر تک جنگلات ہی جنگلات تھے۔ خوب صورتی ایسی کہ لوگ ناران و کاغان

بھول جائیں۔ ہمارے اردگرد ویرانی اور مہیب خاموشی تھی۔ ہم دونوں اس ویرانگی سے خوف زدہ ہو گئے تھے۔ بھوک سے ہمارا برا حال تھا۔ تھکاوٹ نے جسم کے کس بل نکال دیئے تھے۔ قلعہ کا دروازہ ایک خاصہ دار نے ہمارے لیے کھولا۔ ملیشیا کی شلوار قمیص پہنے اور کندھے پر بندوق سجائے وہ قبائلی فوجی ہمیں اپنی نیلی آنکھوں سے حیرت لیے دیکھ رہا تھا۔ دو چھوٹے لڑکوں کو اپنے سامنے شام کے وقت دیکھ کر وہ متعجب دکھائی دے رہا تھا۔ ہم نے مدعا بیان کیا تو اس نے لکڑی کے بڑے پھاٹک میں لگا چھوٹا دروازہ ہمارے لیے کھول دیا۔

اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ سرسبز گھاس کے قالین بچھے ہیں۔ کناروں پر پھول ہی پھول ہیں۔ انگریزوں کے وقت سے بنا قلعہ سفید اور سرخ رنگ سے رنگا ہوا تھا۔ یخ بستہ ہوا بلند پہاڑوں سے اتر کر قلعے کے اندر آوارہ گھومتی تھی۔ اس ٹیچر کو بلایا گیا جس نے میرا پریکٹیکل کا زبانی امتحان لیا تھا۔ وہ ہمیں اس وقت وہاں دیکھ کر حیرت سے اپنی پلکیں جھپکانا بھول گیا۔

ہمیں مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا۔ میں نے اپنی عرضی بیان کرنا شروع کی اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑے بیٹھا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے تو ایک ہفتے کے اندر مارکس شیٹ بھیج دی تھی۔ کسی نے تم لوگوں کو بتایا اور تم اتنی دور مجھے یہ کہنے چلے آئے کہ انہیں وہ مارکس نہیں ملے۔

قلعے کے کمانڈنٹ تک یہ خبر پہنچی کہ دو بچے ڈیرہ اسماعیل سے یہاں رزمک آپہنچے ہیں۔ پورے قلعے میں موجود فوجی ہمیں دیکھنے چلے آئے۔ ہمارے لیے بستر مہمان خانے میں لگائے گئے۔ اسی دوران ہمارے لیے گوشت بھونا گیا۔ پلاؤ تیار ہوا۔ جو بھی آتا ہمارے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتا۔ ایسا خلوص اور محبت پا کر میری آنکھوں میں آنسو اتر آئے تھے۔ میں اپنوں کے درمیان تھا۔ ہمیں کھانا کھلایا گیا، کھانے کے بعد بہت سے لوگ ہمارے گرد بیٹھے ہمیں مسکرا مسکرا کر شفقت بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔ رات موٹی رضائیوں میں بھی ہم سردی سے کپکپا رہے تھے۔

اس رات میں سپنے دیکھتا رہا کہ میں میڈیکل کالج کے کلاس روم میں کلاسوں کے لیے بھاگا دوڑا پھر رہا ہوں۔ سفید گاؤن میرے کندھے پر ہے۔ ہر کوئی مجھے ڈاکٹر صاحب کہہ کر پکار رہا ہے۔ کبھی میں میڈیکل کالج کی کینٹین میں بیٹھا دوستوں کے ہمراہ چائے پی رہا ہوں، سموسے اور شامی کباب کھا رہا ہوں۔ میں خوش ہوں اور ہواؤں کی طرح اڑتا پھر رہا ہوں۔

یہ سب سوچتے سوچتے اور پھر سونے سے پہلے میں نے اللہ کو مخاطب کر کے کہا کہ اب اگر مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ نہ بھی ملے تو میں راضی ہوں۔ اس سپنے نے مجھے اتنی خوشی دے دی ہے کہ میڈیکل میں داخلے کی خوشی اس سے بہت کم ہوگی۔

اور پھر میرا میڈیکل میں داخلہ نہ ہوا مگر اس سپنے کی بدولت میں تمام عمر خوش رہا۔

اس لیے سپنے کبھی رائیگاں نہیں جاتے۔ امیدیں کبھی نہیں مرتیں، خواب ہمیشہ تازہ پھولوں کی طرح خوشبو بکھیرتے رہتے ہیں۔

☆......☆

مجھے اب اپنی فیملی کے لیے ایئر ٹکٹیں لینی تھیں۔ اپنے کزن کو فون کر کے اپارٹمنٹ ملنے کے دو روز بعد کی تاریخ بتا دی۔ اس نے اگلے روز ہی لاہور سے ٹورنٹو براستہ مانچسٹر تین ٹکٹ پی آئی اے سے کنفرم کروا کر مجھے اطلاع کر دی۔ تو میں مطمئن ہو گیا اس لیے بھی کہ کچھ دنوں قبل مجھے اطلاع ملی تھی کہ دو تین روز میں میرے بچے میری بیوی پاکستان سے چل پڑیں گے۔ انہیں ویزا مل گیا ہے۔ میں نے تمنا بھابی کی ضد پر سمیعہ سے کہہ دیا تھا کہ تم لوگ یہاں آنے کی بجائے امریکا جاؤ گی۔ کچھ دن گزار کر یہاں آنا ہے سمیعہ اور بچے راضی ہو گئے تھے کہ اطلاع آ گئی، کچھ کاغذات ابھی ملے نہیں ہیں اس طرح مزید وقت کھنچ گیا تھا لیکن اس بار کنفرم تھا کہ تمام کاغذات مل گئے ہیں۔ اب جیسے ہی کنفرمیشن ملی میں نے بلوانے کی پوری تیاری کر لی۔ ٹکٹس کے لیے رقم بھیجنی تھی۔ جس سے بات کرتا وہ ہنڈی کے ذریعے رقم بھیجنے کا مشورہ دیتا۔ یہی کہتا کہ بینک کی نسبت ریٹ بھی بہتر ملتا ہے اور رقم اسی دن پاکستان میں مطلوبہ شخص کو پہنچ جاتی ہے۔ مجھے اب کسی ایسے ایجنٹ کی تلاش تھی جو قابل اعتبار ہو۔ مجھے یہ تجربہ نہ تھا کہ ہنڈی کا کاروبار کرنے والے سب سے زیادہ قابل بھروسا لوگ ہوتے ہیں۔

پاکستان اور پاکستانی تارکین وطن سے جڑے معاملات کے لیے مقامی اردو کے اخبار بہترین ذریعہ ہوتے ہیں۔ دیسی گروسری شاپ سے اردو کا اخبار مفت ملتا

ہے، وہیں سے میں بھی اٹھا لایا۔ ہنڈی کا کاروبار کرنے والے بہت سے لوگوں کے اشتہارات تھے۔ ایک اشتہار دلچسپ اس لیے تھا کہ وہ صاحب فرما رہے تھے کہ جب پاکستان میں آپ کی رقم ترسیل ہو جائے تو بعد میں یہاں ادائیگی کریں۔ نام کے ساتھ ملک لگا تھا اور ملک صاحب کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ میرے لیے آسانی اور ذہنی تسکین بھی یہی تھی کہ رقم وصولی کی تصدیق کے بعد ان کے اکاؤنٹ میں چیک جمع کرادوں۔

میں نے ملک صاحب کو فون ملایا تو دوسری جانب فوراً رابطہ قائم ہوگیا۔

بھاری بھرکم آواز میں ملک صاحب نے لاہور میں میرے کزن کا فون نمبر اور نام لیا۔ مجھے کہا کہ کل شام کو پاکستان رقم وصول ہونے کی تصدیق کرکے دوبارہ ان سے رابطہ کرکے ان کا اکاؤنٹ نمبر لے لوں۔ نہ ملک صاحب نے میرا نام پوچھا اور نہ ہی ایڈریس یا میرا فون نمبر مانگا۔ مجھے وہ فرشتہ سیرت انسان محسوس ہوا کہ اتنی بھاری رقم بغیر میرا نام پوچھے میرے کزن کو ادا کر رہا ہے۔ کافی دیر میں ملک صاحب کی شخصیت پر غور کرتا رہا۔

دوسرے دن لاہور فون کیا تو کزن نے کہا کہ صبح ایک لڑکا منہ لپیٹے دروازے پر فون کرکے آیا تھا اور رقم پکڑا کر بغیر رسید لیے چلتا بنا۔

اس ایمانداری کی وجہ سے ملک صاحب کے لیے میرے دل میں عزت و احترام دوچند ہوگیا۔

اگلے دن ملک صاحب کو فون کیا اور شکریے کے ساتھ ان کا بینک اکاؤنٹ نمبر لینے کے بعد بولا۔ ”ملک صاحب آپ انتہائی سادہ انسان ہیں۔ اتنی بڑی رقم بغیر مجھے جانے ادا کردی اور میرا نام تک بھی معلوم نہ کیا۔ آپ شریف انسان لگتے ہیں اور مجھے ڈر ہے کسی فراڈیے کے ہاتھوں لٹ نہ جائیں۔ میں آپ کو یہ نصیحت کروں گا کہ آئندہ رقم بھیجنے والے ہر شخص کا ہر زاویے سے جائزہ لے لیا کریں۔“ یہ بول کر میں ملک صاحب سے اپنے لیے تعریفی کلمات اور شکریہ و تحسین کا انتظار کرنے لگا۔

مگر وہاں سے زوردار قہقہہ سننے کو ملا۔ ملک صاحب ٹھیٹ پنجابی میں فرمانے لگے۔ ”جہاں اتنی بڑی رقم بغیر تصدیق کے دے سکتے ہیں تو کیا سمجھتے ہو کہ وصول کرنے والے سے نکلوا نہیں سکتے؟ اتنے سادہ ہوتے تو اس کاروبار میں کیوں پڑتے۔“

انہوں نے فون بند کردیا تھا اور میں پھر سے دیر تک ملک صاحب کی شخصیت پر غور کرتا رہا۔

اپارٹمنٹ، گاڑی اور ایئر ٹکٹس کا انتظام ہو چکا تھا اور اب میرے ذہن پر ایک ہی چیز سوار تھی کہ دس پندرہ دنوں میں سارا فرنیچر، ٹی وی اور اس کے علاوہ خالی اپارٹمنٹ میں ساری ضرورتوں کا سامان میں اکیلا کس طرح سے خریدوں گا۔ مجھے کوئی تجربہ ان چیزوں کا نہ تھا۔ نسرین کو میں ان معاملات میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا کیونکہ یہ اس کے لیے بہت بڑا امتحان ہوتا۔ وہ لاکھ میرے سامنے اپنی خوشی کا اظہار کرے مگر وہ بھی انسان ہے، دل رکھتی ہے۔ میرے بیوی بچوں کے یہاں آنے کی خبر پر وہ اپنا خوف چھپا جاتی مگر میں اس کی آنکھوں میں لہراتے سائے دیکھ لیتا تھا۔ جب وہ بار بار یہ پوچھتی کہ اسے چھوڑ تو نہیں جاؤں گا تو دراصل اپنے خدشے کا اظہار کر رہی ہوتی تھی۔ اسے ڈر یہ تھا کہ میں اپنی بیوی بچوں میں مصروف ہو کر اسے چھوڑ جاؤں گا۔ وہ اپنے وہم دل میں لیے اپنے اپارٹمنٹ میں سوچوں میں بیٹھی تھی اور اسی حالت میں اسے اپنے ساتھ لیے بیوی کے استقبال کی تیاری کرنا اس کے ساتھ سراسر زیادتی تھی۔

میں ہیمو سال کی پارکنگ میں گاڑی پارک کرکے اندر جانے لگا تھا کہ ساتھ والی گاڑی سے کٹی مسکراتی ہوئی باہر نکلی۔ اصل نام کٹ مین تھا مگر کٹی کے نام سے بلائی جاتی تھی۔ چینی تھی اور خوب صورت آنکھوں پر چشمہ لگانے کے بعد اور زیادہ اچھی دکھتی تھی۔ ہم دونوں نے ایک ہی دن ہیمو سال جوائن کیا تھا۔ میں تو پروڈکشن میں ٹیکنیکل کام کرتا تھا مگر وہ باہر واشنگ ایریا میں واشنگ اور صفائی وغیرہ کا کام کرتی تھی۔ ہر ایک کی طرح اسے بھی پروڈکشن کا ٹیکنیکل کام سیکھنے کا جنون تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ٹیکنیکل کام سیکھے بغیر وہ کسی اور جگہ بہتر پوزیشن کے لیے اپلائی نہیں کرسکتی ہے۔ اسی ضرورت کی بناء پر وہ میرے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتی تھی، پھر جب سے میری ترقی Trained Trainer کی ہوئی تھی تو اس کی خوش اخلاقی بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ میری وساطت سے پروڈکشن میں ٹرانسفر ہونا چاہتی تھی۔ وہ جس طرح سے میری جانب بڑھ رہی تھی اس کا انداز دیکھ کر میں گھبرا کر اردگرد دیکھنے لگا۔

(جاری ہے)



سرزمینِ فرعون

شمیم الدین غوری

ماضی بعید میں سرزمینِ مصر طاقتوروں کا خطہ کہلاتا تھا۔ یہاں کے حکمران اپنے آپ کو خدا کہتے تھے اور عوام سے خود کو سجدہ کراتے تھے۔ ان کے رسوم بھی عجیب و غریب تھے۔ اسی لیے اسے پُراسرار سرزمین کہا جاتا ہے۔

اسرار سے بھری سرزمین کا تذکرہ ایک پاکستانی کے قلم سے

مصر کی صدیوں پرانی تہذیب میں سونے کی بڑی اہمیت تھی۔ اس کا ثبوت فراعین مصر کی ممیوں کے مقبروں سے برآمد سونے کی بڑی مقدار ہے۔ روایات کے مطابق یہ سونا پارس پتھر کی بدولت حاصل ہوا۔ مصر کی سرزمین پر بکریاں چرانے والے چرواہے اپنی بکریوں کے سموں میں لوہے کے ٹکڑے لگا دیتے تھے۔ جس بکری کا سم پارس پتھر سے ٹکرا جاتا اس کا لوہا سونا بن جاتا اور وہ اسے بادشاہوں کو بیچ دیتے۔ بچپن کی پڑھی ہوئی ایسی کہانیوں میں پارس پتھر کی شکل صورت اور پہچان بھی دی ہوئی تھی۔ مجھے سبق تو کبھی یاد نہ ہوا لیکن پارس پتھر کی بناوٹ اب تک یاد ہے اور مجھے یقین ہے کہ جیسے وہ سامنے آئے

گا میں پہچان لوں گا۔ پارس اہرام مصر کے علاقے میں پایا جاتا ہے۔ میرے مصر جانے میں پارس پتھر بھی ایک تحریک تھا کہ شاید وہ پتھر مجھے مل جائے۔

پاکستانیوں کو بیشتر ممالک میں انویٹیشن نہ ہو تو ویزا نہیں دیا جاتا۔ وزٹ ویزا تو خیر سے پاکستانیوں کے لیے چند کو چھوڑ کر ساری دنیا کے ممالک میں بند ہے۔ میری بیٹی نسرین غوری محکمہ پاپولیشن ویلفیئر سندھ کی جانب سے قاہرہ مصر میں ایک ڈیموگرافک ڈپلوما کا کورس کر رہی تھی۔ اس کورس میں کئی ممالک کے آفیسرز شرکت کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو یہ عزت بخشی کہ میری بیٹی نے اس کورس میں سب سے زیادہ نمبر لیے اور فرسٹ آ کر پاکستان کا نام روشن کیا۔ ابھی تھیسس جمع کرانے میں وقت تھا۔ اس نے مجھے مصر دیکھنے کی دعوت دے دی۔ میں نے اپنے بچپن کے دوست شاہد اطہر اور ان کی بیٹی سمرا سندس کو بھی دعوت دے ڈالی۔ جو قبول ہو گئی۔ ادھر ہم پاسپورٹ اور ویزا فارم جمع کرانے نہ پائے تھے کہ نسرین نے اسلام آباد میں واقع مصری سفارت خانہ کو اپنی یونیورسٹی سے فیکس کرا دیا کہ طالب علم کے والد اور ان کے فیملی فرینڈز کو کنووکیشن میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ ٹی سی ایس کے منشی یا چھوارہ نما منشی جو کسی ڈیزل ریلوے انجن کے ڈرائیور کی سیٹ پر زیادہ جچتے، کاغذات کی ترسیل پر مامور تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ کے کاغذات اور قاہرہ سے فیکس ایک ہی دن سفارت خانے پہنچنا چاہیے ورنہ ویزا نہیں لگے گا۔ اتنے فارم ہوتے ہیں کہ انہیں کیا پتا کہ کب کس کا انویٹیشن آیا تھا۔

لو جی اُمیدوں پر گھڑوں پانی پھر گیا۔ اب ہم یہاں سے بیٹی کو کہہ رہے ہیں کہ دوبارہ انویٹیشن بھیج دیں۔ وہ کوشش کر رہی ہے لیکن کسی فنی خرابی کی وجہ سے فیکس نہیں ہو رہا۔ ادھر شوقِ ویزا کا عالم تھرمامیٹر توڑے دے رہا تھا۔ ادھر سے فیکس ہمارے صبر کو آزما رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح ویزا آفیسر کا فون مل گیا۔ ایک نستعلیق ہیلو کی دلربا نسوانی آواز دل کے پار ہو گئی۔ بڑھاپا اپنی جگہ آواز کی دلکشی اپنی جگہ۔ ان سے معاملے کو بیان کیا کہ فیکس آنے والا ہے تھوڑا انتظار کر لیجیے۔ ادھر سے تینوں کا نام لے کر انہوں نے کہا کہ تینوں کے ویزے ہو گئے ہیں، ٹی سی ایس کے دفتر جا کر لے لیجیے۔ پاسپورٹ بھیج دیے گئے ہیں۔ منشی چھوارہ نما منشی کے پاس گئے اور پاسپورٹ وصول پائے۔ ویزا دیکھ کر دل بھٹاک بھٹاک کر کے بلیوں اچھلنے لگا۔ اب ہماری دلی خواہش تھی کہ ان کے سخت رویے پر کچھ کہہ کر اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ لیں۔ بس ہلکے سے عرض کی کہ بھائی آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ کیا آپ ریلوے میں ملازم تھے۔ کہنے لگے ہاں ہاں آپ بھی وہیں تھے کیا؟ میں نے کہا نہیں ایک مال گاڑی کے انجن ڈرائیور کو خانیوال میں گاڑی میں سوار بھینسوں کا دودھ بیچتے دیکھا تھا، آپ میں اس کی شباہت ہے۔ اس کے بعد نہ پوچھیے کہ کیا ہوا، بس جتنا ہمارا دل ان کے سخت رویے سے جلا تھا اس کا بدلہ ہم نے ایک تیلی لگا کر لے لیا اور بھاگ لیے۔

پرواز سے ایک دن پہلے جب ساری تیاری مکمل تھی تو عمان ایئر لائن سے ایک فون آ گیا بالکل ایسے جیسے سلطان راہی کہتے تھے آ اے شادی تمہیں ہو سکدی۔ "نامعلوم کیا اعتراض لگا دیا تھا۔ جان نکل گئی۔ سوچا شاہد اور سمرا کیا کہیں گے۔ میں نے کیسی بکنگ کرائی ہے۔ بیٹے کہتے تھے کہ قادر بھائی سٹی ٹریول والے میرے دوست ہیں کنفرم ٹکٹ ہیں۔ قادر بھائی کو فون کیا اور اعتراض بتایا۔ کہنے لگے آپ تیاری کیجیے ٹکٹ کنفرم ہیں، اعتراض آپ پر لاگو نہیں ہوتا۔ جان جو لگ بھگ نکل گئی تھی وہ واپس آ گئی۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ جانے والی واپس آ گئی اس سے پہلے کوئی مؤنث ہمارے لیے جاتے ہوئے کبھی واپس نہیں آئی۔ ویسے ابھی تک جان کے مؤنث ہونے پر کچھ شک ہے۔ منطق کی رو سے میری جان اگر مجنوں کہے تو لازمی طور پر وہ لیلیٰ کی جان ہو گی جو مؤنث ہے۔ اگر لیلیٰ میری جان کہے تو وہ مذکر ہو گی۔ یوں منطقی طور پر ہر مرد کی جان مذکر ہوئی۔ اسی لیے واپس چلی آئی۔ مؤنث ہوتی تو نکل گئی ہوتی۔

☆☆......☆

صبح چھ بجے کی فلائٹ تھی۔ میری بیگم اور بیٹا شہزاد مجھے رات کو شاہد صاحب کے گھر چھوڑ گئے۔ کچھ دیر سوئے۔ مجھے فلائٹ سے تین گھنٹے پہلے پہنچنے کی ہدایت نے جلدی جگا دیا۔ شاہد صاحب تجربہ کار مسافروں کی طرح آرام سے اٹھے اور میرے جلدی مچانے پر بھی چار بجے گھر سے نکلے۔ شاہد صاحب کے کزن راشد اور بھانجے ظفر دو گاڑیوں میں ہمیں ایئرپورٹ چھوڑنے آئے۔ چھ بجے کی فلائٹ کے بعد والی فلائٹس کی چیک ان شروع ہو گئیں لیکن ہماری فلائٹ کی چیک ان ندارد۔ دل پریشان کہ کہیں فلائٹ کینسل نہ ہو جائے۔ الیکٹرونک بورڈ پر صرف فلائٹ کا نمبر اور وقت موجود تھا اطلاعی تفصیل ندارد۔ خواہ مخواہ کے وسوسے کہ کیا ہو گیا، اب کیا ہو گا۔ بچپن کی آرزو پارس سے سونا بنانے کی پوری ہو گی یا نہیں۔

اللہ اللہ کر کے پانچ بجے چیک ان شروع ہوا۔ اب عملہ جلدی مچا رہا ہے، جلدی کرو بھاگو فلائٹ نکل جائے گی۔ بی

لائینوں میں لگ کر امیگریشن وغیرہ سے فارغ ہو کر بھاگم بھاگ جہاز تک پہنچے۔ کسٹم امیگریشن اور سامان کا وزن سب آسانی سے کلیئر ہو گیا تھا۔ انتہائی ناگوار تجربہ تھا کہ ہمیں معزز کلائنٹس کا درجہ دینے والے ہمیں اس طرح بھگا رہے ہیں جیسے ہم نارتھ ویسٹرن ریلوے کے تھرڈ کلاس کے مسافر ہوں۔ بنگلہ دیش بننے سے پہلے ہماری ریلوے کا نام یہی تھا۔ مشرقی پاکستان کی ریلوے کا نام ای بی آر یعنی ایسٹ بنگال ریلوے تھا جو بعد میں ای پی آر ہو گیا یعنی ایسٹ پاکستان ریلوے۔ ہمارے داخل ہونے کے دس منٹ بعد جہاز ٹھیک چھ بجے ٹیک آف کر گیا۔ اومان ایئر لائن کے بوئنگ 737 کے آرام دہ ماحول میں بہت اچھے ناشتے نے سفر کا مزہ دوبالا کر دیا۔ شکر ادا کیا کہ جہاز میں مجھے موشن سکنس کا معاملہ نہیں ہوا۔ کشتی میں تو اکثر طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔

سوا دو گھنٹے پرواز کے بعد ہم مسقط کے خوبصورت، نفیس شاندار اور جدید ائیر پورٹ پر اتر گئے۔ اپنا کراچی کا ائیر پورٹ یہاں ہمیں کچھ کمتر لگنے لگا۔ مقامی وقت کے مطابق اپنی گھڑیاں ایک گھنٹے پیچھے کیں۔ ہمیں یہاں چھ گھنٹے قیام کرنا تھا۔ ائیر پورٹ کی مسجد میں آرام کرنے کی کافی جگہ تھی۔ میں اور شاہد مردانہ حصے میں کچھ دیر سوئے۔ سمرا خواتین کے حصے میں آرام کرتی رہیں۔ ایک بجے کے قریب سمرا نے ہمیں ڈبل روٹی کے سینڈوچ جو آدھی رات کو گھر پر تیار کیے تھے ان کا لنچ دیا۔ لاؤنج سے پورا ائیر پورٹ اور آتے جاتے جہاز صاف نظر آتے ہیں۔ ہم نے خوب ان کے فوٹو لیے اور موویز بنائیں۔ اپنی مشہوری کے لیے ایک دوسرے کے خوب خوب فوٹو کھینچے۔ ابھی سیلفی والا فون یا تو آیا نہیں تھا یا ہمیں اس کے بارے میں معلومات نہیں تھیں۔ اپنے کراچی ائیر پورٹ پر تو ٹکٹ لے کر اوپر جائیے اور دور دور سے جہازوں کا نظارہ کیجیے، یہاں لاؤنج کی کھڑکی سے چند میٹر پر جہازوں کا نظارہ کیجیے۔ ہم جیسے ترسے ہوئے بیچاروں کو جنہیں جہاز آسمان پر یا کہیں دور دور نظر آتا ہے ان کے لیے تو پینڈوؤں کی طرح جہازوں کے فوٹو لینا قدرتی بات تھی پھر ہماری پینڈوگیری کو دیکھ کر کوئی دل میں کچھ بھی کہے ہمیں کیا۔ شاہد ایک ریٹائرڈ بینکر ہیں، سو انہی کو پارٹی کا اکاؤنٹنٹ چنا گیا تھا۔ کچھ ڈالر تبدیل کرا کر ایئر پورٹ کی ایک شاپ سے شاہد صاحب نے ہمیں کولڈ ڈرنک کی عیاشی کرائی۔ جتنے میں کولڈ ڈرنک کے تین ٹن لیے اتنے میں وطن میں پورا کریٹ آجاتا۔ بہر حال ابھی آداب غلامی سیکھنے کی ابتدا تھی۔

کراچی کے صدر میں ونڈو شاپنگ کرنے والوں کی سدا سے فراوانی ہے۔ لڑکپن میں وقت گزاری کا میرا بھی یہ مشغلہ تھا جو جوانی کی تگ و دو میں کئی کئی پارٹ ٹائم کرتے ہوئے کہیں گم ہو گیا تھا۔

جب آپ ایئر پورٹس پر ٹرانزٹ مسافر ہوں تو وقت گزاری کے لیے علم میں اضافہ کرنا شخصیت کے لیے مفید ہوتا ہے۔ اس سے آپ کسی بھی محفل میں برانڈ ناموں کی مصنوعات کا نام لے لے کر اپنی شخصیت کا رعب جھاڑ سکتے ہیں۔ گھر میں، آپ صابن 101 سے نہاتے ہوں باہر تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ جرمنی والی بیئے شورالڈ کی خوشبو بہت اچھی ہوتی ہے، فرانس کا پارٹر تو کئی دن تک جسم کو مہکاتا رہتا ہے۔ پہلے والے سے زیادہ خوشبو ہے اس میں۔ یوں آپ لوگوں پر خوب دھاک بٹھا سکتے ہیں۔ سو خوب علم میں اضافہ کیا۔ اپنا ملک ہو تو کہیں نہ کہیں یہ شرم ہوتی ہے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ دیار غیر میں اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ آپ ایک شاپ کے دس چکر لگا لیں کوئی فکر نہیں۔ انڈیا ایسا ملک ہے جس کو دنیا ہزاروں سالوں سے جانتی ہے۔ پاکستان اور بھارت کو وجود میں آئے ابھی ستر سال ہی ہوئے ہیں (اس دور میں)۔ پوری دنیا میں انڈیا کے لوگ اپنی شکل وشباہت سے الگ ہی پہچانے جاتے ہیں۔ اگر کوئی ناپسندیدہ عمل پاکستانیوں سے دنیا میں کہیں بھی ہو جائے تو بدنامی بھارت کی ہوتی ہے۔ اکثر غیر ملکی کراچی کو بھی انڈیا کا شہر سمجھتے ہیں۔ اس کا تجربہ راقم کو غیر ممالک میں ہوتا رہتا ہے۔ اس بات کو سمرا نے بھی اچھی طرح جان لیا کہ دیار غیر میں کوئی بے عزتی بلکہ بیازتی نہیں ہوتی۔ سو اس نے بھی ونڈو شاپنگ سے خوب استفادہ کیا۔ ہم ٹھہرے متوسط درجے کے بھی نچلے حصے کے لوگ اس لیے آداب غلامی یا آداب چادر اور پاؤں ہم پر مسلط تھے اور ہم پیہم صبر و شکر تھے لیکن ہم نے دیکھا کہ لوگ ایسے شاپنگ کر رہے ہیں جیسے کسی لمبی ہڑتال کی کال سے پہلے کراچی والے دکانوں پر ہلّہ بول دیتے ہیں۔ بھرے بھرے شاپر دیکھ کر ہوت کی جوت کا مطلب جوار دو کے ماسٹر سلطان نہ سمجھا سکے لیکن یہاں خود بخود سمجھ آگیا۔ ٹرانزٹ لاؤنج میں مختلف ملکوں کے بھانت بھانت کے افراد، طرح طرح کے لباس، خواتین کے میک اپ، بچوں کی خوشیوں بھری شرارتیں اور شیطانیاں بڑی دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں۔ ایک کالے کے ہاتھ میں جو دو تولے کی نقرئی انگوٹھی دیکھی تو دل نے کہا کوئی بات نہیں میں بھی پارس کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ اس سے بڑی بنواؤں گا۔ کالا تو کیا شو مار رہا ہے جو میں ماروں گا۔ آخر مجھے پارس کی پہچان ہے۔

دوپہر ڈھائی بجے دوبارہ بوئنگ 737 میں سوار ہوئے۔ اچھا کھانا کھانے کو تلاش،و مچھلی اور لیمب سے لیمب کا آرڈر کیا۔ مسلم ممالک کے جہازوں میں حلال فوڈ کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ دوسرے ممالک میں حلال فوڈ کا مسئلہ ہو جاتا ہے، جیسے چائنا جانے میں اگر پہلے سے حلال فوڈ نہ لکھوائی جائے تو بھوکے ہی رہنا پڑتا ہے۔ یا پھر ابلے چاول پھیکی سبزی یا مچھلی کے ساتھ کھانے کو ملتے ہیں۔ اللہ جانے کہ یہ مچھلی جب کافروں کی کافر جوانیوں کے ہاتھوں سے کٹ کر اور پک کر آتی ہے اور فش ہو جاتی ہے تو حلال ہے یا حرام۔ جہاز پونے چار گھنٹے بعد قاہرہ ایئرپورٹ پر اتر گیا۔ کسٹم اور امیگریشن کے مراحل خیریت سے طے ہوگئے۔ فلائٹ نمبر اور وقت نسرین کو معلوم تھا لیکن وہ ایئرپورٹ پر موجود نہ تھی۔ کوئی سم ابھی ہمارے پاس نہ تھی کہ اسے فون کرتے۔ کافی دیر پریشان ہوتے رہے کہ یہ کیا ہوا۔ ایسے میں ایک پل ایک ایک گھنٹے کا ہو جاتا ہے۔ دیکھا کہ نسرین سردی کے باوجود پسینے پسینے ہوئی چلی آرہی ہیں۔ ایک پٹھان لڑکا ان کے ساتھ تھا۔ یہ حسین احمد تھے جنہوں نے اس سال یونیورسٹی کے جنرل ڈپلوما میں ٹاپ کیا تھا۔ پچھلے سال نسرین نے اسی ڈپلومے میں ٹاپ کیا تھا۔ مصری یونیورسٹی میں کئی ممالک کے طلباء میں مسلسل دو سال پہلی پوزیشن پاکستان کے حصے میں آنا بڑے اعزاز کی بات ہے لیکن جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔ حسین احمد مردان کے پاپولیشن ویلفیئر آفیسر ہیں اور جنرل ڈپلوما کرنے یہاں آئے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے دیر سے آنے کی وجہ ایئرپورٹ پر صحیح ہال کی نشاندہی نہ ہونا تھی۔ یہ کسی اور ہال میں ہمیں تلاش کرتے رہے اور ہم ان کا انتظار کسی اور ہال میں کرتے رہے۔ دونوں ہالوں کے درمیان اچھا خاصا فاصلہ تھا جس کو بھاگ بھاگ کر طے کرنے میں ان دونوں کو پسینے آگئے۔ قاہرہ ایئرپورٹ کے چکنے فرش پر میرا پیر جو پھسلا تو گرتے میں سمرا ہی نزدیک تھی، ڈوبتے کو تنکے کا سہارا اور مجھے سمرا کا سہارا گرنے سے بچنے کے لیے اس کو اچانک جو ہاتھ مارا تو وہ بھی گرتے گرتے بچی اور میں سنبھل گیا۔ نسرین نے پوچھا کیا ہوا میں نے کہا سمرا نے دھکا دیا ہے۔ یہ دھکا سارے ٹور میں ساتھ رہا۔ ہر جگہ سمرا کو کہتے رہے دیکھنا دھکا نہ دے دینا۔ کہیں ایک دوسرے سے کہتے سمرا سے دور رہنا۔

مصر کوئی زیادہ ترقی یافتہ ملک نہیں۔ اس میں بھی ہمارے ملک کی طرح معاشرتی خامیاں موجود ہیں۔ قاہرہ ایئرپورٹ سے ٹیکسی کا وہی طریقہ ہے جو پاکستان میں ہے۔ نئے لوگوں کو دیکھ کر زیادہ کرائے کے لیے منہ پھاڑتے ہیں۔ ٹیکسی والے سے کرایہ طے کیا اور اپنے کرائے کے فلیٹ میں آگئے۔ سب سے پہلے گھڑیاں دو گھنٹے پیچھے کیں۔ قاہرہ اور کراچی میں تین گھنٹے کا فرق ہے۔ ایک گھنٹا مسقط میں پہلے ہی کم کر دیا تھا۔ کوئی بھی شخص جو اپنے ملک سے باہر جاتا ہے اور ایسے ماحول سے واسطہ پڑتا ہے جہاں دنیا کے کئی ممالک کے لوگ موجود ہوں تو الگ الگ نسل، قوم اور مذہب کے ہوتے ہوئے بھی آپس میں بھائی چارہ اور یک جہتی کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک افریقی ملک جبوتی کے حبشی عبدالرزاق جو ماسٹرز کر رہے تھے انہوں نے روٹیاں لا کر دیں۔ کھانا کھا کر ہم نے گھوڑے بیچ دیئے۔

نسرین قاہرہ میں ڈیموگرافک میں ڈپلوما کرنے آئیں تھیں۔ وہ تو انہوں نے کر لیا تھا۔ اب وہ اس میں ایک سال اور لگا کر گریجویشن کورس بھی کر چکی تھیں۔ مزید ماسٹرز کے چکر میں تھیں۔ انہوں نے قاہرہ ڈیموگرافک سینٹر جو یونیورسٹی لیول کا ہے، میں داخلہ لیا تھا۔ یہ سینٹر قاہرہ کے جنوب مشرقی پہاڑی علاقے مقطم میں واقع ہے۔ اس کا درجہ یونیورسٹی کے برابر ہے۔ مقطم کا علاقہ ہمارے ڈیفنس کی طرح پوش علاقہ ہے۔ یہاں دنیا بھر کے لوگوں کو ڈیموگرافک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ پاکستان کے مختلف محکمہ جات سے ہر سال دو افراد کو یہاں ٹریننگ کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ چناؤ میں کئی معاملات مدنظر ہوتے ہیں۔ کمانے والی سیٹ پر کوئی ایماندار آدمی بیٹھا ہے تو اسے بھگاؤ اور یہاں بھیج دو یہ اس کی ایمانداری کا انعام قدرت کی جانب سے ہوتا ہے اور اگر کمانے والا کسی سیٹ پر بیٹھا ہے تو اسے یہاں بھیج کر اس کی جگہ کسی اپنے کو لگا دو۔ یہ اس کو سزا ہو گئی۔ نوجوان آفیسرز جو خود مہم جوئی اور سیاحت کے شوقین ہیں وہ تو اس کے لیے باس کا منہ میٹھا کرانے کو بھی تیار ہوتے ہیں۔ ایسی ہی ایک مہم جو نسرین غوری بھی ہے۔ میری کوشش کہ چلی جائے دنیا دیکھے اور بیگم کے فکرات کہ اکیلی کیسے جائے گی اتنی دور نہ معلوم کیسے رہے گی اسے تو دال پکانی بھی نہیں آتی۔ عربی نہیں آتی وغیرہ۔

نسرین کی یونیورسٹی نے مقطم میں فلیٹ کرائے پر لے کر اس میں ہوسٹل بنا دیئے ہیں۔ تین فلیٹ کسی بلڈنگ میں مل گئے تو وہاں لڑکیوں کا ہاسٹل بنا دیا۔ کہیں لڑکوں کا ہاسٹل بنا دیا۔ یہ روایتی ہاسٹلوں کی طرح نہیں جہاں ایک وارڈن ڈنڈا لے کر بیٹھا یا بیٹھی ہو کہ رات دیر سے کیوں آئے۔ بس ایک طرح سے رہائش گاہیں ہیں اور طلباء و طالبات اپنے اپنے ملک کے افسر لیول کے لوگ ہوتے ہیں۔ لڑکوں کے ہوسٹل کی بلڈنگ میں

ایک ہوادار کشادہ فلیٹ پندرہ دن کے لیے نسرین نے ہمارے لیے کرائے پر لے لیا تھا۔ اس میں دو بڑے بیڈروم ایک ڈرائنگ ڈائننگ روم جس میں دس افراد کھانا کھا سکیں، ایک بڑا باتھ روم کچن فرنیچر الماریاں واشنگ مشین غرض یہ ایک مکمل فرنشڈ ایسا فلیٹ تھا جس میں ہم تمام ضروری سہولتوں کے ساتھ آرام سے گھر کی طرح رہ سکیں۔ پانی بجلی گیس سب کا خرچ کرائے میں شامل تھا اور اس کا کرایہ پندرہ دن کا ہم نے 1200 مصری پاؤنڈ دیا۔ خالی کرتے وقت صفائی کر کے جانا تھا ورنہ ڈپازٹ میں سے سو پاؤنڈ کٹ جاتے۔

ہمارے وہاں پہنچتے پر نسرین بھی اپنے ہاسٹل سے اس آشیانے میں منتقل ہوگئی۔ دو سال سے میری بیٹی جس نے کبھی گھر میں چائے کے علاوہ کچھ نہ پکایا ہو وہ ہاسٹل میں اپنا کھانا خود پکا پکا کر تھک تو گئی ہوگی۔ راقم الحروف نے اس کو باورچی خانے سے آزاد کر دیا اور اس کا چارج خود سنبھال لیا۔ پڑھاکو لڑکیاں گھرداری میں کچھ پیچھے ہی ہوتی ہیں۔ نسرین بھی ایسی ہی ایک لڑکی تھی جسے اب یہاں سب کچھ کرنا پڑ رہا تھا۔ ہاسٹل میں یونیورسٹی کی جانب سے بس رہائش تھی۔ کھانا پکانے کی ذمہ داری طلباء کی اپنی اپنی تھی۔ گھر میں ماں کے ہاتھ کا تازہ کھانے والی اب تین دن کا کھانا اکٹھا پکا کر رکھتی تھی۔

والد صاحب کیپٹن ریٹائرڈ چمن علی غوری صاحب سے سیاحت کا شوق ورثے میں ملا ہوا ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا دنیا کا ساتواں عجوبہ اہرام مصر دیکھنے کا شوق تھا، ویسے پہلے چھ کا علم ہمیں بس واجبی سا ہے۔ ان کے پورے نام بھی نہیں آتے۔ چھ دہائیوں سے زیادہ اس آرزو میں گزار دیں کہ ساتواں عجوبہ دیکھیں گے۔ بیٹی کے مصر جانے کے بعد تو بے صبری کی انتہا نہ رہی۔ مکان بنانے میں جمع پونجی ختم ہوگئی اور ہم رہے پیاسے کے پیاسے لاکھ ساون آئے۔ دو سال بعد آخر کار وہ دن بھی آ پہنچا جب یہ خواہش پوری ہونے والی تھی۔

ہمارے سفر کا ایک ماٹو تھا کہ سفر محفوظ، با کفایت اور آرام دہ ہونا چاہیے۔ یہ ماٹو ہمیں شاہد اطہر صاحب نے دیا تھا۔ اس کے تحت جہاں بس سے جا سکتے ہیں وہاں ٹیکسی سے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ دیار غیر میں وطن کی طرح تین وقت تازہ تو کیا باسی کھانا بھی دستیاب ہونا مشکل ہوتا ہے اس لیے اونٹ کی طرح جب ملے اسٹاک کر لینا چاہیے۔ اچھا ناشتہ کر کے آشیانے سے نکلے۔ مقطم چورنگی پر آئے۔ نزدیک ہی ایک منی چینجر تھا اس سے ڈالر تبدیل کرائے۔ ایک ڈالر کے بدلے چھ پاؤنڈ ملے۔ ہمارے ہاں منی چینجر کے آفس میں ایک سیکیورٹی گارڈ تو ضرور ہوتا ہے لیکن میرے خیال میں یہ کوئی یتیم سا منی چینجر آفس تھا۔ جس کی سیکیورٹی کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ بعدازاں تحقیق پر پتا چلا کہ نمائشی سیکیورٹی کی بجائے خفیہ عملی سیکیورٹی کا بندوبست ہوتا ہے جو نظر نہیں آتی۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اگر گارڈ نہ ہو یا چھٹی پر ہو تو بھی یہ بھرم رہتا ہے کہ گارڈ ہوگا۔ ادھر اپنے ملک میں باوردی نمائشی گارڈ سب سے پہلے نشانہ بنتا ہے، مجرموں کو تسلی ہوتی ہے کہ گارڈ ہے یا نہیں ہے۔

اپنی زیڈ اے کی طرح کی چھوٹی ٹویوٹا بھری ہوئی آ رہی تھیں۔ صبح صبح ڈاؤن ٹاؤن کی جانب تمام لوگوں کا رش تھا۔ ایک مخالف جاتی ٹویوٹا ڈرائیور نے چار سواریاں دیکھ کر گاڑی گھمالی اور ہمیں جگہ مل گئی۔ اس دس نشستوں والی ٹویوٹا میں کوئی کنڈکٹر نہیں ہوتا۔ بس ایک ڈرائیور ہوتا ہے جس کو سب استاد کہتے ہیں۔ پیچھے کی سیٹ والے آگے والوں کو پیسے دیتے ہیں اور وہ مزید آگے اس طرح سارا کرایہ استاد کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ استاد سے اگر ضرورت ہو تو بقایا لے کر پیچھے پہنچا دیتے ہیں۔ کرایہ بس ایک پاؤنڈ ہے۔ کھلے کھلے تین آدمی ایک سیٹ پر بیٹھتے ہیں۔ سمرا کیونکہ کچھ زیادہ ہی دبلی پتلی ہیں اس لیے ہم نے اسے اپنی سیٹ پر بٹھا لیا۔ چار پر اعتراض ہوا تو ایک بندہ الگ بیٹھا۔ کھڑے ہو کر سفر کرنا یا لٹک کر سفر کرنا یہاں ناممکن ہے۔ ٹریفک ہمارے ملک کے مخالف دائیں جانب چلتا ہے۔ جس کو اس کی عادت نہ ہو وہ بہت خطرناک غلطیاں کرتا ہے۔ ہم سے بھی اکثر بھول چوک ہوتی رہی۔

مقطم سے دوسری ٹیوٹا میں مسجد عائشہ کے اسٹاپ پر اترے جو مرکزی جگہ ہے اپنے صدر کی طرح لیکن ماحول لی مارکیٹ جیسا ہے۔ فٹ پاتھ پر سڑک پر پتھارے لگے ہیں، ہاتھ میں سامان لے کر بیچ رہے ہیں۔ سائیکل، موٹر سائیکل، ٹھیلے سب پر سامان بک رہا ہے۔ پھل، مرغیاں، بچوں کی چیزیں، موزے، مفلر، کپڑے، لنڈا کا سامان، اپنے پٹھانوں جیسے ٹھیلے، رش، دھکم پیل، بھاگا دوڑی، کئی علاقوں کے لیے بس اڈے۔ فٹ پاتھوں پر فروٹ کے کریٹ جو کھجور کے پتوں کی ڈنڈیوں سے پنجرہ نما بنے ہوئے تھے رکھے تھے۔ دسمبر کے مہینے میں مصری آم اور تازہ کھجوریں بھی دستیاب تھیں۔ مسجد عائشہ سے حرم کے لیے بس پکڑی۔ اس نے ایک جگہ اتار دیا یہ کوئی بس اسٹاپ تھا پل کے نیچے۔ وہاں سے پھر ایک اور بس پکڑ کر اہرام مصر پہنچ گئے۔ اہرام مصر کے ٹکٹ گھر سے 60 پاؤنڈ فی آدمی تین ٹکٹ لیے اور نسرین نے اپنے طالب علم ہونے کے ناتے پچاس پاؤنڈ کی رعایت حاصل کرلی۔ اہرام دیکھنے کے ٹکٹ کے

ساتھ اہرام کے اندر جانے کا ٹکٹ مزید 100 پاؤنڈ کا ہے۔ سینئر سٹیزن کو کوئی رعایت نہیں۔

اہرام مصر جو انسانی دماغ اور ہاتھوں کا ایک شاندار شاہکار ہے اس کے بارے میں لوگوں کو یقین نہیں آتا کہ پانچ ہزار سال پہلے انسان نے یہ کارنامہ کیسے انجام دیا۔ بیس بیس ٹن کے پتھر کیسے اتنی بلندی پر پہنچا دیے۔ اس بے یقینی کی بناء پر ان کے بارے میں طرح طرح کے تصورات قائم کیے گئے۔ ایک تصور یہ ہے کہ یہ اہرام کسی اور سیارے سے آئی ہوئی مخلوق کا کارنامہ ہے۔ کسی انتہائی ترقی یافتہ سیارے سے آئی ہوئی مخلوق نے اس کو اپنا مرکز بنایا تھا۔ اس مرکز سے انہوں نے کرۂ ارض پر بسنے والی وحشی اور جنگلی قوموں کو تربیت دی، انہوں نے ان کو فصلیں کاشت کرنا، عمارتیں بنانا، اور دیگر علوم وفنون سکھائے۔ یہ اہرام ان کے مرکز کے ساتھ ساتھ مختلف غیر مرئی قوتوں کا سرچشمہ تھے۔ یہ قوتیں ان کے لیے عام بات تھی۔ انہوں نے انسان کو انسان بنایا، سائنسی علوم کے ساتھ ساتھ جادوئی علوم بھی سکھائے۔ انہوں نے سالہا سال یہاں کے باشندوں کی تربیت کی۔ ان اہرام میں ہی ان کی رہائش تھی اسی لیے ان اہرام کے ساتھ کسی آبادی والے شہر کے آثار نظر نہیں آتے۔ جب ان کا کام ختم ہو گیا، جب اس دنیا کے باشندوں کو انہوں نے علم و دانش سکھادی، عملی طور پر تربیت دے کر زندگی گزارنے کے قابل کر دیا تو وہ واپس اپنی دنیا میں لوٹ گئے۔

اہرام مصر ایک ٹورسٹ پلیس ہے۔ ہمارے کلفٹن کی طرح بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی بدتمیزیاں یہاں پائی جاتی ہیں۔ انقلاب مصر اور قتل و غارت گری کی وجہ سے آجکل ٹورسٹ انڈسٹری انتہائی مندی کا شکار ہے۔ تانگے والے، گھوڑے والے، اونٹ والے فوٹو گرافر، گائیڈ آپ کے معاملات میں گھسے چلے آتے ہیں۔ اپنے کلفٹن میں اگر آپ غلطی سے ساحل پر کسی کرسی پر بیٹھ جائیں تو بندہ بندی دیکھ کر پچاس سے دو سو روپے تک اینٹھ لیتے ہیں، آدمی اپنی عزت بچانے کی خاطر کچھ دے کر جان چھڑاتا ہے۔ یہی حال یہاں ہے۔ پوچھے بغیر ہسٹری بیان کرنا شروع کر دیں گے۔ چپک جائیں گے آپ کی پرائیویسی کا ستیاناس کر دیں گے۔ ہر شخص یہاں گائیڈ ہے۔ کسی نے آپ کو ایک بات بھی بتا دی تو بخشش مانگے گا۔ ایک جگہ نسرین اونٹ کے ساتھ میرا فوٹو لے رہی تھی۔ اونٹ بیٹھا ہوا تھا۔ اونٹ والا آیا اور مجھے اٹھا کر اس پر بٹھا دیا میں نا نا کرتا رہا لیکن وہ باز نہ آیا۔ لگتا تھا کہ شکار اس کے ہاتھ آ گیا ہے۔ کیمرا ہاتھ سے لے کر شروع ہو گیا۔ اس کے بعد سو پاؤنڈ کی طلب۔ بات خراب ہوئی۔ نسرین نے ٹورسٹ پولیس کو فون کرنے کا کہا تو بھاگ گیا۔ شکر ہے کہ وہ لوگ اپنی پولیس کی اتنی عزت تو کرتے ہیں۔ ویسے اس کی کھینچی ہوئی تصاویر دورے کی بہترین تصاویر ہیں۔ بڑی مشکلوں سے ان لوگوں سے جان چھڑائی۔ میں ہر پتھر کو دیکھتا رہا کہ ابھی پارس ملا کہ ملا۔ جیب میں ایک بولٹ بھی لوہے کا رکھا ہوا تھا کہ ہاتھ کے ہاتھ ٹیسٹ بھی کر لوں گا۔ گہرے نیلے رنگ کے پتھر میں سنہری لائنیں بال جیسی باریک اس کی پہچان تھی جو بچپن سے میرے ذہن میں نقش ہیں۔ بس سمجھیں کہ پارس ہاتھ آوے ہی آوے۔

یہاں تین اہرام نمایاں نظر آتے ہیں۔ سب سے بڑا اہرام بادشاہ خوفو Khufu یا خوفون کا ہے۔ جو 2550 قبل از مسیح یعنی آج سے 4560 سال پہلے بنایا گیا تھا اس کی اونچائی 461 فٹ یا 147 میٹر ہے۔ خوفو مصر کی چوتھی شہنشاہیت کا دوسرا بادشاہ تھا۔ اس کے باپ کا نام سنیفرو Snefro تھا۔ مشہور سیاح اور تاریخ دان ہیروڈوٹس نے لکھا ہے کہ خوفو نے مقبرہ یا اہرام بنانے کے لیے اپنی رعایا کو غلام بنایا تھا، لیکن ماہرین آرکیالوجی کے مطابق ایسا نہیں تھا۔ آثار قدیمہ سے نکلنے والے ڈھانچے ان مصریوں کے ہیں جنہوں نے یہ اہرام تعمیر کیے تھے۔ یہ دیہاتی تھے اور بستیوں میں رہتے تھے۔ یہ فرعونوں کے سپروائزروں کے پاس مزدوری کرتے تھے۔ ان میں پیشہ ور مزدور مستری بھی تھے اور بیکری والے بھی تھے جو ہزاروں روٹیاں مزدوروں کے لیے بناتے تھے۔ گوشت والے، غلہ فراہم کرنے والے، علاج معالجہ کرنے والے غرض تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق آثار پائے گئے ہیں لیکن غلامی کے آثار کہیں نہیں پائے گئے۔ کچھ لوگ فرعون کے تعمیری کاموں کے مستقل ملازم تھے اور کچھ کام کرنے آجاتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ شواہد بتاتے ہیں کہ ان کارکنوں میں خواتین بھی شامل تھیں۔ خواتین تعمیری کاموں میں بھی حصہ لیتی تھیں۔ کچھ لوگوں کو اپنے کام پر فخر تھا۔ انہوں نے مختلف ناموں سے اپنی تعمیری کمپنیاں یا گروپ بنا رکھے تھے۔ دریافت ہونے والے ناموں میں فرینڈز آف خوفو وغیرہ شامل تھے۔ بیس تا تیس ہزار مزدوروں نے اسی سال تک محنت مزدوری کر کے ان تین اہرام کو بنایا تھا۔ یہ دریائے نیل کے کنارے بنائے گئے تھے۔ اب یہ دریا یہاں سے کچھ دور بہتا ہے۔ کام میں اس وقت تیزی آتی تھی جب دریا میں طغیانی ہوتی تھی تو پتھر کشتیوں میں دور تک آسانی سے چلے جاتے تھے۔ اہرام کے دامن تک کشتیاں چلی جاتی تھیں جن میں بھاری پتھر لائے جاتے تھے۔ ان

پتھروں کو کاٹ کر شکل و صورت دینا اور پالش کرنا بھی یہیں ہوتا تھا۔ اس کے بعد چڑھائیوں پر دھکیل کر نصب کرتے تھے۔ انجینئرز، علم نجوم کے ماہر، مذہبی پروہت مل کر جگہ کا تعین کرتے تھے۔ مذہبی رہنما اور علم نجوم والوں کا کافی اثر سوسائٹی اور بادشاہوں پر تھا۔ مزدور سے انجینئر تک اور ماہر علم فلکیات سے مذہبی پروہت تک سب نے مل کر یہ انجینیرنگ کے لافانی شاہکار تخلیق کیے۔

خوفو کا مقبرہ یا بڑا اہرام انسانی ہاتھوں کا بنا ہوا دنیا کا سب سے بڑا شاہکار کہلاتا ہے جو ساڑھے چار ہزار سال سے آسمان کی جانب سر اٹھائے انسانی کام کی عظمت کو بلند کیے ہوئے ہے۔ ہم نے اس کی سیر کی۔ اس کے اوپر جتنی ہمت تھی اتنے اوپر چڑھے۔ اس کے اندر گئے۔ اندر ایک آدمی کی چوڑائی کی سیڑھیاں ہیں۔ ایک جائے تو دوسرا اس کو رک کر راستہ دے۔ اس میں آسانی کے لیے سیڑھیاں اور اترنے چڑھنے کے لیے ریلنگ لگائی گئی ہے۔ اس کے اندر پہلے ہم سو کے قریب سیڑھیاں اترے پھر اتنی ہی چڑھے۔ کہیں جھکے کہیں لیٹے کہیں رینگ کر گزرے اور ایک ایسے کمرے میں پہنچ گئے جہاں سے خوفو اور دوسرے افراد کی ممیاں برآمد کی گئی تھیں۔ یہاں ایک جدید مشین رکھی تھی شاید ہوا سپلائی کرنے کی ہوگی۔ پورے اہرام میں روشنی اور ہوا کا انتظام ہے کہیں اندھیرے یا گھٹن کا احساس نہیں ہوا۔ یہ کمرا اندازاً دس بائی دس بائی آٹھ فٹ کا ہوگا۔ اندر ہر جگہ کیمرے لگے ہیں جن کو مانیٹر بھی کیا جاتا ہے۔ اگر اندر زیادہ افراد ہو جائیں تو داخلہ روک دیا جاتا ہے۔ اندر فوٹو لینا ممنوع ہے لیکن پاکستانی اپنا کام چلانا جانتے ہیں اور ہم پاکستانی ہیں چائے پانی دینے کے عادی ہیں۔ سو اندر ہم نے ایک ساڑھے چھ فٹ کے گارڈ کے ساتھ تصاویر کھنچوائیں۔ ان بادشاہوں کا عقیدہ تھا کہ وہ مرنے کے بعد مردوں کے بادشاہ ہوں گے۔ وہ تمام لوگ جو مر چکے ان کی ایک لافانی زندگی شروع ہوتی ہے جس میں ان کی بادشاہت اسی طرح ہوگی۔ اسی لیے وہ اپنے مقبرے تو ایسے مضبوط بناتے تھے لیکن رہنے کے محلات ندارد۔ ایک بادشاہ اور پھر دوسرے جہان کے بادشاہ کو اسی شان و شوکت سے تمام ضرورت کے سامان کے ساتھ دفن کرتے تھے جو آیندہ زندگی میں اس کی شان و شوکت اور ضروریات کے لیے کام آسکے۔ ہتھیار، خوراک میں غلہ اور شہد، زیورات، سونے کے تاج، روزمرہ زندگی میں کام آنے والے اوزار، برتن، چھریاں، رتھیں اور بہت سا سامان انہوں نے اپنی آیندہ زندگی کے لیے ان اہراموں میں محفوظ کیا تھا۔ سارا اہرام چھان مارا لیکن پارس نہ ملا۔

خفری کا اہرام سن 2520 قبل از مسیح بنایا گیا تھا۔ اس کی اونچائی 471 فٹ یا 144 میٹر ہے۔ خفری خوفو کا بیٹا تھا۔ اس اہرام کی بنیاد بہت اونچی ہے لیکن اونچائی باپ کے اہرام سے کم ہے۔ اس کی لاش والے کمرے میں ایک گڑھا تھا جس

پہچان یہ ناز تو پہچان جایئے

45 منٹ کا یہ پروگرام جسے یاور مہدی پیش کرتے تھے ہر عمر کے لوگوں میں مقبول تھا جسے لوگ باقاعدگی سے سنتے تھے۔ اس پروگرام کا فارمیٹ یہ تھا کہ جب پروگرام ”پہچان یہ ہے ناز تو پہچان جایئے“ شروع ہوتا تو ایک گانے یا غزل کی کوئی سطر سنا دی جاتی یا پھر کسی افسانہ نگار کے افسانے یا ناول نگار کے ناول سے چند ایک پیراگراف سنا دیا جاتا اور پھر سوال کیا جاتا تھا کہ کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ افسانہ کس کا ہے؟ یا یہ نظم کس شاعر کی ہے؟ اور یہ نغمہ کس گلوکار نے گایا ہے؟ اس کے ساتھ یہ بھی اعلان کیا جاتا تھا کہ صحیح جواب دینے والوں کو ریڈیو پاکستان کی جانب سے انعامات دیے جائیں گے اور پھر ریڈیو کا نمبر سامعین کو بتایا جاتا تھا جو 70761 تھا۔ پھر پروگرام شروع ہوتے ہی کالز کا تانتا بندھ جاتا تھا اور ریڈیو میں لوگ پوچھے گئے سوالات کا جواب دینے لگتے۔ اس پروگرام کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک بار پاکستان بھر سے پروگرام میں شامل ہونے کے لیے عوام نے لگاتار اتنی کالیں کیں کہ گارڈن پر قائم ٹیلی فون ایکسچینج کی تاروں میں بری طرح آگ لگ گئی جس کے بعد ٹیلی فون کے محکمہ کی جانب سے ریڈیو پاکستان کو ایک خط لکھا گیا جس میں گزارش کی گئی کہ اس پروگرام کو براہ کرم ختم کردیا جائے کیونکہ جب یہ شروع ہوتا ہے تو ٹیلی فون ایکسچینج پر بے پناہ دباؤ پڑ جاتا ہے جس سے دوبارہ لائنیں جلنے کا خطرہ ہے۔

اقتباس: یاور مہدی از عون عباس
مرسلہ: محمد شہزاد۔ کراچی

میں اس کے دل گردے وغیرہ کے مرتبان رکھنے کی جگہ تھی۔ یا تو دماغ ضائع کر دیا جاتا تھا یا ضائع ہو گیا تھا۔ اندرونی اعضاء مع آنتوں کے جارز میں رکھ کر محفوظ کر دئے جاتے تھے۔ اس اہرام کو باہر سے دیکھا۔ اس کے اندر جانے کا راستہ آرکیالوجی والوں نے بند کیا ہوا تھا۔

فرعون مینکورا کا اہرام 213 فٹ یا 65 میٹر بلند ہے جسے 2490 قبل از مسیح میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ باقی دونوں اہراموں سے چھوٹا ہے۔ جگہ تو بہت تھی لیکن شاید وقت یا لاگت کی کمی سے چھوٹا بنایا گیا تھا۔ یہ مصر کی چوتھی شہنشاہیت کا چھٹا بادشاہ یا فرعون تھا۔ مصری بادشاہ اس وقت فرعون کہلاتے تھے۔ یہ اہرام نیچے سے گرینائٹ کا بنا ہوا ہے اور اوپر کا حصہ جس میں تابوت رکھا گیا ہے وہ گرینائٹ سے بھی سخت پتھر costlier سے بنایا گیا ہے۔ مینکورا اچانک مر گیا تو اس کے بیٹے شیکسپیئر نے اسے مکمل کرایا۔ لیکن اینٹوں سے کرایا۔ اس کا بیس یا چبوترہ 339 فٹ اونچا ہے

اس فرعون کا اندرونی کفن بہت خوبصورت تھا۔ کفن پتھر کا بنا ہوا تابوت ہوتا ہے۔ جس کا نیچے اور اوپر کا حصہ ایک ہی پتھر کا بنا ہوتا ہے۔ نیچے کا مستطیل خانہ ایک پتھر میں خلا کر کے بنایا جاتا ہے اور اوپر کا ڈھکنا بھی اسی پتھر سے کاٹ کر بنایا جاتا ہے۔ یہ کم از کم پندرہ ٹن کے ایک پتھر سے بنا ہوتا ہے۔ اس ایک کفن کو ایسے ہی دوسرے کفن میں اور کہیں تو ان دونوں کو تیسرے کفن میں رکھا ہے۔ سب سے اندرونی کفن کے ڈھکن کو چار پانچ آدمی ہلا بھی نہیں سکتے۔ مینکورا کے کفن سے کچھ ہڈیاں برآمد ہوئی تھیں جن کی کاربن ڈیٹنگ سے یہ صرف 2000 سال پرانی پائی گئیں۔ یہ سن 1835 عیسوی کی بات ہے۔ شاید رومن دور میں کسی نے لاش تبدیل کر دی ہو گی۔ اس فرعون کی بعد از مرگ پُراسرار طاقت کا مظاہرہ اس وقت دیکھنے میں آیا جب اس کے خوبصورت کفن کو ایک بحری جہاز سے برطانیہ لے جایا جا رہا تھا۔ مالٹا اور کارتھیجنا کے درمیان یہ جہاز ڈوب گیا اور یہ خوبصورت کفن آج بھی ان دونوں بندرگاہوں کے درمیان سمندر میں دفن ہے۔ بعض لوگ اس جہاز کے ڈوبنے کو مینکورا کی لاش کی نحوست اور بعض اس کی طاقت کو قرار دیتے ہیں۔ اس کفن کے اوپر جو کفن تھا وہ آجکل لندن کے عجائب گھر میں زیر نمائش ہے۔

صلاح الدین ایوبی کے بیٹے الملک العزیز عثمان بن یوسف نے سن 1195 عیسوی میں تمام اہرام گرانے کی کوشش کی اور ابتداء مینکورا کے اہرام سے کی۔ مسلسل تین ماہ تک وہ انہیں گرانے کی کوشش کرتے رہے۔ دن بھر میں ایک یا دو پتھر گرا پاتے۔ رسیوں، بیلیوں، لیور اور افرادی قوت سب آزمائیں لیکن ناکام رہے۔ آخر تنگ آکر چھوڑ گئے۔ فرعونوں کی بددعا سے وہ صرف 27 سال کی عمر میں شکار کھیلتے ہوئے مر گیا۔

تینوں اہراموں کی خوب خوب سیر کی، ندیدوں کی طرح دل بھر کر دیکھا، ہاتھ لگا کر دیکھا، ٹھوک بجا کر دیکھا، چھو چھو کر دیکھا بس چکھ کر نہیں دیکھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔ اہرام دیکھنے کے بعد آخر ہم کنجوسوں نے ایک تانگہ بالکل پاکستانی طرز کا سیر کرنے کے لیے لے لیا۔ اس نے ہمیں تینوں اہرام کا ایک چکر لگوایا۔ ہر ٹورسٹ مقام پر کچھ خاص زاویے فوٹو جینک ہوتے ہیں جن سے مقامی واقف ہوتے ہیں۔ کوچوان سے ہم نے خوب فوٹو بنوائے۔ ایک ایک سین کو تین تین کیمروں میں محفوظ کرایا۔ وہاں سے ہم تانگے میں ابوالہول کے مجسمے پر اتر گئے۔

ابوالہول جسے Sphinx بھی کہتے ہیں ایک چٹان کا تراشہ ہوا دنیا کا سب سے بڑا مجسمہ ہے۔ Sphinx ایک تخیلاتی شے ہے جس میں جسم شیر کا اور سر انسان کا ہوتا ہے۔ انگریزی میں اس کے معنی دہشت کا باپ ہیں۔ اس کی لمبائی 241 فٹ اور چوڑائی 20 فٹ اونچائی 66 فٹ ہے۔ یہ فرعون خفرو یا خفرا کے دور (B.C 2532-2558) میں بنایا گیا تھا۔ یہ اپنی تعمیر کے صدیوں بعد 1880 عیسوی میں آدھا ریت میں دبا ہوا تھا۔ یہ ایک اکیلی چٹان کو تراش کر بنایا گیا ہے جو سنہری رنگ کی ہے۔ اس کو تراشتے تراشتے جب نیچے کی جانب آئے تو پورا جسم بنانے کے لیے اس کے اطراف کی چٹانیں اس طرح تراشیں کہ یہ ایک گڑھے میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس گڑھے میں ریت کا جمع ہونا اس صحرائی علاقے میں قدرتی امر ہے۔ اب بھی اس کی صفائی میں منوں ریت ماہانہ صاف کی جاتی ہے۔

اس کے بارے میں کوئی تحریر، اس کا نام یا اس کے بنانے کا مقصد کسی پرانی تحریر میں نہیں ملتا۔ اس عظیم الشان مجسمے کا سب سے پہلا نام مصر کی نئی شہنشاہیت یعنی سولہویں صدی تا گیارہویں صدی قبل از مسیح میں ملتا ہے۔ اس کو ایک دیوتا Akhet-em-Hor انگریزی میں Horus کا نام دیا گیا۔ مشہور نام Sphinx اس کو اس کی بناوٹ کے دو ہزار سال بعد دیا گیا جب یونانیوں نے اسے اس خیالی روپ کا نام دیا جس میں جسم شیر کا، سر عورت کا اور اس کے اڑنے والے لمبے کھلے پر ہوتے تھے۔ شباہت کی بناء پر یہ نام تو دے دیا لیکن اس کے نہ پر ہیں نہ عورت کا سر۔ اس کا سر کسی فرعون کی شباہت

قاتل ریسلر

اوکس بیکر

اوکس بیکر نے جان بوجھ کر قتل نہیں کیا بلکہ وہ ایسے بدقسمت ریسلر رہے جن کے ہاتھوں ریسلنگ رنگ میں حادثاتی طور پر دو ریسلر مارے گئے۔ پہلے تو 1971 میں وہ البرٹو ٹورس سے مقابلہ کررہے تھے مگر اوکس کے اختتامی داؤ کے نتیجے میں البرٹو عارضہ قلب کے نتیجے میں چل بسے۔ اس سے اگلے سال رے کینکل نامی ریسلر بھی اوک کے ساتھ مقابلے میں ہارٹ اٹیک کے نتیجے میں ہلاک ہوگئے تاہم اوکس بیکر کو کبھی اس واقعات پر الزامات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

ورنے گینگ Verne Gagne

اپنے دور میں یہ چند بڑے ریسلرز میں سے ایک تھے اور امریکن ریسلنگ ایسوسی ایشن کے کرتا دھرتا تھے، جہاں سے ہلک ہوگن نے ریسلنگ کا آغاز کیا۔ 2009 میں الزائمر کے شکار ہونے کے بعد وہ اسپتال میں داخل تھے جہاں انہوں نے باڈی سلیم کے ذریعے ساتھی مریض کو قتل کردیا تاہم مرض کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے انہیں مقدمے کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

گریٹ کھالی

ڈبلیو ڈبلیو ای کی تاریخ کے سب سے طویل قامت ریسلر سمجھے جانے والے انڈین نژاد کھالی ہیوی ویٹ چیمپئن بھی رہے، مگر اے پی ڈبلیو میں ان کے ہاتھوں ریسلنگ میچ میں ایک شخص حادثاتی طور پر مارا گیا جس کے نتیجے میں کمپنی کو ملین ڈالرز کے ہرجانے کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم ریسلنگ میچ کی وجہ سے گریٹ کھالی سزا پانے سے بچ گئے۔

مرسلہ: یوسف وسیم۔ ملتان

کا ہے۔ خیال ہے کہ اس کا سر اس کے بنانے والے فرعون خفرا کا مجسمہ ہے۔ اس کی تعمیر اگرچہ خفرا کے کھاتے میں ڈالی جاتی ہے لیکن ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ جس نے بھی بنایا شاہکار بنایا، کمال کردیا۔ یہ عظیم الشان مجسمہ ساڑھے چار ہزار سال سے وادی نیل میں سر اٹھائے کھڑا ہے جو قابل دید ہے۔ اسے ایسے مرکزی مقام پر بنایا گیا ہے جیسے یہ تینوں اہرام کی حفاظت کررہا ہو۔ اس سارے نظارے کو دیکھ کر انسان کسی طلسمی دنیا میں کھو جاتا ہے یا صدیوں پیچھے کے ماحول میں گم ہوجاتا ہے۔ رومنوں پر الزام ہے کہ انہوں نے اس کا چہرہ مسخ کیا۔ رومن ہوتے تو وہ بتاتے کہ ہم نے تو کبھی اپنے آپ کو بت شکن نہیں کہا۔ ہم نے کبھی بت نہیں توڑے۔ ہمیں تو بت بنانے والوں سے لڑنے بھڑنے سے ہی فرصت نہ ملی۔ تحقیق طلب ہے کہ اس خوبصورت شاہکار کو رومنوں نے نقصان پہنچایا یا مسلمانوں نے۔ ہوسکتا ہے کہ سلطان صلاح الدین کے بیٹے نے جہاں اہرام گرانے کی کوشش کی ہو وہاں اسے بھی نقصان پہنچایا ہو۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ پارس کی تلاش کرنے والوں نے اس کے اندر پارس تلاش کرنے کے لیے اسے نقصان پہنچایا۔

اس سارے علاقے میں صرف یہ تین اہرام اور ایک ابوالہول ہی واقع نہیں۔ اِدھر اُدھر بیسیوں چھوٹی موٹی تعمیرات بکھری ہوئی ہیں جن میں بیسیوں چوکور، شکستہ، ٹوٹے پھوٹے اہرام واقع ہیں۔ ان میں اکثر اوپر سے سپاٹ چبوترے کی طرح ہیں۔ رہائشی تعمیرات کا ابھی کوئی ثبوت نہیں ملا۔ نعشوں کو اور روحوں کو اگلے جہان کے لیے تیار کرنے کے لیے یہاں نہر، تالاب گودیاں وغیرہ بھی بنائی گئی تھیں جو ابھی تک محفوظ ہیں۔ دریائے نیل سے ایک نہر اس علاقے تک لائی گئی تھی جس میں روح کو ایک خوبصورت کشتی کے ذریعے دریائے نیل میں روانہ کیا جاتا تھا۔ اس کشتی کی اس دور کی پینٹنگز قاہرہ میوزیم میں موجود ہیں۔

دل تھا کہ ان مافوق الفطرت اہراموں سے بھرتا ہی نہیں تھا۔ پیدل چل چل کر تھک گئے تھے۔ سفر تو ویسے ہی مختصر سی ہے۔ اس کو دیکھ کر ترس آرہا تھا۔ ایک جگہ سے نسرین نے اندازہ لگایا کہ جس آخری اسٹاپ سے آئے تھے وہ یہیں کہیں سامنے نکل کر ہے۔ اندازہ تو صحیح تھا۔ لیکن فاصلہ بڑھ گیا۔ تین کلومیٹر چلنے کے بعد اس پل کے نیچے کے اسٹاپ پر پہنچے۔ وہاں سے بس پکڑ کر سیدہ عائشہ آئے۔ پھر بس بدل کر معظم آئے۔ معظم سے دو موبائل سم خریدیں اور ایک جگہ کشری کھائی۔ جیسے ہمارے ہاں کسی مخصوص ڈش کے لیے ہوٹل مشہور ہوتا ہے ایسے ہی معظم چوک پر کشری کا مشہور ہوٹل ہے۔ یہ اپنی پلاؤ سے ملتی جلتی کوئی چاول کی ڈش ہے۔ اچھی مزیدار چیز ہے۔ پانچ پاؤنڈ کی سم اور دس پاؤنڈ کا بیلنس اتنا تھا کہ ہمارے پندرہ دن کے دورے میں یہ ہمیں کافی ہوگیا۔ معظم سے آشیانہ چند منٹ کی واک پر تھا۔ یوں ہمیں دن میں تین چار بار یہ واک مفت میں مل جاتی۔ دن بھر کی تھکن ہم نے آشیانے پر آکر اتاری پھر تازہ دم ہوکر چائے پی اور دوبارہ نکل پڑے۔

مسجد الحسین قاہرہ کے وسطی علاقے میں واقع ہے۔ خان الخلیلی مارکیٹ اس سے متصل ہے۔ اس مارکیٹ میں سووینیر اور ہینڈی کرافٹ کی بیشمار دکانیں ہیں۔ مصر میں سیلز گرلز کا رواج عام ہے۔ بزنس مین یہاں میمن بھائیوں کی طرح اپنے لڑکے لڑکیوں کو بچپن سے بزنس سکھاتے ہیں۔ ایک بڑی دکان جس میں لاکھوں کا مال تھا اس کے سامنے ایک اسٹینڈ پر ایک لڑکی کچھ سووینیئر فروخت کررہی تھی۔ اس سے مزید کچھ مانگا تو اس نے ابی کہہ کر اپنے باپ کو پکارا اور مزید کچھ منگایا۔ ہر شاپنگ سینٹر میں آپ کو سیلز گرلز اور سیلز آنٹیاں عام نظر آئیں گی۔ مصر میں دکانوں کے باہر شٹر کا رواج کم ہے۔ بس شیشے کا دروازہ کافی ہوتا ہے۔ دکان کے باہر قیمتی سجاوٹ کا رواج بھی ہے۔ پیتل کے بنے مجسمے اور دیگر سامان رکھا ہوتا ہے۔ یہ خطرہ نہیں کہ کوئی ہیرونچی اس کو اکھاڑ کر فروخت کردے گا۔ اسٹیل کی بنی خوبصورت گرلز بھی دست برد سے بچی ہوتی ہیں۔ مسجد الحسینی میں یہاں کی روایت کے مطابق حضرت امام حسینؓ ...... سر مبارک دفن ہے۔ ہم جب وہاں پہنچے تو آٹھ محرم کی تاریخ تھی۔ مسجد اندر سے بند تھی اور داخلہ محدود تھا۔ ہم گئے تو ہمیں دیکھ کر چوبداروں نے دروازہ کھول دیا۔ اندر جا کر پتا چلا کہ کچھ لوگ بڑی مزیدار کھیر ڈبوں میں تقسیم کررہے ہیں۔ فقیروں کو روکنے کے لیے ہی دروازہ بند ہے۔ ہم نے بھی کھیر لے لی۔ دو دو ڈبیاں حصے میں آئیں جو ہم نے فریج میں رکھ رکھ کر کھائیں۔ اندر لوگ امام حسینؓ .... کے سر مبارک کے روضے پر فاتحہ پڑھ رہے تھے، کچھ دعائیں مانگ رہے تھے۔ کچھ قرآن خوانی کررہے تھے۔ جالیوں میں بہت کم جگہ تھی لیکن جو بھی تھی اس میں سے لوگ خط لکھ کر اندر ڈال رہے تھے۔ سنہری جالیاں قبر کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ وسیع عریض مسجد میں دو جگہ درس ہو رہا تھا بغیر لاؤڈ اسپیکر کے۔ تیس پینتیس آدمی ایک ایک جگہ تھے۔ مسجد اندر سے بہت خوبصورت ہے۔ کئی منزلہ منبر ہے۔ قاہرہ کی تمام مسجدوں کی طرح اس مسجد کی چھت بھی بہت اونچی ہے۔ باہر سے روشنی میں پوری جگمگ کرتی ہے۔ ہم یہاں ونڈو شاپنگ کررہے تھے کہ سردی کی وجہ سے واش روم کی ضرورت پیش آگئی۔ اسے یہاں حمام کہتے ہیں۔ ایک دکاندار سے پوچھا تو اس نے راستہ بتا دیا۔ اندر وہی استادی کہ مقامی تو بغیر پیسے کے استعمال کررہے ہیں اور ہم سے پیسے طلب۔ ہم بھی بے عزتی خراب میں سمرا کے شاگرد تھے۔ سنی ان سنی کرکے سیدھے چل دیے اور کچھ دیے بغیر واپس آگئے۔ خانہ الخلیلی میں خوب اچھی طرح ونڈو شاپنگ کرکے اور دکانداروں کو صبر کا امتحان اے ون گریڈ میں پاس کرا کر واپس آشیانے پر چلے آئے۔

سیدہ عائشہ جانے والی بس قلعہ صلاح الدین سے گزرتی ہے۔ بس سے اتر کر گیٹ سے پچاس پاؤنڈ فی آدمی کے حساب سے ٹکٹ لیے اور اندر داخل ہوگئے۔ مشہور سلطان صلاح الدین ایوبی نے یہ قلعہ مقطم کی پہاڑیوں پر 1176 تا 1183 عیسوی میں بنوایا تھا۔ صلیبی جنگوں میں شہر کی حفاظت کے پیش نظر یہ قلعہ تعمیر کرایا گیا تھا۔ فاطمی خلافت کو زیر کرنے کے چند سال بعد سلطان صلاح الدین نے پورے قاہرہ اور فسطاط کے گرد فصیل اور قلعہ بنانے کا پروگرام تیار کیا۔ جو اس کی وفات کے بعد بھی جاری رہا۔ اور دونوں شہروں کی حفاظت کا بندوبست ہوگیا۔ اس طرح ایک ہی فوج دونوں شہروں کی حفاظت کرتی۔ انیسویں صدی عیسوی تک یہ حکومت کا مرکز رہا۔ 1860 میں خدیو اسمٰعیل دارالخلافہ کو عابدین پیلیس لے آیا جو اسمٰعیلیہ کے نزدیک تھا۔

سلطان صلاح الدین نے ایک کنواں اس قلعے میں 280 فٹ گہرا کھدوایا تھا، جس میں پانی تک تین سو سیڑھیاں گھومتی ہوئی جاتی تھیں۔ الناصر محمد کے زمانے میں یہ کنواں جس کا نام جوزف تھا لشکر کے لیے ناکافی ہوا تو پانی کا ایک ایسا سسٹم الناصر محمد نے بنوایا جس میں چرخیوں کے ذریعے پانی دیوار پر اور پھر قلعے میں آجاتا تھا۔ مملوک دور میں بھی پانی کے لیے مزید بندوبست کیے گئے۔ قلعے کے اندر ناصر محمد نے ایک شاندار مسجد 1318 عیسوی میں بنوائی جو آج بھی اپنی آن بان شان سے موجود ہے اور اس میں نماز پڑھی جاتی ہے۔ اس تاریخی قلعے کا ناصر محمد نے سن 1335 عیسوی میں جنوبی حصہ بنوایا جبکہ شمالی حصہ سلطان صلاح الدین نے بنوایا تھا۔ اس میں رہائشی علاقے اور حرم بھی بنوایا گیا۔ اس قلعے میں 1848۔ 1828 میں محمد علی پاشا نے ایک مسجد محمد علی بنوائی تھی جو آج بھی قائم ہے اس کے پتھر کے گول ستون بیس تا تیس فٹ اونچے گرینائٹ کے ہیں۔ ہر ستون ایک ہی پتھر کا تراشا ہوا ہے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں ایک مسجد الناصر محمد قلعون اور چودھویں صدی عیسوی میں ایک مسجد سلیمان پاشا نے بنوائی تھی۔ اس قلعے میں ایک نوجوان اپنی بیگم اور اپنی کوئی چھ ماہ کی بچی کو بچہ گاڑی میں لیے ہوئے گھوم رہا تھا۔ بیگم نے نقاب پہنا ہوا تھا۔ نزدیک پہنچے تو پاکستانی نکلا، بہت دل خوش ہوا، ورنہ تو جو بھی اپنے جیسا نظر آتا وہ انڈین ہی نکلتا۔

قلعہ صلاح الدین میں ایک میوزیم بھی موجود ہے جو مصر کی نئی پرانی تاریخ پر مشتمل ہے۔ اس میں جہاں ناصر، ور

حسنی مبارک کے مجسمے رکھے ہیں۔ کمال پاشا اور بہت سے پاشاؤں کے مجسمے رکھے ہیں۔ باہر کی جانب دیواروں پر پرانے ہتھیار، تیر کمان، رتھ تلواروں سے لے کر ماڈرن ٹینک اور طیاروں کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ یہ میوزیم مسجد محمد علی کے جنوب میں نیچے کی جانب واقع ہے۔ اس میں کیمرا لے جانے کا ایک پاؤنڈ کا ٹکٹ لیا گیا۔ اس میوزیم کو حریم پیلیس بھی کہتے ہیں۔ محمد علی پاشا نے اس کو 1814 تا 1827 اپنے دور حکومت میں بنوایا تھا۔ اس میں اس کا شاہی خاندان رہتا تھا۔ شاہی خاندان نے اس کو سن 1874 میں چھوڑ دیا تھا اور 1946 سے اس میں عجائب گھر قائم ہے۔ اس عمارت کو یونانی، ترک، بلغاریہ اور البانیہ کے ماہرین نے بنایا تھا۔ اسی لیے یہ اتنی شاندار ہے۔ یہ دو منزلہ ہے اور اس میں بیرکس، اسکول، بارود فیکٹری، اسلحہ خانہ، اسلحہ سٹور اور سکے بنانے کا کارخانہ بھی قائم تھا۔ سن 1822 میں آگ لگنے سے اس کا لکڑی کا اسٹرکچر تباہ ہوگیا تھا۔ محمد علی پاشا نے اس کو دوبارہ ٹھیک ٹھاک کرا کر ماربل کا شاندار فوارہ، ایک شیر، دو چیتے اور ایک ہاتھی کا مجسمہ بھی بنوا کر اس میں خوبصورتی کے لیے نصب کرائے۔ ایک بار پھر 1824 میں بارود خانے میں دھماکے سے یہ جل گیا۔ اس مرتبہ محمد علی پاشا نے اٹلی سے ماربل منگوا کر اس کو بنوایا۔ اس میں اب پرانی رتھیں، ہتھیار، مختلف طرح کی پرانی مشینری کے ماڈل جو جنگ میں استعمال ہوتی تھیں، قلعہ توڑنے کی مشینوں کے ماڈل، پرانے بادشاہوں سلطانوں کے مجسمے غرض یہ عجائب گھر فراعنہ مصر کا دور، یونانی دور، اسلامی دور اور ماڈرن دور کا احاطہ کرتا ہے۔ مصر اسرائیل جنگ کے وقت جو اجلاس فوجیوں کا ہوا تھا اس موقع کو ایک مجسماتی ماڈل کے طور پر بنایا گیا ہے۔ اسرائیل کے تباہ شدہ طیارے کا ایک پر بھی یہاں موجود ہے۔ اوپن ایریا میں ماڈرن جنگی مشینیں جو اب مصری فوج کے استعمال میں ہیں جس میں توپیں، مشین گنیں ٹینک وغیرہ شامل ہیں وہ رکھی ہیں۔ یہ تمام گھوم پھر کر واپس آئے۔ میں نے اور سمرا نے مل کر آلو مٹر پکائے۔ خوب مزے سے کھائے اور شام کو لائٹ اینڈ ساؤنڈ شو دیکھنے کی تیاری کی۔ کھانا کھا کر دوبارہ نکل گئے کہ گھوم پھر کر وقت پر لائٹ اینڈ ساؤنڈ شو دیکھ لیں گے، کیونکہ یہ آج انگریزی میں تھا۔

مصر ایک ہائی کلاس ٹورسٹ ملک ہے۔ اس کی معیشت میں سیاحت اہم ترین ذریعہ آمدنی ہے۔ اس کے لیے انہوں نے فراعین مصر کے دور کو بہت زیادہ ہائی لائٹ کیا ہے۔ اس کی نسبت اسلامی دور کو اتنا ہائی لائٹ نہیں کیا۔ ویسے بھی اسلامی دور

ٹورنٹو

صوبہ آنٹیریو کا صدر مقام۔ آبادی 40,00000 یہاں دنیا کی مختلف قومیتوں کے افراد آباد ہیں۔ کینیڈا میں مقیم چینیوں کی سب سے بڑی تعداد اسی شہر میں رہتی ہے۔ اسی طرح اطالویوں کی بھی بہت بڑی تعداد ٹورنٹو میں مقیم ہے۔ ٹورنٹو کا آن ٹاور یہاں کی بہترین عمارت ہے اس کی سب سے اوپر کی منزل سے پورے شہر کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ 555 میٹر (یا 1820 فٹ) بلند یہ ٹاور بغیر کسی سہارے کے کھڑا دنیا کا بلند ترین ٹاور ہے۔

یہ شہر شمالی امریکا کا ایک اہم سیاحتی مرکز بھی ہے۔ اسے کینیڈا کی اقتصادی و معاشی سرگرمیوں کا مرکز ہونے کا شرف حاصل ہے۔ چائنا ٹاؤن کے علاقے میں وکٹورین طرز کے مکانات بنے ہوئے ہیں۔ ٹاور سے کچھ فاصلے پر فورٹ پارک ہے، جس میں برطانوی فوج کے انیسویں گریژن رہتی تھی فنون لطیفہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک آرٹ گیلری بھی ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں ٹورنٹو ان تین قلعوں کے نام کے طور پر استعمال ہوتا تھا، جنہیں فرانسیسیوں نے تعمیر کرایا تھا، تاکہ ریڈ انڈینز کے ساتھ اپنی تجارت کو انگریزوں اور دوسری یورپی اقوام کی طرف سے کسی خطرے سے محفوظ بنایا جاسکے۔ جب 1759ء میں فرانسیسیوں کو شکست ہوئی تو قلعے مسمار کر دیے گئے۔ یہاں ایک بندرگاہ بھی ہے۔ وکٹورین کیتھڈرل، سینٹ لارنس ہال، یونیورسٹی کالج کی عمارات انتہائی دیدنی ہیں۔ یہ کینیڈا کا سب سے بڑا ثقافتی مرکز ہے۔ یہاں کا سمفنی آرکسٹرا بڑا مشہور ہے۔

ٹورنٹو کی شاہراہوں اور عمارتوں کے نیچے ایک زیر زمین شہر ہے جہاں ریستوران، بینک، ہوٹل، دفاتر اور تجارتی ادارے ہیں۔ تین میل طویل سرنگوں اور زیر زمین راستوں کے ذریعے یہ شہر کے دوسرے علاقوں سے مربوط ہے۔ شہر میں دو یونیورسٹیاں ہیں ایک کا قیام 1827ء میں جبکہ دوسری کا قیام 1959ء میں عمل میں آیا، یہ بیس بال کھیل کا ایک بڑا مرکز ہے۔

نسرین ذوالقرنین، کوہاٹ

کو لوگ دیکھنے کیوں آئیں گے۔ ہم پہلے ہی کون سا اہم کارنامہ کر رہے ہیں دنیا میں۔ ہم سیدہ عائشہ سے بس کے ذریعے پل کے نیچے کے اسٹاپ پر اتر گئے جس کا نام نہیں معلوم۔ وہاں سے ٹیکسی کو دس پاؤنڈ اس لیے دیئے کہ صحیح مقام پر پہنچ جائیں۔ جب تمام پنچھی اپنے گھونسلوں کو لوٹ جاتے ہیں تو لائٹ اینڈ ساؤنڈ شو کا ٹکٹ گھر کھلتا ہے۔ 75 پاؤنڈ کا ٹکٹ عام درجے کا اور 200 پاؤنڈ کا ٹکٹ وی آئی پی کا تھا۔ ایک کھلے میدان میں کرسیاں طریقے سے رکھی تھیں۔ دس روہوں گی۔ آگے کی دو رو وی آئی پی کی تھیں جن پر ایک آدھ ہی بندہ تھا تیسری پر ہم تھے جو شو شروع ہونے پر وی آئی پی بن گئے تھے۔ اہرام مصر کے علاقے میں ایک ایسی لوکیشن ہے جہاں سامنے اسفنکس یا ابولہول کا مجسمہ ہے اور پیچھے تینوں اہرام ہیں۔ وہیں کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ صحرا کی ٹھنڈ کا سنا تھا لیکن تجربہ یہاں آ کر ہوا۔ اس صحرائی علاقے میں سورج غروب ہوتے ہی سردی شروع ہو گئی۔ گرم کپڑوں کے باوجود ٹھنڈ لگ رہی تھی۔

یہ شو کوئی نو بجے شب شروع ہوا۔ سب سے پہلے تمام اہرام پر لائٹ ڈالی گئی جس سے یہ جگمگا اٹھے۔ لائٹ ان کے دامن سے ڈالی گئی۔ مکمل صحرائی اندھیرے میں صرف رنگین لائٹس سے اہراموں کا دمکنا قابلِ دید تھا۔

اسفنکس کے مجسمے کا چہرہ تاریخ نے مسخ کیا ہوا ہے۔ شو شروع ہوا۔ صرف اسفنکس کے چہرے پر روشنی ڈالی گئی۔ ایسی روشنی تھی کہ اس کے خط و خال ایسے نمایاں ہو گئے جیسے وہ زندہ ہو گیا ہو۔ لیزر لائٹ میں اس کے چہرے کی شبیہہ واضح کر دی۔ آنکھوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی اسفنکس ہے جسے دن میں دیکھا تھا۔ زندہ و جاوید اسفنکس۔ اچانک کسی انتہائی زبردست صداکار شاید ہالی ووڈ کے صداکار کی زبان میں بہت گرجدار بھاری اور پُر ہیبت انتہائی شستہ آواز گونجی

آپ دنیا کے ساتویں عجوبے پر ہیں جو لاکھوں میں کوئی ایک دیکھنے کی سعادت حاصل کرتا ہے۔ آپ خوش قسمت ہیں۔ آپ کو یہاں خوش آمدید۔ میں اسفنکس ہوں۔ میں یہاں چار ہزار پانچ سو سالوں سے ہوں۔ میں ان سب کا محافظ ہوں۔ سب کی حفاظت پر ہوں۔ ان کے مقبروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا کیونکہ میں ان کی حفاظت کے لیے یہاں ہوں۔ میں نے چار ہزار پانچ سو سال کے تمام سورج طلوع ہوتے اور غروب ہوتے دیکھے ہیں جو انسان کے بنائے ہوئے کسی اور اسٹرکچر نے نہیں دیکھے۔ میں نے رومن، مملوک، عرب اور تمام حملہ آوروں کو گھوڑوں کی پیٹھ پر آتے دیکھا۔ رومن مجھے پسند نہ کرتے تھے انہوں نے میرا چہرہ بگاڑ دیا۔ وغیرہ۔

یہ آواز ساؤنڈ، افیکٹس اور روشنیاں مل کر اسے زندہ کیے ہوئے تھیں۔ صداکار کی آواز دلوں پر اثر کر رہی تھی۔ جب رومن حملہ آوروں کا جملہ آیا تو ان کی رتھوں کی آواز اور اہرام پر ان کی فلم تمام لوگوں کو اسی دور میں لے گئی۔ فرعون دور کی تاریخ، ان کا رہن سہن، بادشاہوں کے عقائد، تمام ادوار کے حملہ آوروں کی فلم اور آواز، مصر کی پرانی تاریخ۔ فرعون دور کے بادشاہوں کے عقائد اور مائیتھالوجی دکھائی گئی کہ کس طرح ایک کشتی مرنے کے بعد بادشاہ کو دوسری دنیا میں لے جاتی ہے۔ یہ کشتیاں اہرام میں کئی جگہ بنی ہوئی ہیں۔ لائٹ اینڈ ساؤنڈ شو میں لیزر بیم اور لائٹوں کے ذریعے خاکے بنا کر تاریخ کو سپورٹ کیا گیا۔ بیچ بیچ میں مختلف ڈائیلاگ فلمی بھی معلوم ہوتے تھے۔ ایک جگہ لگا کہ فلم قلوپطرہ کے ڈائیلاگ ہیں۔ قلوپطرہ رومن دور میں مصر کی ملکہ بنی تھی اس کے شوہر سیزر کو رومنوں کی کونسل نے فاتح مصر ہونے کے باوجود قتل کر دیا تھا۔ جس پر اس حسین ملکہ نے خودکشی کر لی تھی۔ پروگرام کرنے والوں کی یہ مہارت ہے کہ وہ انسانی نفسیات سے کام لیتے ہوئے سامع کو پوری طرح گرفت میں لے لیتا اور وہ خود کو اسی دور میں پاتا ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے کا یہ وقت پل بھر میں گزر گیا۔ اہراموں پر لائٹ ڈال کر ان کی الگ الگ تاریخ بھی بیان کی گئی۔ صحرا میں جب کسی اکلوتے اہرام پر لائٹ پڑتی تو گویا وہ زندہ ہو جاتا۔ کیا باکمال لائٹنگ تھی۔ لائٹ اینڈ ساؤنڈ دونوں کا ایسا برمحل استعمال اس سے پہلے ہم نے کہیں نہیں دیکھا۔ سید عادل پر اثر کر رہا تھا۔

جو عمارتیں اور نشانیاں فرعون چھوڑ گئے ان کو تو لوگ دیکھتے ہی ہیں لیکن لائٹ اینڈ ساؤنڈ شو جیسی ندرت پیدا کرنا سیاحت کی دنیا میں ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اسے ہفتے کے مختلف دنوں میں انگریزی، جرمن، فرانسیسی، عربی اور دیگر زبانوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ آج کل انقلاب مصر اور امن امان کی خراب صورت حال کی وجہ سے لائٹ اینڈ ساؤنڈ شو میں رش نہیں تھا ورنہ تو لوگ ایک ایک ہفتے پہلے اس کی بکنگ کراتے تھے۔ ہمارے پاکستان میں تو آریاؤں سے لے کر چندر گپت موریہ تک اور سکندر اعظم ... سے لے کر محمود غزنوی اور سلطان محمد غوری تک کی داستانیں بکھری پڑی ہیں۔ اشوک کا زریں عہد ہماری تاریخ کو دنیا بھر میں اجاگر کر سکتا ہے، لیکن ہمارا محکمۂ سیاحت تو بس خود ہی سیاحتیں کرتا ہے۔ سیاحت کے لیے کچھ نہیں کرتا۔ کاش مصر کے بدوؤں سے ہی کچھ سیکھ لیں۔

ابونواس

سلمیٰ اعوان

عرب کا ایک بڑا شاعر جس کی زندگی پرت در پرت تھی۔ عباسیوں کے دور کا یہ شاعر اخلاق تباہ کرنے والا کہلاتا تھا، پھر بھی اس کی شاعری بغداد کے گلی کوچوں میں گونجتی تھی۔ لوگ چھپ چھپ کر اس کی شاعری کا لطف لیتے تھے اور ہجوم میں پہنچ کر اسے برا بھلا بھی کہتے تھے۔ اس کی شاعری ہی اس کی قاتلہ بنی کہ اسے انگور میں زہر دے دیا گیا۔



ایک الگ انداز سے ایک بڑے شاعر کا تذکرہ

بغداد کی رات کے اس پہلے پہر جب میں دجلہ کے پانیوں میں ڈوبی روشنیوں کے عکس، کہیں ان سے بنتے کہکشاں جیسے راستے، کہیں چمکتے دمکتے چھوٹے چھوٹے گولے سے پانیوں میں مستیاں کرتے، کہیں قریبی ہوٹلوں کی روشنیاں ستاروں جیسے روپ لیے پانیوں میں اتری ہوئیں، کہیں مدھم سے قمقمے جلتے بجھتے دیکھتی اور ان کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے روپ اور صورتوں کے تحیر میں گم تھی کہ خیالوں میں جیسے وہ اتر آیا۔

مجھے تو معلوم بھی نہ ہوا تھا کہ کب ایک وجیہہ عراقی بھر بوڑھا میرے پاس آکر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا روایتی لباس، اس کا

کی مخمور آنکھیں، اس کا سنہری رنگت، اس کا بانکپن سبھوں نے میری توجہ کھینچ لی تھی۔ میں نے قدرے حیرت اور استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا تھا اور اس کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہشمند ہوئی۔

یقیناً آنکھوں کی زبان اس نے پڑھ لی تھی۔ گھن گرج سی تھی لہجے میں جب بولا تھا۔ ''میرے نام سے منسوب جدید بغداد کی اس اہم شاہراہ ابونواس پر تم بیٹھی ہو... اور تم نے نہ مجھے یاد کیا، نہ خراجِ تحسین پیش کیا۔ حد ہوگئی ہے دجلہ کے فراق میں ہی گھل رہی ہو۔''

''اوہو!'' میں مسکرائی تھی اور سمجھ بھی گئی تھی کہ میرا مخاطب کون ہے؟

''کمال ہے جب سے یہاں آکر بیٹھی ہوں آپ کے ہی خیال میں تو گم ہوں۔''

شاعر کی جوانی، اس کے دلکش خدوخال، اس کی شہابی رنگت اور سنہرے بال اگر تب راہ چلتے لوگوں کو متوجہ کرتے تھے تو بڑھاپا بھی کم شاندار نہ تھا۔ شاہوں جیسا بانکپن تھا اس میں۔

سچی بات ہے وجاہت تو آنکھوں میں کھب گئی تھی۔ مرعوبیت نے وضاحت بھی فوراً ہی کرنی شروع کردی تھی۔

لو میں نے تو جب عراق آنے کا قصد کیا۔ عراق سے متعلق لٹریچر اور معلومات کے جھمیلوں میں الجھی۔ تم تو اسی دن سے میرے سامنے آگئے تھے اور میرے ساتھ رہنے لگے تھے۔ اور یہ بھی تھا کہ میں ابونواس روڈ پر دجلہ کے کنارے بیٹھ کر تم سے لمبی چوڑی باتیں کرنا چاہتی تھی مگر یہ افلاق مجھے مچھلی کے چکروں میں ڈالے ہوئے تھا۔ اب تھوڑی سی تفصیل تم بھی سن لو تاکہ تمہارا گلہ کچھ دور ہوسکے۔

☆......☆

''مچھلی کھلانی ہے آپ کو۔'' اس نے گاڑی ایک جگہ پارک کردی تھی۔

''مچھلی؟'' بلڈ پریشر کا بھوت میرے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

میرے اظہار پر وہ من موہنا سالڑکا ہنس پڑا تھا۔

''دجلہ کے کنارے بیٹھ کر مچھلی نہ کھائی تو بغداد آنے کا فائدہ۔ میں ہلکے نمک کے ساتھ بنانے کا کہوں گا۔''

تو پھر AL MAZGOUF فش ریسٹورنٹ میں آگئے۔ ''یہ ابونواس روڈ ڈانس کلبوں اور کیسنو کے لیے بھی بڑی شہرت رکھتی ہے۔'' اس نے کہا۔

یہاں دجلے کے کنارے کنارے دور تک چھوٹے چھوٹے ریسٹورنٹوں کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا ہے۔ عمارتیں، ہوٹل اور صفائی ستھرائی کا معیار تو بس اوسط درجے کا ہی ہے لیکن روشنیوں، دجلہ، گھاس کے لان، درختوں کا پانی میں جھکاؤ، ماحول اور لوگوں کے اہلتے سیلاب نے انہیں خاص بنا دیئے ہیں۔ اندر باہر طوفان سا برپا ہے اور لگتا ہے جیسے پانیوں کے اوپر ایک جہاں آباد خود میں گم ہے۔

ایک کونے میں شطرنج کھیلی جارہی ہے تو ذرا آگے تاش کی بازی جمی ہوئی ہے۔ فضا میں کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبوئیں پھیلی ہوئی ہیں۔ بچوں والے لوگ ہیں تو محبتوں اور یاریوں والے بھی بہتیرے ہیں۔ شیشہ پینے والے کس مزے سے بیٹھے حقہ پیتے اور موسیقی پر سردھنتے ہیں۔ موسیقی بہت اونچی پر دلنوازسی ہے۔

عراقی موسیقی، میسو پوٹیما موسیقی اور عرب موسیقی کا دل کش امتزاج ہے۔ جس پر ایرانی روایتی موسیقی نے بھی اپنا اثر ڈالا ہے۔ یہ افلاق نے مجھے بتایا ہے ابھی۔

''یہ عود بج رہا ہے اور یہ مشہور عودسٹ احمد مختار ہے۔ عود ہمارے ہاں کا پسندیدہ ساز ہے۔'' افلاق نے بتایا تھا۔

تالاب کے کنارے کھڑا افلاق کچھ بات کرتا ہے۔ میں بھی پاس چلی گئی تھی۔ مچھلیوں کی تو بہار لگی پڑی تھی۔ چھلنی سے تین نوعمر لڑکے گاہکوں کے بتانے پر مچھلیاں پکڑ پکڑ کر اس زور سے فرش پر مارتے تھے کہ بیچاریوں کو شاید سانس لینا بھی نصیب نہ ہوتا تھا۔

چاقو سے پیٹ چاک ہوا۔ گند مند نکلا پھر مچھلیاں لوہے کی سلاخوں میں پرو کر کونے میں بنے لکڑیوں کے آلاؤ کے گرد کھڑی کردی گئیں۔

اور جو لڑکا شیف کا کام کرتا ہے بڑی شان ہے اس کی۔ پینٹ قمیص پہنے ایپرن چڑھائے، وجاہت والا جیسے شیف نہ ہو آرٹسٹ ہو۔

زندگی تو کھانے کے لیے ہے جیسے خیال رکھنے والوں کے لیے تو یہ لوگ آرٹسٹ ہی ہیں۔ بیٹھنا میں نے وہاں چاہا تھا جہاں تیرا نظارہ درمیان میں، والی بات ہو بغداد میں دجلہ سے بڑا تیرا بھلا کون ہوسکتا ہے۔ اس وقت بھی وہ میرے خیالوں میں تھا اور میں کہہ رہی تھی، یقین ماننا تمہارا خیال بھی تو ساتھ ساتھ ہی تھا۔

ہاں یہ بات بھی تمہارے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں کہ پاکستان میں جو کچھ تم پر پڑھا وہ ادب کے حوالوں سے تو

بہت اہم تھا مگر مجھ جیسی کچھ تنگ نظر، تھوڑی بہت روایات کی اسیر، کچھ مارے موٹے اخلاقیات کے بندھنوں میں جکڑی عورت کے لیے بظاہر کچھ اتنا پسندیدہ نہ تھا کیونکہ تم کہیں رسوائے زمانہ نظروں سے گزرے۔ کہیں مذہبی اقدار کے باغی اور کہیں شہوانیت کے مارے ہوئے نظر آئے۔ پر اندر کی بات بتاؤں کہ میں نے بھی چسکے لے لے کر تمہیں پڑھا اور اپنی ادبی سہیلیوں کو بھی تمہارے شہ پارے سنائے۔ روشن خیال اور ترقی پسند عورتوں نے تمہیں جی بھر کر سراہا۔

خوب صورت لڑکے تو تمہاری شاعری کا ایک مستقل مزاج حصہ ہیں۔ ایک ایسی نظم جس میں عقیدے اور مذہب کی بھی جھلک ہے وہاں یہ دیوانگی کفر کی حد تک چلی جاتی ہے۔ پھڑ پھڑ کرتی شاعری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتی ہے۔

گزشتہ جمعہ کی شب
اچانک میرا ٹکراؤ ایک ہجوم سے ہوا
ہزاروں لاکھوں لوگ پاگلوں کی مانند
چیختے چلاتے تھے
تو یہ روز جزا تھا
اللہ کے پاس جانے کا
ہمارا وقت آخر
جیسا کہ تمام پیغمبر کہتے ہیں
دنیا کے خاتمے کی علامت
نصب شب کا سورج
بھی ہے وہ
ہم کانپ رہے ہیں
ہمیں اعتراف ہے
میں تو ہنسا تھا اور
میں نے کہا
ارے یہ کب سورج ہے
جو ستارے کی طرح طلوع ہوا ہے
بھئی
یہ تو میرا دوست احمد ہے
جس کی موجودگی
اور جس کے بلوری قدموں کے نشان
مخملی چھپر کھٹ کو روشن کرتے ہیں
جس کے ماتھے پر ستارہ چمکتا ہے
جس کے گالوں پر وینس پھوٹتی ہے۔

دیر تک میں اس نظم کے حصار میں قید رہی تھی۔ تمہاری علیت کی داد نہ دینا کتنی زیادتی کی بات ہوتی میں نے بے اختیار داد دی تھی۔ تمہیں سراہا تھا۔ رومنوں کی پیار و محبت کی دیوی وینس مجھے بھی بڑی پسند تھی۔

تمہاری ایک اور نظم میں پڑھتی ہوں۔ کہنا چاہتی ہوں۔ ابونواس تمہاری اس نظم کو پڑھتے ہوئے میرے اندر کے شیطان نے اگر چسکہ لیا تھا تو خیر کے تربیت یافتہ پہلو نے فطرت کی خلاف ورزی پر احتجاج بھی کیا تھا۔

آمادگی پر مائل لڑکے سے مجھے پیار ہے
ایک خوبصورت، پروقار، خطرناک، غزال
جس کی پیشانی نقاب میں چھپے چاند جیسی
کوئلے جیسے سیاہ اور بادلوں جیسے گھنے بال
نہ زیورات کا کوئی مطالبہ
اور نہ ہی پرفیوم کے لیے کوئی تقاضا
نہ کبھی چیتھڑوں سے کپڑوں میں نظر آتا ہے

ایک شام جب میں تمہاری ایسی ہی نظمیں پڑھتے ہوئے جہاں تم نرم و نازک لطیف سے جذبات پر بہتے بہتے گندگی کی پاتال میں اتر جاتے تھے۔ میں نے بے اختیار ہی اس وقت ہاتھوں میں پکڑے نظموں کے پلندے کو دراز میں ٹھونس دیا تھا کہ میرا بڑا بیٹا غضنفر کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ عالمی ادب کے قدیم و جدید شعرا اور ادیبوں سے شناسا اپنے اس بیٹے سے میں نے تم پر بات نہیں کی تھی۔ مجھے شرمندگی سی محسوس ہوئی تھی۔ تم خود بھی تو سوچو نا۔ اب تم جب کہتے ہو

لڑکو آؤ سیدھے میری طرف
میں عیش و عشرت کی ایک کان ہوں
مجھے کھودو
پرانی مدہوش کرنے والی شراب
خانقاہوں میں راہب ہی تیار کرتے ہیں
شیش کباب، بھنے ہوئے مرغ
کھاؤ، پیو اور موج میلہ کرو

اور پھر ایسے ہی ایک دن میں نے زچ آ کر انہیں پٹخ دیا اور خود کو لعن وطعن کرتے ہوئے اپنے اندر کو ڈپٹا۔

”بہت ہو گیا۔ بہت ہو گیا علموں بی بی بس کر اب۔ تھوڑی دیر کے لیے اس موضوع سے ہٹ کر اس کی شاعری کی اور خوبصورت پرتیں دیکھ۔

”ابونواس۔“ میں نے کرسی کی اگلی ٹانگوں پر زور

ڈالتے اور بچپلی کو اٹھاتے ہوئے خود کو اس کے قریب کیا۔ ”مجھے یقیناً اپنی خوش قسمتی پر رشک آرہا ہے کہ آٹھویں صدی کے وسط اور آخری دہائی کا عربی کلاسیکل شاعری کے ایک بہت بڑے نام کا حامل شاعر ابونواس نے مجھے شرف ملاقات بخشا ہے اور میرے پاس آکر بیٹھا ہے۔“

”ابونواس۔“ میں کچھ جھجکی تھی۔

”کہو۔ جو کہنا چاہتی ہو۔ تم ایک دبنگ بندے کے سامنے بیٹھی ہو۔“

”ابونواس میں گنہگاری پکی مسلمان عورت تمہاری شاعری کا جو ورقہ پھرولتی تھی وہی مجھے مایوس سا کرتا تھا۔ ابونواس میں جاہل سی، محدود سے ذہنی افق کی مالک تمہاری شراب اور شراب نوشی، بھکو بازی اور خدا سے تخول بازی کو اس طرح ہضم نہ کرسکی جیسے شاید باقی لوگ کرتے ہوں گے۔ اب میں بھی کیا کروں تم خمریات (شراب نوشی) مدحکارات (بے راہ روی) اور مجنیات (کفر بکنے والا) کے چکروں سے ہی نہیں نکلتے تھے۔ شاعری کا سارا تانا بانا تو ان ہی موضوعات کے گرد بنتے رہے۔“

”بس تو اتنا سا علم لے کر بیٹھی ہو۔“

ابونواس نے گہرے طنز سے کہا۔ ”ایک میں کیا بغداد کے بیشتر شعرا اور لکھاری بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ عرب دنیا کی اکثریت کا یہی انداز تھا۔ چلو ابن رواندی کو چھوڑو تمہارا ایمان خطرے میں پڑ جائے گا۔ ولادہ بنت المستکفی کی شاعری کا جائزہ لیتیں۔ تمہیں پتا چلتا نویں صدی کی عورتوں کی روشن خیالی اور دانشوری کا۔ ابوالعلاء المعری کو پڑھنا تھا۔ اس کے ہاں اگر شہوانیت نہیں مگر مذہب پر تنقید ہے۔ خدا پر ایسی نکتہ چینی ہے کہ تم جیسے چھوٹے ذہن کے لوگ پل نہ لگائیں اور مرتد و کافر کے فتوے دائر کردیں۔ جنت اور جہنم کے پس منظر میں لکھی گئی اس کی مشہور نظم ”رسالت الغفران“ کہ جس سے دانتے نے متاثر ہوکر ڈیوائن کامیڈی لکھی۔“

گویا وہ چند لمحوں کے لیے رکا۔ ایک خوبصورت سنہری بالوں اور شربتی آنکھوں والے بچے نے اس کی توجہ کھینچ لی تھی۔ تھوڑی دیر تک اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ پھر میری طرف متوجہ ہوا۔ ”ہمارے عہد کے مفکر، دانشور، شاعر اور ادیب زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ تم لوگوں کی نسبت زیادہ روشن خیال تھے۔ وہ تمہارے محبوب فارسی کے شعرا عمر خیام اور حافظ جن کی شاعری پر تم جیسے لوگ سر دھنتے ہیں۔ میرے ہی تو جانشین ہیں۔ میری روایات کے امین ہیں وہ۔ یونانی اور رومی شاعروں کو پڑھو۔ دنیا کے فلاسفروں اور دانشوروں کا مطالعہ کرو۔ ان کے کام بھی میرے جیسے ہی تھے۔“ پھر وہ رکا اور نئے لہجے میں بولنے لگا۔ ”سچی بات ہے اگر یہ طعنہ نہ بھی ملتا تب بھی مجھے اپنے سطحی سے علم کا بخوبی احساس تھا۔ میرے ہاں دعویٰ تو سرے سے ہی نہیں تھا۔ دعویٰ تو سراسر جہالت ہے۔“

میں نے اپنے ان جذبات کا اظہار بڑے نرم اور شائستگی و متانت میں ڈوبے لہجے اور انداز میں کیا۔ تھوڑا سا زور اس بات پر بھی دیا کہ شاعری کی بہت ساری اصناف میں شاعر کس میں زیادہ گہرائی کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ اسے پرکھنا تو یقیناً نقادوں کا کام ہے۔ عام قاری تو لطف کی لیے پڑھتا ہے۔ تاہم تاریخ میں درج یہ سچائی اور حقیقت بہت کھل کر سامنے آئی ہے کہ تمہارے علم کی وسعت بے پایاں، تمہارا حافظہ قوی اور یادداشت غیر معمولی تھی۔ تمہارے عہد کے نقادوں کی رائے بشمول ابوحاتم المکی ”کہ ابونواس کے ہاں عمیق گہرائی اور سطحی پن دونوں ہیں۔ ابونواس اگر خود اس کا اظہار نہ کرے تو بسا اوقات سمجھنا مشکل ہوجاتا ہے۔“

یوں تمہاری جی داری اور حوصلے کی بھی داد دینی پڑتی ہے۔ ابوالعتاہیہ جیسا صوفی خدا پرست شاعر مقابلے پر ہو اور مذہبی لوگوں کی جماعتیں بھی تمہارا تیا پانچہ کرنے پر تلی رہتی ہوں تب بھی تم کہتے تھے۔

سرور ملتا ہے مجھے
ان کاموں کے کرنے سے
جنہیں روکتی ہے مقدس کتاب
میں گریزپا ہوں ان سے
جن کی اجازت دیتی ہے الہامی کتاب۔

بغداد کے کوچہ و بازار میں اگر ابوالعتاہیہ کا صوفیانہ کلام گونجتا تھا

کھا سوکھی روٹی کا ٹکڑا
پی ٹھنڈے پانی کا پیالہ
تنہا بیٹھ اور غور کر
مقصد حیات کو سامنے رکھ
یہ چند گھڑیاں بہتر ہیں
بلند و بالا محلات میں شاہوں کے حضور بیٹھنے سے۔

وہیں تجھ سے محبت کرنے اور تیرے چاہنے والے تجھے یوں گنگناتے اور گاتے تھے۔
''ابونواس۔
فائدہ اٹھا اپنی جوانی سے
جان لے یہ باقی نہیں رہے گی
صبح وشام کی شرابیں ملا
نشے کا لطف اٹھا
اور مخمور ہو
''چچ چچ چچ۔''
ایسا طنزیہ اور تمسخرانہ انداز تھا۔ نگاہیں جو چہرے پر جمی تھیں وہ ان احساسات سے لبالب بھری تھیں۔ بڑی خفت سی محسوس ہوئی تھی۔ ایک تو گرمی اوپر سے شرمندگی۔ مساموں سے پسینا پھوٹ نکلا تھا۔
''اندھا تھا ابو العتاہیہ۔ اندھے زندگی بسر کرتے ہیں۔ گزارتے نہیں۔ میں نے زندگی اس کے حسن و رنگوں کے ساتھ بھرپور انداز میں گزاری ہے۔ کوئی بار بار ملنے والی چیز تھی یہ؟''
میں خاموش ہو گئی تھی۔ یقیناً میں اس وقت اسے وہ سب نہیں سنانا چاہتی تھی جو میرے قلب و ذہن میں شور مچائے جاتا تھا۔ چاند چہرے جیسے لڑکے، ان کے مرمریں بدن۔
ابونواس زمانہ قدیم سے جدید تک دنیا بھر میں شہرت کے اعتبار سے مقبول ترین کُتب ایک الف لیلوی کہانیوں میں تمہاری حس ظرافت، تمہارا مزاح اور تمہاری ذہانت بہت دلنشین انداز میں سامنے آئی ہے۔ اپنی کوئی ایسی ہی کہانی آج کی رات دجلہ کے کنارے مجھے سناؤ۔
ابونواس کھلکھلا کر ہنس پڑا اور بولا۔ ''یہ الف لیلوی کہانیوں کا عشق ابھی بھی قائم ہے؟''
''لو کیسی بات کرتے ہو کہانیوں کا عشق بھی کبھی مرتا ہے؟''
کہانی شروع ہوئی صیغہ غائب میں۔
ابونواس بہت چالاک ہوشیار آدمی تھا۔ خلیفہ نے اس کی چالاکیوں کے بارے میں سنا۔ ہوشیاریوں کے متعلق جانا۔ غیر معمولی ذہین اور فطین آدمی ہے۔ درباریوں نے زمین و آسمان کے قلابے ملائے تھے۔
''پیغام بھیجو اسے۔ خلیفہ ملنا چاہتا ہے۔ فوراً۔ لیکن اسے بتا دو کہ وہ میرے پاس اس وقت نہ آئے جب سورج چمکتا ہو، اور جب اندھیرا ہو تب بھی نہیں۔
ہاں اسے بتاؤ کہ اس نے میرے پاس اپنے پاؤں پر چلتے ہوئے نہیں آنا ہے اور نہ ہی اس نے کسی جانور پر سوار ہو کر آنا ہے۔
اور ہاں یہ اس پر واضح کر دو کہ اگر اس نے میرے ممنوع کردہ کسی بھی طریقے کو اپنایا تو بس پھر جلاد اس کا گاٹا اتارنے کو تیار بیٹھا ہے۔
وہ آئے جلد اور بہت جلد۔
اب ابونواس نے جالی کا بڑا سا بیگ لیا۔ اس میں بیٹھا۔ یار بیلیوں نے کہا اسے اونٹ کی گردن سے رسے کے ساتھ لٹکا دو۔ یوں وہ جھومتا جھامتا ایک ایسے وقت میں جب آسمان پر ہلکے سے بادل تھے اور ہلکی ہلکی بارش تھی خلیفہ کے پاس پہنچ گیا۔ خلیفہ اس کی ہوشیاری پر حیران رہ گیا تھا۔
خلیفہ تو حیران تھا ہی۔ اکیسویں صدی کی یہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والی عورت بھی حیران تھی۔ ماحول کے رنگارنگی نے چند لمحوں کے لیے توجہ بانٹ لی تھی۔ پلٹی تو دیکھا کہ اس کی مخمور آنکھیں جیسے یادوں کے جوار بھاٹے میں ہچکولے لے رہی تھیں۔ ذرا سا رخ پھیرنے پر ہی سب جان گئی تھی۔ افلاق نے سامنے ٹی وی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''سنیے انہیں۔ علی ال الزاوی۔ اس کا یہ گانا پوری عرب دنیا میں ہٹ ہوا ہے۔
مکام جیسے سریلے شیریں دل کی دنیا زیر وزبر کرنے والا آلات موسیقی اور مکتوبہ جیسا گیت۔ لوگ جھوم رہے تھے۔ من چلوں کی سیٹیاں تھیں۔ ہیجان تھا۔ پر میں دیکھتی تھی ابونواس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے خفیف سے رنگ تھے۔
میں سمجھ گئی تھی علی ال الزاوی کی پرفارمنس پر ناک بھوں چڑھی تھی۔
پھر جیسے وہ خوابناک سی آواز میں بولنا شروع ہوئے۔
''ہمارا نوجوان زلزل عود بجاتا تھا تو گلیوں میں چلتے لوگوں کے قدموں کو زمین جکڑ لیتی تھی استادوں کا استاد جس نے بے شمار راگنیوں کو ایجاد کیا۔ اسحاق اسی کا شاگرد تھا اور اس میرے ہم عصر ابراہیم موصلی کے گانے پر تو پرندے پھڑ پھڑاتے ہوئے نیچے گرتے تھے۔ دجلہ کا پانی ساکت ہو جاتا تھا۔ ہوائیں چلنا بھول جاتی تھیں۔ اس کی انگلیوں کی پوروں سے سر پھوٹتے تھے۔ راگنیاں جنم لیتی تھیں۔ وہ سر

اور گلے کا بادشاہ تھا۔"

ہمارے سامنے چلتے ٹی وی کی آواز کسی نے اونچی کر دی تھی۔ توجہ منعطف ہوگئی۔ بھرے بھرے گالوں اور موٹی آنکھوں والی ایک مغنیہ مریم فارس سامنے تھی۔ کیا طرحدار لڑکی تھی۔ شانوں پر بکھری گھنگریالی زلفوں پر کہیں شام کی لالیوں کا گمان پڑتا تھا۔ نیم عریاں جسم اور اداؤں کا بانکپن۔

میں نے چہرے کے تاثرات سے یہ جانا تھا کہ ان آنکھوں میں نئے رنگ و آہنگ کو دیکھنے کا سرور ضرور تھا پر گیت کی شاعری کے معیار پر اعتراض تھا۔

"زبیدہ والا قصہ نہیں سنائیں گے۔"

زوردار قہقہہ فضا میں گونج گیا تھا۔

"میری دکھتی رگوں پر آپ کی انگلیاں ہیں۔"

"بخدا نہیں۔" میں بھی ہنس پڑی تھی۔

"دن تو موسم بہار کی رتوں والے تھے۔ کونپلیں پھوٹتی تھیں اور دجلہ بہت گدلا گدلا سا تھا۔ پانی کے بہاؤ نے اس سال ابھی سے ہی آخری کناروں کو پچھاڑنا شروع کر دیا تھا۔

شام کی سنہری کرنوں میں خلیفہ کا محل، دجلہ کے پار برامکیوں کے شاندار محل، فن تعمیر کے وہ نادر نمونے کہ جو بندے کو رک کر دیکھنے پر مجبور کرتے تھے۔ باغ میں دنیا جہاں کے درختوں کی نادر اقسام، کیاریوں میں کھلے سینکڑوں اقسام کے پھولوں کی مہکار، جھاڑیوں کی قطع برید، کہیں سانپوں، شیروں، چیتوں، موروں کی صورت باغبانوں کی فنکاری کے عکاس، گھاس کے قطعوں میں موتی بکھیرتے حوض جن میں ناچتی مچھلیاں۔ دجلہ کے اوپر مرغابیوں کی ڈاروں کو پر پھڑپھڑاتے ہوئے قطاروں کی صورت اڑتے شام کی زرنگار کرنوں میں دیکھنا۔ واللہ کس قدر دل خوش کن منظر تھا۔

میں خلیفہ کے بلاوے پر ان سے ملاقات کے لیے آیا تھا اور چند لمحوں کے لیے رکا تھا۔ بالکونیوں سے باہر کے منظر جیسے چوکھٹوں میں نصب تصویروں کی مانند مجھے دکھے تھے۔

کمرے میں تنہائی تھی۔ نبیذ سے بھری صراحی اور فواکہات کی سینی سامنے تھی۔ میں نے مزاج شاہی کی افسردگی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "واللہ امیر المومنین آپ بھی کیا چیز ہیں؟ فردوس بریں میں رہتے ہیں۔ ذرا نگاہ اٹھا کر تو دیکھیے۔ باہر کے منظر امنگیں جگانے اور جذبات ابھارنے والے ہیں اور آپ ہیں کہ ملول بیٹھے ہیں۔"

میں نے اپنا تازہ کلام سنایا اور کہا۔

"جعفر برمکی نے کنیز خریدی ہے۔ چہرہ جس کا ترک شہزادیوں کا سا، جسم رومی نازنینوں جیسا، نین حجازی دوشیزاؤں اور کمر یمنی مٹیاروں جیسی ہے۔ حضور اس گناہ ثواب کے چکروں کو چھوڑیئے۔ یہ دوروزہ زندگی ہاتھ سے گئی سو گئی۔ لطف اٹھایئے۔ شراب سے، شباب سے اور سمے کی ساعتوں سے۔ ابراہیم موصلی اور ابن جامع کو بلوائیں۔ راگ و راگنیوں سے دل بہلائیں۔ پری چہرہ نازنینوں سے اپنی راتوں کو آباد اور شاد کریں۔"

خلیفہ کی افسردگی دور ہوئی۔ مسکرایا، ہنسا اور شاد کام ہوا۔

میں گھر لوٹا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دستک ہوئی۔ سمجھا کہ غلام خلیفہ کی جانب سے انعام واکرام لے کر آئے ہوں گے۔

کنڈی کھولی۔ غلاموں کی ایک لام ڈور تھی جو دروازے کو دھکے مارتی اندر آئی۔ مجھے پکڑا۔ وہ پٹائی کی کہ چارپائی پر پڑنے اور تیل ہلدی لگانے والی بات ہوگئی تھی۔

معلوم ہوا کہ ابونواس کے محل سے نکلتے ہی زبیدہ خاتون غصے سے لال پیلی ہارون کے کمرے میں آئی اور پوچھا۔ "ابونواس آپ سے کیا باتیں کرتا تھا؟"

زبیدہ بڑی زبردست اور ڈاڈھی ملکہ تھی۔ خلیفہ تو پل بھر میں ہی منکر ہوگیا۔ وہ بھری۔ "امیر المومنین کمال کرتے ہیں۔ میں نے خود اپنے کانوں سے اسے تمہیں بہکاتے اور گناہ کی ترغیب دیتے سنا۔ تم سے اتنا نہ ہوا کہ اسے پھٹکار دو اور نہیں تو ڈانٹ ڈپٹ دو۔"

ہارون ہنسا۔ "بھئی زبیدہ کچی بات ہے۔ ایسی اچھی اچھی باتوں پر ڈانٹنے کا کیا کام۔"

اور زبیدہ نے اپنے ملازموں سے ابونواس کو ایسی چھینٹی لگوائی کہ بیچارہ دو ماہ تک بستر پر پڑا رہا۔

مجھے مزہ آیا کیونکہ ایک خوبصورت قہقہہ فضا میں دیر تک گونجا۔

خلیفہ کو ایک دن پھر میری ہڑک اٹھی۔ بلا بھیجا۔ ایسی خستہ حالی دیکھی تو پوچھا۔ "ابونواس تمہیں کیا ہوا؟ بیمار تھے کیا؟"

"امیر المومنین بس کچھ مت پوچھیے۔"

میں ساری بات چھپا گیا کہ میں نے دونوں کمروں کے بیچ دروازے میں رکھے چوبی پردے کے پیچھے جان لیا

''ہاں تو امیر المومنین اس دن میں آپ کو بتا رہا تھا کہ عربی میں ایک کہاوت ہے کہ جس کی دو بیویاں اس کی کیا زندگی؟ ادھر جھوٹ ادھر جھوٹ۔ ادھر کچھ ادھر کچھ۔ جس کی ہوں تین بیویاں وہ بیچارہ تو گویا دکھوں کی سان پر چڑھ گیا۔ اور جس نے کی چار وہ بنا مظلوم۔ نہ زندوں میں نہ مردوں میں۔ تو امیر المومنین میں نے تو دنیا کو دیکھتے ہوئے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بیوی بس ایک ہی، دل کی وہی رانی۔''

ہارون الرشید نے پہلے تو حیرت سے آنکھیں پھاڑیں پھر چیخا۔ ''ابونواس تم بکواس کرتے ہو۔ قسم لے لو مجھ سے جو تم نے اس دن ایک بھی ایسی بات کی ہو۔''

''امیر المومنین'' ابونواس عاجزی سے جھکتے ہوئے بولا۔

''آپ میری باتیں بھول گئے ہیں شاید۔ میں نے اس دن آپ سے یہ بھی کہا تھا کہ بنی مخزوم قریش میں افضل ترین زبیدہ خاتون دختر قاسم اس قوم کے خوشنما پھولوں میں سے سب سے حسین پھول۔ اس دن مجھے محسوس ہوا تھا کہ آپ کا دل دوسری عورتوں کی طرف مائل ہے۔ میں آپ کو سمجھانا چاہتا تھا کہ زبیدہ خاتون ہی آپ کے قلب و جان کے

ہارون الرشید غصے میں چلایا۔ ''ابونواس تم جھوٹے ہو۔ خدا کی لعنت ہو تم پر۔''

ابونواس نیم ایستادہ ہوا۔ کورنش بجالاتے ہوئے بولا۔ ''امیر المومنین آپ مجھے وقت سے پہلے مروانا چاہتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ یہ جو میں لنگڑاتا ہڈیاں گوڈے رگڑتا آپ کے حضور حاضر ہو گیا ہوں۔ اس سے بھی جاؤں۔ رحم کیجیے مجھ پر۔''

اسی وقت پردے کے پیچھے سے زبیدہ کی ہنسی سنائی دی۔ ''ابونواس تم سچے ہو۔ تم نے یہ سب کہا ہوگا۔ امیر المومنین چونکہ پریشان تھے انہوں نے یہ سب باتیں اپنے پاس سے گھڑیں اور تمہارا نام لگا دیا۔''

''بالکل، بالکل، درست۔'' کہتا میں اپنے گھر دوڑ گیا۔ گھر پہنچا تو دروازے پر زبیدہ کے غلام خلعت فاخرہ اور زر نقد لیے کھڑے تھے۔

کئی ماہ بعد خلیفہ کو یہ سب معلوم ہوا۔ بہت ہنسا۔ انعام و اکرام سے نوازا۔

''وہ کلام الیل والا کیا قصہ تھا؟ اسے بھی تو سنائیں۔''

"ارے بھئی ان دنوں محل میں آرمینیا کی چند کنیزوں کا بڑا چرچا تھا۔ آرمینیا کی کنیزیں بڑی مہذب اور شائستہ سمجھی جاتی تھیں۔ محل میں بچوں کی تربیت کا بیشتر کام ان کے سپرد تھا۔ ایک رات ہارون نے تنہائی میں ایک طرحدار اور دل کش کنیز سے کچھ شرارت کرنی چاہی۔ اس نے صبح پر ٹرخا دیا۔ اگلے دن ہارون نے اسے بلوایا اور وعدہ یاد دلایا۔ آرمینیائی کنیز نے ادائے بانکپن سے کہا۔ کلام الیل یمحوہ النھار۔

ہارون مسکرایا۔ اسے کنیز کی بات بہت پسند آئی تھی۔ بغداد کے سب شاعروں کو اکٹھا کیا اور کہا کہ اس پر گرہ لگائیں۔

"جانتے ہیں یہ بازی کس نے جیتی؟" انہوں نے میری طرف سوالیہ انداز میں دیکھا تھا۔ میرے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ فوراً اپنے سینے پر فخریہ انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ "ارے بھئی میں نے۔ یعنی ابونواس نے۔ میں نے تضمین کے مصرعوں میں ہارون الرشید کی دراز دستی کا سارا حال بیان کردیا تھا۔"

"تو اب رخصت۔ تمہاری مچھلی بس آیا ہی چاہتی ہوگی۔"

میں نے نگاہیں اٹھا کر دور پھینکیں۔ افلاق تو مجھے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

"کیا مجھے تھوڑا سا وقت اور نہیں عنایت کریں گے۔" میرا انداز بڑا ملتجی سا تھا۔ "کچھ اپنے بارے میں بھی بتادیں۔ خود سے ملادیں۔"

"ارے بھائی ہماری زندگی بس ایسی ہی اجڑی بجڑی سی تھی۔ جس کا نطفہ تھا۔ اس کی صورت تو کبھی دیکھی ہی نہیں۔ بس سنا کہ مردان دوم کی فوج میں ایک سپاہی ہے اور نام بھی معلوم نہیں ایک بار ماں نے "ہینی" بتایا تھا۔ میری ماں گلبان ایرانی اور پیشے کی جولاہی تھی۔ کھڈی پر بڑا خوبصورت کپڑا بنتی تھی۔ صورت کی اتنی حسین کہ ہواؤں میں اڑتے پرندے دیکھ لیں تو غش کھا کر سیدھے اس کے قدموں میں گریں۔ نام تو میرا ماں نے الحسن ابن ہینی ال حاکمی رکھا۔ میں خوبصورت تھا۔ سنہری بالوں میں کنڈل پڑتے تھے اور دو لٹیں شانوں پر گرتی تھیں تو گاؤں کے من چلوں نے "ابونواس" کہنا شروع کردیا۔ ہاں پیدا کہاں ہوا؟ کچھ پتا نہیں۔ کسی نے دمشق کہا۔ کسی نے بصرہ اور کچھ اہواز کہتے ہیں۔ حقیقت کیا ہے؟ مجھے تو خود معلوم نہیں۔"

ابونواس نے منہ بنایا۔ ہاتھوں کی انگلیاں نچائیں چہرے پر تلخی کا تاثر بکھیر دیا۔

"ماں نے مجھے یمن کے کسی تاجر کے پاس کیوں بیچ دیا؟ میں کبھی سمجھ نہیں سکا۔ چھوٹا سا تھا۔ کیا میری روٹی اس پر بھاری تھی؟"

یمن کے اس تاجر کی دکان بصرہ میں تھی۔ کھانے پینے کی یہاں مکمل ڈل تھی۔ خوب قد کاٹھ نکالا۔ یوسف اول جیسا تھا۔ ذہین بھی بہت اور حسین بھی بہت۔ راہ چلتے رک کر دیکھتے ضرور تھے۔

اور پھر اس نے مجھے دیکھا۔ ولیہ ابن احباب نے یہ شاعر تھا۔ اس نے مجھے خریدا اور اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ پڑھائی لکھائی، گرامر، صرف ونحو۔ کوئی دو سال بدوؤں میں بھی رکھا کہ زبان خالص ہوجائے۔ یہ ولیہ ہی تھا جو مجھے بغداد لایا۔ یہیں میں نے شاعری شروع کی۔ مزاح سے بھرپور۔ صحرائی روایات کے برعکس، شہری زندگی کی عکاس جس میں ذخیز لڑکوں کی محبت اور شراب تھی۔

میں باغی تھا۔ روایات کا، اقتدار کا، مذہب کا۔ سرور ملتا تھا جب ملا چیختے چلاتے تھے جب لعن طعن ہوتی تھی۔

قصیدہ گو تھا اپنے سرپرستوں کا۔ برامکیوں کے لیے کیوں نہ لکھتا۔ وہ تو نگینے تھے جو عباسیوں کو مل گئے تھے۔ عربوں کا عروج اپنی جگہ، ان کی فتوحات کے پھیلاؤ کی اہمیت کا اپنا مقام۔ ان کی زبان کی وسعت، مذہبی رواداری، آئین و دستور کی بالادستی نے دوسری قوموں پر انہیں غالب کیا یہ سب حقائق مسلم۔ لیکن ایرانیوں کے تہذیب وتمدن کی شائستگی، نرمی اور لطافت بھی اپنی جگہ بڑی نمایاں تھی۔ برامکی ایرانی جنہوں نے اپنا رنگ ان کے رنگ میں شامل کیا اور اسے مزید نکھارا۔

برامکی میرے محسن تھے۔ مجھے نوازتے تھے۔ جعفر برمکی نے جب اپنا وہ شاندار محل بنایا جو شان وشوکت کے اعتبار سے خلیفاؤں کے محلوں سے بھی بڑھ چڑھ کر تھا۔ اور ہاں دیکھو یہ میری چھٹی حس تھی۔ یا تم اسے میرا وجدان کہہ لو کہ جیسے مجھے ان کے عبرت ناک انجام کی طرف اشارہ ہوا۔ محل کو دیکھتے ہی بے اختیار میرے ہونٹوں پر یہ اشعار تھرتھرانے لگے۔

اے محل شکستگی کے آثار تجھ پر ظاہر ہیں
میں نے تیری دوستی میں خیانت نہیں کی
اے برمک کی اولاد جب تم دنیا سے گم ہوجاؤ

تم پر ہمیشہ سلامتی رہے۔ دنیا تمہیں یاد کرے۔

ہارون الرشید کو مجھ پر اتنا تیخ پا ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے بھی تو احسان فراموشی کی انتہا کردی تھی۔''

''ابونواس ہارون الرشید پر تمہارا اتنا غصہ درست نہیں۔ طاقتور شاہوں کی کتاب میں یہ درج ہوتا ہے کہ صرف انہیں ہی مرکز رہنا ہے اور جب کوئی دوسرا مرکز بننے کی کوشش کرتا ہے تو پھر وہی ہوتا ہے جو برمکیوں کے ساتھ ہوا۔ انہوں نے اختیارات اور شاہانہ اظہار کی تمام حدیں پھلانگ لی تھیں۔''

''ہاں مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ہجو لکھی تھی، ہارون الرشید کی ہجو، جو بغداد کے گلی کوچوں میں زور و شور سے گونجی۔ خلیفہ نے مجھے دیس نکالا دے دیا اور میں مصر بھاگ گیا تھا۔ میری بہترین شاعری امین کے دور میں لوگوں کے سامنے آئی تھی۔''

''ابونواس اگر کچھ کہوں تو سنیں گے نا؟ تم نے امین کا استاد ہونے کے ناطے اسے بھی شراب پر لگا دیا تھا۔ امین بہت خوبصورت اور وجیہہ لڑکا تھا۔''

''تمہاری عدالت میں ہوں۔ جو چاہو کہہ سکتی ہو۔''

''نہیں نہیں ابونواس۔ میں نے تو جو ماڑا موٹا پڑھا ہے اسی کی روشنی میں تم سے بات کرتی ہوں اور تصدیق چاہتی ہوں۔''

''تو پھر سنیں۔ یہ امین ہی تھا جس کی شعر گوئی کی اصلاح پر زبیدہ نے مجھے مامور کیا۔ میں نے اصلاح کی۔ غلطیاں بتادیں تو نوجوان شہزادے نے مشتعل ہو کر مجھے بندی خانے میں ڈال دیا۔ ہارون کو پتا چلا تو بیٹے پر ناراض ہوا اور مجھے رہائی دلوائی۔

چند ہی دنوں بعد جب میں خلیفہ کی خدمت میں حاضر تھا انہوں نے بیٹے سے کہا کہ اپنا تازہ کلام ابونواس کو سناؤ۔ امین نے ابھی دو تین شعر ہی پڑھے ہوں گے کہ میں کھڑا ہوگیا۔ ہارون نے بے حد تعجب سے میری طرف نگاہیں کیں اور استفسار کیا کدھر؟ میں نے کہا بندی خانے جانے کے لیے۔

میں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ بھئی ہم تو ایسے ہی تھے نڈر اور بے باک، البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ امین کے مرنے پر جو نوحے میں نے تخلیق کیے وہ عربی شاعری کا سرمایہ ہیں۔ زبیدہ کے نالے اور بغداد کی گلیوں میں گونجتے نوحے میری شاعری کے صدقے تھے جنہوں نے مامون کو فتح یاب ہو کر بھی بغداد میں داخل ہونے سے مہینوں روکے رکھا۔ خائف تھا وہ۔ مامون میرا نام سننا نہیں چاہتا تھا۔

''ایک روایت یہ بھی ہے کہ ابونواس تم آخری عمر میں تائب ہو گئے تھے۔ بڑے مذہبی اور خدا پرست بن گئے تھے۔''

''یہ ہوائی تو میرے کسی دشمن نے اڑائی ہوگی۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ جیل اور بڑھاپے نے پریشان کر دیا تھا۔ انعام کے لالچ میں مدح سرائی بھی کی۔ اور ہاں ایک بہت بڑی حماقت بھی سرزد ہوئی کہ مامون کے درباری مشیر نے چالاکی سے علی ابن طالب کے خلاف ہجو بھی لکھوالی اور اسے بغداد کے کوچہ و بازار میں نشر بھی کر دیا۔''

''کہتے ہیں زہر دیا گیا تھا تمہیں۔ اسماعیل بن ابوسہل مرکزی کردار تھا۔''

''زہر ملایا جیل میں ہی طبعی موت مرا۔ بس دنیا سے جانے کا بہانہ ہی چاہیے تھا۔ وہ مل گیا اور میں چلا گیا۔ لو تمہاری مچھلی آگئی ہے۔ کھاؤ، میں چلتا ہوں۔'' ایک ہاتھ میری طرف بڑھا تھا جسے میں نے محبت سے تھاما۔

بڑی سی پتی میں ٹماٹر، پیاز، کھیروں اور چٹنی کے ساتھ بھی مچھلی آگئی تھی۔

افلاق بتاتا تھا کہ مچھلی الاؤ پر روسٹ کے بعد مرچ مصالحوں کے ساتھ گرم کوکلوں کی ریت میں دم پخت کی جاتی ہے۔

اب ذائقے کے بارے میں کیا کہوں۔ استنبول کا پرنس آئی لینڈ یاد آگیا تھا کہ تب بھی جی چاہا تھا اٹھا کر باسفورس میں پھینک دوں۔ میں تو چاہتی تھی۔ سیما ہی نہیں مانی۔ اور اب بھی اگر افلاق ساتھ نہ ہوتا تو دجلہ میں پھینکنا ضروری تھا۔

افلاق بیٹوں جیسا ہی تھا۔ ذائقے سے آشنا بھی، تو ہرج ہی کیا تھا کہ اسے مچھلی بھی کھلاتی جاؤں اور باتیں بھی کرتی جاؤں اور اس شخصیت کو تھوڑا سا اور یاد کرلوں۔

ابونواس کے مرنے پر جب گھر کی تلاشی لی گئی تو بدخواہوں اور حاسدوں کو صرف کاغذوں کا ایک دستہ اور کہانیوں کی ایک کتاب کا بیرونی کور ہی ملا تھا۔ دستے میں صرف ونحو اور گرامر کی چند تراکیب درج تھیں۔ وہ ٹھیک کہتا تھا۔ اس کی شاعری سے متعلق ہر بات کی تان اس کے غیر معمولی گہرے اور ذو معنی اظہار پر ہوتی تھی۔

اپنے عہد اپنے وقت کا ایک بڑا شاعر ابونواس۔



فاتح

طارق عزیز خان

انگلستان جس نے آدھی دنیا کو فتح کر رکھا تھا، جس کی حکومت میں کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا۔ افریقا سے ایشیا تک اسی کا سکہ چلتا تھا۔ اتنی مستحکم سلطنت کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اس حکومت کا بانی انگریز نہیں تھا، انگلستان سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

انگلینڈ کے بانی کا مختصر سا تعارف

سلطنت برطانیہ کو ماضی میں دنیا کی عظیم ترین سلطنت ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ یہ وہ عظیم ترین سلطنت تھی جس کی حدود مشرق و مغرب کا احاطہ کیے ہوئے تھیں اور جس کے طول و عرض میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق 1913ء میں اپنے دور عروج پر عظیم برطانوی سلطنت کا کل زمینی رقبہ 3 کروڑ 55 لاکھ مربع کلومیٹر کے لگ بھگ تھا اور اس کی حدود دنیا کے ساتوں برّاعظموں اور پانچ بڑے سمندروں کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ یہ دنیا کے کل زمینی رقبے کا 24 فیصد بنتا ہے۔ جس کی حدود میں موجودہ کینیڈا، شمال مغربی امریکا، مصر، سوڈان، جنوبی افریقا، کینیا، تنزانیہ، برصغیر پاک و ہند، عراق، جزیرہ نما یمن، اومان، ملائیشیا، آسٹریلیا سمیت بحرالکاہل کے بیشتر جزائر شامل تھے۔ جبکہ دنیا کے غیر آباد برّاعظم انٹارکٹیکا کا شمالی جزیرہ نما علاقہ بھی سلطنت برطانیہ کی حدود میں شامل تھا۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے بتاتے چلیں کہ سلطنت برطانیہ کے مقابلے میں 1309ء میں عظیم منگول سلطنت کا رقبہ 2 کروڑ 40 لاکھ مربع کلومیٹر تھا اور یہ تاریخ میں دوسری بڑی سلطنت تھی۔ اپنے دور عروج یعنی 1913ء میں دنیا کی 23 فیصد آبادی برطانوی سلطنت کا حصہ تھی جس کا اندازہ 41 کروڑ 20 لاکھ تھا۔ برطانوی سلطنت کا یہ عروج پہلی جنگ عظیم تک جاری و ساری رہا یہاں تک کہ دنیا کی بساط پر نئی عالمی طاقتیں چھا گئیں۔ پہلی جنگ عظیم کی شروعات میں سلطنت برطانیہ زوال کا شکار ہونا شروع ہوئی اور دوسری جنگ عظیم کے اختتام تک برطانوی تاج

کی حکمرانی موجودہ جزائر برطانیہ تک محدود ہو چکی تھی۔

اپنے تابناک ماضی کے مقابلے میں آج برطانیہ کا کُل زمینی رقبہ 2 لاکھ 42 ہزار 4 سو 95 مربع کلومیٹر جبکہ آبادی ساڑھے چھ کروڑ کے قریب ہے۔ لندن ملک کا سب سے بڑا شہر اور دارالحکومت ہے جبکہ اہم بندرگاہوں میں ساؤتھمپٹن، پورٹس ماؤتھ، لیورپول، نیوکیسل اور ڈوور شامل ہیں۔

برطانیہ چاروں اطراف سے سمندر میں گھرا ہوا ملک ہے اس کے شمال میں بحیرہ ناروے، جنوب میں رودبار انگلستان، مشرق میں بحیرہ شمالی اور مغرب میں شمالی بحر اوقیانوس کا کھلا سمندر واقع ہے۔ ملک کی قومی زبان انگریزی جبکہ کرنسی پاؤنڈ ہے۔ برطانیہ چار اکائیوں پر مشتمل ہے جن میں انگلینڈ، ویلز، اسکاٹ لینڈ اور شمالی آئرلینڈ شامل ہیں۔ سن 1542ء میں ویلز اور انگلینڈ باہم متحد ہوئے جبکہ یکم مئی 1707ء کو اسکاٹ لینڈ اور یکم جنوری 1801ء کو آئرلینڈ کا جزیرہ، برطانیہ میں شامل ہوا۔ پانچ دسمبر 1922ء کو آئرلینڈ آزاد ملک بنا جبکہ شمالی آئرلینڈ بدستور برطانیہ میں شامل رہا۔ آج یورپ کے شمال مغربی حصے میں واقع برطانیہ دنیا کی سیاست اور معیشت میں اہم مقام رکھتا ہے۔ یہ دنیا کی ایک اہم فوجی طاقت بھی ہے۔ یہ دنیا کے ان پانچ طاقتور ممالک میں شامل ہے جنھیں اقوام متحدہ میں ویٹو یعنی حتمی فیصلہ سازی کا اختیار حاصل ہے۔

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ سلطنت برطانیہ کی بنیاد رکھنے والا اور برطانیہ کو بطور ایک آزاد و خودمختار ملک قائم کرنے والا ایک غیر انگریز شخص تھا۔ جی ہاں فرانسیسی نسل سے تعلق رکھنے والا ولیم فاتح وہ پہلا شخص تھا جس نے 11 ویں صدی عیسوی کے وسط میں موجودہ برطانیہ کے تمام علاقوں بشمول انگلینڈ، ویلز، اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ کو باقاعدہ فتح کرکے برطانوی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ ہماری آج کی تحریر کا موضوع وہ واقعات و عوامل ہیں کہ جن کی بنیاد پر ولیم کا عظیم منصوبہ کامیابی سے ہمکنار ہوا اور ایک ایسی عظیم سلطنت کا قیام ممکن ہوا جس کی نظیر دنیا کی سیاسی تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق موجودہ برطانوی جزائر میں انسان کی موجودگی کے آثار 7 لاکھ 80 ہزار سال پرانے ہیں۔ جبکہ اس علاقے میں دریافت ہونے والی سب سے پرانی انسانی ہڈیاں پانچ لاکھ سال پرانی ہیں۔ وہ پہلے مہذب انسان جنھوں نے برطانیہ کو آباد کیا فرانس اور جرمنی کے موجودہ علاقوں سے تعلق رکھنے والے ملاح تھے جو قریب تیس ہزار سال پہلے رود بار انگلستان کو پار کرکے جنوبی ویلز اور آئرلینڈ میں آباد ہوئے۔

اگلے ہزاروں سال تک اسکنڈے نیویا، فرانس اور جرمنی کی سرزمین سے ملاحوں اور ماہی گیروں کی ٹولیاں انفرادی طور پر سمندر پار کرکے برطانیہ میں آباد ہوتی رہیں۔ تاہم مجموعی طور پر یورپین اقوام ان جزائر کے جغرافیائی محل وقوع سے بے خبر رہیں۔

یونانی ملاح پائے تھیاس وہ پہلا یورپین تھا جس نے 355 قبل مسیح میں موجودہ برطانیہ کے جزائر کو دریافت کیا۔ اس نے یہ کارنامہ فرانس کی کارتھیج سلطنت کے لیے سرانجام دیا۔ پائے تھیاس کے ساتھیوں نے جنوبی انگلستان کے ساحلی علاقے کورن وال کو آباد کیا۔ انھوں نے کورن وال کے قرب و جوار میں واقع لوہے کی کانوں کو دیکھا۔ وہاں کام کرنے والی عورتوں نے اپنی حفاظت کے لیے سر پر لوہے کے ہیلمٹ اور اوپری جسم پر لوہے سے بنا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ پائے تھیاس نے ان کے اس لباس کی بنا پر اس علاقے کو **Britannia** کا نام دیا جس کا قدیم رومن زبان میں مطلب ”لوہے کا لباس“ ہے

(پائے تھیاس کی مہم سے متعلق تفصیلی معلومات ”سرگزشت“ کے جنوری 2013ء کے شمارے میں بیان کی جا چکی ہیں)

پائے تھیاس کی اوّلین مہم کے بعد کسی بھی یورپین قوم نے برطانیہ کو باقاعدہ طور پر اپنی سلطنت میں شامل نہیں کیا۔ تاہم ان جزائر سے متعلق معلومات عام ہو جانے کے بعد یورپ کی مرکزی سرزمین سے نئے مواقعوں کی تلاش میں برطانیہ جانے والے ملاحوں، مہم جوؤں اور عام لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی آبادیاں برطانیہ کے طول و عرض میں قائم ہو گئیں۔ یہ آبادیاں چھوٹی چھوٹی خودمختار بادشاہتوں میں تقسیم ہو گئیں۔ صدیوں تک یہ بادشاہتیں زیادہ سے زیادہ علاقے کے حصول کے لیے آپس میں برسرپیکار رہیں یہاں تک کہ فرانس سے تعلق رکھنے والے مہم جو، ولیم نے برطانیہ فتح کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔

فرانس کے شمالی علاقے نارمنڈی میں فالیس کے مقام پر 1027ء میں ولیم پیدا ہوا۔ وہ نارمنڈی کے نواب رابرٹ اوّل کا واحد بیٹا لیکن اُس کی ناجائز اولاد تھا۔ 1035ء میں رابرٹ، یروشلم کی زیارت کرکے واپس لوٹا تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ خوش قسمتی سے اس نے اپنی زندگی ہی میں ولیم کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا۔ یوں صرف 8 برس کی عمر میں ولیم کو نارمنڈی کا نواب منتخب کر لیا گیا۔ کم عمر ولیم کو اپنی جانشینی سے کوئی شاہانہ اور بااختیار حکومت حاصل نہیں ہوئی... کیونکہ نارمنڈی کے پختہ عمر نوابوں نے اسے دل سے اپنا حکمران تسلیم

نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ولیم کی تخت نشینی کے بعد نارمنڈی میں سیاسی انتشار اپنی انتہا پر پہنچ گیا۔ ولیم کے تین وفادار سرپرست ہولناک موت کا شکار ہوئے حتیٰ کہ اس کے اتالیق کو بھی بے دردی سے قتل کردیا گیا۔ 1042ء میں ولیم نے سیاسی امور میں دلچسپی لینی شروع کی۔ اس نے 1047ء میں فرانس کے بادشاہ ہنری اوّل کی مدد سے اپنے دشمنوں کی مشترکہ فوج کو شمالی فرانس کے شہر کائن میں شکست دے دی۔ اب بظاہر نارمنڈی میں ولیم کے اقتدار کو کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ تاہم ”حرامی“ ہونے کا حوالہ اب بھی اس کے لیے طعنہ بنا ہوا تھا۔ ولیم کو یہ سن کر تکلیف ہوتی کہ اس کے حریف اپنی نجی محفلوں میں اسے حرام زادہ کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتے تھے۔ یہی وہ پس منظر تھا جس میں ولیم نے سمندر پار برطانیہ میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔

اس زمانے میں برطانیہ پر بادشاہ ایڈورڈ (1042-1066) کی حکومت تھی۔ ایڈورڈ کے کوئی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے لندن میں محلاتی سازشیں اپنے عروج پر تھیں۔ موقع مناسب دیکھ کر ولیم نے ایڈورڈ اوّل کو پیغام بھجوایا کہ ایڈورڈ کی ماں ولیم کے دادا کی بہن تھی۔ ولیم نے ایڈورڈ کا رشتہ دار ہونے کی وجہ سے برطانوی تخت کا دعویدار ہونے کا اعلان کیا۔ خود ایڈورڈ کا جھکاؤ ولیم کی طرف محسوس کرنے کے بعد برطانیہ میں اقتدار کی رسہ کشی اور تیز ہوگئی۔ اسی دوران 1064ء میں برطانیہ کے سب سے بااثر نواب ہیرالڈ گوڈون نے جو خود بھی برطانوی تخت کا دعویدار تھا، نارمنڈی کا سرکاری دورہ کیا۔ ولیم نے ہیرالڈ اور اس کے دو قریبی ساتھیوں کو گرفتار کرلیا۔ اس نے انھیں اس وقت تک قید رکھا جب تک کہ ہیرالڈ نے ولیم کی جانشینی کی حمایت کرنے کی قسم نہیں کھالی۔ تاہم ہوا اس کے برعکس، 1066ء میں ایڈورڈ کا انتقال ہوا تو ہیرالڈ گوڈون نے خود کو برطانیہ کا بادشاہ قرار دے دیا۔ یہ صورتِ حال ولیم کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔ اس نے اگست 1066ء میں بزور طاقت برطانیہ کا اقتدار حاصل کرنے کی منصوبہ بندی شروع کی۔ تاہم اس دوران ناروے کے بادشاہ نے برطانیہ پر حملہ کردیا۔ ولیم کی خوش قسمتی رہی کہ ناروے کی بحریہ برطانوی فوج کے آگے نہ ٹھہر سکی اور چند روزہ جنگ میں اسے شکست فاش ہوگئی۔ اب ولیم نے وقت ضائع کرنے کی بجائے ستمبر 1066ء میں اپنے بیڑے کے ساتھ رودبار انگلستان عبور کی اور برطانیہ پر حملہ کردیا۔ قریب دو ماہ کے جنگ وجدل کے بعد ولیم کو فتح کامل نصیب ہوئی اور اس کے مقابلے میں برطانوی تخت کے تمام دعویدار مارے گئے۔

1066ء میں کرسمس کے دن لندن میں ولیم کی تاجپوشی ہوئی۔ اگلے چار سالوں کے دوران ولیم کی وفادار فوج نے انگلینڈ اور ویلز میں چھوٹی بڑی تمام بغاوتوں کو کچل دیا۔ 1072ء میں ولیم نے اسکاٹ لینڈ کے بادشاہ میلکولم سوئم کو اپنا باج گزار بنالیا۔ ولیم کو سکون میسر آیا تو اس نے برطانیہ کی آبادی، حدود اور ملک میں موجود ہر قسم کی املاک کا ریکارڈ مرتب کروانے کا کام شروع کیا۔ 1086ء میں Domesday Book کے نام سے مرتب کیا گیا یہ ریکارڈ آج بھی ایک تاریخی دستاویز کے طور پر موجود ہے۔ برطانیہ پر مکمل کنٹرول کے بعد ولیم، شمالی فرانس کے شہر روئن (Rouen) میں گھوڑے سے گر کر ایسا زخمی ہوا کہ 7 ستمبر 1087ء کو اس کا انتقال ہوگیا۔ ولیم کے چار بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ اُس کی وفات کے بعد اس کے تیسرے بیٹے کو ولیم دوئم کے نام سے برطانیہ کا بادشاہ بننے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

ولیم کو برطانوی سلطنت کی تشکیل کے حوالے سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ یہ برطانیہ میں یورش کر کے داخل ہونے کی تاریخ میں آخری فوجی یورش تھی۔ ولیم کی اس فتح سے برطانوی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب ہوئے اور ایک منظم سلطنت قائم ہوئی جس نے دریافتوں کے حوالے سے یورپ کے باقی ممالک کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا۔ 325ق م میں یونانی ملاح پائے تھیاس کے ہاتھوں برطانیہ کی دریافت کے بعد یہاں بسنے والی انگریز قوم اگلے ایک ہزار سال تک مختلف حملہ آوروں کے خلاف دفاع میں مصروف رہی۔ ولیم وہ پہلا شخص تھا جس نے فرانسیسی نسل سے ہونے کے باوجود برطانیہ پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ اس نے ملک کے طول وعرض میں پھیلی خود مختار و نیم خود مختار ریاستوں کو ایک پرچم تلے متحد کیا اور ایک منظم حکومت کی بنیاد رکھی۔ اُس کے جانشینوں نے اپنی سلطنت کو اس حد تک طاقتور کردیا کہ پھر کبھی کوئی طالع آزما برطانیہ پر حملے کی جرأت نہ کرسکا۔ ولیم کا نام بطور مہم جو، اس تحریر میں شامل کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسی سلطنت کا بانی تھا جس کی اپنے عروج پر حدود پوری دنیا میں پھیل چکی تھیں۔ 19ویں صدی کے دوران کرۂ ارض پر موجود برطانوی کالونیوں کی تعداد کسی بھی دوسری یورپین اقوام کے زیر تسلط علاقوں سے زیادہ تھی۔ یہ وہ سنہری دور تھا جس میں سلطنت برطانیہ کی حدود میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا۔

قسط نمبر: 22

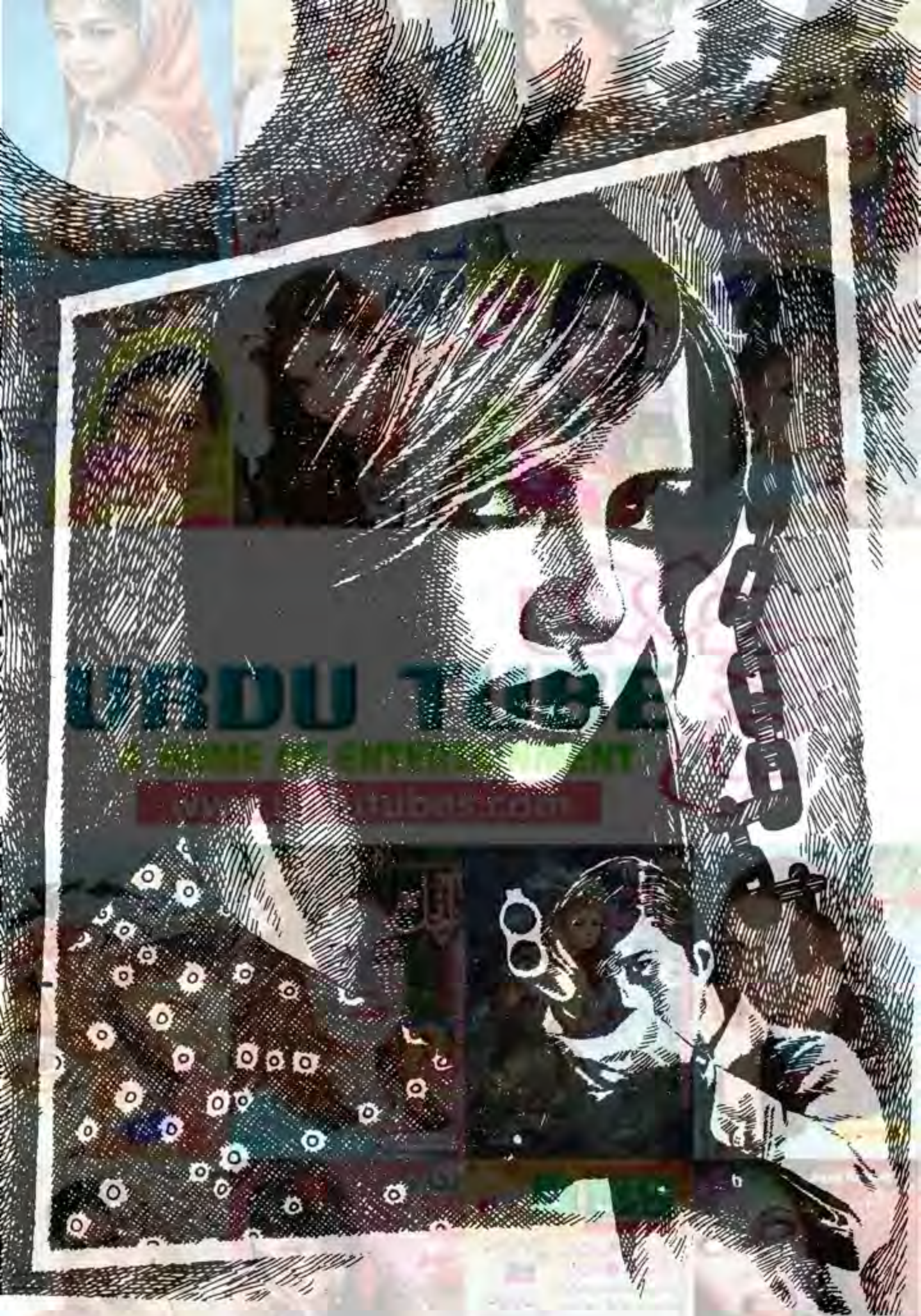
ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے





(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

رانا بشیر کی بیوی کا قتل ہو گیا تھا اور الزام آیا تھا احمد حسین پر۔ اس جرم میں اسے پھانسی ہو گئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ زنیرہ کے ساتھ مل کر اصل قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بشیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اب اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری اڈے کی یونین میں نائب صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈا ختم ہو جائے اور اس کی زمین پر عمارت بنا کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ تندہی سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی چال نعمان الٹی پر الٹ دیتا، ابھی وہ اس مسئلے پر غور کر ہی رہا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو مقتولہ کی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کر ہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی فہیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہنا کو اکثر رات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔ فہیم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحانہ کا میسج آ گیا کہ اسے ڈائری کا پارٹ ٹول گیا ہے۔ اگلے دن زنیرہ کے ساتھ میں فرحانہ کے گھر گیا تو ڈائری کے واقعات سنے جس نے رفعت قتل کے واقعے کو مزید الجھا دیا تھا۔ اس دن میں اڈے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آ گئے۔ ان میں عزیر خان بھی تھا جس کو اختر کی بہن ثوبیہ کی گمشدگی کا ذمے دار سمجھا جا رہا تھا۔ میں نے عزیر خان سے کہا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ کاروباری حضرات کو بھی سہولت ملے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ معاہدہ پارٹنرز بیس پر ہو لیکن ان لوگوں نے منع کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں ستا رہا تھا کہ کالیا کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ عارف مچھندر جیل سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر سنتے ہی میں الجھ گیا۔ گڈز ٹرانسپورٹ کی گاڑیاں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ سدو بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گڈز کی آڑ میں منشیات کا کاروبار ہوتا تھا۔ سدو کو رخصت کر کے میں بیٹھا ہی تھا کہ کالیا آ گیا۔ اس نے بتایا کہ میری ضمانت منسوخ ہو چکی ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے ایس ایچ او دلاور خان آ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلا اور اس کی بائیک پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ کالیا کے اڈے پر پہنچا تھا کہ بہن کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس گھر پر آئی تھی اور فہیم کو لے گئی ہے۔ مجبوراً میں نے گرفتاری دے دی۔ وہاں مجھ پر تشدد بھی ہوا۔ میں حوالات میں بیٹھا تھا کہ ایک سپاہی نے آ کر ایک اخبار دیا۔ اخبار میں چھپی خبر دیکھ کر میں پریشان ہو اٹھا۔ فہیم کے تھپڑ نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔ وہ تھپڑ مار کر باہر نکل گیا تھا۔ میں اڈے پر پہنچا تو وہاں صوبیہ کے قتل میں ملوث عزیر نظر آ گیا۔ میں اس کے دفتر میں پہنچا اور ان سے صوبیہ کے متعلق پوچھا۔ وہ گھبرا اٹھا۔ میں نے کہا کہ یہ سوال پولیس بھی پوچھے گی اور وہاں سے اٹھ آیا رانا بشیر کے ہاں پہنچا پھر میں نے ٹرک ڈرائیور کی گلوخلاصی کرا دی جس کے ٹرک نے زنیرہ کی کار کو ہٹ کیا تھا۔ گھر آیا تو کاشف ملنے آ گیا جو میری بہن کو چاہتا تھا۔ وہ بھی اغوا کا سن کر پریشان ہو گیا پھر اسی رات کالیا کے ساتھ ہم سیٹھ ستار کے بنگلے میں داخل ہوئے۔ وہاں روزی نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ سیٹھ ستار نے کہا کہ اس نے میری بہن کو ایک جگہ چھپا رکھا ہے ابھی بلواتا ہوں کہہ کر اس نے کسی کو فون کیا کہ لڑکی کو لے کر آ جائے۔ تبھی روزی نے کہا کہ سیٹھ ستار جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے لڑکی کو گلشن حدید میں کہیں اور رکھا ہے پھر اس نے بتایا کہ میں سیٹھ ستار سے اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لیے اس کے ساتھ ہوں۔ بعد میں اس کا کہا سچ نکلا۔ اس کے آدمیوں نے مجھے بھی زخمی کر دیا۔ ساتھیوں سے نمٹ کر میں نے سیٹھ سے اگلوا لیا کہ عاصمہ کو کہاں رکھا ہے اسے باحفاظت نکال لایا پھر روزی کے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ یہ اس کی سہیلی کا فلیٹ تھا۔ ہم اس سے بات کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر باہر سے آواز آئی۔ ”کیبل والا، بل لے کر آیا ہوں۔“ روزی نے دروازہ کھولا تو کیبل والے کو دھکا دے کر دو مسلح شخص اندر آ گئے۔ اس سے نمٹ کر میں نے انسپکٹر کامران کو فون کر کہا کہ روزی کی حفاظت کے لیے دو پولیس والے بھیج دو پھر میں کالیا کے ساتھ باہر آ گیا۔ انسپکٹر کامران کی معرفت کئی ایک کو گرفتار کرایا پھر زنیرہ کے گھر پہنچا۔ کچھ ضروری باتیں کر کے میں باہر نکلا تھا کہ ایک ٹیکسی پر نظر پڑی۔ میں اسے نظرانداز کرتا کہ اس ٹیکسی میں بیٹھا ایک شخص اتر کر زنیرہ کے دروازے پر پہنچا۔ میں ہوشیار ہو گیا اور بھاگتا ہوا زنیرہ کے پڑوس والے گھر میں داخل ہو گیا اور چھت کے ذریعے زنیرہ کے گھر میں اتر گیا۔ ٹھیک اسی وقت نیچے سے گولی چلنے کی آواز آئی اور ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ تب تک میں سیڑھیوں تک پہنچ چکا تھا۔ اندر سے زنیرہ پستول تھامے دھمکی دیتی ہوئی نکلی۔ اس کے پیچھے خالہ نجو کھڑی چیخ رہی تھیں۔ میں نے زخمی پر قابو پا کر خالہ سے رسی لانے کو کہا۔ تبھی باہر سے دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔ محلے کے لوگ آ گئے تھے کچھ دیر بعد پولیس بھی پہنچ گئی۔ اسے پولیس کے حوالے کیا اور وہاں سے چل پڑا، ابھی گھر آیا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اسپتال سے بتایا گیا کہ فہیم مل گیا ہے۔ میں اسپتال پہنچا فہیم نے بتایا کہ کچھ لوگ اس پر بے پناہ تشدد کرتے تھے۔ اس کی ٹانگیں بھی کاٹ دی گئی تھیں۔ سیٹھ ستار الگ کالیا کو قتل کرنے پر تلا ہوا تھا کیونکہ وہ مجو کے قتل کا بدلہ لینا چاہ رہا تھا۔ استاد بھا بھا نے مشورہ دیا کہ خود کو چھپا کر رکھوں کیونکہ لیاری کا بچہ بچہ ٹی ٹی لے کر ہمیں ڈھونڈ رہا ہوگا ہم نے میک اپ کیا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچے تو اندر دشمن موجود تھے۔ ہم نے ان پر قابو پایا پھر اگلے روز جب اڈے پر پہنچا تو انور شاہ نے بتایا کہ حاجی مہران آیا تھا اور دھمکیاں دے کر گیا ہے۔ میں اپنے دوست فرقان کے دفتر میں جو بندرگاہ میں واقع ہے وہاں پہنچا تو بن رائد سے سامنا ہو گیا۔ اس کا پیچھا کرتا ہوا میں کنٹینروں کے درمیان پہنچا تو کسی نے مجھے مارنے کے لیے کنٹینر گرایا۔ میں تو بچ گیا مگر ایک دوسرا شخص دب کر ہلاک ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہاں کئی پارٹیاں ہیں جو ایک دوسرے سے الجھ رہی ہیں۔ میں بن رائد کے جہاز کو ڈھونڈنے میں ناکام ہو کر سائیں داد کے ساتھ ساحل پر آ گیا تھا کہ وہ مجھے نظر آ گیا۔ میں اس کے تعاقب میں آگے بڑھ رہا تھا کہ اسے احساس ہو گیا۔ اس نے پستول نکالنا چاہا تھا کہ میں نے اس پر جست لگا دی مگر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو

گیا، میں اور کالیا رانا بشیر کے ہاں پہنچے تو اسے شاہ میر کے آدمیوں نے کور کر رکھا تھا۔ ہم نے ان آدمیوں پر قابو پایا۔ رانا بشیر نے پولیس بلوائی۔ پولیس کے سامنے شاہ میر کے آدمیوں نے بیان دیا کہ وہ لوگ شاہ میر کو نہیں جانتے۔ ہم وہاں سے نکلے تو فوزیہ کا فون آگیا کہ کچھ کرو۔ میں نے چاچا انور سے بات کی۔ انہوں نے فکرمندی کا انداز اختیار کیا اور اس سوچ میں پڑ گیا کہ انور شاہ ایسی کیا بات کرنا چاہتے ہیں پھر وہ مجھے ساتھ لے کر نکل پڑے راستے میں بولے کہ عطا محمد انکار کر سکتا ہے کیونکہ یہ لوگ برادری سے باہر رشتہ نہیں کرتے ہیں گھر پہنچ کر میں نے عاصمہ کو بتایا اسی وقت دستک ہوئی۔ باہر پولیس والے تھے۔ وہ بولے کہ تمہیں ثمیر کے اغواء کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے۔ مجھے تھانے لایا گیا۔ وہاں انسپکٹر رجب علی تھا۔ زنیرہ نے ضمانت کرائی کالیا کے ساتھ آرہا تھا کہ راکا سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اس نے ہمیں گھیرنے کی کوشش، فائرنگ کی آواز پر بھیڑ جمع ہوگئی ہم کسی نہ کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ عاصمہ کی ضد پر اگلے دن رشتہ مانگنے عطا محمد کے گھر گئے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ ہم گھر آئے۔ اگلے دن کالیا پہنچا ہی تھا کہ جمی کا فون آگیا۔ اسے ہم نے ثمیر کی حفاظت کے لیے رکھا تھا۔ جب وہاں پہنچے تو جمی نے بتایا ثمیر مر چکا ہے۔ شاہ میر کے بیٹے ثمیر کو اغوا کر کے کالیا نے جہاں رکھا تھا وہاں اس کی نگرانی کے لیے جمی کو بٹھایا گیا تھا اس نے فرار کی کوشش کرنے کی وجہ سے ثمیر کو گولی مار دی۔ اس حادثے پر ہم سب پریشان ہو اٹھے تھے لیکن لاش کو چھپانا بھی ضروری تھا، اسے لے جا کر میں نے ہاکس بے پر پھینکا۔ ادھر رانا بشیر اپنی بیٹی کے لیے پریشان تھا کیونکہ وہ شاہ میر کے قبضے میں تھی۔ تھانے سے انسپکٹر دلشاد کا فون آگیا کہ فوراً آ کر مجھ سے ملو۔ اس سے ملاقات ہوئی تو احساس ہوا کہ وہ بھی میرے دشمنوں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ لاری اڈے کی نوکری ختم ہو چکی تھی۔ رانا بشیر نے مجھے اپنی کمپنی میں عہدہ دے کر بحرین بھیجنے کا کہا۔ بحرین پہنچتے ہی میر اکبر اور راکا سے ہو گیا۔ وہاں سے نکلا تو بحرین میں میرا اکلوتا ہمدرد ہاشم بھی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ اب میری مددگار صرف شہزادی نیلم ہو سکتی تھی۔ شہزادی نیلم کی وادی کا پانی اس کے مخالفین نے بند کر دیا تھا۔ کالیا بھی مجھ تک پہنچ چکا تھا۔ ہم صرائقہ کی شہزادی سے رخصت ہو کر پہاڑی سلسلہ کو عبور کر رہے تھے کہ ایک مسلح دستے نے ہمیں گھیر لیا، ان میں راکا بھی تھا۔ اس کی نظریں مجھ پر ٹک گئی تھیں۔ ہمارے عقب میں پہاڑیاں تھیں۔ راکا نے سیل فون پر کسی سے رابطہ کیا۔ اسی وقت ایک جبہ پوش ایک لڑکی کو لے کر آیا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ اپنے ساتھی اوبرائے کے ساتھ نوکری کے لیے آئی ہوئی تھی۔ جیسے ہی راکا گیا اور اس کے ساتھیوں نے ہمیں رسی سے باندھنے کی کوشش کی میں نے جھپٹا مار کر ایک کی گن چھین لی، کالیا نے بھی یہی کیا اور ہم ایک دراڑ میں داخل ہو گئے۔ لڑکی کو بھی ساتھ لے لیا تھا دوسری طرف نکلے تو ایمونیشن ڈمپ تھا۔ اسے آگ لگا دی۔ کالیا کا کہنا تھا صائقہ کی طرف جائیں مگر ہم ایک نخلستان میں بنی عمارت میں گھس گئے، وہاں مقابلہ ہوا اور لڑکی چھلنی ہو گئی۔ ہم عمارت میں داخل ہوئے تو اوبرائے کو زخمی حالت میں پایا لیکن اس نے اپنی ساتھی لائیلا کا بدلہ لینے کے لیے ہم پر گن تان لی۔

(.......................... اب آگے پڑھیں)

گولی چلنے کا دھماکا کالیا کی گن نے شعلے کی صورت میں اگلا تھا۔

اوبرائے گرانٹ کے حلق سے چیخ خارج ہوئی اور میری چھٹی ہوئی گن اس کے زخمی ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا پڑی۔

وہ اپنی ابتر حالت کے باوجود اسے دوبارہ اٹھانے کے لیے لپکا تھا کہ میں نے اس پر جست بھری اور چہرے پر بوٹ کی ٹھوکر رسید کر دی۔ اس کے حلق سے چیخ خارج ہوئی اور وہ فرش پر بیٹھے بیٹھے پیچھے کو لڑھک گیا۔

میں نے اپنی گن اچک لی اور غصے سے گرانٹ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”تم پاگل ہوئے ہو؟ ہم تو تمہیں سلطان بن رائد کی قید سے چھڑانا چاہتے ہیں؟“

وہ ایک خون آلودہ تھوک پھینکتا ہوا پُرغضب آواز میں میری جانب گھورتے ہوئے غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ ”میں تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”ابے لے.....!“ ایک طرف کھڑے کالیا کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا تھا۔ ”خود اس کی حالت پتلی ہو رہی ہے اور یہ ہمیں دھمکیاں دے رہا ہے۔“

”کیا مطلب؟ ہم سے بھلا تمہاری کیا دشمنی ہے؟“ میں نے تیز لہجے میں گرانٹ کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس کے زخمی ہاتھ سے خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ بلاشبہ گرانٹ ایک سخت جان آدمی تھا، اسے اپنے کسی زخم کی کوئی پروا نہ تھی۔

”تم نے میری ساتھی کو ہلاک کر کے اچھا نہیں کیا۔“

میں اس کی بات سن کر ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ یقیناً اسے راکا وغیرہ نے یہی بتایا ہوگا۔ میں نے کہا۔ ”تم بے وقوف ہو۔ بھلا ہم کیوں اسے ہلاک کریں گے، وہ تو ہمارے ساتھ تھی اور ہم اس کی مدد سے ہی یہاں تک پہنچے تھے۔ وہ تو راکا اور اس کے ساتھیوں نے اسے گولی......“

”سب معلوم ہے مجھے......“ وہ غرایا۔ ”تمہارے اور اس کے بیچ بحث و مباحثہ ہوا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ اکیلی سلطان حسن بن رائد کے محل داخل ہو، کیونکہ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ میری اور ان سے کوئی لڑائی نہ تھی۔“

”ابے تو ہمیں کیا پاگل سمجھے ہوئے ہے یا گھاس چرا ہوا۔“ کالیا کو غصہ آگیا۔

”تم ایک نمبر کے غبی اور شکی ہو......ایسا کچھ نہیں ہوا

ہے۔ تمہیں غلط بتایا گیا ہے۔'' اسے گھرکی دینے کے بعد کالیا مجھ سے بولا۔ ''چل جگری! چھوڑ اس بدبخت کو۔ محل میں ڈھنڈیاں پڑی ہوگی ہماری، نکل چل جلدی۔'' کہتے ہوئے اس نے دروازے کی طرف دیکھا، کیونکہ اسی لمحے اس طرف متعدد دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز ابھری تھی۔

''نہیں کالیا! ذرا ٹھہر۔'' میں نے کہا اور گرانٹ کی طرف متوجہ ہوا۔

''اگر ایسی بات تھی تو ہمیں بھی یہ معلوم ہو چکا ہے کہ تمہاری ان سے کسی بات پر ساز باز ہو گئی تھی، پھر کیوں آخر میں تمہاری ان سے ان بن ہو گئی؟''

''تم بھی غلط سمجھے ہو۔'' وہ بولا۔ ''وہ میں ان سے چالاکی چل رہا تھا لیکن لائیلا کی ہلاکت کا سن کر مجھے ایک دم طیش آ گیا تھا۔ آخر میں میرا جھگڑا ان سے اسی بات پر ہوا تھا کہ جب انہیں پتا تھا کہ میری ساتھی تمہارے (میرے اور کالیا) ساتھ ہے تو انہیں احتیاط کرنا چاہیے تھی۔''

اس کے ان الفاظ کہ ''تم بھی غلط سمجھے ہو۔'' اشارہ کرتی تھی کہ وہ تذبذب کا شکار تھا۔

''یہ غلط فہمیاں بعد میں دور کرلیں گے۔ اس وقت ہمارے ساتھ یہاں سے نکل چلو۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس پر نیم بے ہوشی سی طاری تھی۔

اسی وقت دروازہ باہر سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ کالیا نے بے دریغ دروازے پر فائر کھول دیا۔ میں نے بے ہوش گرانٹ کو کاندھے پر اٹھا لیا۔

کالیا کی اندھا دھند فائرنگ سے دروازہ ادھڑ چکا تھا اور باہر سے چیخوں کی آوازیں ابھری تھیں۔

''راستہ صاف ہے جگری! نکل چل اور اس مصیبت کو ادھر ہی چھوڑ دے۔''

کالیا نے مجھ سے کہا، میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

ہم دونوں راہداری میں آ گئے۔ تین افراد زخمی حالت میں پڑے کراہ رہے تھے۔ انہیں پھلانگتے ہوئے ہم نے اسی طرف کا رخ کیا تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے بن رائد نشست جمائے بیٹھا تھا۔

وہ کمرا خالی تھا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ جلد ہی دائیں جانب ایک اور دروازہ دکھائی دیا۔ میں نے بے ہوش گرانٹ کو ایک طرف آہستگی سے کونے میں ڈال دیا اور اس کمرے کی جانب لپکا اور اچھل کر اسے زوردار لات رسید کر ڈالی۔ وہ ٹوٹ کر نصف سے زیادہ کھلتا چلا گیا۔

میں وارانہ وار اندر داخل ہوا تو دیکھا بن رائد پستول نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں بہ سرعت اس کے سر پر پہنچ گیا اور اس کا ہولسٹر جھپٹ کر پستول نکال لیا۔ اپنی رائفل میں نے پھینک دی تھی۔

''بس! تمہارا کھیل ختم ہوا۔'' میں نے اسی کے پستول کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔

''تم پھر بھی یہاں سے زندہ بچ کر نہیں نکل سکتے۔'' وہ غراہٹ آمیز آواز میں بولا۔

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں، ہم سر سے کفن باندھے ہوئے ہیں چلو۔'' میں نے اسے نشست والے کمرے کی طرف دھکیلا۔

یہ سب کچھ جلد از جلد نمٹانے کا متقاضی تھا۔ کالیا نے نجانے کیا سوچ کر میری رائفل اٹھا کر کاندھے پر جھلا لی تھی۔ اپنی رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔

ہم جیسے ہی نشست گاہ والے کمرے میں آئے تو ٹھٹک گئے۔ وہاں راکا اور اس کے چار مسلح ساتھی کھڑے تھے۔ باہر بھی لوگوں کی موجودگی محسوس ہوئی تھی۔

''خبردار! کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا، ورنہ اسے گولی مار دوں گا۔'' میں نے وحشیانہ انداز میں غراتے ہوئے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

اپنے سلطان کو میرے رحم و کرم پر دیکھ کر انہیں پہلے تو یکلخت سانپ سونگھ گیا اس کے بعد ان کے چہروں پر غضب ناک تاثرات ابھر آئے۔

''نعمان! بہت خطرناک غلطی کر رہے ہو۔'' راکا مجھے گھور کر زہریلے لہجے میں بولا۔

''بکواس بند کرو اپنی...... گاڑی کا بندوبست کرو۔'' میں نے راکا سے درشت لہجے میں کہا۔

''ہرگز نہیں...... تمہاری یہ جرأت ممکن ہی نہیں ہے کہ تم سلطان بن رائد کے محل کی چھت کے نیچے کھڑے ہو کر اس کا بال بھی بیکا کرنے کی ہمت کرسکو۔'' راکا زہریلی مسکراہٹ سے بولا۔

نجانے کیوں مجھے اس بدبخت کی زہریلی مسکراہٹ میں غضب کا اعتماد محسوس ہوا تھا جس نے ایک لمحہ کو میرے اپنے اعتماد کو بھی متزلزل کر ڈالا تھا۔ اس میں کیا شک تھا کہ میں اور کالیا موت کے بالکل دہانے پر کھڑے تھے۔

راکا یا اس کے مسلح ساتھی میرا حکم ماننے کے بجائے اڑ جاتے تو میرے پاس ایک ہی راستہ بچتا تھا۔ سلطان بن رائد کو گولی مار دیتا اور اپنے ساتھ کالیا کو بھی موت کی نظر کر ڈالتا۔ کوئی اور آپشن نہیں تھا میرے پاس زندگی اور موت کے اس خطرناک کھیل میں۔

تاہم یہ سب میں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا جو راکا کے لیے حوصلہ افزاء ثابت ہو لہٰذا اسی انداز میں، میں نے بھی زہر خند لہجے میں اس سے کہا۔ ''راکا......! میرے سر پہ خون سوار ہے، موت دونوں صورتوں میں میرے سامنے کھڑی ہے اور میں کم از کم کسی کو مار کے ہی مروں گا۔ جانتا ہوں کہ میں اس وقت آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہوں۔''

''راکا......! جیسا یہ کہہ رہا ہے ویسا کرو۔'' اچانک بن رائد نے چیخ کر کہا۔ زندگی اور موت کی کشمکش کی ان جاں گسل گھڑیوں نے شاید بن رائد جیسے سہل پسند کے اعصاب پر بری طرح اثر ڈالا تھا۔

راکا حیرت سے بن رائد کا چہرہ تکنے لگا۔ وہ مردود بالکل بھی اس موڈ میں نہ تھا کہ میں اور کالیا یہاں زندہ سلامت نکل جائیں۔

میری تیز بھانپتی ہوئی نظروں نے راکا کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ کوئی ''گل'' کھلانے کی کوشش میں ہے۔

نشست گاہ میں یکلخت چند ثانیے کے لیے بڑا اعصاب شکن سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ میرا دل جیسے سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑک رہا تھا۔ کسی بھی لمحے کچھ بھی ہونے کا احتمال کسی ہتھوڑے کی طرح دماغ میں ضربیں لگاتا محسوس ہوتا تھا۔

راکا نے تو نہیں، البتہ سلطان بن رائد کے ہی کسی ''معتبر'' ساتھی نے اپنے سلطان کی بات پر ہاتھ کھڑا کر دیا اور راکا کو پیچھے ہٹ جانے کا کہا۔ میں اندر سے کھٹکا۔ راکا سے متعلق جو میں نے مرحلہ وار تجزیے قائم کیے ہوئے تھے وہ آہستہ آہستہ درست ثابت ہو رہے تھے، جس کے مطابق راکا، بن رائد کا گماشتہ نہیں تھا وہ کوئی ''نمائندہ'' لگتا تھا، مزید سہل لفظوں میں اسے کسی کا ''ایجنٹ'' کہا جا سکتا تھا اور جس کا وہ ایجنٹ تھا وہ بن رائد کا ''تعلق دار'' ہو سکتا تھا۔

القصہ کوتاہ، یہ جاں گسل گھڑی ٹل گئی اور میرا مطالبہ راکا کو تو نہیں البتہ بن رائد اور اس کے ''درباریوں'' کو ماننے ہی پڑی۔

ہمارے لیے فوراً ایک عدد گاڑی کا بندوبست کر دیا گیا۔ آگے بڑھنے کا راستہ صاف پاتے ہی ہم محل سے باہر آ گئے۔ کالیا نے گرانٹ کو کسی طرح ہوش میں لا کر اسے اپنے ساتھ سہارا دے رکھا تھا اور وہ بھی یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

وہ لمبی سی ایک پرانے ماڈل کی جیپ تھی، جس کا میری ہدایت کے مطابق کالیا نے اچھی طرح ''جائزہ'' لے لیا تھا۔

جب ہم جیپ میں سوار ہونے لگے تو مجھ سے سلطان بن رائد کو چھوڑ دینے کا کہا گیا مگر میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ ''خد'' کی سرحد پار کرتے ہی میں اسے چھوڑ دوں گا۔ اس پر راکا کو ہی نہیں بلکہ بن رائد کے آدمیوں کو بھی سخت اعتراض ہوا تھا مگر میں اپنی بات پر اڑا رہا، ان کے پاس اور کوئی راستہ نہ تھا۔ تاہم بن رائد کے اسی آدمی نے مجھ سے خونخوار لہجے میں کہا۔

''اگر ہمارے سلطان کا ذرا بھی بال بیکا ہوا تو یاد رکھنا اس کی سزا صرائفہ اور شہزادی نیلم کو بھگتنا پڑے گی۔''

''اسے کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''ہم محض اپنی تسلی کی خاطر انہیں ساتھ لے جا رہے ہیں۔'' کہتے ہوئے میں جیپ میں سوار ہوا۔ پستول بن رائد کی کنپٹی سے بدستور میں نے لگا رکھی تھی۔

کالیا نے گرانٹ کو عقبی سیٹ پر جیسے تیسے ٹکا دیا تھا، خود میں بھی بن رائد کو لیے اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ کالیا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ساتھ ہی میری عقابی نظریں ان سب کے چہروں کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔ ان کے چڑھے ہوئے تیور اور سرخ پڑتے بشروں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ایک ذرا موقع پاتے ہی یہ ہماری تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔

گرانٹ بدستور سخت جانی اور قوت ارادی کے بل بوتے پر زخمی ہونے کے باوجود اپنی شرٹ پھاڑ کر پٹی سی بنانے میں مصروف ہو گیا تھا۔ یوں بھی اب وہ کافی سنبھل سا گیا تھا۔ بس، کالیا کی چلائی ہوئی گولی کا زخم اس کے ہاتھ پر آیا تھا، گولی اسے چھیدتی ہوئی نکل گئی تھی۔

کالیا نے جیسے ہی جیپ اسٹارٹ کی راکا چند قدم آگے بڑھا ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''ٹھہر جاؤ......! میں بھی ساتھ چلوں گا۔'' میں اس کی بات پر چونکا۔ دیگر لوگ بھی غیظ

بھلا کر حیرت سے راکا کا چہرہ تکنے لگے۔

''ابے لے......!'' کالیا کے منہ سے حسبِ سابق برآمد ہوا۔

''ٹھیک ہے، مگر اپنے دونوں ہاتھ پشت کی جانب بندھوا دو، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔'' میں نے پوری تسلی سے جواب دیا۔

''ہرگز نہیں، جیسے سلطان کو لے جا رہے ہو ویسے ہی گن پوائنٹ پر میں بھی ساتھ چلوں گا۔'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے مزید کہا۔ ''میرا ساتھ جانے کا مقصد صرف سلطان کی حفاظت کرنا ہے۔''

پل کے پل مجھے یوں لگا جیسے شاطر راکا کوئی چال چلنے کی کوشش میں ہو۔ میں نے کہا۔ ''ہمارے پاس وقت نہیں ہے، تم ادھر ہی رہو تو زیادہ بہتر ہے۔'' پھر میں نے کالیا کو جیپ آگے بڑھانے کا کہا۔ اس نے ابھی گیئر ڈالا ہی تھا کہ ایک آدمی آگے بڑھ کر مجھ سے بولا۔

''میں ساتھ چلتا ہوں اور اپنے دونوں ہاتھ بندھوانے کے لیے تیار ہوں۔''

میں نے انکار میں سر ہلا دیا اور راکا کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''اب یہی چلے گا اور کوئی بھی نہیں۔'' میں نے دیکھا کہ اس صورتِ حال سے راکا پریشان سا نظر آنے لگا تھا۔ یہاں اس کی سلطان سے وفاداری کی ساری مٹی پلید ہونے لگی تھی۔ اس آدمی نے راکا سے کہا کہ وہ میری بات مان لے، راکا کے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ بچا تھا۔ انکار کرتا تو وفاداری مشکوک ہوتی تھی، یوں ہاتھ بندھوا کر چلتا تو اپنے لیے کسی مشکل کا گماں ہوتا تھا۔ شاید جوش میں وہ اپنی ہی بات کہہ کر پھنس گیا تھا۔

''کالیا! گاڑی آگے بڑھا دو۔'' میں نے اچانک کہا اور کالیا نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

وہ سب دیکھتے ہی رہ گئے۔ کالیا نے ایک موڑ کاٹا اور جیپ کی رفتار تھوڑا بڑھا دی۔ ہم گرد و پیش پہ بھی نظریں ڈالے ہوئے تھے۔ پہر رات کی تاریکیوں میں مکانوں کے ہیولے خوابیدہ سے محسوس ہو رہے تھے۔ کھجوروں کے بڑے باغ کی کچی دیوار کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی جیپ کھلے ریگ زار میں آئی تو کالیا نے رفتار بڑھا دی۔ جیپ کے مخصوص ٹائر ریت پر ہی چلنے کے لیے بنائے گئے تھے۔

''اس مردود کو کیوں چھوڑ دیا جگری؟ اسے بھی لے چلتے۔''

آبادی سے نکلتے ہی کالیا نے کہا۔

''ابھی اس کی ضرورت نہیں، یہ کہاں جائے گا بچ کر پہلے ذرا یہ معاملہ نمٹا دیں۔'' میں نے کہا۔ ''تعاقب کا دھیان رکھنا، میں بھی محتاط ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اسے کہاں اتارنا ہے اور ہم کیا صرائفہ چلیں؟'' کالیا نے پوچھا۔

اس کا اشارہ بن رائد پر تھا جو خاموش بیٹھا تھا۔

''محمود الحسن کی رہائش گاہ پر چلو، صرائفہ والوں سے بھلا ہمارا کیا لینا دینا ہے، اپنا کام ختم کر کے میں جلد سے جلد پاکستان لوٹ جانا چاہتا ہوں۔''

ایسا میں نے دانستہ بن رائد کو سنانے کے لیے کہا تھا۔ کالیا نے ایسے نازک موقعے پر صرائفہ کا ذکر اپنی زبان پر لا کر بیوقوفی کی تھی۔ دراصل میں بن رائد کو بلف کرنا چاہتا تھا۔ میرا تیر نشانے پر لگا۔ بالآخر اس نے فوراً لب کشائی بولا۔ ''تمہیں مجھ سے کیا کام ہے؟''

''مجھے فرحانہ چاہیے، میں اسے لے کر اپنے وطن کی راہ لوں گا۔ میرا کام ختم۔''

''تم تو شہزادی نیلم اور صرائفہ والوں کے نجات دہندہ بنے ہوئے تھے؟ یہ اچانک پلٹا کیسے کھا لیا؟'' اس کے لہجے میں ہلکا طنز عود آیا تھا۔

''بن رائد! شاید تمہارا حافظہ کمزور ہے۔ کیونکہ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔'' میں نے گویا سلسلہ جنبانی جاری رکھتے ہوئے اس سے کہا۔ ''میرا اوّل تا آخر دشمن شاہ میر ہے۔ اس نے میرے گرد گھیرا تنگ کرنے کے لیے تم سے ساز باز جاری کی تم نے کسی حد تک اس کا کام آسان کیا، یوں مجھے بھی یہاں مناوا میں تمہارے دشمنوں کی تلاش تھی کیونکہ اس وقت تم ہی شاہ میر کے واحد سپورٹر تھے۔ میں نے شہزادی نیلم کی مدد سے تمہارے گرد گھیرا تنگ کیا۔''

بن رائد خاموش رہا۔

''تم لوگ اب کہاں جانے کا ارادہ رکھے ہوئے ہو؟'' معاً گرانٹ نے سوال کیا۔

''کسی نہ کسی ٹھکانے پر تو جانا ہی ہوگا، جہاں میں بن رائد سے فرحانہ نام کی ایک لڑکی کے بارے میں اگلوانا چاہتا ہوں۔'' میں نے گرانٹ کے جواب میں کہا۔

وہ بولا۔ ''تو کیا تم اسے چھوڑنے کا ارادہ نہیں

رکھتے؟‘‘

’’ہرگز نہیں۔‘‘ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ بن رائد اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے تھوڑا کسمسا کر رہ گیا۔ واضح تھا کہ اسے میرا ارادہ جان کر بے چینی سی ہوئی تھی۔

’’تو پھر اس مقصد کے لیے میرا ٹھکانا سب سے زیادہ محفوظ ہے۔‘‘ گرانٹ بولا۔ میں نے اس کی بات پر غور کرنے کے ..... انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ ایسے میں کالیا اس سے بولا۔

’’مسٹر گرانٹ! کیا تمہاری غلط فہمی دور ہوگئی ہے ہم سے؟‘‘ شاید کالیا اپنی محتاط طبع کے سبب اتنی جلدی او برائے گرانٹ پر بھروسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

’’میرا خیال ہے تم لوگوں نے ٹھیک ہی کہا تھا ورنہ اتنا بڑا خطرہ مول لے کر تم مجھے کیوں کر وہاں سے نکالتے؟‘‘ گرانٹ نے کہا۔

’’خیال نہیں حقیقت بھی یہی ہے کہ ......‘‘ کہتے ہوئے میں نے گرانٹ کو حالات سے آگاہ کر دیا۔

’’اس میں غلطی لائیلا ہی کی تھی، وہ بہت جلد باز ثابت ہوئی تھی۔‘‘ میں نے آخر میں کہا تو کالیا نے بھی لقمہ دیا۔

’’مگر اس کی جلد بازی کی یہ وجہ بڑی ٹھوس تھی کہ وہ ...... تم سے بے حد محبت کرتی تھی۔ وہ جلد سے جلد تمہیں ان خطرناک لوگوں کے چنگل سے رہا ہوتے دیکھنا چاہتی تھی۔ افسوس تو اس بات کا ہوتا ہے کہ ...... وہ دیکھ بھی رہی تھی کہ ہم اپنی منزل کی جانب پہنچ چکے ہیں، اسے ہم سے ایک بات پر اختلاف ہو گیا تھا، بلکہ وہ ہم سے کچھ چھپانے لگی تھی جب اسے یہ تسلی ہوئی کہ وہ لوگ اب تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے، ہم نے تو اس کی اس تسلی کی وجہ بھی نہیں پوچھی بلکہ اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی، مگر ......‘‘ کالیا خاموش ہو گیا تو میں نے گرانٹ سے کہا۔

’’اس بات کی تصدیق تم اس سے بھی لگا سکتے ہو کہ ہم نے کوہ جبل کے مقام پر جہاں حدی والوں نے عارضی بند باندھ کر صرائفہ والوں کا پانی بند کر رکھا تھا، جہاں کچھ لوگوں نے تمہیں گرفت میں لے لیا تھا اور پھر تم نے نجانے ان سے کیا کہا کہ ان کا رویہ تم سے ایک دم دوستانہ ہو گیا تھا۔‘‘ یہ سب کہتے ہوئے میں نے آخر میں دانستہ کہا۔

’’شاید تمہاری ان سے پہلے ہی سے کسی اہم بات پر اندرونی ساز باز قائم تھی، ورنہ تو ہمیں ان کے تیوروں سے صاف نظر آرہا تھا کہ وہ تمہیں گولی مار دیں گے۔‘‘

میری اس آخری بات نے گرانٹ کو شاید چونکا دیا تھا۔ یہ گویا ہماری سچائی کی آخری تصدیقی مہر تھی۔

وہ اچانک بولا۔ ’’تم لوگ اب میرے ٹھکانے کے سوا اور کہیں نہیں جاؤ گے کیونکہ میں نے بھی تم لوگوں کی یہ غلط فہمی دور کرنی ہے کہ میں نے ان سے اندرون خانہ کوئی ساز باز کر رکھی تھی اور یہ کہ میں نے ان کے ساتھ کیا چال چلی تھی تمہیں بتا دوں گا۔ لگتا کچھ ایسا ہی ہے جیسے ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔‘‘

ماحول میں ایکا ایکی عجیب سا کھنچاؤ طاری ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ بن رائد کی وہاں موجودگی تھی۔ ہم نے خاموشی اختیار کر لی۔

اب کالیا، او برائے گرانٹ کے بتائے ہوئے راستے پر ہو لیا تھا۔

☆......☆

جیسا کہ مذکور ہوا، او برائے گرانٹ کی رہائش گاہ کیمپ تھری کی رہائشی آفیسرز کالونی میں تھی لیکن وہ ہمیں کسی اور ہی ٹھکانے میں لے چلا تھا۔ ظاہر ہے ان حالات میں ہم رہائشی کالونی کے اندر نہیں داخل ہو سکتے تھے۔

بن رائد ایک ’’یرغمالی‘‘ کی صورت میں ہمارے ساتھ تھا، لیکن بہ قول گرانٹ کے اس کا ایک اور ٹھکانا بھی تھا۔ اس کی نہ اس نے تفصیل بتائی کہ یہ کس نے دیا اور کیوں؟ نہ میں نے پوچھنا مناسب سمجھا کیوں کہ بن رائد ساتھ تھا اور اسے بہر حال ہم نے چھوڑنا نہیں تھا۔

یہ ٹھکانا اگرچہ کیمپ تھری کے آس پاس ہی تھا، مگر رہائشی کالونی سے تین چار کلومیٹر اور دفاتر سے ڈیڑھ کلومیٹر کی دوری پر تھا۔

آبادی سے قدرے پرے اور کھجوروں کے جھنڈ جیسے مختصر سے ایک نخلستان میں بنا ہوا تھا، یہاں فقط تین چار ہی گھر نظر آرہے تھے، جو کھنڈر کی صورت میں تھے۔ یہاں کوئی نہیں رہتا تھا، بالکل غیر آباد نخلستان تھا، ہر طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ رات کے آخری پہر میں یہ شہر خموشاں کا منظر پیش کرتا تھا۔ میں یہاں زیادہ مطمئن نہ تھا، لہٰذا میں جیپ سے اترے بغیر ہی اس ٹھکانے کو ریجکٹ کر دیا۔

’’ہم نے کسی معمولی آدمی کو یرغمال نہیں بنا رکھا ہے مسٹر گرانٹ!‘‘ میں نے اس سے کہا۔ ’’ایک پورے قبیلے کا سلطان ہمارے قبضے میں ہے اور اب تک اس کی مسلح فوج

ہمارے تعاقب میں لگ چکی ہوگی۔"

گرانٹ جیپ سے نیچے اتر آیا اور اسرار بھرے انداز میں مسکرا بولا۔ "پہلے اندر آجاؤ پھر دیکھنا کہ یہ کیسا ٹھکانا ہے۔" کہتے ہوئے وہ مکان کے گیٹ کی جانب بڑھا۔ اس پر تالا نہیں تھا، فقط کنڈی لگی ہوئی تھی، اس نیم اور مختصر سے نخلستانی ویرانے میں آنا بھی کس نے تھا۔ گیٹ کھلا تو گرانٹ نے کالیا کو جیپ سمیت اندر آنے کا اشارہ کر دیا۔

اندر وسیع صحن تھا، جیپ کا انجن بند کر دیا گیا۔ میں اور کالیا نیچے اتر آئے۔ سامنے کے رخ پر دو کمرے نظر آئے۔ گرانٹ ہمیں اشارہ کرتے ہوئے بہ وقت تمام ایک کمرے کی جانب بڑھا۔ اس کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

یہ کمرا لمبائی کے رخ پر مستطیل تھا، ایک کونے میں جا کر اس نے ایک پرانی سی مسہری ایک جانب سرکائی اور کالیا کو اس نے مدد کے لیے بلایا، پھر دونوں فرش پر جھک گئے۔ ایک بھاری سل کو جب تھوڑا سا اوپر اٹھایا تو وہ مخصوص مینوئل ٹرک کے ساتھ ہلکی سرسراہٹ سے ایک طرف کو سرک گئی۔ آگے بڑھ کر دیکھا گیا تو اندر زمین دوز کمرا دکھائی دیا۔ ایک سنگی زینہ نیچے جاتا تھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ گرانٹ کو یہ تہ خانے والا جنگی مکان کس نے عنایت کیا تھا؟ لیکن محمود الحسن کی زبانی میں نے سن رکھا تھا کہ کسی زمانے میں یہاں عربی ریاستوں کے درمیان تیل کے معاملات میں بڑی جنگیں ہوا کرتی تھیں اور یہاں ایک دو مکان چھوڑ کر ہر تیسرے مکان میں تہ خانہ ہوتا ہے۔

اگر یہ بات تھی بھی تو ہم سے زیادہ اس کی معلومات بن رائد کے آدمیوں کو بھی ہو سکتی تھی اور میں نہیں سمجھتا تھا کہ یہاں ہم ان کی دست برد سے زیادہ دیر محفوظ رہ سکیں گے۔

"میں اب بھی یہی کہوں گا کہ ہمیں کہیں اور چلنا ہوگا۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا تو گرانٹ بولا۔

"ہر جگہ یہی دھڑ کا رہے گا لیکن یہ نسبتاً زیادہ محفوظ جگہ ہے۔ میں تمہارے خدشات کی وجوہات کا اندازہ کر سکتا ہوں۔ بے فکر رہو، اندر اترو اس کے بعد میں اور کالیا باہر جا کر جیپ اور اس کے ٹائروں کے نشانات سے چھٹکارا بھی پالیں گے۔ اب جلدی کرو، سوچنا نہیں ہے۔"

اس نے جو توجیہ پیش کی تھی اس سے مجھے کافی حد تک تسلی ہوئی، باقی خطرات کا تو مجھ سے اب چولی دامن کا ساتھ رہا تھا۔ رسک لیے بغیر آگے بڑھنا ناممکن بھی تھا۔

ہم تہ خانے میں آگئے۔ یہاں کا ماحول سیلن زدہ تھا۔ چند بوسیدہ سی کرسیاں دھری پڑی تھیں اور ایک لوہے کے زنگ آلودہ پائپوں والا بیڈ بھی تھا جس پر کچھ میلی سی شے بچھی ہوئی تھی۔

گرانٹ اور کالیا واپس اوپر چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد جب لوٹے تو گرانٹ کے زخموں پر بینڈیج اور اسی طرح کی پٹیاں بھی بندھی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں پانی کا مشکیزہ بھی تھا۔

"لگتا ہے اس مکان میں ہر طرح کی سہولیات موجود ہیں۔" میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"یہاں کچھ بھی نہیں تھا، ماسوائے اس تہ خانے کے......" گرانٹ بھی جواب میں مسکرا کر بولا۔ "یہ ساری میری اپنی لائی ہوئی چیزیں ہیں۔"

"تو گویا تم نے کسی خاص مقصد کے لیے یہاں بھی پورا پورا قبضہ جمایا ہوا ہے۔" میں نے اسے کھولنا چاہا۔ "جیسے تم جنگ کی حالت میں رہ رہے ہو یہاں۔"

"کچھ ایسی ہی بات سمجھ لو، لیکن افسوس کہ میں نے اپنی گرل فرینڈ کو گنوا دیا۔" اس کے لہجے میں پچھتاوا اور دکھ تھا پھر جیسے موضوع بدلنے کی غرض سے بن رائد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اب اس کا کیا کرنا ہے۔"

میں بن رائد کی طرف گھوما۔ "بن رائد! تم جانتے ہو نا، کہ ادھر پاکستان میں بھی تمہارے خلاف قتل کا ایک مقدمہ درج ہے۔ تم نے را کے ذریعے بندرگاہ پر مجھے کنٹینر تلے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی، میری زندگی تھی، بچ گیا، لیکن اس کنٹینر کی زد میں ایک نوجوان مزدور غفورے کا بوڑھا باپ آگیا، جو میرا محسن تھا، اس بے چارے نے مجھے بچانے کے لیے عین وقت پر دھکا دے دیا تھا۔ تم قانون کی زد سے بچ نکلے لیکن تم غفورے اور میرے بھی مجرم ہو۔ تمہیں قانون کے مطابق سزا ملے گی، اگر تم نے زیادہ پر پرزے پھیلائے تو یاد رکھنا یہ قانون میں اپنے ہاتھ میں لے لوں گا۔"

"وہ مجھ پر جھوٹا الزام تھا، سچا ہوتا تو میں کیوں رہائی پاتا؟" بن رائد ڈھٹائی سے بولا۔

"تم نے رہائی نہیں پائی ہے، پیسوں کا چکر چلایا اور ضمانت کروائی۔ وہ منسوخ بھی ہو سکتی ہے اور تمہیں انٹرپول کے ذریعے گھیرا بھی جا سکتا ہے۔" میں نے اسے ڈرایا۔ وہ

اس کے برعکس طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔
”میں ان سب معاملات سے نمٹنے کے سارے گر جانتا ہوں۔تم صرف اپنے کام کی بات کرو۔“

مجھے اس کے اطمینان اور ڈھٹائی پر غصہ تو بہت آیا مگر ضبط سے کام لینے پر مجبور رہا میں۔جانتا تھا میں کہ وہ دولت مند ہی نہیں بلکہ اثرورسوخ والا آدمی بھی تھا۔اس سے بڑھ کر وہ ایک ایسے ”کالے شیطان“(بلیک ڈیول) کا دست راست بھی تھا جو ترقی پذیر اور تیسری دنیا بالخصوص اسلامی دنیا میں تیل کی مصنوعی قلت پیدا کر کے انہیں ایک سپر پاور کے سامنے جھکانا چاہتا تھا اور ان کی من مانی کی راہ ہموار کرنے کے لیے کوشاں تھا،انھی کی اس کالے شیطان کو درپردہ سپورٹ بھی حاصل تھی۔

فی زمانہ آتشیں اسلحے کی جنگ سے زیادہ اقتصادیات اور معاشیات کی جنگ کا زمانہ تھا اور بیرونی قوتیں وطن عزیز سمیت اسی ”ہتھیار“ کو بروئے کار لائے ہوئے تھیں۔

”تو پھر دوٹوک بات یہ ہے کہ مجھے فرحانہ کا پتا چاہیے۔“میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”شمیر کا تم نے کیا کیا؟“جواب دینے کی بجائے بن رائد نے الٹا سوال کر ڈالا اور میں جو پہلے ہی اس کی ڈھٹائی اور اکڑ پر اندر ہی اندر تلملائے ہوئے تھا،نیز اس بات پر بھی کہ یہ درندہ صفت آدمی میرے وطن کے ایک غریب مزدور کا قاتل بھی تھا،میں نے نفرت وغیظ تلے اپنے ہونٹ سکیڑ کر اس کے چہرے پر ایک زوردار گھونسا رسید کر دیا۔بن رائد کے حلق سے ”اوخ“ کی آواز خارج ہوئی اور وہ کرسی سمیت ایک طرف کو الٹ گیا۔اس کا منہ خون سے سرخ ہو گیا۔

کالیا ایک طرف سینے پر ہاتھ باندھے تسلی کے ساتھ کھڑا تھا جبکہ گرانٹ اپنی حالت کے پیش نظر بوسیدہ سے بیڈ پر نیم دراز تھا۔اس کا رخ اسی طرف تھا اور بڑی دلچسپی سے وہ یہ منظر دیکھ رہا تھا۔بن رائد جیسے بے حس آدمی کو میرے ہاتھوں پٹتے دیکھ کر اس کے شاید کسی جذبے کی تسکین ہو رہی تھی۔

”تت......تم......نے......تم نے......مجھ پر ہاتھ اٹھایا؟ بن رائد پر ایک ریاست کے سلطان پر......بہت برا خمیازہ......“وہ خون تھوکتے ہوئے غصیلے پن سے کہہ رہا تھا اور میں نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے اسے گردن سے دبوچا اور دوبارہ کرسی پر جما دیا۔وہ ہانپنے

ستر سال کی عمر میں سقراط پر بت پرستی کے خلاف وعظ گوئی اور حکومت کے خلاف تقریریں کرنے کا الزام لگایا گیا۔اس زمانے میں حکام سلطنت ووٹوں کے ذریعے سے منتخب ہوتے تھے۔ سقراط کہتا تھا کہ یہ رسم نہایت نامعقول اور بے ہودہ ہے۔اگر ملاح،معمار اور بڑھئی کی ضرورت ہو تو کوئی شخص ووٹ نہیں لیتا بلکہ جو شخص ان کاموں کے لیے مناسب ہوتا ہے اسے مقرر کیا جاتا ہے اگر ایسے انتخاب میں غلطی ہو جائے تو انفرادی حیثیت کی وجہ سے چنداں مضر نہیں ہوتی لیکن جہاں ہزارہا انسانوں کے حکام منتخب کرنے میں ووٹ لیے جائیں وہاں بلاشبہ یہ سخت حماقت ہے۔غرض یہ کہ حکومت کی طرف سے سماعت مقدمہ کی تاریخ مقرر ہو گئی لیکن سقراط بدستور اپنی تعلیم و تدریس اور وعظ گوئی میں مصروف رہا۔ایک شخص نے کہا ”سقراط! تم عجیب آدمی ہو۔تم پر جو سخت ترین الزام حکومت کی طرف سے لگایا گیا ہے اگر خدانخواستہ وہ ٹھیک ثابت ہو جائے تو تمہاری جان کے لالے پڑ جائیں گے۔تم ایسی مخدوش حالت میں بے فکر بیٹھے ہو۔جواب دہی کے لیے تمھیں تیاری کرنی چاہیے۔“ سقراط نے بے پروائی سے کہا۔
”میں اسی کو کافی تیاری سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی عمر میں کوئی گناہ اور فریب نہیں کیا۔اس وقت تک میری عمر نہایت اطمینان سے گزری ہے اور میں لگاتار اخلاقی ترقی کرتا رہا ہوں اور لوگوں کو بھی اخلاقی تعلیم دیتا رہا ہوں۔تمام لوگ میری عزت کرتے رہے ہیں اگر میری زندگی منقطع نہ ہو تو بڑھاپا مجھے ستائے گا۔ میرے حواس کام نہیں کریں گے،میری فراست میں کمی آ جائے گی۔ایسے حالات میں زندگی کی مجھے چنداں خواہش نہیں۔اب اگر مجھے مجرم گردان کر مار ڈالا جائے تو لوگ ججوں کے فعل کو قابل نفرت خیال کریں گے اور میرے خلاف کوئی الزام نہ لگائیں گے بلکہ ممکن ہے کہ میری موت کی وجہ سے میری عزت پہلے سے بڑھ جائے۔“

مرسلہ:رفیع الدین۔ساہیوال

لگا تھا اور میری بھی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔
''کسی غرور اور اکڑ میں مت رہنا بن رائد! تم سلطان ہو یا کسی مغربی طاقت کے بدمعاش کے لاڈلے کے آلۂ کار، سب میں جان چکا ہوں۔'' میں نے اسے ہلکا اشارہ ہی دیا تھا۔ ''اب مجھے صرف میرے سوال کا جواب چاہیے بن رائد! فرحانہ کہاں ہے؟''
''تت..... تم اور کیا جانتے ہو؟'' وہ ہکلایا۔ میرا ہاتھ دوبارہ حرکت میں آیا اور اس بار اس کی ٹھوڑی پر پڑا۔ وہ پھر گر پڑا۔ میں نے اسی طرح دوبارہ اسے گلے سے دبوچ کر اٹھایا اور کرسی پر گرایا۔
''فرحانہ کہاں ہے؟'' میں نے خوں ناک غراہٹ سے کہا۔ وہ بری طرح ہانپ اور کراہنے لگا۔ دو گھونسوں نے ہی اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیے تھے۔
''جب تک مجھے جواب نہیں ملے گا، میں پیٹتا رہوں گا تمہیں چاہے تمہاری جان ہی کیوں نہ نکل جائے، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم کیا ہو اور کس کے آلۂ کار بنے ہوئے ہو۔ فرحانہ کہاں ہے؟'' میں نے دہرایا۔
''وہ..... وہ..... شش..... شاہ میر کی قید میں ہے۔'' اس نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ اس بار میرا مکا اس کی ناک پر پڑا۔ وہ ایک چیخ مار کے کرسی سمیت پیچھے الٹ پڑا۔ اس بار میں نے اسے نہیں اٹھایا بلکہ اپنی ایک ٹانگ اس کی موٹی گردن پر رکھ دی۔
''فرحانہ کہاں ہے؟''
''تت..... تم ظالم..... وحشی!..... مم..... میں تمہیں چھ..... چھوڑوں .....'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اس بار میری ٹانگ حرکت میں آئی اور وہ اس کے پہلو پر پڑی۔ وہ مارے اذیت کے گٹھڑی بن گیا۔
''فرحانہ کہاں ہے؟''
''بب..... بتاتا..... ہوں..... پپ..... پانی۔'' اس کی جیسے جان نکلی جا رہی تھی۔ وہ اب تک اپنے زرخرید آدمیوں اور کتوں کو حکم دیتا آیا تھا۔ آج خود تختۂ مشق بنا تو اسے اس کی اوقات یاد آ گئی تھی۔ میں نے کالیا کو اشارہ کیا۔ اس نے چمڑے کا چھوٹا سا مشکیزہ اس کے منہ سے لگا دیا، چند گھونٹ بھرے تو میرے ہی اشارے پر کالیا نے مشکیزہ ہٹا لیا۔
''فف..... فرحانہ میری قید میں ہے۔''
''وہ تو مجھے بھی یقین ہے؟'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''یہ بتاؤ اسے رکھا کہاں ہے؟''
ویسے میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ وہ زندہ تھی۔
''مم..... میری جان کی کیا ضمانت ہوگی۔'' اس نے درد سے کراہتے اور ہانپتے ہوئے کہا۔
''کوئی ضمانت نہیں ہوگی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ہاں! جو جگہ تم بتاؤ گے، تمہاری یہاں موجودگی تک ہم وہاں جا کر اسے لانے کی کوشش کریں گے، ہمارا ایک ساتھی یہاں موجود رہے گا، تمہاری بات جھوٹ نکلی تو تم ختم سمجھو اپنے آپ کو۔''
''تت..... تم کیا اتنا بڑا قدم اٹھا سکتے ہو.....؟ مم..... مجھے ہلاک کر کے، پپ..... پوری ریاست کی مشینری حرکت میں آ جائے گی تمہارے خلاف۔'' اس نے مجھے ڈرایا تو میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔
''اور..... جب تمہاری اس پوری مشینری کو یہ پتا چلے گا کہ تم اپنی ہی دھرتی کے تیل کا خزانہ اغیار کے سپرد کرنے کی ایک عالمی گھناؤنی سازش میں شامل ہو تو تمہارے اپنے ہی لوگ تمہاری تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔''
اسے میری اس بات پر ایک بار پھر جھٹکا لگا۔ حقیقت یہی تھی کہ اس سے متعلق ابھی میری معلومات ادھوری تھیں اور لیکن بہ قول شخصے، ادھورا سچ پورے سچ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔
لہٰذا میرے اس ادھورے سچ نے بھی بن رائد پر خاصا اثر کیا تھا، اسی سبب تلے اس کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔
''تت..... تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟'' اس کے یوں استفسار پر میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رقص کر گئی اور میں اسی لہجے میں اس سے بولا۔
''تمہارا یہی سوال میرے ثبوت کا ایک حصہ ہے۔ بن رائد! اس لیے کہہ رہا ہوں صرف اپنی سلطنت کی حدود تک محدود رہو اور صرائفہ پر قبضے کے خواب دیکھنا چھوڑ دو۔''
''تمہارا دماغ..... بہرام کی بیوہ گلنارا ..... نے خراب کیا ہوگا۔'' وہ غصیلے لہجے میں بولا اور میرا دماغ ایک بار پھر الٹ گیا، اب میں نہیں رکا اور اسے لاتوں اور گھونسوں پر رکھ دیا۔ مجھ پر جیسے جنون طاری ہو گیا۔ کالیا میرا یہ روپ جانتا تھا مگر اور برائے گرانٹ حیرت اور قدرے دلچسپی سے یہ

تشدد انگیز منظر دیکھ رہا تھا۔

بن رائد کی ٹھکائی میں شاید اس کے بھی کسی انتقامی جذبے کی تسکین ہوتی تھی۔ مار کھانے کے دوران بن رائد تکلیف و اذیت سے چیخنے چلّانے لگا تو کالیا نے آگے بڑھ کر مجھے روکا۔

میرا پارہ چڑھا ہوا تھا اور سانسیں پھول گئی تھیں، میں نے لہورنگ نظروں سے مضروب بن رائد کو گھورتے ہوئے غرا کے کہا۔ ”بدمعاش تو اصل میں تمہاری ہے، وہ تو ایک بہادر آدمی کی دلیر بیوہ ہے۔ جسے تمہارے ہی کتوں نے ہلاک کیا ہوگا اس لیے کہ اس نے تمہارے اور تمہارے شیطان ٹولے کے مکروہ چہروں سے نقاب نوچ لیے تھے۔“

میں ذرا اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتے ہوئے دوبارہ اس سے بولا۔ ”فرحانہ کو تم نے کہاں رکھا ہے؟“

”وہ...... وہ...... میرے محل کے تہہ خانے میں بند ہے۔“ اس نے کراہتے ہوئے بہ مشکل جواب دیا۔ میں نے لحہ کے لیے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور قدرے الجھی ہوئی نظروں سے ساتھ کھڑے کالیا کی طرف دیکھا، وہ مطلب سمجھتے ہی پوری تسلی سے بولا۔

”یہ جھوٹ بول رہا ہے۔“

میں گھاگ اور جہاندیدہ کالیا کی بات کو رد نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر تہہ خانے کے تنگ اور اکھڑی ہوئی اینٹوں والے سیلن زدہ فرش پر پڑے بن رائد کو خونخوار...... نظروں سے گھورا۔ کالیا کے الفاظ اس کی سماعتوں سے بھی ٹکرائے تھے، ازیں علاوہ مجھے ایک بار پھر جارحانہ تیوروں کے ساتھ دیکھ کر وہ دوبارہ کراہتے ہوئے مگر جلدی سے بولا۔ ”پپ...... پہلے اسے وہیں رکھا گیا تھا لیکن بعد میں اسے میری الرقاع...... والی رہائش گاہ میں منتقل کردیا گیا۔“

”پتا بتاؤ اپنی رہائش گاہ کا۔“ میں نے کہا۔ ”اور...... یاد رکھنا اگر یہ بھی غلط بیانی ثابت ہوئی تو پھر تمہاری خیر نہیں۔“

بن رائد نے زبانی کلامی ”الرقاع“ یعنی اپنی شہر والی جگہ کا پتا بتادیا، جسے میں نے ہی نہیں کالیا اور راو برائے گرانٹ نے بھی اچھی طرح ذہن نشین کرلیا، تاہم گرانٹ بولا۔

”میں نے اس کی وہ رہائش گاہ دیکھ رکھی ہے۔ بحرین کا وہ پوش علاقہ کہلاتا ہے اور خاصا گنجان بھی،،، وہیں از ابیلا نام کی اس کی ایک محبوبہ بھی مستقل طور پر مقیم ہے۔“

میں نے غور کرنے والے انداز میں...ان کے چہرے کی طرف دیکھا، پھر کالیا کی جانب گھوما۔ ”کیا خیال ہے کالیا! تم ادھر رک سکتے ہو؟ جبکہ میں اور گرانٹ......“

”زیادہ بہتر گرانٹ کا یہاں رکنا ہوگا۔“ کالیا نے میری بات کاٹتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”تمہارا دوست ٹھیک کہہ رہا ہے، مسٹر نعمان!“ گرانٹ نے بھی کالیا کی تائید کرڈالی۔ ”یہاں کا ماحول میرے لیے نیا نہیں ہے۔ کسی بھی ممکنہ خطرے کے پیش نظر میں بن رائد سمیت اپنی کمین گاہ بدل بھی سکتا ہوں۔“

”گڈ۔“ میں نے کہا۔ ”اور مجھے پورا یقین ہے کہ اس کے کتے، بالخصوص راکا ہمیں ڈھونڈ رہا ہوگا۔ وہ دیر سویر یہاں پہنچ سکتے ہیں۔“

”بے فکر رہو اور جا کر اپنا کام نمٹاؤ۔ لیکن مجھ سے رابطے میں ضرور رہنا، تم نے کالے شیطان کے متعلق جو باتیں کی ہیں اس کے لیے ہمارا اب مشترکہ ساتھ اور بھی ضروری ہوگیا ہے۔ ہم بعد میں اس سلسلے میں تبادلۂ خیال کریں گے اور مجھے یقین ہے کہ ایک دوسرے کو نئی باتیں بھی معلوم ہوں گی۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے اس جگہ کا بھی پتا بتایا جہاں اس کی کار کھڑی تھی۔ وہ یہاں سے زیادہ دور نہ تھی۔

میں اور کالیا فوراً روانہ ہوگئے۔ ایک رائفل گرانٹ کو تھما گئے تھے۔ دوسری میں نے اپنے پاس رکھی تھی۔

میں اور کالیا مکان سے باہر نکلے اور نہایت محتاط روی سے کھجوروں کے درختوں اور امتداد زمانہ سے منہدم شدہ مکانوں کے کھنڈر سے ہوتے ہوئے بالآخر مطلوبہ جگہ جا پہنچے۔

وہ کوئی دفتری ٹائپ چھوٹی سی ایک منزلہ عمارت تھی، اوپر رہائشی پورشن تھا شاید، وہاں ویرانی کا راج تھا۔ ہم کار کی طرف بڑھے۔

کار پرانے ماڈل کی مگر ٹھیک ٹھاک حالت میں تھی، لیکن اگنیشن سوئچ میں چابی عنقا تھی، مگر میرے یا کالیا کے لیے بغیر چابی کے کار اسٹارٹ کرنا چنداں مشکل ثابت نہ ہوا۔

اگلے چند منٹوں بعد ہماری کار مناوا کی طرف دوڑی جارہی تھی۔ یہ وہی نیم پختہ سی سڑک تھی جس پر میں ٹیکسی میں سفر کرتا رہا تھا۔ اسی راستے پر میرا سرائے نما ہوٹل بھی تھا، جہاں میں نے مستقل طور پر ایک کمرا ہفتہ بھر کے لیے کرائے پر لے رکھا تھا۔

عراق میں دفن شدہ شہر کی دریافت

تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو 2500 ق م سے 2000 ق م تک دنیا میں پائی جانے والی چار ایسی تہذیبوں کا سراغ ملتا ہے جن کے باشندے اپنے زمانے کے ترقی یافتہ لوگ تھے جو کپڑے، برتن، زیور اور ہتھیاروں کا استعمال جانتے تھے، اینٹوں سے بنے ہوئے گھروں میں رہتے تھے، کپڑا اور چمڑا رنگنے، شراب کشید کرنے اور کھیتی باڑی سے واقف تھے۔ یہ چاروں تہذیبیں کرۂ ارض پر بہنے والے دریاؤں کے کنارے پر واقع تھیں۔ ان میں سے پہلی تہذیب مصر میں دریائے نیل کے کناروں پر تھی۔ مصر پر حکومت کرنے والے فراعنہ مصر اسی تہذیب کا حصہ تھے۔ دوسری میسوپوٹیمیا کی تہذیب تھی جو موجودہ عراق اور شام کے علاقوں میں واقع تھی اس تہذیب کا مرکز اس علاقے میں بہنے والے دو دریاؤں ٹائگریس اور یوفریٹس کے درمیان بتایا جاتا ہے۔ تیسری تہذیب چین میں دریائے زرد کے کنارے موجود تھی اور چوتھی تہذیب دریائے سندھ کے کنارے یعنی برصغیر میں واقع تھی۔ اس تہذیب کے آثار آج بھی ہڑپہ اور موہنجو داڑو کی صورت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ حال ہی میں ماہرین آثار قدیمہ کو عراق میں میسوپوٹیمیا تہذیب کے ایک دفن شدہ شہر کے آثار ملے ہیں۔ اس شہر کی نشاندہی تو ایک امریکی جاسوس سیارے نے کئی دہائیاں پیشتر کردی تھی مگر اس خبر کو خفیہ رکھا گیا تھا۔ اب جب امریکا انتظامیہ

اسٹیئرنگ وہیل میں نے سنبھال رکھا تھا۔ کالیا میرے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔

رات اپنی سیاہ اوڑھنی دھیرے دھیرے سمیٹنے لگی تھی اور اس میں سے سپیدہ سحر اپنا پُرنور جلوہ دکھا رہی تھی۔ آسمان پر خوشگوار سی نیلاہٹ ابھر آئی تھی۔ دور ریتیلے ٹیلوں پر صبح دم کی سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔

کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد کالیا نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "جگری......! کہیں یہ مردار بن رائد، ہماری غیر موجودگی میں او برائے گرانٹ سے کوئی خفیہ ساز باز نہ کرلے۔"

"میرے ذہن میں بھی پہلے یہی شبہ ابھرا تھا۔" میں نے کار کی ونڈ اسکرین کے پار ہیڈ لائٹس کی روشنی راستے پر نظریں جمائے رکھتے ہوئے جواب میں کہا۔

"لیکن کالے شیطان والے معاملے میں مجھے لگ رہا ہے کہ گرانٹ کے سلسلے میں میرا پہلا خیال محض بدگمانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ دیکھا نہیں تم نے کہ وہ اس سلسلے میں کس قدر پُرجوش نظر آ رہا تھا۔ ہم سے بھی یہی کہہ رہا تھا کہ وہ اور ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ کالے شیطان کے ٹولے سے تعلق نہیں رکھتا ہے۔ بلکہ وہ بھی ہماری طرح اس کا دشمن ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اب تم نے گرانٹ کو......" کالیا کہتے کہتے رکا اور پھر ایک دم مسکرا کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ "ابے لے...... جگری! تو بھی سامنے والے پر بہت جلدی بھروسا کرلیتا ہے۔ کیا بھول گئے تم کہ کوہ جبل میں اس نے کس طرح بن رائد کے ان گماشتوں سے کچھ کہا تھا جو اسے موت کی نیند سلانے لگے تھے، لیکن گرانٹ نے......"

"وہ اس نے چال چلی ہوگی، جس کا اندازہ بعد کے پیش آمدہ حالات سے ہو چکا ہے۔" میں نے درمیان میں کہا۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو، خیر......!" کالیا موضوع بدلنے کی غرض سے آگے بولا۔ "بہ قول گرانٹ کے ہی الرفاع شہر کے وسط میں واقع ہے، وہاں ہماری پولیس چیکنگ بھی ہوسکتی ہے، کیا تمہارے پاس کاغذات پورے ہیں؟"

میں اس کی بات پر چونکا اور بولا۔ "تم نے بروقت مجھے یاد دلایا کالیا! ابھی راستے میں میرا ہوٹل آئے گا، میرے تمام سفری کاغذات وغیرہ وہیں موجود ہیں۔"

کالیا نے سر ہلا دیا۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے اپنے کمرے سے کاغذات سنبھالے۔ کالیا نیچے ہوٹل سرائے کے ناپختہ احاطے میں ہی کار کے پاس موجود رہا۔ اس کام میں بہ مشکل چند منٹ صرف ہوئے اس کے بعد میں نے کار دوڑا دی۔

شہر جانے والی سڑک چند کلو میٹر تک سمندر کے ساتھ ساتھ چلتی رہی اس کے بعد دائیں جانب مڑ گئی اور بحرین کے قلب میں داخل ہوگئی۔

نے جاسوس سیارے سے ملنے والی تصاویر شائع کیں تو دنیا بھر کے ماہرین آثار قدیمہ کی توجہ اس جانب مبذول ہوگئی۔ یہ شہر عراق کے پہاڑی سلسلے زیگروس میں واقع ایک درے "دربندرانیہ" کے پاس دریافت ہوا ہے۔ یہ درہ اس راستے پر واقع ہے جہاں سے گزر کر سکندر اعظم نے ایران پر چڑھائی کی تھی مگر حیرت کی بات ہے کہ سکندر اعظم کے حملوں کے متعلق کتابوں میں قطعاً اس شہر کا ذکر نہیں ملتا۔ اب جب برٹش میوزیم کے سائنسدانوں نے اس علاقے میں کھدائی شروع کی ہے تو انہیں اس مقام سے برتن، زیورات اور آرٹ کے نمونے ملنے لگے ہیں۔ دفن شدہ شہر سے ملنے والی نوادرات سے ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ شہر سکندر اعظم کے دور کے بعد بھی تقریباً تین سو سال آباد رہا۔ اس شہر پر پہلے سیلیوسیڈس حکمران رہے اور بعد میں یہ شہر ہیلینیئنک کے قبضے میں چلا گیا۔ دفن شدہ شہر کی کھدائی سے ایک قلعہ اور شراب کی متعدد بھٹیاں بھی دریافت ہوئی ہیں۔ شہر کے جنوبی حصے میں تراشے ہوئے پتھروں سے تعمیر شدہ ایک عبادت گاہ بھی ملی ہے جس میں یونانی دیوتاؤں کے مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ اس شہر میں ایک مقبرہ بھی دریافت ہوا جو ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق بادشاہ اروڈس دوئم کا ہے جس نے اس شہر پر 57 ق م سے لے کر 38 ق م تک حکومت کی تھی۔

مرسلہ: عنایت اللہ، فیصل آباد

یہاں آتے ہی ہم ہائی وے پر آگئے جہاں اور بھی ہیوی ٹریفک رواں دواں تھی۔ کالیا نے بھی اپنے کاغذات پہلے سے سنبھالے ہوئے تھے، لیکن باوصف اس کے میرے پاس تو انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس تھا مگر کالیا کے پاس نہیں تھا، اسی لیے میں ہی گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد ہائی وے سے متصل چند ذیلی سڑکیں دائیں بائیں اور انڈر پاس سے ہوتی ہوئی مختلف علاقوں کی جانب گھوم رہی تھیں، ان علاقوں کے بڑے بڑے سائن بورڈ پر ہم نے نظر رکھی ہوئی تھی اور پھر جلد ہی ہمیں الرفاع کا بورڈ بھی دکھائی دے گیا۔

ہائی وے کے بطن سے مذکورہ شہر کی طرف جانے والی سڑک دائیں جانب سے گھوم کر ایک انڈر پاس سے دوسری جانب چلی گئی تھی۔ میں نے اسی جانب کار موڑلی۔

بہ قول گرانٹ کے الرفاع دو حصوں میں بٹا ہوا تھا، ایک مغربی اور دوسرا مشرقی۔ آخرالذکر حصہ ساحل سمندر کے قریب واقع تھا اور ہماری منزل اسی جانب تھی۔

مغربی حصہ شہر کے قلب میں واقع تھا۔ مشرقی الرفاع کے نسبتاً ایک شارٹ کٹ راستہ گرانٹ نے سمجھایا تھا۔ اس طرف چیکنگ وغیرہ کا خطرہ بھی کم ہی تھا۔ یہ مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ جانے والی سڑک تھی۔ اگرچہ چیکنگ سے کترانے کی کوئی خاص وجہ تو نہ تھی لیکن پھر بھی میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کارروائی میں وقت ضائع ہو۔

ہمارے پاس موبائل فونز نہیں تھے اور ہمیں بڑی الجھن سی ہو رہی تھی۔ شہر آکر لامحالہ میرا خیال گلنارا کی طرف چلا گیا، شہر میں فرحانہ کی رہائی سے متعلق ایک مہم میں تو میں سردست مصروف ہی تھا، دل میں خیال ابھرا گلنارا سے ایک ملاقات یوں بھی ضروری تھی، کالے شیطان کی بربادی اور حدی اور صرائفہ کو سرد جنگ سے بچانے کے لیے محمود الحسن، شہزادی نیلم اور کسی حد تک ادبرائے گرانٹ کے ساتھ گلنارا بھی میرے اس عظیم مشن میں شامل ہوچکی تھی۔

اپنی اپنی جگہ اب سب میرے اہم مہرے تھے۔ فرحانہ والا معاملہ نمٹاتے ہی میں بہت جلد ان سب کو ایک تنظیم کی شکل میں سامنے لانا چاہتا تھا۔ ابھی ہم سب منتشر تھے۔

بحرین کے اس علاقے الرفاع پر ہی کیا موقوف تھا کہ پورا بحرین ہی بڑا اکھلا ڈلا ملک تھا۔ ایک عظیم خلیجی ریاست۔ خلیج فارس میں بنا ایک خوبصورت جزیرہ۔ اس کے جنوب اور مغرب میں سعودی عرب ہے، جو شاہ فہد نامی پل سے اسے سعودی عرب کے ساتھ منسلک کرتا ہے۔ مشرق میں قطر ہے اور ان کے درمیان بھی پل کی تعمیر کے معاملات جاری ہیں۔ اس کا دارالحکومت "منامہ" کہلاتا ہے جو یہاں کا ایک عظیم ترین شہر ہے۔ بحرین کو 16 دسمبر 71 19 کو انگریزوں سے آزادی ملی تھی۔

اس کا سب سے بڑا مضافاتی علاقہ مناوا کہلاتا تھا جہاں کچھ آزاد قبائل تھے۔ جبکہ "رابع الخالی" کے عظیم صحرا میں واقع، صرائفہ اور حدی ان میں سرفہرست اور قابل ذکر

ریاستیں تھیں۔

دنیا کی ٹاپ ٹین بڑی کرنسیوں میں ''بحرینی دینار'' دوسرے نمبر پر مضبوط ترین کرنسی ہے۔ ایک بحرینی دینار 2.65 امریکی ڈالر اور 278.02 پاکستانی روپوں کے برابر ہے۔ جبکہ بحرین کی کرنسی کا سب سے بڑا نوٹ بھی بیس دینار کا ہے جو 53.05 امریکی ڈالرز کے برابر ہے۔

یوں تمام عرب ممالک اگرچہ تیل اور گیس کے ذخائر سے مالا مال ہیں اور وہ ان کی برامدات سے زرمبادلہ کماتے ہیں لیکن یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ بحرین وہ پہلا عرب ملک ہے جس نے اپنی سرزمین میں تیل اور گیس کے ذخائر دریافت کیے۔

صبح کی روشنی منامہ میں پوری طرح پھیل چکی تھی اور اس کی بلند عمارتیں، کھجوروں کے باغات صاف ستھرے روڈ راستے اور مارکیٹیں بڑا خوشگوار سا منظر پیش کر رہی تھیں۔

ہماری کار ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ جانے والی سڑک پر آ چکی تھی۔ بن رائد اور بالخصوص گرانٹ کے بتائے ہوئے پتے کے مطابق ہم منزل کے قریب پہنچ چکے تھے۔

میں نے کار کی رفتار آہستہ کر لی تھی۔ یہ ساحلی سڑک درختوں میں گھری ہوئی تھی۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ کالیا! بن رائد کی اس شہر والی رہائش گاہ پر اس کے کتنے مسلح محافظ ہو سکتے ہیں؟''

''چار پانچ سے زیادہ نہیں۔'' اس نے عام سے انداز میں جواب دیا۔ ''کوئی اتنی بڑی سرکاری شخصیت تو بن رائد نہیں ہے کہ وہاں مسلح پہرے داروں کا جمگھٹا ہو۔ نہ ہی کوئی اتنا بڑا سلطان کہ سرکاری سطح پر......'' وہ کہتے کہتے اچانک رکا اور میری طرف گردن گھما کر دیکھنے لگا۔

''کیا ہوا؟ اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو مجھے؟'' میں نے بھی ایک ذرا سامنے سے نظریں ہٹا کر گردن اس کی جانب گھمائی تھی اور پھر ڈرائیونگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''یہ تم مجھ سے اس قدر بچکانہ سوالات کیوں کر رہے ہو؟ اب بھلا مجھے کیا پتا کہ وہاں کیا انتظامات کیے ہوں؟ میں نے بھی آخر کو تمہاری طرح پہلی ہی بار یہاں قدم رکھا ہے۔'' وہ بولا۔ میں مسکرا دیا۔

''کالیا! دراصل ان معاملات میں تمہارا ذہن چلتا نہیں بلکہ دوڑتا ہے۔ اب دیکھو کس قدر ٹھیک ٹھیک تجزیہ کیا ہے تم نے۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا، ابھی تو ہم وہاں تک پہنچے ہی نہیں۔'' وہ بھی بحث پر اتر آیا۔ مجھے خوشی تھی کہ ان حالات میں بھی کالیا کی زندہ دلی قائم تھی۔

''میں تمہاری بات سے متفق ہوں اسی لیے۔''

''ہوشیار باشد! منزل قریب......'' وہ اچانک بولا۔

سامنے سڑک بائیں جانب کو قوس کی شکل میں گھوم رہی تھی چاروں طرف اب قطار اندر قطار دیدہ زیب اور ایک منزلہ بنگلوں کی قطاروں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ کار کی رفتار میں نے مزید ہلکی کر دی۔ آتی جاتی پرائیوٹ گاڑیاں چم چماتی اور نئے ماڈل کی تھیں۔ ایسی آرام دہ اور پُرکشش تھیں کہ میں نے تو یہ پاکستان میں بھی نہیں دیکھی تھیں۔

ایک سے ایک مرسڈیز اور انٹر کولر ماڈل کی بھاری بھرکم گاڑیاں اور فیملی کاریں۔ ان کے درمیان گرانٹ کی یہ پرانے ماڈل کی کار عجیب مضحکہ خیز سی نظر آتی تھی۔

اب ہمیں ذیلی سڑک کی تلاش تھی جو دائیں جانب کو گھوم کر ساحل سمندر کے قدرے چلی جاتی تھی اور جس کا اختتام اس رو کے ان آخری بنگلوز کی طرف تھا جن میں سے ایک بن رائد کا تھا۔

جلد ہی وہ سڑک قریب آ گئی، میں نے اسٹیئرنگ کاٹا۔ کار دائیں جانب مڑی۔ ایک کھلا گھاس کا میدان یا کوئی باغ سا بنا ہوا تھا، دائیں بائیں نظر آنے لگا۔ اس کے پار جہاں تک سڑک سمندر کی طرف چلی گئی تھی وہاں مجھے کم و بیش چار پانچ بنگلے دکھائی دینے لگے جو ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر بنے ہوئے تھے، ان کی ساخت بھی مخصوص دکھائی پڑتی تھی۔ ان میں ایک دو بنگلے زیرِ تعمیر نظر آتے تھے۔ نیلے اور سفید رنگ کی دیواروں اور بڑے سے سرخ اور سنگِ سیاہ کے ستونوں سے بنا ہوا گیٹ، وہی تھا جسے نشانی کے طور پر ہم نے یاد رکھا تھا۔ بہ قول گرانٹ اور بن رائد کے...... ہماری مطلوبہ رہائش گاہ کا ایسا ہی گیٹ تھا۔

''جگری......! اس طرف کار موڑ لو۔'' اچانک کالیا نے کہا۔ اس نے اسی جانب ہی اشارہ کیا تھا جدھر میرا اپنا ارادہ بھی کار لے جانے کا تھا، اس طرف کچھ لوگ جاگنگ کر رہے تھے۔ کچھ اسٹال بھی بنے ہوئے نظر آ رہے تھے، غرضیکہ لوگوں کا وہاں کچھ رش سا نظر آتا تھا۔ ملکی و غیر ملکی وہاں سن باتھ سے انجوائے کرنے میں مصروف تھے، یا یوں کہنا مناسب ہوگا کہ سحر خوری کر رہے تھے، کیونکہ سورج ابھی پوری طرح سے طلوع نہیں ہوا تھا۔

اس طرف کچھ گاڑیاں اور ہیوی ڈیوٹی بائیکس بھی کھڑی تھیں۔ کار ہم نے وہیں لے جا کر کھڑی کر دی اور نیچے اتر آئے۔

تھوڑی دیر تک یونہی مٹر گشت کرنے کے انداز میں ہم وہاں ٹہلتے اور کن انکھیوں سے مطلوبہ بنگلے کا جائزہ لیتے رہے اس کے بعد آہستہ آہستہ ہم نے اس کی جانب قدم بڑھانا شروع کر دیا۔

بنگلے کے اطراف میں تو کجا اس کے گیٹ پر بھی ہمیں کوئی نظر نہیں آیا لیکن ابھی ہم چند ہی قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ اچانک ٹھٹک گئے۔

ایک بھاری بھرکم گاڑی اسی سڑک پر خاصی تیز رفتاری سے دوڑتی دکھائی دی، جس سڑک پر ذرا دیر پہلے ہماری کار تھی۔

میں اور کالیا اس گاڑی کو تکتے رہ گئے، جو ہمارے مطلوبہ بنگلے کے گیٹ کے سامنے پہنچ کر رک گئی تھی۔

”آگے بڑھ...... جگری!“ کالیا نے نجانے کس خیال کے تحت کہا، ورنہ تو میرا ابھی ارادہ اس بنگلے کے قریب بھی بھٹکنے کا نہیں ہو رہا تھا، کیونکہ مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا تھا کہ کہیں بن رائد کے آدمیوں کو شبہ تو نہیں ہو گیا ہو گا کہ میں یہاں کا رخ بھی کر سکتا ہوں لیکن ابھی میں اس معاملے میں گومگو کا ہی شکار تھا۔

”ابے لے...... جگری! غور سے دیکھ...... ان دونوں خبیثوں کو......“ اچانک کالیا نے کہا اور میں نے تین چار افراد کو اس انٹر کولر گاڑی سے اترتے دیکھا جبکہ ان میں سے تین کا انداز مودبانہ اور چوکس سا نظر آتا تھا، باقی دو جن کی طرف کالیا نے اشارہ کیا تھا، وہ ایک تو راکا تھا اور دوسرا...... شاہ میر......

اپنے ازلی دشمن کو دیکھتے ہی میرے سینے میں دبی انتقام کی چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔

”سمجھ گیا میں ......“ کالیا مجھے کسی قسم کا اظہار خیال کرنے سے پہلے ہی خود کلامیہ بولا۔

”شاطر اور زیرک دماغ راکا جان گیا ہو گا کہ بن رائد کے منہ سے سب سے پہلے رانا بشر کی بیٹی فرحانہ کے بارے میں ہی اگلوایا جائے گا اور چوں کہ فرحانہ، شاہ میر کا شکار تھی اسی لیے راکا نے فی الفور اس سے ٹیلی فونک رابطہ کر کے اسے ساری صورتِ حال بتائی ہو گی انہیں یقین تھا یا پھر یقین کی حد تک کوئی شبہ کہ ہم میں سے کوئی یہاں رخ کر سکتا ہے۔ یہ دونوں یہاں آن پہنچے۔“

”لیکن کالیا! بہ قول تیری کچھ روز پہلے کی اطلاع کے مطابق شاہ میر دبئی میں تھا۔ اتنی جلدی......“ کالیا نے میری بات کاٹ دی، بولا۔

”شاہ میر کے پاس تیل کی کمائی ہے جگری! جس طرح اس نے کاریں رکھ چھوڑیں ہیں اسی طرح اس کے پاس اپنے ہوائی اور بحری جہاز ہیں اور پھر ایک پرائیوٹ طیارے میں دبئی سے بحرین پہنچنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔“

”مان لیا، لیکن اب کیا جائے؟“ میں نے قدرے پریشان ہو کے پوچھا۔ ”میں تو سمجھا تھا کہ چپ چپاتے ہی یہ اہم معاملہ بھی نمٹ جائے گا۔ مگر......“

”نمٹ جائے گا...... بڑے آرام سے۔“ کالیا بولا۔

”نہیں کالیا! یہ شہر ہے۔ دیکھ نہیں رہے ہو تم، ان کے تین گماشتے کس طرح تنے کھڑے ہیں اور غیر مسلح نظر آ رہے ہیں۔ حالانکہ مجھے یقین ہے یہ پانچوں ہی جدید ترین اسلحے سے لیس ہوں گے۔“

”یہ ان کی مجبوری، بالکل ویسی ہی ہے جس کا تم نے ابھی ذکر کیا۔“ کالیا بولا۔

”اصل دمادم مست قلندر تو اندر ہو گا۔“

ارسطو یونان کی وحدت کا قائل تھا اور جب وہ 334-335 ق م میں ایتھنز گیا تو اس نے کھلم کھلا اس جماعت کی حمایت کی جو اس وحدت کی حامی تھی۔ ارسطو کی عملی سیاسی زندگی کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ محض فلسفی اور مفکر ہی نہ تھا، بلکہ زندگی کو مختلف زاویوں سے پرکھنے والا ایک عالم اور مدبر بھی تھا۔ اس نے ایتھنز میں آتے ہی ایک عالیشان مدرسے کی بنیاد رکھی، جو کئی لحاظ سے اپنے زمانے میں منفرد حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے اس مدرسے کی تجربہ گاہ کے لیے بیرونی ممالک سے انواع و اقسام کی چیزیں منگوائیں جو اسے اسکندر اعظم کے ساتھ تعلق رکھنے کی وجہ سے دستیاب ہو گئیں۔ اس اعتبار سے اسے حکمت طبعی یا سائنس کا بانی کہیں تو بے جا نہ ہو گا۔ ارسطو چونکہ ٹہلتے ہوئے درس دینے کا عادی تھا، اس لیے اس کے مکتب فکر کا نام مشائیت اور اس کے پیروؤں کا نام مشائین پڑ گیا۔

مرسلہ: ڈاکٹر سعیدہ شاہ، کراچی

"تو پھر کیا کیا جائے؟"

"میرا خیال ہے پہلے تھوڑی دیر کھڑے ہو کے دیکھتے ہیں کہ یہ کرتے کیا ہیں۔" کالیا کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"میرا تو یہی خیال ہے کہ یہ لوگ فرحانہ کو یہاں سے کہیں اور لے جانے کے لیے آئے ہیں۔"

"اس خدشے کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔"

"ہم سے غلطی ہوگئی، کیا یہ بہتر نہیں ہوتا کہ ہم پولیس کو خبر کر دیتے۔ اس طرح بن رائڈ بھی رنگے ہاتھوں قانون کی زد......"

"یہ ایک بھیانک غلطی کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ الٹا ہم یہاں کی پولیس کی نظروں میں آجاتے۔"

ہم اسی طرح ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ بالآخر یہی فیصلہ کیا گیا کہ تھوڑی دیر "تماشا" دیکھا جائے۔ اندر گھستے ہی ان لوگوں سے مار ماری لازمی تھی۔ معاملہ گڑبڑ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ الگ بات تھی اگر وہ فرحانہ کو کسی اور جگہ منتقل کرانے کی غرض سے آئے تھے تو ہم اسی صبر اور موقع مناسبت کے منتظر رہتے ہوئے ان کا تعاقب کرتے اور پھر آسانی سے ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتے۔

وہ لوگ سب اندر جا چکے تھے۔ ہم دونوں ذرا پیچھے ایک اسٹال کی جانب سرک گئے تھے۔ جس کی پیشانی پر "کولڈ کوکونٹ کارنر" درج تھا، وہاں سے ہم دونوں ناریل لے کر سائفن سے اس کا پانی پینے میں مشغول ہوگئے۔

تھوڑی دیر گزری، سب پُرسکون رہا، لیکن میرا دل و دماغ ہلچل کی سی کیفیات کی زد میں تھا اور ابھی میں اور کالیا اپنے اندازے کے درست ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں غور ہی کر رہے تھے کہ اچانک گولی چلنے کی آواز ابھری۔

آس پاس کے لوگ ٹھٹکے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے، خود میں اور کالیا بھی چونک پڑے، اسی وقت مذکورہ بنگلے سے برسٹ چلنے کی آواز ابھری اور پھر تو جیسے ساحل کے اس ٹکڑے پر افراتفری مچ گئی، خود ہمارے لیے یہ سب بالکل غیر متوقع اور اچانک تھا کہ ابھی تو ہم نے اندر قدم بھی نہیں رکھا تھا اور یہ ہنگامے شروع ہوگئے تھے۔

"کک......کالیا! یہ کیا ہوگیا؟" میرے منہ سے ہکلاتے ہوئے برآمد ہوا۔ یہ ایک غیر متوقع صورتِ حال تھی کہ میرے جیسا انسان بھی گھبرا گیا تھا۔

"ابے لے......جگری! تیری تو آواز کانپنے لگ گئی۔" کالیا بولا۔ پھر فوراً سنجیدہ ہوگیا۔ "لگتا ہے اندر کوئی اور ہی پُراسرار چکر چل پڑا ہے۔"

اب ہمارے لیے مطلوبہ بنگلے کا رخ کرنا مناسب نہ رہا تھا۔ اندر فرحانہ بھی موجود تھی۔ کسی پُراندیش خیال تلے میرا دل دہل سا گیا۔ میں نے اسی تفکر سے کہا۔

"کالیا! ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔"

"ہرگز نہیں۔" کالیا نے انکار کر دیا۔ "ابھی تھوڑی دیر میں پولیس آجائے گی یہاں۔ صرف دیکھتے رہو اندر سے جلد ہی کچھ برآمد ہونے والا ہے۔" اس کے چہرے پر بھی بری طرح الجھن کے آثار تھے۔ حالانکہ وہ فوراً ٹھیک ٹھیک مفروضے قائم کر لیا کرتا تھا لیکن یہاں شاید اس کی عقل بھی خبط ہوگئی تھی۔

ہم دونوں کی نظریں بنگلے پر ہی جمی ہوئی تھیں اور چند دیگر "تماش بین" ٹائپ کے لوگ بھی کافی فاصلے سے اسی جانب تکے جا رہے تھے۔

اچانک میں نے گیٹ سے کسی کو زخمی حالت میں نکلتے دیکھا۔ ہماری دھڑکتی نظریں اس طرف بدستور جمی رہیں۔

وہ زخمی شخص گاڑی میں سوار ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور اسے پہچان کر میرا دل جیسے یکلخت کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا۔ وہ کوئی اور نہیں راکا تھا۔

ٹھیک اسی وقت جب وہ گاڑی میں سوار ہو رہا تھا، اندر سے کسی نے برسٹ فائر کر دیا۔ وہ شاید اس کے تعاقب میں لگا ہوا تھا۔

راکا گولیوں سے چھلنی ہوگیا۔ اس کے حلق سے برآمد ہونے والی آخری چیخ بڑی کربہ انگیز تھی۔ میں اور کالیا بت بنے یہ عجیب اور پُراسرار کھیل دیکھتے رہ گئے۔

☆......☆

ہمارے لیے تو نہیں البتہ تماشا دیکھنے والوں کے لیے یہ کھلی بربریت تھی، ہمارے لیے اس لیے نہیں تھی کہ راکا جیسا خونی اور سفاک درندہ اسی انجام کا مستحق تھا۔ اول الذکر لوگوں نے چیخیں مارتے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگنا شروع کر دیا۔

"ابے لے......جگری! یہ مسٹنڈا راکا تو گیا۔ عجیب ہی اور نہ سمجھ میں آنے والا چکر چل پڑا ہے یہ تو۔" کالیا کے لہجے میں بلا کا تحیر تھا۔ جبکہ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ جہاں مجھے راکا جیسے موذی کے جہنم واصل ہونے کی مسرت ہوئی تھی وہیں ایک کھٹک بھی تھی کہ آخر ان کے بیچ ایسا اچانک کیا ہوگیا تھا کہ ان کی آپس میں اس بری طرح ٹھن

گئی تھی؟

میں نے فوراً پیچھے پلٹتے ہوئے کالیا کو بھی ساتھ آنے کا کہا۔

ذرا ہی دیر بعد ہم کار میں براجمان تھے، ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی میں نے انجن اسٹارٹ کر دیا تھا۔ نظریں بدستور اسی طرف جمی ہوئی تھیں اور وہی ہوا، جس کا مجھے اندازہ تھا اور اسی لیے میں نے ابھی اپنی کار کی راہ لی تھی۔

شاہ میر برآمد ہوا اور اس کے ہمراہ وہی ساتھی تھے جنہیں میں پہلے بھی اندر داخل ہوتے دیکھ چکا تھا، لیکن انہیں دیکھ کر مجھے جھٹکا لگا تھا۔

وہ پہلے تین تھے لیکن اب دو نظر آرہے تھے، بلکہ دوسرا بھی خاصا زخمی تھا، وہ ہی نہیں خود شاہ میر نے بھی اپنا ایک بازو تھام رکھا تھا۔ گویا وہ بھی زخمی تھا اور زخمی بازو سے خون بہہ رہا تھا۔

وہ سب عجلت میں تھے اور گاڑی میں سوار ہوئے۔ پھر جیسے ہی یہ روانہ ہوئے، اسی وقت ساحل والی سڑک سے پولیس کی دو گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی نمودار ہوئیں۔ میں اور کالیا کار کی فرنٹ سیٹوں پر بیٹھے ونڈ اسکرین سے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔

میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ گویا منتظر تھے کہ تھیلے میں سے کیا برآمد ہوتا ہے۔

شاہ میر کی انٹرکولر حرکت میں آچکی تھی، اس کا رخ ساحلی سڑک کی جانب تھا، وہ بہت تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔

پولیس گاڑیوں کی چھتوں پر سرخ نیلی بتیوں کے علاوہ میگا فون بھی نصب تھے۔ وہ انٹرکولر کو رکنے کا آرڈر کر رہے تھے، لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا تو انٹرکولر پر پولیس نے دو تین فائر جھونک دیے، انٹرکولر غراتی ہوئی سڑک کی جانب پہنچ چکی تھی۔

یہی وہ وقت تھا جب دونوں پولیس گاڑیوں میں سے ایک نے راستہ بدلا اور...... شاہ میر کی گاڑی کے تعاقب میں لگ گئی جبکہ دوسری گاڑی نے بنگلے کا رخ کیا۔

”کالیا! تو ادھر ہی اتر جا اور کوشش کرنا، اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے اور فہمی کی بھی خبر لینے کی کوشش کرنا، میں تجھے دوبارہ ادھر ہی سے آ کر پک کرتا ہوں۔“ میں نے جلدی جلدی کالیا سے کہا۔

وہ بھونچکاں سا ہو گیا۔ بے اختیار اس کے منہ سے

سائنس دانوں کے پیشِ نظر دو بڑے مسائل ہیں پہلا فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار پر قابو پانا اور دوسرا کسی سستے اور آسان طریقے سے توانائی حاصل کرنا ہے۔ یہ توانائی بجلی کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے یا پھر کوئی ایسا ایندھن جو پیٹرول اور ڈیزل کی طرح دنیا میں گاڑیوں، جہازوں اور کارخانوں کو رواں رکھ سکے۔ پودوں میں قدرتی طور پر ہونے والا ضیائی تالیف کا عمل اس ضمن میں سائنس دانوں کی بہترین رہنمائی کر رہا ہے۔ ضیائی تالیف کے دوران درخت اور پودے فضا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ اور زمین سے پانی حاصل کر کے اپنی غذا تیار کرتے ہیں۔ حال ہی میں ٹورنٹو یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کے سائنسدانوں نے ایسے عمل انگیز (Catalyst) تیار کیے ہیں جن کو استعمال کرتے ہوئے دونوں بڑے مسائل پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ یہ تحقیقی ٹیم دو ایسے معاملات پر کام کر رہی ہے جن میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کو کاربن مونو آکسائیڈ میں تبدیل کیا جا سکے گا اور دوسری طرف پانی کی برقی پاشیدگی سے حاصل ہونے والی ہائیڈروجن کو ملا کر ایسا نامیاتی ایندھن تیار کیا جا سکے گا جو پیٹرول اور ڈیزل کا نعم البدل ہو گا۔ ان سائنسدانوں کا تیار کردہ عمل انگیز جو نکل، آئرن، کوبالٹ اور فاسفورس پر مشتمل ہے اگر کامیاب ہو گیا تو فضائی کاربن ڈائی آکسائیڈ کو ایندھن میں تبدیل کرنا کوئی مسئلہ نہیں رہے گا اس طرح نہ صرف فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار کنٹرول میں رہے گی بلکہ توانائی پیدا کرنے کا ایک سستا اور آسان طریقہ بھی ہاتھ لگ جائے گا۔

مرسلہ: شیخ علی اکبر، لاہور

نکلا۔ ''ابے لے...... جگری!'' لیکن آگے کچھ نہیں بولا اور اپنی طرف کا دروازہ بند کر کے نیچے اتر گیا۔

انجن اسٹارٹ ہی تھا، میں نے گیئر ڈالا اور اگلے ہی لمحے کار حرکت میں آگئی۔

ذرا دیر بعد ہی میں ان کے تعاقب میں اس ذیلی سڑک پر آچکا تھا جو ساحل پر آتی تھی۔

آگے دونوں گاڑیاں تیز رفتاری کے ریکارڈ توڑنے میں مصروف تھیں اور میں خود کو بھی اس ''مقابلے'' میں شامل سمجھ رہا تھا۔ تاہم مجھے احتیاط یہ کرنا پڑ رہی تھی کہ پولیس کو اس تعاقب کا شبہ نہ ہو ورنہ ممکن تھا کہ وہ شاہ میر کی انٹرکولر کا تعاقب چھوڑ کر زیادہ سہل راستہ یہ اپناتی کہ میرے پیچھے لگ جاتی۔

تاہم یہ ممکن تھا کہ اگر تعاقب طول پکڑ جاتا تو مزید پولیس گاڑیاں بھی اس ''کاروانِ تعاقب'' کا حصہ بن جاتیں اور میرا تو دھر لیا جانا یقینی امر کہلاتا۔

انٹرکولر کا ڈرائیور پولیس کار کو جل دینے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔ گاڑیاں ابھی مین روڈ پر نہیں اتری تھیں یا پھر انٹرکولر کا چابک دست ڈرائیور دانستہ مین روڈ کا رخ کرنے کی بجائے چھوٹی موٹی سڑکوں اور مارکیٹ کے چھوٹے اور نسبتاً تنگ راستوں کا رخ کیے ہوئے تھا۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا، دو اور پولیس گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی ایک چوراہے سے نمودار ہوئیں۔ ایک تو میرے آگے رہی جبکہ دوسری ایک لمبا چکر کاٹ کر میری کار کے عقب سے نمودار ہوئی، میں نے اس طرح اپنی کار ایک طرف موڑ کر روک دی۔

میرے پیچھے سے آنے والی کار ''زن'' سے گزر گئی۔

میں نے سکون کی سانس لی۔ کار کا انجن میں نے بند نہیں کیا تھا اور ایک بار پھر میں ان کے پیچھے لگ گیا۔

اس وقت یہ خطرناک اور سنسنی خیز عمل بڑی مہارت سے کر گزرنے کا متقاضی تھا، میں کسی صورت میں بھی انٹرکولر کو آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا، لیکن اگر وہ پولیس کے نرغے میں آجاتے تو اور بات تھی۔

ایک انڈر پاس سے گزرتے ہوئے تین شاخوں کی صورت میں سڑکیں نکل رہی تھیں۔ پہلی والی پولیس کار کے پیچھے جو دو پولیس گاڑیاں تعاقب میں تھیں انہوں نے شاید آگے سے انٹرکولر کو گھیرنے کے دائیں بائیں گھوم گئیں۔

مجھے سڑکوں کے اس جال کا تی برابر بھی اندازہ نہ تھا اسی لیے میں لکیر کا فقیر بنا ہوا تھا، مگر اچانک شاید انٹرکولر نے پولیس کی اس چالاکی کو بھانپ لیا اور...... ایک رہائشی علاقے کی طرف گاڑی موڑلی گئی۔ متعاقب پولیس کار بھی چیختی چلاتی ہوئی اسی طرف گھوم گئی۔

میں راستوں کا کچھ اندازہ قائم کرنے کی کوشش میں تھا اور اس کے ساتھ والے گلی نما راستے میں کار موڑ لی۔

اب وہ دونوں گاڑیاں میرے سیدھے ہاتھ والے عمارتوں کی پٹی کے دوسری جانب والے راستے پر گامزن تھیں۔ دفعتاً مجھے زوردار چرچراہٹ کی آواز سنائی دی اور پھر ایک دھماکا ہوا۔ میں چونک گیا۔ تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن میں لامحالہ یہی خیال آیا کہ ان دونوں گاڑیوں میں سے ایک گاڑی نے بریک لگائے تھے اور کسی کے ٹکر مار دی تھی۔

میں اب کوئی ایسا راستہ تلاشنے لگا جو ان کمرشل اور رہائشی عمارتوں کے درمیان سے جا کر پہلے والے گلی نما راستے سے ملتا ہو۔

اور پھر جلد ہی مجھے ایک ایسا راستہ مل گیا۔ میں نے فوراً ... اسٹیئرنگ کاٹا اور پھر جیسے ہی اس گلیارا نما راستے پر آیا تو بری طرح ٹھٹک گیا۔

وہاں دائیں بائیں کئی اور لوگ بھی موجود تھے۔ وہ بھی اس صورتِ حال پر گھبرائے اور بوکھلائے ہوئے نظر آرہے تھے۔

میرے ٹھٹکنے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے شاہ میر کو پیدل بھاگتے ہوئے پایا۔ اس کا دائیاں بازو ہنوز زخمی تھا اور خون بہے جا رہا تھا اس کی حالت بھی نڈھال سی تھی۔

میں نے کار یک دم اس کے قریب لے جا کر روک دی اور ایک ہاتھ سے جلدی رومال نکالا اور اپنے چہرے پر یوں پھیرنے لگا جیسے پسینا پونچھ رہا ہوں جبکہ یہ حرکت میری دانستہ تھی، میں اپنا چہرہ چھپانا چاہتا تھا، پھر وہی ہوا جس کا مجھے اندازہ تھا۔

شاہ میر کسی طرح اپنی گاڑی سے اترنے اور پولیس کو جل (عارضی طور پر ہی سہی) دے کر اس طرف دوڑا چلا آیا تھا، لیکن اس کے لڑکھڑاتے قدموں اور ڈولتی ہوئی حالت زار سے صاف نظر آتا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک اپنی ٹانگوں پر نہیں کھڑا ہو سکتا تھا۔ وہی ہوا، میری کار رکتے ہی وہ میری کھڑکی کی طرف آیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔ ''مم...... مجھے لے

چلو یہاں سے...... ہم...... میں تمہیں سونے میں تول دوں گا۔"

میرے ہونٹوں پہ زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔

رومال ہنوز میرے چہرے پر دھیرے دھیرے متحرک تھا، میں نے اسے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھا اور میں نے کار آگے بڑھا دی۔

وہ زیادہ نہیں بیٹھ سکتا تھا، جلدی سیٹ پر لڑھک کر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے رومال جیب میں رکھ لیا اور کار کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

☆......☆

یہ میرے لیے ایسا ہی عمل تھا جیسے تھوڑی تگ و دو کے بعد ثمر مراد میری جھولی میں ٹپک پڑا ہو، ان گنت مصائب و آلام اور کشاکش حالات کے بعد جب انسان نامراد ہو کے تھک کر ذرا ستانے کو بیٹھ جائے تو تقدیر یوں بھی راستے آسان کر دیتی ہے۔ میری زندگی میں اکثر ایسا ہوتا رہا تھا، جہاں میں نے جان توڑ محنت کی اور اس کے خاطر خواہ ثمرات سے بھی مستفید ہوتو وہاں ایسا موقع بھی آیا کہ ہزار کوششوں اور جان کو خطرات میں ڈالنے کے باوجود معلوم ہوتا تھا کہ میرے ساتھ ہنوز دلی دوراست والا معاملہ رہا۔

لیکن تب ہی میری تقدیر حرکت میں آجاتی۔

اب ذرا تقدیر کی طرفہ کاری تو ملاحظہ فرمایئے۔ میرا دشمن ازلی پولیس سے بچ کر میرے چنگل میں، مجھے اپنا نجات دہندہ سمجھ کر آن پھنسا۔ گویا اس کے لیے آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی بات تھی۔

میرے چہرے پر پھیلے ہوئے رومال سے وہ مجھے پہچان نہ پایا تھا اور کچھ خود اس کی اپنی حالت بھی دگرگوں تھی۔ اس نے مجھے "سونے میں تولنے" کی پیشکش کر ڈالی تھی کہ میں اس وقت اسے پولیس سے بچا کر نکال لے جاؤں۔ اب اسے کیا پتا تھا کہ اس کا سونا جو کالا تھا میرے لوہے سے بھی سستا تھا۔

میں نے پہلے کار کے بیک ویو اور پھر گردن گھما کر عقبی سیٹ پر ڈھیر پڑے زخمی شاہ میر کو دیکھا۔

اس کی حالت کا اندازہ لگایا اور کار کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

یہ ایک بڑے خطرے کو گلے لگانے اور آ بیل مجھے مار...... کے مترادف ہی تھا، کیونکہ اگر الرفاع کے مغربی ساحل پر ہونے والے تازہ کار کوئی پیٹرولنگ پولیس چیکنگ

پروفیسر ڈاکٹر آفتاب احمد ملک

معلم، صحافی، سائنس دان اور عالم دین، وہ لاہور میں محمد اشرف ملک کے ہاں 1949ء میں پیدا ہوئے انہوں نے 1969ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی ایس سی اور 1971ء میں اسلام آباد یونیورسٹی سے ایم ایس سی اور 1973ء میں اسی یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگری لی۔ 1976ء میں انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں بطور لیکچرار تعیناتی ہوئی۔ 1972ء میں پاکستان ایڈمنسٹریٹو اسٹاف کالج لاہور سے ایڈمنسٹریشن اور مینجمنٹ کی خصوصی تربیت حاصل کی اور کورس پاس کیا۔ 1977ء میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ 1977ء ہی میں حکومت برطانیہ نے برٹش کونسل اسکالر شپ ایوارڈ دیا۔ تین سال کے عرصے میں یونیورسٹی آف کینٹر بری انگلستان سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ انگلستان میں اپنے قیام کے دوران تحقیقاتی کام کے علاوہ تدریسی فرائض بھی انجام دیے۔ کین کینٹر بری یونیورسٹی میں 1978ء میں سینیٹر کا انتخاب ہوا جس میں بطور سینیٹر منتخب کیے گئے۔ کینٹ کاؤنٹی انگلینڈ میں تین سال تک درس قرآن پاک کے علاوہ نماز جمعہ میں خطبہ دیتے رہے۔ 1984ء میں پنجاب یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری لی۔ اسی دوران 1982ء میں ایسوسی ایٹ پروفیسر اور 1987ء میں انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں بطور پروفیسر تقرری ہوئی۔ قائداعظم لاء کالج اور پنجاب لاء کالج لاہور میں جیورس پروڈنس (اسلامک) اور اسلامی نظام قانون کے موضوعات پر بطور وزیٹنگ پروفیسر کئی لیکچر دیے۔ قومی سیرت النبیؐ کانفرنس میں کئی مرتبہ مقالات پیش کیے۔ نویں، دسویں گیارہویں اور بارہویں جماعتوں کے لیے کمپیوٹر کی کتابیں بھی لکھیں۔ 1988ء انجینئرنگ یونیورسٹی کے ممبر سینٹ، ممبر اکیڈمک کونسل، ممبر بورڈ آف اسٹڈیز، ممبر فیکلٹی آف سائنس اینڈ اسلامک اسٹڈیز بھی ہیں۔ تصانیف، کمپیوٹر سائنس انجینئرنگ، میتھ میٹکس پر تین عدد کتب تحریر کیں۔ سو تحقیقی مقالے ان کے علاوہ ہیں۔ صدر مملکت سے چار دفعہ ایوارڈ حاصل کیا، ایک بار سیرت ایوارڈ بھی ملا۔

مرسلہ: ذیشان ہمدانی، سیالکوٹ

فلم مل جاتی تو میں ایک بڑے قانونی شکنجے میں پھنس جاتا۔
میں تقریباً گھنٹے بھر کے اندر دوبارہ اسی مقام پر پہنچا تو وہاں کالیا ساحل پر مطلوبہ بنگلے سے کافی پرے ایک جوس کارنر پر ناریل پکڑے سائفن سے اس کا پانی پینے میں مصروف تھا۔
جائے وقوعہ پر پولیس کی بھاری نفری موجود تھی۔ کرائم سین کی پٹی کو بنگلے کے چوگرد تقریباً تیس فٹ کے فاصلے سے گھیراتانا ہوا تھا۔
میری کار دیکھتے ہی کالیا میری جانب لپکا تھا اور میں نے اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑتے دیکھیں تو چونک گیا۔
وہ پہلے کبھی مجھے اس قدر تشویش زدہ، گھبرایا ہوا اور پریشان دکھائی نہیں دیا تھا۔
بے شک پولیس کی بھاری تعداد جائے وقوعہ پر موجود تھی۔ کالیا آزاد کھڑا تھا پھر اس کی یہ حالت کیوں تھی۔
''غضب ہوگیا جگری......!'' کالیا بڑی تیزی کے ساتھ میرے برابر کا دروازہ کھول کر سیٹ سنبھالتے ہی بولا اور تب ہی اس کی نگاہ عقبی سیٹ پر ڈھیر پڑے شاہ میر پر پڑی تو پھر جیسے اس کے چودہ طبق ہی روشن ہوگئے۔ اس کے منہ سے بہت زور سے برآمد ہوا۔
''ابے لے......! ای ی...... یہ کیا مصیبت......؟''
''بعد میں بتاتا ہوں پہلے یہاں سے نکل چلوں۔'' میں نے کہا اور اس سے پہلے کہ کوئی اس طرف متوجہ ہوتا میں کار کو ساحل والی سڑک پر ڈال چکا تھا۔
شکر رہا کہ وہاں کسی پولیس والے نے ہمیں روکنے یا چیک کرنے کی ضرورت نہیں کی تھی۔ سب کی توجہ وقوع پر مرکوز تھی۔
میں تیزی سے کار دوڑاتا ہوا مین شاہراہ پر لے آیا اور پھر وہاں سے منا واجانے والی روڈ پکڑ لی۔
''تو پہلے یہ بتا کہ تیرے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟'' بالآخر قدرے سکون ملتے ہی میں نے اس سے پوچھا۔
کالیا بار بار گردن موڑ کر پچھلی سیٹ پر بے سدھ لیٹے ہوئے زخمی شاہ میر کو دیکھتا جاتا تھا۔
''اس کی فکر مت کر، یہ خود پکے ہوئے پھل کی طرح میری جھولی میں آن گرا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تو میرے سوال ہے کا جواب دے، تجھے کیا ہوا ہے؟ اس قدر پریشان اور بوکھلایا ہوا میں نے تو پہلے کبھی نہیں دیکھا تجھے۔''
''جگری! حالات ہماری سوچ سے بھی زیادہ خراب ہوگئے ہیں۔ بس! دعا کر جگری! کہ وہ زندہ بچ جائے۔''
کالیا کی باتیں میری تشویش اور پریشانی کو فزوں تر کیے جارہی تھیں۔ وہ بھی شاید میری بے چینی کو بھانپ کر بتاتا چلا گیا اور آخر میں جولرزا خیز انکشاف کر کے خاموش ہوا تو اس نے تو میرے بھی اوسان خطا کروا لے۔
شاہ میر نے فرحانہ کو گولی ماردی تھی۔
میں تو کئی ثانیے تک سکتے کی سی کیفیات کا شکار رہا، یہ تو کالیا نے مجھے ٹوکا کہ میں اس وقت بھری پری شاہراہ پر ڈرائیونگ کررہا ہوں۔ خود کو سنبھالوں۔
''پولیس کی ایمبولینس میں اسے اسپتال لے جایا گیا ہے۔'' میری دم بہ خود سماعتوں میں اس کے جملے ہتھوڑے بن کے لگ رہے تھے۔
''لیکن جگری! حالت اس کی نازک ہے، خدا کرے وہ بچ جائے، ورنہ معاملہ بہت زیادہ بگڑ جائے گا، بلکہ تقریباً بگڑ ہی چکا ہے۔''
میں نے سنبھالا لینے کی کوشش چاہی اور بولا۔ ''اس کا مطلب ہے شاہ میر کو اس حقیقت کا پتا چل چکا ہے کہ اس کا بیٹا ثمیر دنیا میں نہیں رہا۔''
''فرحانہ کو گولی مارنے کا اور کیا مقصد ہوسکتا ہے پھر؟'' کالیا نے استفساریہ سے لہجے میں کہا تو میں کسی پھیکی پھیکی امید تلے بولا۔
''کیا خبر کوئی اور بات رہی ہو؟ راکا کو بھی تو انہوں نے ختم کردیا ہے۔ لگتا ہے ان میں زبردست پھوٹ پڑ چکی ہے۔''
''وہ تو صاف ظاہر ہے، لیکن چھوڑ۔'' وہ ایک ذرا پھر گردن موڑ کے عقبی سیٹ پر زخمی حالت میں بے سدھ پڑے شاہ میر کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اب یہ بتا اس کا کیا کرنا ہے؟ اور ہم جا کہاں رہے ہیں؟''
''گلنارا کے گھر۔''
''گلنارا؟'' کالیا کے منہ سے سوالیہ برآمد ہوا اور پھر اسے یاد آگیا۔
''اوہو اچھا وہی...... بہرام خان کی بیوہ۔''
''ہاں، وہی......'' (میں نے کالیا کو اس کے متعلق تفصیلاً بتا رکھا تھا)
''اس زخمی شاہ میر کو لے کر؟''

''ہاں!''

''اسے کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

''نہیں، وہ ہمارے اور اپنے مرحوم شوہر کے عظیم کاز میں ہمارے ساتھ ہے۔''

''گرانٹ پر کس حد بھروسا کیا جاسکتا ہے؟''

''اس کا فیصلہ بعد میں۔ ویسے اگر وہ ہمارے ساتھ صدق دل سے شامل ہو جاتا ہے تو یہ بہت اچھا ہوگا، پتا نہیں کیوں وہ مجھے انہی کے اندر کا ہی آدمی لگتا ہے، ایک ایسا آدمی جو یا تو ان سے باغی ہو چکا ہو یا پھر ایک طویل عرصے سے ان کے بیچ رہا ہو۔''

اسی طرح کی گفتگو کے دوران ہم گلنارا کی رہائش گاہ پر جا پہنچے۔ سارے راستے میں یہی دعائیں مانگتا آرہا تھا کہ وہ گھر پر موجود ہو۔ میرا کئی روز سے اس سے ملنا ہو سکا تھا نہ ہی بات بھی ہو پائی تھی۔ یقیناً وہ بھی میری منتظر ہوگی۔

میں اس کی طرف سے فکرمند بھی تھا کہ اس روز کے حملے کے بعد وہ کس حال میں تھی؟ میں جانتا تھا کہ اس حوالے سے وہ میری ممنون بھی ہوگی۔ اس نے مجھ سے ہر طرح کی مدد کا بھی وعدہ کر رکھا تھا۔

اس کی رہائش گاہ الرابع ایونیو میں ایک چھوٹی سی مارکیٹ کے عقب میں تھی۔ یہاں زیادہ تر دکانیں بھی تھیں اور فلیٹس بھی بنے ہوئے تھے۔

میں پہلی بار یہاں آیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے گھر کا پتا بتا رکھا تھا جو مجھے ذہن نشین تھا۔ گلنارا نے مجھے بتایا تھا کہ یہ مکان اس کے بھائی منصور کا تھا۔ وہ ایک آئی ٹی کمپنی میں کمپیوٹر انجینئر تھا۔ وہ غیر شادی شدہ تھا۔

یہ بھی ایک اچھا خاصا بنگلا ٹائپ گھر تھا۔ گیٹ پر کوئی نظر آرہا تھا۔ میں نے کالیا کو کار میں ہی بیٹھے رہنے کی تاکید کی اور خود نیچے اتر آیا۔

گیٹ کے دائیں جانب انٹرکوم سسٹم کا بٹن دبایا۔ ذرا ہی دیر میں ایک نسوانی آواز پر میرا دل دھڑکا۔ یہ مجھے گلنارا ہی کی آواز محسوس ہوئی تھی۔

''گلنارا صاحبہ! یہ میں ہوں۔ نعمان!'' میرے کہنے کی دیر تھی کہ ہلکے سے کھٹکے کی آواز ابھری اور گیٹ کے دونوں آہنی پٹ سلائیڈ ہوتے چلے گئے۔

میں پلٹا اور، ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور کار آگے بڑھا لے گیا۔

کنکریٹ کی ایک پختہ روش سے ہوتا ہوا کار پورچ میں جا رکا اور نیچے اتر آیا۔

میرے دائیں جانب خوب صورت لان تھا اور سامنے گھر کا دیدہ زیب محرابی دروازہ۔ وہاں میں نے گلنارا کو باہر نکلتے دیکھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی سیدھی میری طرف بڑھی چلی آئی۔

''تت......تم نعمان ......!'' وہ مسرت بھرے لہجے میں بولی۔ اس کا گلنار سا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ وہ عام گھریلو لباس میں بھی دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور لگتا ایسا ہی تھا جیسے وہ تھوڑی دیر پہلے اندر کسی گھریلو کام یا کچن میں معروف تھی۔

''شکر آپ نے پہچان لیا۔ کیسی ہیں آپ......؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔ اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا جسے میں تھام لیا۔ اسی طرح جوابی مسکراہٹ سے بولی۔

''تمہیں بھلا میں کیسے بھول سکتی ہوں نومی! آؤ...... آؤ اندر آجاؤ۔ یہاں بہت گرمی پڑ رہی ہے۔''

''میرا دوست بھی میرے ساتھ ہے۔'' میں نے کار کی طرف اشارہ کیا۔

''اسے بھی لے آؤ۔'' وہ اس طرف دیکھتے ہوئے بولی جہاں کالیا کار سے اتر کر اس سے ٹکا کھڑا تھا۔

''ایک اور شخص بھی ہے ہمارے ساتھ۔'' میں نے کہا۔

''کون ہے وہ......؟ کہاں ؟'' اس نے پھر کار کی طرف متلاشی نگاہوں سے دیکھا۔ ''مجھے تمہارے اس دوست کے علاوہ اور کوئی نہیں نظر آرہا ہے۔''

''شاہ میر ہے میرے ساتھ......اور ہم ذرا ایمرجنسی حالت میں ہیں۔''

''شش......شاہ میر......؟ کک......کہاں ہے وہ؟'' اس کی آواز اٹکنے لگی۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ کار کی پچھلی سیٹ پر زخمی اور بے ہوش پڑا ہے۔ اسے اندر لے جا کر اس کی معمولی ڈریسنگ کرنا ہوگی پھر میں اس سے تھوڑی پوچھ گچھ کروں گا۔''

میری بات سن کر گلنارا نے فوراً حوصلہ پکڑا۔

تھوڑی دیر بعد میں اور کالیا، بے ہوش شاہ میر کو اٹھائے اندر ایک کمرے میں لا چکے تھے۔ اس کے دائیں بازو میں گولی لگی تھی اور ظاہر ہے پولیس نے ہی چلائی تھی۔

گولی آر پار ہو گئی تھی۔ اس کے زخم کی مرہم پٹی کالیا

نے ہی کی تھی۔ اسے ہوش آنے لگا تھا مگر کالیا نے میرے کہنے پر احتیاطاً اس کے دونوں پیروں کو نائیلون کی ڈوری سے جکڑ دیا تھا۔

خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس پر نقاہت طاری تھی۔ وہ ہوش میں آتا اور پھر نیم غنودہ یا بے ہوش سا ہو جاتا۔ اسے وہیں چھوڑ کر ہم دوسرے کمرے میں آگئے۔

گلنارا گھر پر اکیلی تھی اور دونوں بچے اسکول گئے ہوئے تھے، بھائی منصور ڈیوٹی پر تھا جو شام یا رات گئے گھر لوٹتا تھا۔ بچے دو بجے تک اسکول سے آجاتے تھے۔

گلنارا نے پہلے ہمارے لیے کھانے پینے کا بندوبست کیا، سکون کی چند گھڑیاں نصیب ہوئیں تو کھانے پینے کا بھی ہوش آیا۔ کھانے کے دوران ہی میں نے گلنارا کو اب تک کے سارے حالات سے آگاہ کر دیا۔

وہ یہ سب سن کر ششدر رہ گئی اور اسے اس بات پر بھی بے پناہ مسرت ہوئی تھی کہ ہم نے صرائفہ کی ترقی اور اس کے حقوق غصب کرنے والوں کے خلاف بھی علم بلند کرلیا اور سات پردوں میں چھپے کالے شیطان کی سرکوبی کے لیے ایک چند بہترین لوگوں کی ٹیم بنا چکے ہیں۔ نیز کالے شیطان کے دو بڑے شیطان چیلے بن رائد اور شاہ میر پر بھی خاطر خواہ ہاتھ ڈال چکے ہیں۔

صرائفہ کا پانی بند کرنے کی حد والوں کی سازش بھی ناکام بنا دی تھی۔ گلنارا یہ سب سن کر اس قدر خوش ہوئی تھی کہ اس کی قدرتی کاجل لگی آنکھیں فرط جذبات سے بھیگ گئی تھیں۔ متشکرانہ اور ممنون بھرے جوش تلے اس کا پُرکشش اور دلنواز سانولا چہرہ ہی نہیں بلکہ پورا وجود مرتعش ہو رہا تھا۔

واضح طور پر محسوس ہوتا تھا کہ اگر صنف نزاکت آڑے نہ آتی تو وہ مجھے بے اختیار گلے لگا لیتی۔ یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ...... اسے اپنے مرحوم شوہر بہرام خان سے کتنی محبت تھی کہ وہ اسے اب بھی نہیں بھولی تھی۔ یہ اسی کا ہی تو مشن تھا۔ یعنی کالے شیطان کی گھناؤنی سازش کو بے نقاب اور نیست و نابود کرنا اور صرائفہ کی ترقی۔ یوں گلنارا آج بھی ایک شہید بیوہ ہونے پر فخر محسوس کرتی تھی۔

کھانا ختم ہوا تو باتیں بھی تمام ہوئیں اور اب آئندہ پر تبادلۂ خیال ہونے لگا تو گلنارا نے یہی کہا۔ ''میرا خیال ہے نعمان! تمہیں شاہ میر کو اسی وقت پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے تھا۔ وہ یوں رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا۔''

''سب سے پہلے میں نے اسی پر ہی غور کیا تھا۔'' میں نے جواب میں کہا۔ ''لیکن اس وقت صورت میرے حق میں کچھ ٹھیک نہ تھی۔ اس سارے پُراسرار چکر میں خود میں بھی لپیٹ میں آجاتا اور ایک عرصے سے پولیس اور قانون کے چکروں میں محدود ہو کر رہ جاتا۔''

''بات تو تمہاری بھی صحیح ہے، میں شاید جوش اور جلد بازی میں اتنے نازک پہلو پر غور نہ کرسکی، لیکن اب شاہ میر اور بن رائد کا کیا کرو گے؟''

اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''سردست تو میں بن رائد اور شاہ میر کو قانون کے حوالے کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں، اگر کوئی ایسا راستہ مل جاتا ہے تو اس سے زیادہ بہتر بات کوئی نہیں ہوسکتی، بہ صورت دیگر ہم اپنے طور پر ہی سوچ سمجھ کر ہی ان کے خلاف کوئی قدم اٹھائیں گے۔''

''اس کا زیادہ بہتر طور پر مشورہ میرا بھائی منصور ہی دے سکتا ہے۔'' گلنارا نے کہا۔ ''وہ یہاں کی پولیس انتظامیہ میں تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہے۔''

گلنارا کچھ سوچ کر بولی، دوسرے مشورے کے لیے ہم محمود الحسن کو یہاں بلوا لیتے ہیں۔ وہ مجھ سے رابطے میں رہتا ہے۔''

''آپ نے اپنے شوہر کے قتل سے متعلق اب تک کیا کیا ہے؟'' اچانک میرے ذہن میں یہ سوال ابھرا تھا۔ وہ ایک گہری سانس کھینچ کر بولی۔

''میں نے گلفو آئل کمپنی کے تین بڑوں کے خلاف رپورٹ کردی ہے، ان میں شاہ میر کا نام بھی شامل ہے۔ لیکن پولیس بغیر کسی ثبوت کے ان پر ہاتھ نہیں ڈال رہی ہے، البتہ تفتیش کے لیے انہیں ہیڈ کوارٹر بلایا تھا اور پھر چھوڑ دیا۔''

''مگر بہ قول آپ کے، بہرام خان کے قاتلوں کے خلاف آپ کے پاس سارے ثبوت موجود تھے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں!'' اس نے قدرے نگاہیں جھکاتے ہوئے ہولے سے کہا۔ ''خیال تو میرا یہی تھا کہ وہ ٹھوس ثبوت ثابت ہوں گے لیکن پولیس تفتیشی ٹیم کی نظروں میں وہ سب ناکافی ہیں، تاہم تفتیش جاری ہے۔''

''مجھے تو یہاں کا نظام بھی پاکستانی پولیس جیسا ہی لگ رہا ہے۔'' کالیا نے لقمہ دیا۔

''یہ باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔ ہمیں شاہ میر سے دو باتیں کرلینی چاہیے پہلے۔'' کالیا جواب تک خاموش

بیٹھا ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ بولا۔ میں اس کا شیراز کی حیثیت سے گلنار اسے تعارف کرا چکا تھا۔

"آپ دونوں اس کے پاس چلو، میں تب تک محمود الحسن کو فون کر لیتی ہوں۔" گلنار اصوفے سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "وہ بلا دیر منادا سے یہاں پہنچ جائے گا۔"

میں اور کالیا دوسرے کمرے میں آئے تو شاہ میر کو ہوش آچکا تھا اور وہ اپنے پیروں کے جکڑ بند کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

دوسرا ہاتھ اس کا زخمی تھا اور وہ اس سے ایسا کوئی سخت کام لینے سے قاصر تھا جبکہ دوسرے ہاتھ سے اسے ناکامی ہو رہی تھی۔

"کوئی فائدہ نہیں اب شاہ میر......!" میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی زہر خند لہجے میں اس سے کہا اور اس کے سامنے والی نشست پر براجمان ہو گیا، کالیا نے اس کے برابر والی کرسی سنبھال لی۔

شاہ میر میری طرف اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا جیسے اسے یہ یقین کرنے پر تامل ہو کہ میں اس کے سامنے بیٹھا ہوں۔

"تت......تم......ی......ی......تم مجھے کہاں لے کر آئے ہو؟" اس کے منہ سے اٹکتے ہوئے بے ربط جملے برآمد ہوئے۔

"تم اس وقت میرے رحم و کرم پر ہو شاہ میر!" میں نے اس کے چہرے پر گھورتی نظریں گاڑھتے ہوئے نفرت خیز لہجے میں کہا۔

"پہلے ذرا دیر پُرسکون رہ کر اپنے اوپر پیش آمدہ حالات کا جائزہ لو وہ تمہیں یاد آگئے ہیں یا نہیں، پھر بات کی جائے تم سے۔"

"آ چکے ہیں، بہت اچھی طرح حالات یاد آچکے ہیں مجھے نعمان!" وہ جیسے اپنے زخمی بازو کی تکلیف بھلا کر ایک دم بھیڑیئے جیسی غراہٹ سے بولا۔

"تت......تم نے میرے اکلوتے بیٹے کو بالآخر ہلاک کر ڈالا۔ سمجھ لو تم نے اپنے پورے خاندان کی موت پر مہر ثبت کر لی ہے۔" کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے نفرت و انتقام کے شعلے بھڑکنے لگے۔ "مت بھولنا نعمان! کہ میرا بیٹا ثمیر کسی معمولی شخص کا بیٹا نہیں تھا، میرا بیٹا تھا وہ، شاہ میر کا......" اس کے لفظ لفظ سے غیظ و انتقام کا لاوا ابلتا محسوس ہوتا تھا۔ میں خاموشی سے اس کی گیدڑ بھبکیاں سنتا رہا۔ اسے دل کی بھڑاس نکالنے دیتا رہا۔ جب وہ تھک گیا تو میں نے نہایت سکون سے کہا۔

"شاہ میر! تمہیں پتا ہے کہ جب تم نے میرے بھائی فہیم کو ٹانگوں سے محروم کر کے سفاکی اور درندگی کا نشانہ بنایا تھا تو میرے پاس بھی ایک ایسا ہی موقع تھا جب تمہارے بیٹے کی ٹانگیں میرے سامنے تھیں اور ایک تیز فولادی بغدا میرے ہاتھ میں تھا، صرف چند لمحوں کی بات تھی اور میں تمہارے بیٹے ثمیر کو بھی اس کی دونوں ٹانگوں سے محروم کر سکتا تھا جس طرح تم نے میرے بھائی کے ساتھ کیا، لیکن جانتے ہو نا...... تمہیں فون پر تمہارے بیٹے کی بات کروائی تھی میں نے اس وقت، وہ میرے رحم و کرم پر تھا، لیکن مجھ سے یہ ایسی درندگی کا مظاہرہ نہیں ہو سکا تھا۔ تم اس وقت کیا سمجھے تھے کہ میں نے تم سے ڈر کر ایسا نہیں کیا تھا؟ نہیں شاہ میر! نہیں، میں تو سوائے خدا کے کسی سے نہیں ڈرتا۔ وہ میری فطرت کی مجبوری تھی۔ میں کسی کے ساتھ ایسی درندگی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔ ہرگز نہیں۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" وہ بھویں سکیڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"میں ثمیر کو ہرگز ہرگز ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی یہ میرا شیوا ہے۔ میری اور کالیا کی غیر موجودگی میں اس نے فرار کی کوشش چاہی تھی کہ ہمارے ایک آدمی کی گولی کا وہ نشانہ بن گیا۔"

"ہا......!" شاہ میر حقارت سے میری بات اڑاتے ہوئے بولا۔ "مجھے بہلانے کی کوشش مت کرنا نعمان! ثمیر تمہاری کسٹڈی میں ہلاک ہوا اور تم ہی اس کے ذمے دار ہو۔ بس!"

"او کے، جیسا تم سمجھو۔ یہ بتاؤ، فرحانہ کو تم نے کیوں گولی ماری؟ اور یہ راکا سے تمہارا کیا جھگڑا ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ بہتری اسی میں ہی ہے کہ مجھے جانے دو۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔

"جواب تو تمہیں میرے سوالوں کے دینا ہی پڑیں گے، شاہ میر! مت بھولو کہ اس وقت تم کہاں اور کس کے سامنے بیٹھے ہو۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔

"جانتا ہوں اچھی طرح سے میں تم جیسوں کو......" اس کا انداز تضحیک آمیز اور نفرت سے بھرا ہوا تھا۔ میرا دماغ

بھنا گیا اور میں نے اپنے دائیں ہاتھ کا ایک زوردار مکا اس کے جبڑے پر رسید کردیا۔

اس کے حلق سے کریہہ چیخ خارج ہوئی، میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر صوفے سے گھسیٹ لیا اور فرش پر پٹخا۔ اس کا زخمی بازو دکھنے لگا تو وہ چلّا اٹھا۔

میری آنکھوں کے سامنے میرے بے گناہ باپ کی پھانسی پر جھولتا منظر گھومنے لگا۔ میرے بھائی فہیم کا معذور وجود اور اس کا اداس مایوس چہرہ رقصاں ہونے لگا تھا۔

”شاہ میر! میں چاہوں تو اسی وقت تمہارے ناپاک وجود کو تمہاری گندی روح سے آزاد کرڈالوں۔“ میں نے اسے خوناک نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

”لیکن نہیں، میں تمہیں کٹہرے تک پہنچا کر رہوں گا۔ جہاں تم عدالت کے سامنے ایک ایک لفظ سچ بولو گے کہ میرا باپ بے گناہ تھا، وہ قاتل نہیں تھا، بلکہ اصل قاتل تم تھے اور تمہی نے اسے بے گناہ تختہ دار پر چڑھایا تھا اسے قربانی کا بکرا بنایا تھا۔“ میں ہانپنے لگا۔ اس کی بھی سانسیں چڑھی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک ذرا..... توقف سے دوبارہ کہا۔ ”مگر یہ بھی تمہارے حق میں بہتر ہوگا کہ تم میری اس دی ہوئی مہلت سے فائدہ اٹھاؤ اور خود کو مزید کسی بڑے اور ناقابل تلافی نقصان اور جنجال سے بچالو، کیونکہ پھر ہوسکتا ہے کہ مجھے وقت اور حالات کے مطابق آئندہ اپنا ارادہ بدلنا پڑے اور تمہیں اپنے ہاتھوں سے جہنم واصل کرڈالوں۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر تک گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ اس کا زخمی بازو دکھے جارہا تھا جس کے زخم کو وہ اپنے دوسرے ہاتھ سے سہلائے بھی جارہا تھا۔

”اب میرے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دو، ورنہ میں تمہارے بازو کا زخم کھول دوں گا۔“ میں نے کہا۔

”راکا سے تمہاری اچانک دشمنی کی وجہ کیا تھی؟ اور یہ کہ جس کالے شیطان کے تم آلۂ کار بنے ہوئے ہو اس کا ٹھکانا کہاں ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے۔ کون ہے وہ۔ اصل نام کیا لیتے ہیں اس کا......؟“

کالے شیطان کے تذکرے پر اس کی کیفیت بھی بن رائند جیسی ہوگئی۔ وہ حیرت اور الجھن بھری نظروں سے آنکھیں پھاڑے مجھے گھورتا رہ گیا، پھر اچانک نجانے اسے کیا ہوا کہ وہ اپنی تکلیف بھلا کر ہنسنے لگا اور ہنستا ہی چلا گیا۔

میں نے اسے تھوڑی دیر تک ہنسنے دیا۔ تاہم اس کے ہنسنے کا انداز مجھے تضحیک آمیز لگا تھا۔ میں اپنے ہونٹ اور دانت بھینچے اس کے چہرے کو گھورتا رہا، جواب میرا مکا لگنے کے سبب تلے خاصا بگڑ چکا تھا۔

”تم کالے شیطان کا بھلا کیا بگاڑ سکو گے؟ وہ تو شہنشاہ ہے، تمہارے جیسے نجانے کتنے ہی لوگ اس کے محض ایک جنبش ابرو پر آگ میں کود پڑنے کو تیار رہتے ہیں ہر دم......“ وہ غرور سے بولا۔

”یاد رکھو شاہ میر!“ میں نے اسے بھی اسی لہجے میں کہا۔ ”کالے شیطان کا تذکرہ تو میں نے تم سے محض رواروی میں کردیا لیکن میں اس کے بارے میں اپنے نئے ساتھیوں کی زبانی بہت کچھ جانتا بھی ہوں۔“ میں نے دانستہ ”نئے ساتھیوں“ کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ جس کا خاطر خواہ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اس کے چہرے پر چونکنے کے آثار نمودار ہوئے تھے۔ میں نے اور چوٹ کی۔ ”یہی نہیں مجھے تو اس کے عظیم الشان آئل پروڈکشن پلیٹ کا بھی علم ہے اور اسے میں نے تباہ کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔“

میری بات سن کر شاہ میر ایک بار پھر مجھے چونک کر دیکھنے لگا۔ وہ جیسے اب ہنسنا بھی بھول گیا تھا۔ پھر بولا۔

”تم اس کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتے نعمان! پہلے اپنے بھائی فہیم اور محبوبہ فوزیہ کی خیر مناؤ۔“

اس مردود کی بات نے میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا دیا اور میں نے پرُطیش انداز میں دانت اور ہونٹ بھینچے ہوئے جھک کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور اسی طرح اٹھا کر پھر صوفے پر گرادیا۔ وہ کراہا۔

”کیا کیا بکواس کرنا چاہتے ہو تم میرے بھائی اور فوزیہ کے بارے میں؟ بولو...... جواب دو......؟“

میں بپھر گیا اور اندر سے تشویش زدہ بھی ہوا، کہ نجانے اس بدبخت نے فرحانہ کی طرح خدانخواستہ ان کے ساتھ بھی کچھ نہ کرڈالا ہو۔

”تم کیا سمجھتے تھے کہ مجھے کبھی اپنے بیٹے کی حقیقت معلوم نہیں ہوسکے گی کہ اسے تم نے مار ڈالا؟“ اکلوتے بیٹے کے ذکر پر اس کا لہجہ کچھ مرتعش ہوا۔ ”کیا تم اتنا ہی خود کو پھنے خاں سمجھے ہوئے تھے کہ ثمیر کی ہلاکت کا علم ہوتے ہی میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں گا؟“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو بدبخت انسان!“ میں پریشانی اور تشویش تلے جھلا کر بولا۔ ”یاد رکھنا شاہ میر! اب کی بار میرے بھائی فہیم یا فوزیہ کا تم نے ذرا بھی بال بیکا کیا تو تمہارا وہ حال کروں گا کہ تم مجھ سے زندگی کی نہیں بلکہ موت کی

بھیک مانگو گے۔ جواب دو...... ان کے ساتھ تم کیا کیا ہے؟

وہ مردود جیسے میری تشویش آمیز پریشانی کو بھانپ کر حظ اٹھانے والے انداز میں مکروہ مسکرا کر بولا۔ ''ابھی تو کچھ نہیں کیا ہے، مگر بہت جلد تم ان کا انجام دیکھو گے۔'' اس کی ڈھٹائی پر میں تلملا اٹھا اور غیظ ناک انداز میں غراتے ہوئے پھر اس پر جھپٹا۔

''میں اس سے پہلے ہی تمہیں جہنم واصل کر ڈالوں گا کتے......!''

میں ایک بار پھر اس پر پل پڑا۔ کالیا نے مجھے روکا۔ میں غیظ و غضب کے مارے ہانپنے لگا۔

''چھوڑ دے کالیا مجھے۔ میں موذی مردود کو زندہ نہیں چھوڑوں گا، ٹھیک ہی کہتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے کہ انہیں سر اٹھانے سے پہلے ہی ختم کر دو۔'' کہتے ہوئے میں خود کو کالیا کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا تو وہ بولا۔

''جگری! اگر اسے ہلاک کرنا ہی ہے تو گلا دبا کر ختم کر دے اسے، کم از کم ایک سیاپا تو ختم ہو۔''

''اسے اچھی طرح باندھ دو کالیا!'' میں نے ایک خونخوار۔ نظر شاہ میر پر ڈالی اور پلٹ کر دوسرے کمرے میں آیا تو گلنارا اپنے سیل فون پر کسی سے گفتگو کرنے میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھتے ہی فون پر بولی۔ ''لو...... محمود! وہ آگئے ہیں، تم خود ہی ان سے بات کر لو۔'' کہتے ہوئے گلنارا نے ہلکی سی مسکراہٹ سے اپنا فون میری طرف بڑھایا۔ بولی۔ ''محمود الحسن لائن پر ہے۔''

اس کا سیل فون خاصا مہنگا تھا، وہ میں نے ہاتھ میں لیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

محمود الحسن چھوٹتے ہی بولا۔ ''نعمان! مائی ڈیئریسٹ برادر! تم نے صرائفہ والوں پر جو احسان عظیم کیا ہے وہ لوگ تمہارے بے چینی سے منتظر ہی نہیں بلکہ پریشان بھی ہیں اور ...... اور شہزادی نیلم تو تمہارے لیے اس قدر پریشان اور تشویش زدہ ہے کہ وہ خود تمہارا پوچھنے کے لیے میرے پاس چلی آئی تھی۔ شکر ہے خدا کا تم اور تمہارا ساتھی خیریت سے ہو لیکن یہ کیا معاملہ ہوا......؟ راکا اپنے ہی گرو گھنٹالوں کے ہاتھوں مارا گیا اور ...... اور بن رائد اور شاہ میر جیسے جنات تمہارے قبضے میں ہیں۔''

وہ خوشی، فخر اور فکر و پریشانی کے ملے جلے عجیب اثرات تلے بولتا ہی چلا گیا۔ شاہ میر نے میرا پارہ چڑھا رکھا

تھا۔ لہٰذا میں خود کو قدرے پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''محمود صاحب! ہم آپ کو اسی لیے یہاں بلانا چاہ رہے تھے تاکہ باہم مل کر اس نئی صورت حالات پر تبادلہ خیال کرسکیں۔''

''میں ابھی تھوڑی دیر میں روانہ ہو رہا ہوں، تم بالکل فکر مت کرو، برادر!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں اب فون بند کر رہا ہوں اور مناوا سے منامہ کے لیے اپنی کار میں نکل کر رہا ہوں۔''

''پہنچ جائیں پھر جلدی۔'' کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کر دیا اور سیل دوبارہ گلنارا کو تھما دیا اور کسی خیال کے تحت اس سے پوچھا۔

''کیا آپ نے اپنے بھائی منصور کو ہمارے متعلق بتا دیا؟''

''نہیں، وہ ابھی دفتر میں مصروف ہوگا۔ درمیان میں کسی بریک کے دوران اگر ضروری ہو تو مجھ سے بات کر لیتا ہے۔ یا میں میسج بھیج دیتی ہوں۔''

اس نے جواب میں کہا۔ ''لیکن میں اس سے فون پر بات نہیں کرنا چاہتی۔ گھر آئے گا تو تسلی سے بتا دوں گی، وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوگا۔'' اس نے بات ختم کی ہی تھی کہ کالیا اپنا سر جھٹکتا ہوا اندر داخل ہوا اور میرے قریب صوفے پر براجمان ہوگیا۔

''آپ ایک کام کرسکتی ہیں گلنارا صاحبہ؟'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

''ہاں...... ہاں! کیوں نہیں؟ کیا کام ہے؟ بولیں؟'' میں نے کالیا کی طرف دیکھا اور اس سے کہا۔

''کالیا! تمہیں اندازہ ہے کہ پولیس ایمبولینس فرحانہ کو کون سے اسپتال لے کر گئی ہوگی؟ میرا مطلب ہے تم نے ایمبولینس پر کسی اسپتال کا مونوگرام یا نام تو دیکھا ہوگا؟''

کالیا ابھی اپنے ذہن پر زور دے ہی رہا تھا کہ گلنارا نے پھر اپنا سیل سنبھالا اور بولی۔ ''ابھی میں اس کا پتا چلا لیتی ہوں۔'' کہتے ہوئے وہ کوئی نمبر پنچ کرنے لگی تو میں نے اس درمیان میں کہا۔

''خیال رہے، کہیں آپ کسی قانونی پیچیدگی یا انکوائری وغیرہ میں نہ پھنس جائیں۔''

اس نے نمبر ملانے کے بعد سیل اپنے کان سے لگا کر میرے چہرے پر گہری نگاہیں جمائے رکھتے ہوئے دلکش سی مسکراہٹ سے تیکھی انداز میں ہولے سے سر کو جنبش دی تھی اور میں نے دیکھا اس کی اسی طرح مسکراتی سی نگاہیں میرے چہرے پر ہی ثبت رہی تھیں، پھر میں نے ہی اپنی نظریں پھیر کر یونہی مدھم سے لہجے میں کالیا سے مخاطب ہونے لگا۔

''عربی میں ہی کچھ لکھا ہوا تھا ایمبولینس کی باڈی پر، انگریزی کے بھی چند مختصر الفاظ درج تھے، جو میں ٹھیک طرح نہیں پڑھ سکا۔'' کالیا نے ہولے سے جواب دیا۔ میں نے پرسوچ انداز میں ہونٹ بھینچ لیے۔

میں سمجھ رہا تھا کہ تقدیر نے اس وقت تمام پتے میرے ہاتھ میں تھما تو دیئے تھے لیکن بسا اوقات یہی پتے الٹی بازی کی طرح گلے بھی پڑ جاتے ہیں۔

بن رائد اور شاہ میر جیسے دو بڑے دشمن میرے رحم و کرم پر تو تھے لیکن مجھے ایسا بھی لگتا تھا کہ کہیں وہ میرے لیے ایسے چھچھوندر ثابت نہ ہوں جو نگل پائیں اور نا ہی اگل پائیں۔

وہ...... الہدیٰ اسپتال میں اس زخمی لڑکی کو لے کر گئے ہیں۔''

گلنارا کی آواز نے اچانک مجھے خیالات سے چونکایا۔ میں اور کالیا اس کا چہرہ تکنے لگے۔

''فرحانہ کی حالت کا کچھ پتا چلا؟'' میں نے گلنارا کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

''وہ ایمرجنسی آپریشن تھیٹر میں منتقل کر دی گئی ہے۔'' گلنارا نے بتایا۔ ''میں نے اپنی ایک فرینڈ سے پوچھا ہے، وہ ایک اسپتال میں لیڈی سی ایم او (کیزولٹی میڈیکل آفیسر) ہے۔ اسی نے ہی فوراً پتا چلا کے مجھے بتایا ہے۔''

''ہم......!'' میرے منہ سے پُرسوچ انداز میں برآمد ہوا تھا۔

''جیسے ہی فرحانہ کی طرف سے کوئی خبر ہوگی آسیہ مجھے بتا دے گی۔'' گلنارا آگے بولی۔ ''خدا کرے کہ اس کی زندگی بچ جائے، ایسی صورت میں وہ بن رائد اور شاہ میر کے گلے کا پھندا بن جائے گی۔''

''اور...... شاہ میر یا بن رائد یہ پھندا کاٹنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔'' کالیا نے لقمہ دیا۔

''وہ دونوں تو ابھی خود ہی پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں۔'' میں نے استہزائیہ مسکراہٹ سے کہا۔

''میرے کہنے کا مقصد یہی تھا کہ ان دونوں کو تب

تک ہماری ہی گرفت میں ہونا چاہیے۔'' کالیا کی دور رس بات پر میں اور گلنارا خاموش ہو رہے۔

وقت گزرتا گیا۔ صبح دس بجے آئے تھے ہم، اب سہ پہر کے تین بج رہے تھے۔ دونوں بچے اسکول سے آ گئے تھے، مجھے پہچانتے تھے مگر کالیا ان کے لیے اجنبی تھا، بہرحال تمیز دار اور اچھے بچے تھے، بڑی لڑکی تھی، کوئی بارہ تیرہ برس کی ہو گی، لڑکا نو، دس سال کا ہو گا۔ ارحم نام تھا اس کا اور لڑکی کا کنزہ۔

گلنارا نے بتایا کہ اس کی منصور سے بات ہو چکی تھی اور چوں کہ اس نے اپنے بھائی کو میرے اور اس سارے چکر کے بارے میں پہلے ہی سے غائبانہ طور پر بتا رکھا تھا۔

بھائی کہہ رہے تھے کہ وہ آج جلدی دفتر سے گھر لوٹنے کی کوشش کریں گے، اگرچہ اس کی اُمید کم ہی ہے کیونکہ یہاں کام اور ڈیوٹی کی سختی بہت ہوتی ہے، کچھ اس لیے بھی کہ یہاں تنخواہوں پر ٹیکس نہیں عائد ہوتا تھا، جو ہوتا بھی تھا وہ بہت کم تھا۔ اسی سبب مغربی ممالک کے باشندے عموماً مڈل ایسٹ کی ریاستوں میں ہی نوکری کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔

ٹھیک چار بجے محمود الحسن آن پہنچا مگر اسے دیکھ کر ہم چونک پڑے۔ وہ اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ دو اور افراد بھی تھے ایک مرد اور ایک فل سیاہ عبایوش دراز قامت خاتون۔

نوجوان مرد کو تو میں دیکھتے ہی پہچان گیا تھا، وہ نوجوان راشد تھا، جس کا تعارف، صرائفہ میں شہزادی نیلم مجھ سے کروا چکی تھی۔

وہ شیخ سلیمان کا بھتیجا تھا جس کے مکان میں محمود الحسن نے رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا، ارشد گلفو آئل کے دفتر اور اس کی رہائشی کالونی کے جنوب مغرب میں واقع قصبہ کارڈوف میں رہتا تھا۔

اپنے ہم عمر اس نوجوان راشد کو دیکھتے ہی سیاہ عبایوش خاتون کی طرف میرا دھیان از خود چلا گیا کہ وہ شہزادی نیلم کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی، میرا یہ خیال غلط ثابت بھی نہیں ہوا تھا۔

وہ سر سے پاؤں تک پردہ پوش تھی، جب اندر آ کر اس نے اپنے چہرے کا عبایا ہٹایا تو میں تو نہیں البتہ کالیا ضرور چونک پڑا اور حسبِ دستور اس کے منہ سے برآمد ہوا۔

''ابے لے......!''

وہ شاید میری طرح شہزادی نیلم کے لیے پہلے سے اندازہ قائم نہیں کر پایا تھا، اندازہ تو مجھے بھی نہ ہوتا اگر ساتھ راشد نہیں ہوتا۔

بہرکیف...... ہم سب پُرتپاک انداز میں ملے، محمود، راشد اور بالخصوص شہزادی نیلم...... ہم سے (کالیا اور مجھ سے) بے حد خوش اور ممنون تھے۔ صرائفہ میں اسی روز پانی کا دیرینہ مسئلہ حل ہو چکا تھا اور وہ سیراب ہو چکا تھا، قلعچیں پانی سے بھر گئی تھیں۔

حدی والوں نے جو شبانہ روز محنت اور کئی مہینوں کی محنت سے صرائفہ والوں کا پانی روکنے کے لیے بند بنایا تھا وہ ہم نے نہ صرف اسے تباہ کر دیا تھا بلکہ انہوں نے ''جنگی پہرے'' کی بنیاد پر جو مستقل طور پر کوہ جبل پر اپنا ''بیس کیمپ'' بنا رکھا تھا وہ بھی ان کے ایمونیشن ڈمپ سمیت تباہ کر ڈالا تھا۔

محمود الحسن تو میرے گلے لگ گیا تھا۔ ہم لوگ اندر نشست گاہ میں آ کر بیٹھ گئے تھے اور نئی صورتِ حال کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے رہے۔

سب کی رائے یہی تھی کہ فرحانہ کی طرف سے کوئی خبر آنے تک کم از کم شاہ میر کو نہ چھوڑا جائے۔ کیونکہ فرحانہ کا بیان (اگر وہ زندہ بچ جاتی ہے) تو وہ شاہ میر اور بن رائد، دونوں کے لیے بڑی آسانی سے گلے کا پھندا بن سکتی تھی۔

منصور ایک ستائیس اٹھائیس سالہ شخص تھا۔ قد کا چھوٹا اور غیر شادی شدہ تھا۔

اس نے بھی کالیا اور مجھ سے مل کر بے پناہ خوشی کا اظہار کیا تھا اور اس روز اپنی بہن کی مدد پر اس نے میرا خاص طور پر شکریہ ادا کیا۔

''بن رائد کو چھوڑ دینا چاہیے جبکہ اس بات کا پتا لگانا ضروری ہے کہ راکا جیسے اپنے ہی ایک اہم کارندے کو انہوں نے کیوں قتل کیا؟'' منصور نے کہا۔

''انہوں نے نہیں، بلکہ صرف شاہ میر نے......'' میں نے کہا۔

''کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ عین وقت پر شاہ میر اور راکا کے درمیان کسی ایسی بات پر ٹھن گئی ہو گی جس کے نتیجے میں شاہ میر یا اس کے آدمی نے اسے گولیوں سے بھون ڈالا۔''

''ان کے بیچ ٹھن جانے کی اہم وجہ فرحانہ ہی ہو سکتی ہے۔'' کالیا بولا۔ ''کیونکہ شاہ میر انتقاماً فرحانہ کو گولی مار کے ہلاک کرنا چاہتا ہو گا، راکا نے اسے روکنا چاہا ہو اس لیے

کہ وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ راکا کو خدشہ ہوگا کہ بن رائد چونکہ ہماری قید میں ہے اور فرحانہ ہماری ساتھی ہے۔ اسے اگر شاہ میر ہلاک کر دیتا ہے تو ہم اپنے یرغمالی بن رائد کو بدلے میں ہلاک کر دیں گے، اسی لیے یہ اچانک تنازعہ صرف راکا اور شاہ میر کے درمیان وجہ نزاع بنا ہوگا۔"

"مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر راکا، شاہ میر کو فرحانہ کے پاس کس مقصد کے لیے لایا تھا؟" گلنارا نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ منصور اور محمود الحسن کے اذہان میں بھی شاید یہی الجھن تھی، اسی سبب وہ بھی گلنارا کی طرح میرا اور کالیا کا چہرہ تکنے لگے۔

"آپ کو سارے حالات کا ابھی پتا نہیں اسی لیے آپ لوگ نہیں سمجھے۔" میں نے مسکرا کر جواب میں کہا۔

اس کے بعد میں نے سب سے پہلے تو مختصراً اپنے اور شاہ میر کی ازلی دشمنی کے بارے میں انہیں آگاہ کیا یوں رانا بشیر کا بھی ذکر آیا، ازیں علاوہ اس دیرینہ دشمنی میں سنگ دل شاہ میر نے میرے بھائی فہیم کو بڑی سفاکی سے دونوں ٹانگوں سے معذور کر دیا پھر اصل بات کی طرف آیا اور صراحت بیان کرتے ہوئے آگے بولا۔

"دیکھیں، ہماری ابتدائی حاصل کردہ معلومات کے مطابق...... شاہ میر نے پاکستان میں راکا کے ذریعے فرحانہ کا اغوا کیا۔ اس کے بعد اس بدبخت نے فرحانہ کو بن رائد کے حوالے کر دیا اس وقت بن رائد کا جہاز پاکستان کی بندرگاہ پر لنگر انداز تھا۔ وہ مردود بن رائد، فرحانہ کو یہاں لے آیا اور جواب میں ہم اس وقت تک شاہ میر کے بیٹے ثمیر کو اغوا کر چکے تھے۔ رانا بشیر نے مجھے اپنی امپورٹ ایکسپورٹ کمپنی میں جاب دی اور بہ ظاہر اپنے ایک کاروباری مقصد (جو ایک طرح سے حقیقت بھی تھا)، کی آڑ میں مجھے اپنی بیٹی کو چھڑانے کے لیے یہاں بھیجا۔ ایک بات بتا دوں کہ وہاں پاکستان میں شاہ میر کا بیٹا ثمیر اپنی بے وقوفی کی وجہ سے ہمارے ہی ایک ساتھی کے ہاتھوں مارا گیا۔ میں چاہتا تو اپنے بھائی فہیم کا انتقام شاہ میر کے بیٹے کو بھی دونوں ٹانگوں سے معذور کر کے لے سکتا تھا، مگر میری فطرت میں سفاکی نہیں تھی اور نہ ہی میری اس کے بیٹے ثمیر سے کوئی دشمنی تھی، یہ تو میں نے محض ایک ڈراما رچانے اور فرحانہ کو چھڑانے کے لیے ایسا کیا تھا۔

یوں میں یہاں آگیا۔ اب آپ لوگ بات کو بہتر طور سے سمجھ پائیں گے۔" میں نے لمحہ بھر کو توقف کیا اور اصل بات کی طرف آیا۔

"فرحانہ کو بن رائد نے اپنے دست راست شاہ میر کا "شکار" کی حیثیت سے یہاں اپنی کسٹڈی میں رکھا۔ ہم بن رائد کو راکا اور اس کے آدمیوں کی ناک کے نیچے سے اٹھا لائے۔ صرف راکا جانتا تھا کہ میں بن رائد کے منہ سے سب سے پہلے فرحانہ ہی کے بارے میں اگلوا سکتا ہوں۔ یہ وہی بات ہوگئی کہ چار آدمیوں میں سے ایک چور ہو اور وہاں چوری کی شے کا ذکر کیا جائے کہ وہ فلاں جگہ رکھی ہوئی ہے تو ان چار آدمیوں میں سے جو چور ہوگا اسے چوری کے مال کی سب سے پہلے فکر ہوگی اور وہ تسلی کی غرض سے چوری کا مال دیکھنے لپکے گا، بعینہٖ اسی طرح راکا، فرحانہ کو کسی اور جگہ منتقل کرانا چاہتا ہوگا۔ اس کے لیے اس نے شاہ میر سے ہی رابطہ کرنا زیادہ مناسب سمجھا ہوگا۔ اب یہ ایک خطرناک اتفاق ہی تھا کہ شاہ میر کو اچانک کسی طرح علم ہوگیا کہ اس کا بیٹا مارا جا چکا ہے۔ اسی وقت راکا نے اس سے فرحانہ کے سلسلے میں بات کر لی اور راکا نے شاہ میر کو یہ بھی بتایا ہوگا کہ بن رائد ہماری قید میں ہے۔ شاہ میر، بیٹے کی موت پر پہلے ہی بدلے کی آگ میں جل رہا تھا، اس پر مستزاد...... راکا نے اسے فرحانہ تک پہنچا دیا۔ شاہ میر نے فرحانہ کو ہلاک کرنا چاہا تو راکا کے لیے یہ غیر متوقع بات ثابت ہوئی۔ اس نے منع کیا ہوگا کہ بن رائد ہمارے شکنجے میں ہے۔ فرحانہ کو ہلاک کرنے کی وجہ سے بن رائد کو ہم نہ بدلے میں مار ڈالیں۔ یہ بات ان دونوں کے درمیان وجہ تنازع ثابت ہوئی۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر ہمیں بن رائد کو یہ حقیقت بتا کر اسے چھوڑ دینا چاہیے۔ اس کی شاہ زمان سے ٹھن جائے گی۔" محمود الحسن نے آخر میں مشورہ دیا۔

"یہ تو ٹھیک ہے، چھوڑنا تو ہمیں بن رائد کو پڑے گا ہی...... یہ حقیقت جان کر اس کے پرپرزے بھی ڈھیلے پڑ جائیں گے لیکن اب شاہ میر کا کیا جائے؟"

ہم سب اپنے اپنے طور پر سوچ میں پڑ گئے۔

اچانک کال بیل بجی۔ منصور نے انٹرکام کا کارڈلیس اٹھایا اور ہیلو کہا۔

ہماری نظریں منصور کے چہرے پر تھیں۔ دیکھا تو دوسری جانب سے جانے اس سے کیا کہا گیا۔ اس کے چہرے پر یک دم تشویش اور پریشانی کے آثار نمودار ہوگئے۔

(جاری ہے)

بیت بازی

قارئین

(عبدالحکیم ثمر کراچی کا جواب)

ممتاز احمد.........چکوال

وہ شاخ جو اک پیڑ سے ٹوٹی تھی کہاں ہے
اب سوکھ کے تیلے کی طرح ہو گی جہاں ہے

(ہادیہ ایمان ماہا ایمان فورٹ عباس کا جواب)

زریں تاج.........میر پور خاص

یقیں رکھتی نہیں ہوں میں کسی کے تعلق پر
جو دھاگا ٹوٹنے والا ہو اس کو توڑ دیتی ہوں

ہما صغر بٹ.........سیالکوٹ

یوں ہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

(مریم بنت کاشف حیدر آباد کا جواب)

عباس علی.........لاہور

یاد ان کو حقوق نہیں ہیں اپنے
جو فرائض ادا نہیں کرتے

ابرار احمد.........لاہور

یہ کرامت سے کم نہیں ناصح
عشق میں جو زیاں نہیں ہوتا

(اشرف حمیدی کراچی کا جواب)

رضا احمد اعوان.........دریا خان

ہر شخص مجھے صورت اخبار سمجھ کر
صفحات سے مطلب کی خبر کاٹ رہا ہے

زاہد حامد.........کراچی

ہمیشہ زندہ تو رہنا نہیں کسی کو یہاں
سو کیوں ہو فکر میاں کون مارا جائے گا

ثمینہ یاسمین.........کراچی

ہم محبت میں کیا نہیں کرتے
وہ تو پھر بھی وفا نہیں کرتے

انعام حسن مجیدی.........کراچی

ہمارے اشک اذیت سے روشنی پھوٹی
چلو کہیں سے چراغوں کا سلسلہ تو ہوا

(ذوالفقار حسین کراچی کا جواب)

نزابت افشاں.........مہورہ

میں یہ رونقیں یہ محفلیں یہ گھر چھوڑ جاؤں گا
میں ایک روز یہ خوشیوں کا نگر چھوڑ جاؤں گا

افشاں ناز.........کراچی

مرے باہر کی یارو خیر مانگو
مرے اندر بغاوت ہو گئی ہے

زنیرہ جبیں.........مظفر گڑھ

میں نے اب کے دل بنایا آئینہ خانہ کنول
ایک پتھر پھر میرے سینے پہ کوئی دھر گیا

آفتاب حسین.........حیدر آباد

اک نظر ہے ترب تعاقب میں
اک نظر ہے مری زمانے پر

(احمد جان لاہور کا جواب)

عبدالحکیم ثمر.........کراچی

حیات مستعار میں سکون کی تلاش کیا
سکون اگر ہے زندگی تو موت کس کا نام ہے

(حنیف ادیب لاہور کا جواب)

اسلم خورشید.........مردان

اسے بھی مجھ سے محبت ہے کہہ کے اے روحی
مرے تمام گناہوں کو کیسا ڈھانپ گیا

نبیلہ اشتیاق.........مظفر گڑھ

آئینہ ٹوٹ کر بکھر بھی گیا
عکس عرفان کو آزمانے تک

(نزابت افشاں مہورہ کا جواب)

اقبال حسین.........فیصل آباد

ایک چٹھی ہوں تیرے نام آئی
کاش تجھ کو وصول ہو جاؤں

اشتیاق احمد خان.........سیالکوٹ

اتنا نازک نہیں یہ دل میرا
چوٹ کھا کر سنبھلنے والا ہے

(سدرہ بانو ناگوری کراچی کا جواب)
اسفند خان..........کراچی
یہ سرخ سرخ سی آنکھیں جو دیکھتے ہو عزیز
جگر کا خون ہے یہ بادۂ شراب نہیں
ندرت فاطمہ..........سرگودھا
یہ کیا کھیلیں مہاسے داغ دھبے
رخ انساں نکھرنا چاہیے تھا
(قاضی اشرف حمیدی کراچی کا جواب)
وجاہت علی..........پشاور
میں لڑ رہا ہوں اندھیروں سے اس لیے یارو
کہ ان اندھیروں کے پیچھے نیا اجالا ہے
(عباس انصاری مظفر گڑھ کا جواب)
سدرہ بانو ناگوری..........کراچی
اذیتوں کے تمام نشتر میری رگوں میں اتار کر
بڑی محبت سے پوچھتا ہے تیری آنکھوں کو کیا ہوا
امجد یوسف..........سیالکوٹ
اس کی وسعت کو پانے کا تمہیں بھی شوق تھا
اب بتاؤ اس سمندر کا سفر کیسا لگا
الطاف علی مخمور..........بہاولپور
اشک وہ بھی نہ اپنے روک سکا
ملک الموت تھا بڑا مجبور
(امیر حمزہ اشرف کوٹ رب نواز کا جواب)
عشرت جہاں..........کراچی
یہ کیا کہ سب سے بیاں دل کی حالتیں کرتی
فراز تم کو نہ آئیں محبتیں کرنی
عابد علی..........گوجرانوالہ
یہ دنیا ایک گھر بن کر رہے گی
ملے گی سب کو عزت دیکھنا
اشرف شیخ..........چنیوٹ
یہ بے کل امنگیں یہ پاگل ہوائیں
تمہاری جدائی میں جی کو جلائیں
(حکیم سید محمد رضا نقوی نورنگہ کا جواب)
علمدار رضا نقوی..........لاہور
یہ میرا دور ہی انہونیوں کا دور ہے بھائی
سنا کرتے تھے کہ پھولوں کو دفنایا نہیں کرتے

اشفاق حسن..........لاہور
یہ فتویٰ حکیم ہم نے لکھوایا ہے مجنوں سے
جو لوگ محبت کے منکر ہیں وہ کافر ہیں
زریں مجید..........فیصل آباد
یہ کیا تھا، بے حسی یا استقامت
دھماکے پر بھی تیرا دل نہ دہلا

بیت بازی کا اصول ہے۔ جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

مقابلہ
بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام ....
پتا ....
....
محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے) 116

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

کڑوا سچ

محترمہ عذرا رسول
تسلیم

میری تحریر مجھ بیتی ہے۔ ایک تلخ سچائی ہے جو لڑکیوں کے لیے لازم ہے۔ اسے آپ بغور پڑھیں تو آپ بھی یہی کہیں گی کہ یہ تو گھر گھر کی کہانی ہے۔ ہم لڑکیوں کی زندگی کتنی دشوار ہے اس کا اندازہ سب کو ہے۔

فائزہ
(فیصل آباد)

ان دنوں مجھے شدت سے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ جس گھر میں، میں رہ رہی ہوں وہاں میری کوئی قدر نہیں ہے۔ ذرہ برابر بھی اہمیت نہیں دی جاتی۔ کسی کو میری ضرورت نہیں ہے۔ میں گھر کے فالتو سامان کی طرح کاٹھ کباڑ کا حصہ بن گئی ہوں۔ یہ احساس ایک دن میں پیدا نہیں ہوا بلکہ بچپن سے ہی میرے ساتھ یہ سلوک روا رکھا گیا تھا۔ حالانکہ میں تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ اصولاً تو مجھے گھر بھر کی آنکھ کا تارا ہونا چاہیے تھا لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میں نے شعور کی وادی میں قدم رکھتے ہی یہ جان لیا تھا کہ میرے مقابلے میں تینوں بھائیوں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے حالانکہ میں کسی بھی لحاظ سے کم نہیں تھی۔ گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں اور مسکراتا ہوا چہرہ، غیروں کو بھی مجھ پر پیار آجاتا تھا لیکن گھر والوں نے مجھے ہمیشہ حقیر اور بے وقعت ہی سمجھا۔

کہتے ہیں کہ والدین کو اپنے سب بچوں سے یکساں پیار ہوتا ہے۔ وہ کبھی کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں دیتے لیکن یہاں معاملہ بالکل مختلف تھا۔ میں اکثر سوچتی کہ امی میرے مقابلے میں بھائیوں کو کیوں اتنی زیادہ اہمیت دیتی ہیں لیکن میرا ننھا ذہن اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے قاصر تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بات میری سمجھ میں آگئی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ دراصل امی پرانے زمانہ کی دقیانوسی سوچ رکھنے والی عورت تھیں اور ان کے میکے میں لڑکی کی پیدائش کو معیوب سمجھا جاتا تھا اور لڑکوں کو زیادہ اہمیت اس لیے دی جاتی تھی کہ نہ صرف ان سے خاندان آگے بڑھتا ہے بلکہ وہ بڑھاپے میں والدین کا سہارا بھی بنتے ہیں جب کہ لڑکی کی پیدائش سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ وہ کچھ لے کر نہیں آتی بلکہ جہیز کے نام پر بہت کچھ سمیٹ کر لے جاتی ہے۔ شادی کے بعد بھی مسئلے ختم نہیں ہوتے بلکہ ہر موقع پر داماد اور اس کی سسرال والوں کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔

جیسے ہی یہ بات میری سمجھ میں آئی میں نے لاشعوری طور پر اپنے آپ کو منوانے کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیے۔ میں شروع سے ہی ذہین تھی اور جب میں نے پڑھائی میں دلچسپی لینا شروع کی تو بہت جلد اس کا نتیجہ سامنے آگیا۔ میں ہر سال اپنی کلاس میں اوّل آنے لگی لیکن کسی نے میری حوصلہ افزائی نہیں کی۔ امی تو پہلے دن سے ہی مجھے اسکول بھیجنے کے خلاف تھیں ان کا خیال تھا کہ لڑکیوں کو پڑھانا محض وقت اور پیسا ضائع کرنے کے برابر ہے۔ وہ چاہے کتنا ہی پڑھ لکھ جائے، اسے شادی کے بعد چولہا ہانڈی ہی کرنا ہے۔ یہ پڑھائی اس کے کسی کام نہیں آئے گی اس سے تو بہتر ہے کہ جو پیسا اس کی تعلیم پر خرچ کیا جا رہا ہے وہ سنبھال کر رکھا جائے تا کہ شادی کے وقت اس کے کام آسکے۔

البتہ ابو اس معاملے میں امی سے متفق نہیں تھے اس لیے انہوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے سب بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں تا کہ معاشرے میں انہیں جائز مقام مل سکے وہ امی کو بھی یہی سمجھاتے تھے کہ اگر لڑکی پڑھی لکھی ہو تو اس کی شادی اچھی جگہ ہو سکتی ہے۔

میں نے امی کا دل جیتنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ چھوٹی سی عمر میں ہی گھر کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ تمام تر ڈانٹ ڈپٹ اور جھڑکیوں کے باوجود میں ان کا دل جیتنے کی کوشش کرتی رہی۔ مجھے شروع سے ہی اخبار اور رسالے پڑھنے کا شوق تھا۔ میں نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ اچھے سلوک سے دشمن کا دل بھی جیتا جا سکتا ہے، وہ تو پھر ماں



تھیں ۔ انہیں قابو کرنا کون سا مشکل تھا اور ایسا ہی ہوا۔ جب میں نے امی کے ساتھ مل کر کام کرنا شروع کیا تو ان کے رویے میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی آنے لگی اور انہیں بیٹی کی اہمیت کا احساس ہونے لگا۔

اس کے باوجود امی کا رویّہ میرے ساتھ جارحانہ ہی تھا۔ وہ اب بھی بیٹوں کو زیادہ اہمیت دیتی تھیں اور میرے حصے میں ڈانٹ ڈپٹ، روک ٹوک ہی آتی تھی۔ انہیں میری ہر بات پر اعتراض تھا۔ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، دوپٹا ڈھنگ سے اوڑھو، زیادہ دیر تک ٹیلی فون پر باتیں نہ کرو، وغیرہ وغیرہ۔ انہی پابندیوں اور روک ٹوک کی وجہ سے میں نے اپنے آپ کو محدود کرلیا تھا۔ کسی دوست کے گھر نہ جاتی اور نہ ہی انہیں اپنے گھر بلاتی۔ میری دوستی صرف اسکول کی حد تک تھی۔ حالانکہ سہیلیاں آئے دن مجھے کسی نہ کسی تقریب میں مدعو کرتی رہتیں۔ کسی کی سالگرہ ہے تو کسی کی بہن کی منگنی یا شادی ہورہی ہے لیکن میں کہیں نہیں جاتی۔

جیسے جیسے میں بڑی ہوتی گئی مجھ پر عائد پابندیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ گھر میں آئے ہوئے مہمانوں خصوصاً کزنز کے سامنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اسکول میں میری سہیلیاں جب اپنے کزنز کے قصے مزے لے لے کر سناتیں تو میرا دل مسوس کر رہ جاتا اور میں سوچتی کہ ایسا کیوں ہے۔ کیا امی کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے یا وہ مجھے ہمیشہ کے لیے اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتی ہیں۔

دن گزرتے رہے۔ میں نے میٹرک پاس کرلیا اور کالج میں آگئی۔ نیا ماحول، نئے لوگ، نئی مصروفیات۔ ان تبدیلیوں نے میری شخصیت پر بھی اثر ڈالا۔ کالج کا پہلا سال مکمل ہونے تک میں پہلے سے زیادہ پُراعتماد اور بولڈ ہوچکی تھی۔ مجھے لوگوں کے مزاج اور رویوں کو پرکھنے کا سلیقہ آگیا تھا۔ میں جان گئی تھی کہ امی میرے ساتھ جارحانہ رویّہ کیوں رکھتی ہیں۔ ان کی بلاوجہ کی روک ٹوک کا سبب کیا ہے۔ وہ کیوں مجھے اپنے سانچے میں ڈھالنا چاہتی ہیں۔ دراصل امی

کی شخصیت میں حاکمیت کا عنصر بہت زیادہ تھا لیکن وہ گھر میں کس پر حکم چلاتیں؟ شوہر صبح کا نکلا شام کو گھر آتا اور اپنے آپ کو ٹی وی اور اخبار میں گم کرلیتا۔ لڑکوں کی اپنی معروفیات تھیں۔ وہ اماں کے قابو ذرا کم ہی آتے تھے۔ لے دے کے ایک فائزہ ہی رہ گئی تھی جس پر وہ اپنا حکم چلا سکتی تھیں اس لیے مجھ پر مشقِ ستم روا رکھتیں۔ میں نے بھی اس حقیقت کو محسوس کرلیا تھا۔ انہیں خوش اور مطمئن رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔

وقت کچھ اور آگے بڑھا۔ میں اب یونیورسٹی میں آگئی تھی۔ حسبِ معمول امی نے یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ مجھے آگے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ گھر پر رہ کر امور خانہ داری میں ان کا ہاتھ بٹاؤں۔ یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم تھی۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں کوئی ایسا ویسا لڑکا پیچھے لگ گیا تو جان چھڑانا مشکل ہوجائے گی۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں یقین دلایا کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں یونیورسٹی پڑھنے جارہی ہوں۔ دوستی تو دور کی بات ہے۔ میں کسی لڑکے سے بات بھی نہیں کروں گی۔ ابو نے بھی حمایت کی۔ مجبوراً امی کو ہتھیار ڈالنے پڑگئے۔

یونیورسٹی کا ماحول کالج سے بالکل مختلف تھا۔ پہلی بار لڑکوں سے واسطہ پڑا تھا اس لیے میں خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہاں ہر لڑکا پڑھنے نہیں بلکہ لڑکیوں سے دوستی کرنے آیا تھا۔ میری طرف بھی کئی لڑکوں نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا لیکن میں نے کسی کو منہ نہیں لگایا جس کے نتیجے میں مجھے مغرور، گھمنڈی اور خودسر جیسے خطابات سے نوازا گیا لیکن میں نے کسی کی پروا نہیں کی۔ چند لڑکیوں سے دوستی ہو گئی تھی۔ میں اپنا زیادہ وقت انہی کے ساتھ گزارتی۔ خالی پیریڈ میں لائبریری چلی جاتی اور وہاں بیٹھ کر نوٹس بناتی، میں پوری دلجمعی کے ساتھ پڑھائی پر توجہ دے رہی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے ہی سمسٹر میں میں نے اپنی کلاس میں ٹاپ کیا۔ اس طرح میں تمام ٹیچرز اور کلاس فیلوز کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ وہی لڑکے جو مجھ پر ہوٹنگ کیا کرتے تھے اب عزت کرنے لگے۔

انہی دنوں سب سے بڑے بھائی سلمان کو ایک بڑی کمپنی میں اچھی جاب مل گئی جیسے ہی اسے پہلی تنخواہ ملی امی کو سلمان کی شادی کی فکر ستانے لگی اور وہ اپنے کماؤ پوت کے لیے اچھی سی لڑکی ڈھونڈنے کی مہم پر نکل پڑیں۔ جب کئی گھروں کی خاک چھاننے کے بعد بھی گوہر مقصود ہاتھ نہیں آیا تو انہوں نے ایک رشتہ کرانے والی عورت کی خدمات حاصل کیں۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن کسی لڑکی کی تصویر لیے چلی آتی۔ امی اس کی خوب خاطر تواضع کرتیں۔ صرف چائے سے اس کی طبیعت سیر نہیں ہوتی تھی۔ لہٰذا اس کے لیے سموسے بسکٹ اور پان منگوائے جاتے۔ وہ اورنگی میں رہتی تھی اس لیے جاتے وقت امی اسے رکشے کا کرایہ بھی دیتی تھیں۔

ایک دن میں یونیورسٹی سے واپس آئی تو رشتہ کرانے والی عورت بیٹھی چائے اور سموسوں سے دل بہلا رہی تھی اور امی کے سامنے تخت پر تین چار لڑکیوں کی تصویریں پڑی ہوئی تھیں۔ مجھے وہ عورت شروع سے ہی پسند نہیں تھی اور مجھے معلوم تھا کہ اس نے صرف پیسے بٹورنے کے لیے یہ ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ میں نے اسے سرسری انداز میں سلام کیا اور کمرے میں چلی گئی۔ حالانکہ مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی لیکن میں اس کے سامنے نہیں آنا چاہ رہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ میرے لیے بھی کوئی الٹا سیدھا رشتہ نہ بتا دے۔

اس کے جانے کے بعد میں کمرے سے باہر آئی اور اماں سے بولی۔ ''آپ کیوں اس عورت کے چکر میں پڑی ہوئی ہیں۔ اسے یہاں آئے ہوئے اتنے دن ہوگئے ابھی تک تو اس نے کوئی ڈھنگ کا رشتہ نہیں بتایا۔''

''پھر کیا کروں۔'' امی بے بسی سے بولیں۔ ''تم ہی میری کچھ مدد کرو۔''

''میں...... میں بھلا آپ کی کیا مدد کرسکتی ہوں۔'' میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''ارے بیٹی! یونیورسٹی میں تو سیکڑوں لڑکیاں آتی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ تم ہی اپنے بھائی کے لیے لڑکی دیکھو۔''

میں گڑبڑا کر رہ گئی۔ اپنی جان چھڑانے کے لیے کہا۔ ''میری کلاس میں جو لڑکیاں پڑھتی ہیں یا جن سے میری واقفیت ہے ان میں سے کوئی بھی ایم ایس سی کرنے سے پہلے شادی نہیں کرے گی۔ دوسرے ڈیپارٹمنٹ کی لڑکیوں سے میری اتنی جان پہچان نہیں ہے، جو بھی کوئی اچھی صورت نظر آئی تو اس کے بارے میں ضرور معلوم کروں گی۔''

''ہاں ہاں ضرور، مجھے یقین ہے کہ تم اپنے بھائی کے لیے ایک اچھی سی لڑکی ڈھونڈنے میں کامیاب ہوجاؤ گی۔''

مجھے ان کی سادگی پر ہنسی آگئی۔ ہر ماں کی طرح وہ بھی

اپنے بیٹے کو شہزادہ گلفام سمجھ کر اس کے لیے حور پری تلاش کر رہی تھیں۔ میں نے کئی بار پوچھنا چاہا کہ ان کے ذہن میں اچھی سی لڑکی کا تصور کیا ہے لیکن پوچھ نہ سکی کیونکہ میں جانتی تھی کہ امی کیا جواب دیں گی۔ ان کی نظر میں اچھی لڑکی وہ ہے جو خوب صورت اور تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ امور خانہ داری میں بھی ماہر ہو۔ ڈھیر سارا جہیز لائے اور سسرال کی چوکھٹ پر قدم رکھتے ہی ساس نندوں کو ان کی ذمے داریوں سے آزاد کرے اور خود گھر کا سارا انتظام سنبھال لے اور اگر برسر روزگار ہو تو سونے پر سہاگا اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے کہ بہو اپنا خرچا پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو ساس نندوں کے لیے تحفے تحائف خریدنے کے علاوہ بستر کی چادریں، کراکری اور گھر کی ضرورت کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی لاتی رہے تاکہ شوہر کا بوجھ ہلکا ہو سکے اور وہ بیوی کی ذمے داریوں سے بے فکر ہو کر پوری تندہی سے ماں اور بیٹوں کی ناز برداری میں لگا رہے۔

دوسرے دن میں یونیورسٹی گئی تو ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ میں اپنے بھائی کے لیے ایک اچھی سی لڑکی ڈھونڈنا چاہ رہی تھی اور اس کے لیے پہلی شرط خوب صورتی تھی۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ امی اور دوسرے گھر والوں کی نظر میں خوب صورتی کا معیار کیا تھا۔ گورا رنگ، لمبا قد، جھیل جیسی آنکھیں، ستواں ناک، لمبے اور گھنے بال، صراحی دار گردن، یاقوتی ہونٹ اور متناسب جسم۔ میں نے اپنے ڈیپارٹمنٹ پر نظر دوڑائی تو کوئی بھی لڑکی معیار پر پوری نہ اتری۔ کسی کا قد چھوٹا تھا تو کسی کی ناک چپٹی، کوئی سانولے رنگ کی تھی تو کسی کے بال چھوٹے تھے۔

مایوس ہو کر میں نے دوسرے ڈیپارٹمنٹ کی لڑکیوں کو دیکھنا شروع کیا۔ روزانہ خالی پیریڈ میں کینٹین اور لائبریری کے چکر لگاتی لیکن کامیابی نہ ہوتی۔ تاہم میں نے ہمت نہ ہاری اور تلاش جاری رکھی۔ میں نے اپنی کلاس فیلوز سے بھی کہہ دیا کہ اگر ان کی نظر میں کوئی لڑکی ہو تو بتائیں۔ آہستہ آہستہ یہ بات پورے ڈیپارٹمنٹ میں پھیل گئی کہ وہ اپنے بھائی کے لیے لڑکی دیکھ رہی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی لڑکیاں بے تکلف ہونے کی کوشش کرنے لگیں لیکن کوئی بھی معیار پر پوری نہ اترتی تھی۔

ایک دن میں گھر آئی تو دیکھا کہ امی کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ انہیں کوئی بہت بڑی خوش خبری مل گئی ہو۔ میں لباس تبدیل کرنے کمرے میں آئی تو امی بھی پیچھے چلی آئیں اور ایک تصویر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔ ”ذرا دیکھو تو کیسی ہے۔“

میں نے ان کے ہاتھ سے تصویر لے لی اور اسے غور سے دیکھا۔ وہ لڑکی شکل و صورت کی اچھی تھی بلکہ اسے کسی حد تک حسین بھی کہا جا سکتا تھا۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، ستواں ناک، تراشیدہ ہونٹ اور گھنے سیاہ بال لیکن تصویر دیکھنے کے بعد میرے ذہن میں لڑکی کا کوئی اچھا تاثر نہیں ابھرا۔ وہ حد سے زیادہ پُراعتماد اور ذہین لگ رہی تھی۔ ایسے لوگ کسی کی بالادستی قبول نہیں کرتے بلکہ اپنی عقل اور سوچ کے مطابق کام کرتے ہیں۔ میں نے اس تصویر کو مستقبل کے خانے میں فٹ کرنے کی کوشش کی تو کچھ امید افزا حالات نظر نہیں آئے مجھے لگا کہ یہ لڑکی کبھی بھی ایک محکوم بہو بن کر نہیں رہ سکتی بلکہ اگر اس پر اپنی مرضی مسلط کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ کسی بھی وقت علم بغاوت بلند کر سکتی ہے تاہم میں نے اپنے خدشات کا اظہار کرنا مناسب نہ سمجھا اور تصویر واپس کرتے ہوئے بولی۔ ”اچھی ہے۔“

”اچھی ہے یا بہت اچھی؟“ امی اشتیاق سے بولیں۔

”صرف تصویر دیکھ کر یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا جب تک ہم لڑکی کو دیکھ نہ لیں اس سے مل نہ لیں۔“

”یہ تو تم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ میں آج ہی کاشف سے کہتی ہوں کہ وہ ہمیں جلد از جلد اس لڑکی سے ملوا دے۔“

”اوہ تو یہ بات ہے۔“ میں نے دل میں سوچا۔ ”بھائی نے خود ہی لڑکی پسند کر لی اور ہمیں ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ ہم بلاوجہ ہی ان کے لیے پریشان ہو رہے تھے۔“

پھر سارے معاملات بآسانی طے ہو گئے۔ کاشف بھائی نے لڑکی کے گھر والوں سے ملاقات کا دن اور وقت طے کر لیا۔ امی، ابو اور میں لڑکی دیکھنے ان کے گھر گئے۔ کاشف کو بھی بر دکھوے کے لیے لے جایا گیا۔ امی کا کہنا تھا کہ انہیں روز روز کے چونچلے اچھے نہیں لگتے۔ ہم ان کی لڑکی دیکھنے جا رہے ہیں۔ اچھا ہے وہ بھی ہمارا لڑکا دیکھ لیں۔

مجھے امی کی سادگی پر ہنسی آ گئی۔ بے چاری کچھ بھی نہیں جانتی تھیں جب کہ میں اپنے طور پر کاشف بھائی سے سب معلوم کر چکی تھی۔ وہ اس لڑکی کو دو تین سال سے جانتا تھا، وہ اس کے ساتھ ہی پڑھتی تھی اور اس نے اپنے والدین کو کاشف کے بارے میں بتا دیا تھا بلکہ وہ دو تین مرتبہ ان

کے گھر بھی جا چکا تھا۔ تمام معاملات پہلے سے طے شدہ تھے۔ میرے گھر والے تو محض رسم پوری کرنے ان کے یہاں گئے تھے۔

افشاں کے والدین بڑے تپاک سے ملے۔ ان کا چار سو گز پر بنا ہوا دو منزلہ شاندار بنگلا تھا اور گھر کی آرائش و سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ نفیس اور قیمتی سامان سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں جب ہمیں بٹھایا گیا تو امی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ انہیں اپنی کم عقلی پر غصہ آنے لگا۔ وہ بلاوجہ ہی پاپوش، دستگیر اور گلبرگ جیسے علاقوں میں لڑکی ڈھونڈتی رہیں۔ شاید انہیں اپنے بیٹے کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں تھا۔

افشاں کے گھر والوں نے جس بھرپور انداز میں ہماری پذیرائی کی۔ اسے دیکھتے ہوئے امی کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسی وقت رشتے کی بات چھیڑ دیں لیکن پہلی ملاقات میں یہ مناسب نہیں تھا چنانچہ انہوں نے رواج کے مطابق ان لوگوں کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی جسے ان لوگوں نے قبول کرلیا۔ لڑکی انہیں پسند آگئی تھی اس لیے وہ چاہتی تھیں کہ بات کو آگے بڑھا کر رشتہ طے کردیں۔ البتہ میں مطمئن نہیں تھی۔ تصویر دیکھنے کے بعد میرے ذہن میں جو خدشات ابھرے تھے۔ افشاں سے ملنے کے بعد وہ اور پختہ ہوگئے۔ میرا دل چاہا کہ چپکے سے امی کے کان میں کہہ دے کہ یہ لڑکی آپ کے مطلب کی نہیں ہے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ لڑکی کو کاشف بھائی نے پسند کیا تھا اور امی کے پاس افشاں کو رد کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

چند رسمی ملاقات کے بعد کاشف بھائی اور افشاں کا رشتہ طے ہوگیا۔ امی بڑی دھوم دھام سے منگنی کرنا چاہ رہی تھیں لیکن افشاں کے گھر والوں نے منع کردیا اور کہا کہ ہمارے خاندان میں منگنی راس نہیں آتی۔ البتہ اگر وہ چاہیں تو ایک چھوٹی سی رسم ادا کرکے لڑکی کو انگوٹھی پہنا دیں اور دونوں خاندانوں میں مٹھائی تقسیم کرکے اس کا باقاعدہ اعلان کردیا جائے۔

مجھے ان لوگوں کی چالاکی پر بہت غصہ آیا لیکن امی ان کی باتوں میں آگئیں۔ انہوں نے افشاں کے لیے منگنی کا جوڑا، قیمتی انگوٹھی اور کئی دوسری چھوٹی موٹی چیزیں خریدیں۔ شہر کی ایک مشہور اور بڑی دکان پر مٹھائی کا آرڈر دیا اور مقررہ وقت پر سامان سے لدی پھندی ان کے گھر پہنچ گئیں۔

امی کا خیال تھا کہ وہ اس موقع پر اپنے چند قریبی رشتہ داروں یعنی کاشف کے چچا، پھوپی، ماموں اور خالاؤں کو بھی ساتھ لے جائیں لیکن افشاں کے گھر والوں نے کاشف کے ذریعے کہلوا دیا کہ وہ یہ رسم سادگی سے ادا کرنا چاہتے ہیں کیونکہ افشاں کی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اس لیے وہ اتنے سارے لوگوں کی خاطر تواضع نہیں کرسکیں گی۔

جب وہ لوگ رسم ادا کرنے پہنچے تو انہیں یہ دیکھ کر بہت حیرانی ہوئی کہ پورا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ افشاں کی امی نے اپنے سبھی قریبی رشتے داروں کو بلایا تھا۔ یہ دیکھ کر امی کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ غصہ سے بولیں۔ ”اگر مجھے پتا ہوتا کہ آپ نے اپنے سارے رشتے داروں کو جمع کر رکھا ہے تو میں بھی اپنی دو چار نندوں، بھاوجوں اور بہنوں کو لے آتی۔ مجھے تو یہ بتایا گیا تھا کہ آپ یہ رسم بڑی سادگی سے ادا کرنا چاہتی ہیں۔“

افشاں کی امی کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولیں۔ ”ارادہ تو یہی تھا لیکن یہ اپنے بہن بھائیوں کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے اس لیے عین وقت پر ارادہ بدل گیا۔ ماشاء اللہ اتنا بڑا خاندان ہے اگر ہر گھر سے دو دو آدمی بھی بلائیں تو چالیس پچاس لوگ بن جاتے ہیں۔“

امی کا موڈ بگڑ چکا تھا تاہم انہوں نے اپنے آپ کو نارمل رکھنے کی کوشش کی اور منگنی کی رسم ادا کردی گئی۔ افشاں کو انگوٹھی پہنانے کے بعد ان کا خیال تھا کہ جواب میں کاشف کو بھی انگوٹھی پہنائی جائے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ پھر افشاں کی امی کو کچھ خیال آیا۔ وہ اپنے کمرے میں گئیں اور ایک گھڑی لاکر افشاں کے ابو کو دی کہ وہ اسے کاشف کے ہاتھ پر باندھ دیں اور میری امی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔ ”بہن! میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہمارے یہاں منگنی کی رسم ادا نہیں کی جاتی اسی لیے میں نے کاشف بیٹے کے لیے انگوٹھی نہیں بنوائی۔“

امی جل کر بولیں۔ ”ضروری نہیں کہ ہمارے اور آپ کے رواج ایک جیسے ہوں۔“

”میں نے دل میں سوچا کہ یہ تو ٹریلر ہے۔ جب پوری فلم چلے گی تو سب کچھ سامنے آجائے گا۔“

”میرا خیال بالکل درست نکلا۔ وہ انتہائی چالاک اور مطلبی لوگ تھے۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے کاشف کو اپنے جال میں پھانسا تھا۔ منگنی کے چند دنوں بعد ہی بہت سی باتوں کا اندازہ ہوگیا۔ پہلے کاشف بھائی دفتر سے سیدھا گھر

آتے تھے لیکن اب وہ تقریباً روزانہ افشاں سے ملنے جانے لگے۔ وہاں سے ان کی واپسی دس گیارہ بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔ امی کے لیے یہ صورتِ حال ناقابل قبول تھی۔ انہیں بدنامی کا ڈر تھا اس لیے یہی بہتر تھا کہ یہ شادی جلد از جلد کردی جائے۔ انہوں نے کاشف سے بات کی تو وہ بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ لوگ اتنی جلدی شادی نہیں کریں گے۔ انہیں تیاری کے لیے وقت چاہیے۔''

''یہ تم نے خوب کہی۔'' امی بولیں۔ ''آج کل لڑکی کی شادی کی تیاری میں کیا وقت لگتا ہے۔ ہر چیز تو بنی بنائی بازار میں مل جاتی ہے۔''

''آپ خود ہی ان سے بات کرلیں۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' کاشف بھائی نے یہ کہہ کر اپنی جان چھڑائی۔

جب امی نے افشاں کے گھر والوں سے بات کی تو انہوں نے صاف انکار کردیا اور کہا کہ وہ ایک سال سے پہلے شادی نہیں کرسکتے کیونکہ افشاں کے ابو نے پہلے ہی دفتر سے کچھ قرض لے رکھا ہے جب تک وہ ادا نہ ہو جائے نیا قرض نہیں مل سکتا۔

امی نے کہا۔ ''آپ نے پہلے سے بھی کچھ تیاری کر رکھی ہوگی یا پوری شادی قرض کے پیسوں سے ہی کریں گی۔''

افشاں کی امی جھینپتے ہوئے بولیں۔ ''جی ہاں تھوڑی بہت تیاری تو ہے لیکن شادی میں اس طرح کے اخراجات ہوتے ہیں۔ مثلاً مہندی، برات کا کھانا، فرنیچر اور جہیز کا دیگر سامان۔''

''آپ جہیز کے لیے پریشان نہ ہوں۔ ہمارے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے اس لیے ٹی وی، فریج، الیکٹرونک کا سامان اور فرنیچر دینے کی ضرورت نہیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ اپنی بیٹی کو ایک بیڈروم سیٹ دے دیں۔''

''واہ! یہ کیسے ہوسکتا ہے، میں تو اپنی بیٹی کو ضرورت کی ہر چیز دوں گی ورنہ دنیا کیا کہے گی؟''

''آپ دنیا کی پروا نہ کریں۔ ان کا تو کام ہی باتیں بنانا ہے۔ آپ اپنی گنجائش دیکھ کر تیاری کریں۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ جہیز دینے کے چکر میں اپنے اوپر مزید قرض چڑھالیں۔''

''میرا دل نہیں مان رہا کہ بیٹی کو اس طرح رخصت کردوں لیکن آپ کہتی ہیں تو میں افشاں کے ابو سے بات کروں گی لیکن میری ایک شرط ہے۔''

''وہ کیا؟'' امی نے پوچھا۔

''شادی کے بعد آپ میری بیٹی کو جہیز نہ لانے کا طعنہ نہیں دیں گی۔''

''توبہ کریں۔ آپ کیسی باتیں کررہی ہیں۔'' امی اپنے گالوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولیں۔ ''میں نے تو کبھی جہیز کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ میری بھی بیٹی ہے۔ میں کسی دوسرے کی بیٹی کو یہ طعنہ کیسے دے سکتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں افشاں کے ابو سے بات کرکے آپ کو بتادوں گی۔''

افشاں کے گھر والوں کی چال کامیاب رہی۔ انہوں نے امی کے منہ سے اپنے مطلب کی بات کہلوادی۔ وہ تو یہی چاہتے تھے کہ افشاں کی شادی پر کم سے کم خرچ کیا جائے اور

نیوجیک

اوریجنل ای سی ڈبلیو دیکھنے والے اس ریسلر سے بخوبی واقف ہوں گے جو اپنے جسم کے ذریعے حریفوں کے لیے رنگ کو جہنم بنا دیتا تھا اور مشتعل مزاج ہونے کے نتیجے میں اس کے ریکارڈ میں چار قتل بھی درج ہیں جو کہ ریسلنگ کی آمد سے قبل کیے۔

کرس بینوا

یہ وہ ریسلر ہے جو لاکھوں افراد کو پسند تھا مگر جو کچھ اس نے کیا وہ اب تک پرستار بھول نہیں سکے ہیں۔ منشیات کے استعمال اور سر کی چوٹوں کے نتیجے میں متعدد جسمانی و نفسیاتی مسائل سے دوچار ریسلر نے جون 2007 میں اپنی اہلیہ اور بیٹے کو قتل کیا اور پھر خودکشی کرلی۔ اس واقعے نے ڈبلیو ڈبلیو ای کو بھی ریسلرز کی صحت کے حوالے سے احتیاطی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور کیا۔

اسکاٹ ہال

ڈبلیو ڈبلیو ای میں ریزر جبکہ ڈبلیو سی ڈبلیو میں اسکاٹ ہال کے نام سے مشہور اس ریسلر کو اس شعبے کے تاریک ترین کرداروں میں سے ایک مانا جاتا ہے۔ 1983 میں ایک نائٹ کلب میں ایک اجنبی سے لڑائی ہوئی، جس نے اسکاٹ ہال پر گن تان لی، تاہم ریسلر نے اسے چھین کر اجنبی کو فائرنگ کرکے ہلاک کردیا۔ اگرچہ شواہد کی کمی کی وجہ سے وہ سزا سے بچ گئے مگر مختلف انٹرویوز میں اس کا اعتراف ضرور کیا۔

مرسلہ: وسیم بن اشرف۔ ملتان

جہیز کے نام پر صرف وہ چیزیں دیں جو افشاں کے ذاتی استعمال کی ہوں۔

میں ان لوگوں کی چالاکی سمجھ رہی تھی لیکن بولنا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے تو صرف اپنے بھائی کی خوشی عزیز تھی۔ ایک ہفتہ بعد افشاں کی امی نے فون کر کے شادی کی تاریخ دے دی اور کچھ شرطیں بھی لگا دیں۔ مثلاً یہ کہ مہر ایک لاکھ روپے لکھا جائے گا۔ براتیوں کی تعداد سو سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے اور مہندی کی تقریب مشترکہ ہوگی جس میں دونوں طرف سے سو سو مہمان شریک ہوں گے۔

امی نے پہلی دونوں باتیں مان لیں لیکن تیسری شرط انہیں قبول نہیں تھی۔ انہوں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے منگنی میں کسی کو نہیں بلایا۔ برات میں بھی آپ نے سو آدمیوں کی پابندی لگا دی ہے لیکن مہندی میں تو سب کو بلاؤں گی۔ میرا خاندان بہت بڑا ہے اگر ہر گھر سے دو افراد بھی بلائے تو وہ سو سے بہت زیادہ ہوں گے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ مہندی کی تقریب مشترکہ کی بجائے الگ الگ کر لیں تاکہ میں اپنے سب لوگوں کو بلا سکوں۔''

ان کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ افشاں کی امی ڈر گئیں اور ہتھیار ڈالتے ہوئے بولیں۔ ''جیسے آپ کی مرضی! جتنے چاہے آدمی لے آئیں لیکن ہمیں پہلے سے بتا دیں تاکہ اسی کے مطابق انتظام کیا جائے۔''

شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی امی نے بری کی تیاری شروع کر دی۔ وہ تقریباً روزانہ ہی بری کے جوڑوں کے لیے میرے ساتھ بازار جاتیں اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتی تھیں۔ شادی اور ولیمے کے جوڑے تو انہوں نے ایسے بنائے کہ دیکھنے والے اش اش کر اٹھے لیکن جب وہ بھی بری لے کر مہندی والے روز افشاں کے گھر گئیں تو انہوں نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا اور نہ ہی کسی چیز کی تعریف کی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ لوگ جان بوجھ کر ہمارے گھر والوں کو نیچا دکھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

امی خون کے گھونٹ پی کر رہ گئیں۔ ان کا بس چلتا تو وہ مہندی کی تقریب ادھوری چھوڑ کر چلی جاتیں لیکن میں نے انہیں ایسا کوئی قدم اٹھانے سے باز رکھا۔ وہ خود بھی اس صورت حال سے مایوس تھیں اور انہیں اندازہ ہو گیا کہ افشاں زیادہ عرصہ سسرال والوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی اور بہت جلد کسی بہانے کاشف کو لے کر الگ ہو جائے گی۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ افشاں نے پہلے دن سے ہی اس گھر کو اپنا نہ سمجھا اور مہمانوں کی طرح وقت گزارتی رہی۔ شروع کے چند دن تو دعوتوں اور سیر سپاٹے میں گزر گئے۔ کاشف بھائی نے دفتر سے پندرہ دن کی چھٹی لی تھی۔ اس دوران وہ روزانہ کسی نہ کسی بہانے اپنے میکے جاتی رہی۔ اس کی واپسی رات بارہ ایک بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔ امی کو اس کے باہر جانے پر اعتراض نہیں تھا لیکن ان لوگوں کے دیر سے آنے پر وہ پریشان ہو جاتی تھیں۔ انہوں نے ایک دو مرتبہ کاشف بھائی کو دبی زبان میں سمجھانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے سنی اَن سنی کر دی۔

کاشف بھائی کی چھٹی ختم ہو گئی اور وہ دفتر جانے لگے پھر بھی انہیں ناشتا دینے کی ذمہ داری ماں اور بہن کے سر پر ہی رہی۔ میں یونیورسٹی جانے کے لیے اپنا ناشتا بناتی تو بھائی کو بھی آواز دے لیتی۔ افشاں مزے سے سو رہی ہوتی۔ اس کی صبح عموماً بارہ بجے ہوتی تھی۔ اس کے بعد بھی وہ کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتی اور دن کا بقیہ حصہ ٹیلی فون پر باتیں کرنے یا ٹی وی دیکھنے میں گزار دیتی۔

کئی بار امی نے سوچا کہ وہ افشاں کو گھر کے کاموں میں حصہ لینے کے لیے کہیں لیکن ہر بار میں نے انہیں روک دیا۔ وہ جانتی تھی کہ ان کے کہنے کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ وہ تو کھانے کے بعد میز پر سے برتن نہیں اٹھاتی تھی۔ گھر کے کاموں میں کیا ہاتھ بٹائے گی اور اگر اس نے کوئی سخت جواب دے دیا تو امی کی بے عزتی ہو جائے گی۔ میں نے مشورہ دیا کہ افشاں کی بجائے کاشف سے بات کی جائے وہی اسے سمجھا سکتا ہے۔

امی کو یہ مشورہ پسند آیا اور انہوں نے ایک دن موقع دیکھ کر کاشف سے کہا۔ ''فائزہ کے امتحان ہو رہے ہیں۔ وہ رات دیر تک پڑھتی رہتی ہے اور میں جوڑوں کے درد کی وجہ سے صبح سویرے نہیں اٹھ سکتی۔ تم اپنی بیوی سے کہو کہ وہ اگر کچھ اور نہیں کر سکتی تو کم از کم صبح کو تمہیں ناشتا ہی دے دیا کرے۔ ویسے تو اسے گھر کے کاموں میں بھی دلچسپی لینی چاہیے۔ فائزہ آخر کب تک کرے گی۔ اسے بھی ایک دن اپنے گھر جانا ہے۔''

''یہ بات میں اس سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں لیکن اس نے صاف کہہ دیا کہ اسے گھر کا کام کرنے کی عادت نہیں ہے اور نہ ہی اسے کھانا بنانا آتا ہے۔ بہرحال میں اسے ایک بار پھر سمجھاؤں گا۔''

فائزہ کی امی سمجھ گئیں کہ افشاں نے کاشف کو پوری

طرح قابو میں کرلیا ہے اس لیے وہ اس پر سختی کرنے کے قابل نہیں رہا۔ انہوں نے دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور اپنے معمولات میں لگ گئیں۔ وہ جانتی تھیں کہ جب سر پر پڑے گی تو بیگم صاحبہ کو کچن کا رخ کرنا ہی پڑے گا۔

ایک دن کاشف بھائی دفتر سے واپس آئے تو بہت خوش لگ رہے تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ اور دوسرے ہاتھ میں گاڑی کی چابی تھی۔ انہوں نے دونوں چیزیں ماں کے سامنے رکھیں اور ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولے۔ ''امی مبارک ہو، میری پروموشن بھی ہوگئی ہے۔ یہ دیکھیے۔ زیرو میٹر گاڑی بھی ملی ہے۔'' انہوں نے کار کی چابی اماں کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

''بہت بہت مبارک ہو بیٹا۔ اللہ کرے تم اور ترقی کرو۔'' انہوں نے اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

''یہی نہیں۔'' اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''مجھے دفتر کی طرف سے مکان بھی ملے گا۔ جس کا کرایہ کمپنی ادا کرے گی۔''

ماں نے بڑے ضبط اور حوصلے سے یہ روح فرسا خبر سنی پھر آہستہ سے بولیں۔ ''بیٹا! تمہیں علیحدہ گھر لینے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنا اتنا بڑا گھر ہے۔ سکون سے تو رہ رہے ہو یہاں۔''

کاشف بھائی کو امی کی سادگی پر ہنسی آگئی۔ وہ دو سو گز کے مکان کو اتنا بڑا گھر کہہ رہی تھیں جس میں کل تین بیڈ روم تھے۔ ایک امی ابو کا، دوسرا میرا اور تیسرا ان کے قبضے میں تھا۔ جب کہ دونوں بھائی لاؤنج میں سوتے تھے۔ وہ تو شادی کے بعد سے ہی اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ انہیں کمپنی کی طرف سے مکان مل جائے تا کہ ان کے جانے کے بعد باقی گھر والے آرام سے رہ سکیں۔ انہوں نے اماں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''امی! ہم تو سکون سے ہیں لیکن باقی لوگوں کو بہت تکلیف ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ ہمیں جانے کی اجازت دے دیں۔ اسی میں ہم سب کی بہتری ہے۔''

انہوں نے بڑے دکھ سے سوچا کہ جب تم لوگ الگ ہونے کا فیصلہ کر ہی چکے ہو تو یہ اجازت لینے کا ڈھونگ رچانے کی بھی کیا ضرورت ہے لیکن وہ یہ بات زبان سے نہ کہہ سکیں بس اتنا ہی کہا۔ ''ٹھیک ہے بیٹا، جہاں رہو خوش رہو۔''

اس طرح افشاں بیگم بڑی خوش اسلوبی سے اپنے شوہر کو لے کر الگ ہوگئیں۔ امی نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن انہیں بیٹے کی جدائی کا دکھ برداشت کرنا ہوگا لیکن ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے اس لیے انہوں نے بیٹے کی علیحدگی کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کرلیا اور صبر کر کے بیٹھ گئیں۔

شروع شروع میں تو افشاں اور کاشف بھائی روزانہ ہی ان سے ملنے آتے تھے پھر اس میں وقفہ آنے لگا۔ اب وہ ہفتے میں ایک بار آنے لگے۔ پہلے کاشف ہر ماہ ماں کو گھر کے خرچ کے لیے ایک معقول رقم دیا کرتے تھے لیکن الگ گھر لینے کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ ان کے اپنے اخراجات بڑھ گئے تھے اس لیے وہ کوشش کے باوجود انہیں کچھ دینے سے قاصر تھے تاہم امی کو روپے پیسے کی کوئی فکر نہیں تھی۔ ابو کا کاروبار بہت اچھا چل رہا تھا۔ اس کے علاوہ عاطف کو بھی جاب مل گئی تھی۔ وہ تو بس یہ چاہتی تھیں کہ کاشف بھائی انہیں ایک پیسا بھی نہ دیں۔ بس ان کی نظروں کے سامنے رہیں لیکن کاشف بھائی کو ان کے جذبات واحساسات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ تو بس اپنی دنیا میں مگن تھے۔ ان کا یہی احسان بہت تھا کہ وہ ہفتہ میں ایک مرتبہ آکر ماں کو اپنی شکل دکھا دیتے تھے۔

کاشف بھائی کی شادی کو ایک سال بھی نہیں ہوا تھا۔ میں اس وقت سیکنڈ ایئر آرٹس میں تھی کہ منجھلے بھائی عاطف نے ایک دھماکا خیز اعلان کر کے گھر کی پُرسکون فضا میں ہلچل مچا دی۔ اسے کینیڈا کی امیگریشن مل گئی تھی اور وہ اپنے بہتر مستقبل کی خاطر اگلے ہفتہ پرائے دیس جارہا تھا۔ امی اور گھر کے دوسرے افراد کے لیے یہ ایک غیر متوقع خبر تھی کیونکہ عاطف نے اس سے پہلے باہر جانے کا کوئی اشارہ نہیں دیا تھا۔ بس چپکے چپکے اپنی تیاریوں میں لگا رہا اور جب ساری کارروائی مکمل ہوگئی تو اس نے اچانک ہی بم پھوڑ دیا۔

امی تو یہ خبر سن کر سکتے میں آگئیں۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ البتہ ابو سے برداشت نہ ہوسکا، وہ ہمیشہ سے ہی لڑکوں کے باہر جانے کے خلاف تھے۔ انہوں نے ذرا تیکھے لہجے میں کہا۔ ''یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی۔ یہاں کیا تکلیف ہے۔ اچھی خاصی جاب ہے تمہاری۔ اپنا گھر ہے۔ بھائی بہنوں کے درمیان رہ رہے ہو۔ پردیس جا کر تو بالکل اجنبی بن جاؤ گے۔''

عاطف نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”آپ نے ساری زندگی سادگی اور قناعت میں گزار دی اس لیے آپ کو کچھ محسوس نہیں ہوتا ورنہ کیا رکھا ہے اس ملک میں۔ آئے دن کسی نہ کسی عذاب سے واسطہ پڑتا ہے۔ کبھی پانی نہیں تو کبھی بجلی غائب۔ کبھی گیس کا پریشر کم ہو جاتا ہے۔ بے ہنگم ٹریفک، ماحولیاتی آلودگی، چھینا جھپٹی، چوریاں، ڈاکے، آئے دن کی ہڑتالیں اور دھرنے۔ کوئی ایک خوبی ہو تو بتائیں اور جس جاب کو آپ بہت اچھا سمجھ رہے ہیں۔ اس کی حقیقت میں جانتا ہوں۔ یہاں ہر کوئی ٹانگ کھینچنے کے چکر میں ہے۔ ذرا سی بھی چوک ہو جائے تو برطرفی کا پروانہ ہاتھ میں ہوگا اسی لیے میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے ورنہ اپنا گھر اور ملک چھوڑ کر کون جاتا ہے۔“

عاطف کی اس وضاحت کے بعد ابو خاموش ہو گئے۔ ویسے بھی جوان اولاد سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا اس لیے دل پر پتھر رکھ کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ روانگی والے دن سب لوگ اسے ایئرپورٹ چھوڑنے گئے۔ جاتے جاتے ماں نے اسے تاکید کی کہ وہ روزانہ ٹیلی فون پر اپنی خیریت سے مطلع کرتا رہے۔ اپنے کھانے پینے کا خیال رکھے اور سب سے اہم بات یہ کہ سال دو سال بعد جب بھی اسے چھٹی ملے تو وہ پاکستان آنے کی کوشش کرے تاکہ وہ اس کی شادی کر سکیں۔

دو بھائیوں کے جانے کے بعد گھر سونا سونا لگنے لگا۔ تیسرا بھائی عارف میڈیکل کے آخری سال میں تھا۔ اس کی شکل صرف رات کے کھانے اور صبح ناشتے کے وقت ہی نظر آتی۔ باقی وقت وہ پڑھائی میں مصروف رہتا۔ میں صبح کی گئی شام کو واپس آتی تھی اور یہی حال ...... ابو کا بھی تھا۔ ان کی واپسی بھی دس گیارہ بجے تک ہوتی تھی۔ امی سارا دن بولائی بولائی پھرتی تھیں۔ ان سے کوئی بات کرنے والا بھی نہیں تھا۔ اب وہ شدت سے عارف کی پڑھائی ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ نوکری ملتے ہی وہ اس کی شادی کر دیں گی تاکہ بہو کے آنے سے گھر میں کچھ رونق ہو جائے۔

وہ یہ بھول گئی تھیں کہ پرندے اڑنا سیکھ جائیں تو اپنا ٹھکانا بدل لیتے ہیں۔ یہی کچھ ان کی اولاد بھی کر رہی تھی۔ عارف نے بھی امتحان پاس کرتے ہی اڑنے کے لیے پر تولنا شروع کر دیئے۔ اس کی نظر میں ایم بی بی ایس کی ڈگری ناکافی تھی۔ لہٰذا اس نے امریکا جا کر مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے پروگرام بنایا لیکن یہ ایک کٹھن مرحلہ تھا اس کے لیے پہلے پاکستان اور پھر امریکا میں انٹری ٹیسٹ دینا ہوتا تھا۔ اس نے پاکستان میں تو ٹیسٹ پاس کر لیا لیکن امریکا جانے کے لیے اسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ اس موقع پر عاطف نے اس کی مدد کی اور اس کے لیے ٹکٹ کا انتظام کر دیا۔

جب اس نے اپنے پروگرام سے گھر والوں کو مطلع کیا تو سب سناٹے میں آ گئے .... ابو نے اس کے جانے کی بھرپور مخالفت کی اور کہا کہ اگر وہ اپنی تعلیمی قابلیت بڑھانا چاہتا ہے تو اسے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ پاکستان میں رہ کر بھی اسپیشلائز کر سکتا ہے۔

”دونوں میں بہت فرق ہے۔ یہاں کی ڈگری کی اتنی ویلیو نہیں ہے، ورنہ کوئی باہر نہ جاتا۔ سب یہیں رہ کر ایف سی پی ایس کر لیتے۔“

”کیا تمہیں یہ احساس نہیں کہ تمہارے جانے کے بعد ہم بالکل اکیلے رہ جائیں گے۔“

”ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ”آپ کا خیال رکھنے کے لیے کاشف بھائی اور فائزہ ہیں نا۔ بلکہ آپ کاشف بھائی کو اپنے پاس ہی بلا لیں۔ ہم دونوں کے جانے کے بعد ان کے لیے اس گھر میں کافی جگہ ہو جائے گی۔“

”تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے میرے بلانے پر وہ فوراً ہی دوڑا چلا آئے گا، اگر اس کو ہمارا ذرا سا بھی خیال ہوتا تو وہ ہمیں چھوڑ کر نہ جاتا۔ جہاں تک فائزہ کا تعلق ہے تو وہ اس گھر میں تھوڑے دنوں کی مہمان ہے۔ اس کی پڑھائی مکمل ہونے والی ہے۔ جیسے ہی کوئی مناسب رشتہ آیا، ہم اس کی شادی کر دیں گے۔“

”خیر آپ فکر نہ کریں۔ صرف تین سال کی تو بات ہے۔ ڈگری ملتے ہی میں واپس آ جاؤں گا۔“

”اللہ تمہیں خوش رکھے۔ تم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔“ امی بولیں۔ ”میں بھی یہی کہنے والی تھی۔ تم واپس آ جاؤ تو تمہاری اور عاطف کی شادی ایک ساتھ کر دوں۔“

”ضرور...... ضرور۔ وہی ہوگا جو آپ چاہیں گی۔“

میں نے اس کے لہجے کا کھوکھلا پن واضح طور پر محسوس کیا۔ میں جانتی تھی کہ عارف صرف اماں کو مطمئن کرنے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے ورنہ اس کا واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ بھلا جانے والے بھی کبھی لوٹ کر آئے ہیں۔

عارف کے جانے کے بعد گھر پر سناٹے کا راج ہو

گیا۔ ابو نے آنے والے دنوں کا اندازہ لگا لیا تھا اس لیے وہ کاروبار پر پوری توجہ دے رہے تھے تاکہ مستقبل کے لیے کچھ پس انداز کرسکیں۔ انہیں اپنے بیٹوں سے کوئی توقع نہیں تھی اور نہ ہی وہ ان سے کچھ مانگنا پسند کرتے تھے۔

میرا فائنل ایئر تھا۔ جب آنگن میں پہلا پتھر آن گرا۔ خالہ اپنے بیٹے جنید کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ میں انہیں ہمیشہ سے ہی پسند تھی اور وہ اس انتظار میں تھیں کہ میری پڑھائی ختم ہو جائے تو وہ رشتہ کی بات چلائیں۔ جنید میں بظاہر کوئی برائی نہیں تھی۔ دیکھا بھالا لڑکا تھا۔ پڑھا لکھا، مہذب اور خوش اخلاق۔ ایک پرائیویٹ کمپنی میں اچھی پوسٹ پر فائز تھا۔ میں بھی اسے پسند کرتی تھی اس لیے جب خالہ اس کا رشتہ لے کر آئیں تو میں خوشی سے جھوم اٹھی۔ میں نے سوچا کہ شادی تو کرنا ہی ہے تو پھر جنید سے کیوں نہ کی جائے۔ کم از کم وہ میرے..... لیے اجنبی تو نہیں۔

امی اتنی جلدی میری شادی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ تین بیٹوں کی جدائی کے دکھ نے انہیں نیم پاگل کر دیا تھا اس لیے وہ مجھے اس وقت تک اپنے پاس رکھنا چاہ رہی تھیں جب تک عاطف اور عارف میں سے کسی ایک کی شادی نہ ہو جائے۔ ان کا خیال تھا کہ بہو کے آنے کے بعد ہی وہ بیٹی کو رخصت کریں گی اس لیے انہوں نے پڑھائی کا بہانہ بنا کر بہن کو ٹال دیا اور کہا کہ ابھی فائزہ پڑھ رہی ہے۔ پہلے وہ ایم ایس سی کرلے۔ اس کے بعد ہی اس کی شادی کے بارے میں سوچیں گے۔

خالہ یہ جواب سن کر حیران رہ گئیں۔ وہ تو بڑی اُمید اور اعتماد کے ساتھ رشتہ مانگنے آئی تھیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ بہن کی طرف سے انکار ہو جائے گا لیکن وہ بھی ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھیں۔ انہوں نے بڑے تحمل سے امی کی بات سنی اور بولیں۔ ”ٹھیک ہے، ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ فائزہ بے شک اپنی تعلیم مکمل کرلے۔ ہم انتظار کرسکتے ہیں دو سال گزرتے کیا دیر لگتی ہے۔ البتہ میں چاہتی ہوں کہ بات پکی ہو جائے تاکہ میں شادی کی تیاری شروع کردوں۔“

”نہیں آپا، یہ مناسب نہیں ہوگا۔“ اماں نے کہا۔ ”اگر ابھی بات پکی ہوگئی تو تم سال چھ مہینے بعد ہی شادی کا تقاضا شروع کردو گی اور میں ابھی اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

خالہ سمجھ گئیں کہ اس ٹال مٹول کی وجہ تعلیم نہیں بلکہ کچھ اور ہے اس لیے انہوں نے مزید اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ البتہ جانے سے پہلے اتنا ضرور کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں نے تمہاری بات سن لی۔ اب تم بھی میری بات غور سے سن لو۔ فائزہ پر پہلا حق میرا ہے اس لیے جب بھی اس کی شادی کرنے لگو تو میرے بیٹے کے بارے میں ضرور سوچنا۔“

مجھے جب معلوم ہوا کہ امی نے خالہ کو ٹال دیا ہے تو میں نے ساری شرم و حیا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اماں سے پوچھا۔ ”امی، امجد میں کیا برائی ہے جو آپ نے خالہ کو ٹال دیا۔“

”میں نے کب کہا کہ اس میں کوئی برائی ہے۔ بس میں چاہتی ہوں کہ پہلے تم اپنی تعلیم مکمل کرلو۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔“

یہ ایک انتہائی بودی دلیل تھی اور اس میں کوئی وزن نہیں تھا۔ خالہ کی طرح میں بھی سمجھ گئی کہ اس ٹال مٹول کی وجہ کچھ اور ہے۔ میں نے اماں سے اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کی اور اپنے طور پر کھوج میں لگ گئی کہ آخر امی میری شادی میں کیوں ٹال مٹول کر رہی ہیں۔

اسی روز میں عشاء کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تو جنید کا فون آگیا۔ اتفاق سے اس وقت آس پاس کوئی نہیں تھا۔ ”فائزہ! تمہیں تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ امی تمہارے گھر آئی تھیں لیکن خالہ جان نے انہیں مایوس لوٹا دیا۔“ جنید ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”ہاں معلوم ہے۔“ فائزہ نے جواب دیا۔

”پھر تمہارا کیا فیصلہ ہے؟ کیا تم بھی خالہ جان کی رائے سے متفق ہو؟“

”میرے متفق ہونے یا نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔“ میں تلخ لہجے میں بولی۔ ”یہاں تو کسی نے مجھے بتانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔“

”یہ تو سراسر زیادتی ہے۔“ جنید بولا۔ ”شادی کا معاملہ ہے اس لیے تمہاری رائے کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔“

”چھوڑیں جنید...... ان باتوں کی کسے پروا ہے۔“ میرے لہجے کی تلخی ابھی تک برقرار تھی۔ ”لڑکیاں چاہے کتنا ہی پڑھ لکھ جائیں لیکن شادی بیاہ کے معاملے میں ان کی مرضی جاننے کا کسی کو خیال نہیں آتا۔“

”اچھا یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ پروپوزل منظور ہے؟“

”یہ سوال تو آپ کو رشتہ بھیجنے سے پہلے کرنا چاہیے

تھا۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" جنید بولا۔ "میں صرف یہ جاننا چاہ رہا ہوں کہ اگر تم سے پوچھا گیا تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟"

میرا دل چاہا کہ ہاں کردوں لیکن میں ٹھنڈا کر کے کھانے کی عادی تھی اس لیے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں نے ابھی تک اپنی شادی کے بارے میں نہیں سوچا۔ پہلی بار کسی نے مجھ سے یہ سوال کیا ہے اس لیے فوراً کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ اس کے لیے مجھے کچھ وقت چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہارے پاس وقت ہی وقت ہے۔ میں ایک ہفتہ بعد تمہیں دوبارہ فون کروں گا۔ اس دوران تم اچھی طرح سوچ لو لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا۔ میں تمہارے لیے بہت سیریس ہوں اور دو سال تو کیا ساری عمر تمہارا انتظار کرسکتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔

اس رات میں دیر تک بستر پر لیٹی جنید کے بارے میں سوچتی رہی۔ ویسے تو جنید میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ وہ ہر لحاظ سے ایک آئیڈیل شخص تھا لیکن جب میں نے اسے مزید کھنگالا تو اس کی خوبیاں ایک ایک کر کے سامنے آنے لگیں۔ ان کی مختصر سی فیملی تھی۔ بڑی بہن کی شادی ہوچکی تھی جب کہ دو چھوٹے بھائی ابھی پڑھ رہے تھے۔ خالو کی ریٹائرمنٹ میں دو سال باقی تھے اس لیے جنید پر کوئی اضافی ذمے داری نہیں تھی۔

میں نے ایک اور زاویے سے سوچنا شروع کیا اگر جنید نہیں تو پھر کون؟ میں نے خاندان میں نظر دوڑائی۔ صرف دو لڑکے ممکنہ امیدوار ہوسکتے تھے۔ پھوپی زاد جمیل اور چچا کا بیٹا اشرف لیکن ابھی تک ان دونوں گھروں نے میرے بارے میں اشارتاً بھی کوئی بات نہیں کی تھی اور اس کی وجہ بھی میں جانتی تھی۔ جمیل انجینئر تھا اور پھوپی اس کے لیے کوئی لیڈی ڈاکٹر ڈھونڈ رہی تھیں جب کہ چچی کے دماغ بہت اونچے تھے۔ وہ اپنے بیٹے کو کوہ قاف کا شہزادہ سمجھتی تھیں اور اپنے گلفام کے لیے کوئی سبز پری ڈھونڈ رہی تھیں جو خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ دولت مند بھی ہو۔

اس لیے اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ ان دونوں میں کوئی میرا طلب گار بنتا۔ یونیورسٹی میں بھی میں ہمیشہ الگ تھلگ رہی۔ نہ تو کسی کو دوست بنایا اور نہ ہی کسی نے میری طرف بڑھنے کی کوشش کی۔ ابو کا حلقہ احباب بھی بہت مختصر تھا اور نہ ہی وہ دوستی کو رشتے داری میں بدلنے کے قائل تھے اس لیے لے دے کر ایک جنید ہی بچتا تھا جو پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں آن گرا تھا۔ چنانچہ صبح ہوتے ہوتے میں جنید کے حق میں فیصلہ کرچکی تھی۔

میرا خیال تھا کہ امی نے خالہ جان کو انکار کر کے جلد بازی سے کام لیا۔ انہیں کم از کم ابو سے تو بات کرنا چاہیے تھی اور جب خالہ جان دو سال انتظار کرنے پر بھی تیار تھیں تو پھر انکار کرنے کا کیا جواز تھا۔ بہت غور و خوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ اصل وجہ کچھ اور ہے پڑھائی کا تو محض ایک بہانا تھا۔ اب مجھے وہ وجہ معلوم کرنا تھی۔

دو تین دن بعد ہی مجھے اصل وجہ بھی معلوم ہوگئی۔ افشاں اور کاشف بھائی ہر اتوار کو ان سے ملنے آتے تھے۔ اس روز دوپہر کو کھانے کے بعد امی نے بہو اور بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں چاہتی ہوں کہ عاطف اور عارف کی بھی شادی ہوجائے۔ اب تو خیر سے فائزہ فائنل ایئر میں آگئی ہے۔ اس کے بھی رشتے آنا شروع ہوگئے ہیں۔ اگر کوئی اچھا رشتہ آگیا تو میرے لیے بڑی مشکل ہوجائے گی۔ اسے انکار بھی نہیں کرسکتی اور نہ ہی یہ چاہوں گی کہ عاطف اور عارف سے پہلے اس کی شادی ہو۔ اگر وہ بھی چلی گئی تو میں بالکل اکیلی رہ جاؤں گی۔"

"یہ تو فائزہ کے ساتھ زیادتی ہوگی۔" افشاں نے کہا۔ "اگر اس کا کوئی اچھا رشتہ آتا ہے تو فوراً ہاں کردیں عاطف اور عارف کی شادیوں سے بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا کیونکہ وہ تو اپنی بیویوں کو لے کر واپس چلے جائیں گے۔"

"یہ تمہارا خیال ہے۔ میرے بیٹے ایسے نہیں ہیں۔ عاطف تو پاکستان آنے کے لیے تڑپ رہا ہے کیونکہ اس کا وہاں دل نہیں لگ رہا۔ ہوسکتا ہے کہ شادی کے بعد واپس جانے کا خیال دل سے نکال دے اور عارف بھی پڑھنے گیا ہے۔ وہ ہمیشہ وہاں نہیں رہے گا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" کاشف نے مصالحانہ انداز میں کہا۔ "یہ بتائیں، میں اس سلسلے میں کیا کرسکتا ہوں؟"

"تم کسی طرح ان دونوں کو پاکستان آنے پر رضامند کرلو تاکہ میں ان کی شادیاں کردوں بے شک وہ اپنی بیویوں کو ساتھ لے جائیں لیکن اتنی جلدی تو یہ ممکن نہیں ہوگا۔ ان کے جانے میں سال دو سال تو لگ ہی جائیں گے۔ تب تک کچھ تو رونق رہے گی۔"

''ٹھیک ہے۔ میں عاطف سے بات کرتا ہوں۔'' کاشف بھائی نے کہا۔ ''لیکن فی الحال عارف کی شادی کا خیال دل سے نکال دیں۔ جب تک اس کی تعلیم مکمل نہ ہو جائے۔ وہ پاکستان نہیں آسکتا۔''

''چلو تم عاطف سے ہی بات کرلو۔ کم از کم میں اس کے فرض سے ہی سبکدوش ہو جاؤں۔''

میں بھی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ مجھے اپنی ماں کی باتوں پر غصہ آرہا تھا اور حیرت بھی ہو رہی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اپنے بیٹوں کو فوقیت دی جنہوں نے باہر جانے کے بعد ایک دفعہ بھی پلٹ کر نہ پوچھا کہ ماں باپ اور بہن کس حال میں ہیں۔ ٹھیک ہے۔ ابو کو کاروبار سے تھوڑی بہت آمدنی ہو رہی تھی لیکن پہلے والی بات نہیں تھی۔ کاروبار دن بہ دن سکڑتا جا رہا تھا۔ اس وجہ سے ابو بھی پریشان رہنے لگے تھے اور امی کو اپنے لاڈلے بیٹوں کی شادی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔

میں اماں کی سوچ پر حیران تھی۔ مائیں تو بیٹی کے پیدا ہوتے ہی اس کی شادی کے بارے میں سوچنے لگتی ہیں اور ایک میری ماں تھیں جنہوں نے تنہائی سے بچنے کے لیے اچھا بھلا رشتہ ٹھکرا دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر جنید کے بعد بھی اس کا کوئی رشتہ آیا تو وہ اسے بھی انکار کر دیں گی۔ خدا جانے عارف اور عاطف کی شادی کب ہو۔ اس میں کئی سال بھی لگ سکتے ہیں۔ اس طرح تو میں بوڑھی ہو جاؤں گی اور کوئی اچھا تو کیا برا رشتہ بھی نہیں آئے گا۔

اب مجھے جنید کے فون کا انتظار تھا۔ اس نے وعدے کے مطابق ٹھیک سات روز بعد اسے فون کیا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تو وہ بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم نے اچھی طرح سوچ لیا ہوگا۔ اب جلدی سے اپنا فیصلہ سنا دو تاکہ میں مطمئن ہو جاؤں۔''

''میری بات غور سے سنیں جنید۔'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''مجھے آپ کا پروپوزل منظور ہے جب کہ امی میری پڑھائی کا بہانہ بنا کر خالہ جان کو انکار کر چکی ہیں لیکن اصل وجہ کچھ اور ہے جو میں جان چکی ہوں۔ وہ مجھ سے پہلے عاطف اور عارف کی شادی کرنا چاہ رہی ہیں تاکہ وہ تنہا نہ رہ جائیں۔ ان کی عقل میں یہ بات نہیں آرہی کہ اس طرح ان کی تنہائی کیسے دور ہوگی کیونکہ وہ تو اپنی بیویوں کو ساتھ لے جائیں گے۔''

''میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔'' جنید بولا۔ ''لیکن خالہ جان کو کیسے سمجھایا جائے۔''

''میرا خیال ہے کہ تمہاری امی یہ کام کر سکتی ہیں۔ ان سے کہو کہ وہ ایک مرتبہ پھر کوشش کریں اور انہیں یقین دلا دیں کہ میری تعلیم مکمل ہونے تک وہ شادی کے لیے تقاضا نہیں کریں گی۔ ممکن ہے کہ امی مان جائیں کیونکہ اس کے بعد ان کے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں ہوگا۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ امی اس کے لیے تیار ہو جائیں گی کیونکہ وہ میری شادی جلد از جلد کرنا چاہ رہی ہیں۔ پہلے تو وہ دو سال انتظار کرنے پر راضی تھیں لیکن خالہ جان کی طرف سے انکار کے بعد ان کا بھی ارادہ بدل گیا ہے۔ شاید وہ بھی سمجھ گئی ہیں کہ انکار کی اصل وجہ کچھ اور ہے۔''

''بہر حال یہ تمہارا مسئلہ ہے کہ تم انہیں کیسے راضی کرتے ہو۔ میری سمجھ میں تو اس کے علاوہ کوئی اور حل نہیں آرہا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں۔'' وہ بجھے ہوئے

ٹامس کپ

بیڈمنٹن کے عالمی مقابلے کے کپ کا نام، اس کی حیثیت وہی ہے، جو ٹینس میں ڈیوس کپ کی ہے، گو اس کا سرکاری نام انٹرنیشنل بیڈمنٹن چمپئن شپ چیلنج کیا ہے، لیکن چاندی کی یہ خوبصورت صراحی تمام دنیا میں ٹامس کپ کے نام سے مشہور ہے۔ عالمی بیڈمنٹن چمپئن شپ کے بارے میں 1939ء میں انٹرنیشنل بیڈمنٹن فیڈریشن نے سنجیدگی سے غور کیا اور اس کے صدر جارج ٹامس کی طرف سے یہ کپ مقابلے میں رکھا گیا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کی وجہ سے یہ مقابلے فوراً نہ ہو سکے۔ پہلا مقابلہ 1948ء میں ہوا۔ یہ مقابلے ہر تین سال بعد ہوتے ہیں ابتدائی مقابلوں کے لیے اسے چار علاقوں (زون) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ چاروں علاقوں کے فائنل جیتنے والے ملک یہ کپ حاصل کرنے کے لیے چمپئن ملک کے خلاف کھیلتے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ دو مسلم ممالک ملائیشیا اور انڈونیشیا کے کھلاڑی بیڈمنٹن کے ان مقابلوں میں سرفہرست رہتے ہیں۔

مرسلہ: عارف اللہ، کراچی

لہجے میں بولا۔
مجھے خالہ جان کی فطرت کا تھوڑا بہت اندازہ تھا۔ وہ بھی اس کی امی کی طرح ضدی اور اپنی بات پر اڑ جانے والی تھیں۔ امی کے انکار کو انہوں نے اپنی توہین سمجھا اور اپنی طرف سے اس باب کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ اب صرف ایک موہوم سی اُمید تھی کہ شاید وہ بیٹے کی ضد اور اصرار سے مجبور ہو کر دوبارہ دست سوال دراز کریں۔
اس سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے امی کے سارے کس بل نکال دیئے۔ ایک دن میں یونیورسٹی سے واپس گھر آئی تو ایک نیا ہنگامہ منتظر تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی کی موت واقع ہو گئی ہو۔ سب سے زیادہ حیرت ابو کو دیکھ کر ہوئی۔ وہ اتنی جلدی گھر کیسے آ گئے۔ کاشف بھائی اور افشاں بھابی بھی سنجیدہ صورت بنائے بیٹھی تھیں۔ امی نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ رکھا تھا اور ان کی آنکھیں پرنم تھیں۔ میں یہ منظر دیکھ کر گھبرا گئی اور ان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ ''کیا ہوا امی! خیریت تو ہے۔ سب لوگ اتنے پریشان کیوں ہیں؟''
''کیا بتاؤں بیٹی! ہم لٹ گئے برباد ہو گئے۔'' اس کے ساتھ ہی انہوں نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔
میں ان کی حالت دیکھ کر مزید پریشان ہو گئی۔ میرے دل میں برے برے خیالات آنے لگے۔ کہیں پردیس میں بھائیوں کو تو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ میں نے مضطرب ہو کر کاشف بھائی سے پوچھا۔ ''بھائی آپ بتائیں کیا بات ہے؟''
کاشف نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''کچھ نہیں ہوا تم لباس تبدیل کرو، کھانا کھاؤ پھر آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''
میں نے بے یقینی سے انہیں دیکھا اور بولی۔ ''آپ لوگوں کے چہرے بتا رہے ہیں کہ ضرور کوئی بات ہے۔ بتائیں نا کیا ہوا ہے؟''
امی گلوگیر آواز میں بولیں۔ ''ہاں بیٹی بہت بڑی بات ہوئی ہے۔ جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔''
''پھر بھی معلوم تو ہو کہ کیا ہوا ہے؟'' میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔
''کچھ نہیں ہوا۔'' اس کے ابو دہاڑے۔ ''کوئی قیامت نہیں ٹوٹی۔ نہ کہیں زلزلہ آیا بس اتنا ضرور ہوا ہے کہ تمہارے عاطف بھائی نے وہیں کینیڈا میں شادی کرلی

ہے۔''
''اوہ۔'' میں نے سکون کا سانس لیا اور بولی۔ ''امی یہ تو خوشی کی خبر ہے۔ بھائی نے آپ کو بہت سے بکھیڑوں سے بچا لیا۔ پہلے آپ ان کے لیے لڑکی ڈھونڈتیں پھر بری بناتیں۔ اس کے لیے بازار کے دسیوں چکر لگانا پڑتے۔ اس کے بعد مہندی، برات اور ولیمہ میں لاکھوں خرچ ہو جاتے۔ بھائی ایک ڈیڑھ مہینا یہاں رہتے۔ دعوتیں اڑاتے اور بیوی کو لے کر چلے جاتے۔ آپ کے ہاتھ کیا آتا۔''
امی نے گھور کر دیکھا اور جھڑکتے ہوئے بولیں۔ ''چپ ہو جاؤ۔ تمہیں حساب کتاب کی پڑی ہوئی ہے یہاں میرا کلیجہ جل رہا ہے۔ کیا کیا خواب سجائے تھے۔ سب کچھ خاک میں مل گیا۔''
''مجھے تو صرف اس بات کا افسوس ہے کہ اس نے ہمیں بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔'' ابو بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ''وہ تو کاشف نے اسے فون کیا تو پتا چلا۔''
میں نے رات کو جنید کو فون کیا اور اسے عاطف کی شادی کے بارے میں بتایا تو وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔ ہمارے راستے کی یہ رکاوٹ بھی دور ہو گئی۔''
''ہاں میرا خیال ہے کہ اب تمہیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ امی کے مزاج کا کچھ پتا نہیں کب ان کے دماغ میں کوئی نئی بات آ جائے۔''

تین چار دن بعد خالہ جان پھر آ گئیں۔ انہیں عاطف کی شادی کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا لیکن انہوں نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کی۔ البتہ امی نے خود ہی انہیں بتا دیا کہ عاطف نے کینیڈا میں ایک پاکستانی لڑکی سے شادی کرلی ہے۔ خالہ نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''مبارک ہو بہن! اب تمہیں فائزہ کے بارے میں سوچنا چاہیے۔''
''میں چاہ رہی تھی کہ پہلے عارف کی شادی کر دوں تا کہ فائزہ کو رخصت کرنے سے پہلے گھر میں بہو آ جائے، ورنہ میں بالکل تنہا رہ جاؤں گی۔''
''تم غلط انداز میں سوچ رہی ہو۔'' خالہ تیز لہجے میں بولیں۔ ''عارف کی تعلیم مکمل ہونے میں کئی سال باقی ہیں۔ اس کے بعد بھی تم یقین سے نہیں کہہ سکتیں کہ وہ واپس آئے گا یا وہیں سیٹل ہو جائے گا۔ تم کب تک بیٹی کو اپنے پاس

بٹھائے رکھو گی۔"

"مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور واپس آئے گا۔" رقیہ بیگم بڑے اعتماد سے بولیں۔

"اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔" خالہ نے کہا۔ "لیکن میرا مشورہ ہے کہ اس کے انتظار میں وقت ضائع نہ کرو۔ میں آج اسی مقصد سے آئی ہوں۔ مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے بس تم اس رشتے کے لیے ہاں کردو۔"

اس بار امی نے قدرے نرم رویہ اختیار کیا۔ عاطف کی شادی نے ان کے سارے کس بل نکال دیئے تھے پھر بھی انہوں نے اپنی بات اوپر رکھنے کے لیے کہا۔ "ٹھیک ہے آپا۔ میں فائزہ کے ابو سے مشورہ کر کے جواب دوں گی۔"

"ضرور مشورہ کرو لیکن جواب میری مرضی کا ہونا چاہیے۔ یوں سمجھ لو کہ فائزہ اب اس گھر میں میری امانت ہے۔"

خالہ مطمئن ہو کر چلی گئیں اور میں سب کچھ بھول کر اپنی پڑھائی میں لگ گئی۔ فائنل ایگزام ہونے والے تھے۔ بالآخر یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا اور میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گئی خالہ مبارک باد دینے آئیں اور باتوں باتوں میں انہوں نے امی سے پوچھا۔ "تم نے بھائی صاحب سے بات کی۔ وہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں انہیں یہ رشتہ منظور ہے لیکن ہمیں کچھ مہلت چاہیے۔ آج کل ان کا ہاتھ کچھ تنگ ہے۔ کاروبار میں مسلسل گھاٹا ہو رہا ہے۔ کچھ پیسے ہاتھ میں ہوں تو شادی کی تیاری شروع کی جائے۔"

خالہ سمجھ گئیں کہ امی بیٹوں کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکی ہیں اور صرف شوہر کی کمائی پر ہی ان کا گزارہ ہو رہا ہے۔ انہوں نے ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں جہیز وغیرہ کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تم سادگی سے نکاح اور رخصتی کردو۔ اس کے علاوہ ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔"

"آپا! یہ کیسے ہو سکتا ہے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہو گا۔ مجھے ایک سال کی مہلت دو تاکہ میں بیٹی کو شایان شان طریقے سے رخصت کر سکوں۔"

"جیسے تمہاری خوشی۔" خالہ بولیں۔ "جہاں میں نے اتنا انتظار کیا ہے۔ وہاں کچھ دن اور سہی۔" میں اور جنید اپنی جگہ مطمئن تھے کہ اب ان کی شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی چنانچہ میں نے وقت گزاری کے لیے ایک دواؤں کی کمپنی میں ملازمت کرلی۔ گھر کے حالات سامنے تھے۔ ابو کا کاروبار تقریباً ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا اور آمدنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ انہوں نے اچھے وقتوں میں جو بچت کی وہی کام آرہی تھی۔ تینوں بھائیوں کو کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ حالانکہ کاشف بھائی کی اچھی خاصی تنخواہ تھی اور وہ باآسانی والدین کو سپورٹ کر سکتے تھے لیکن انہیں اپنی بیوی کی ناز برداریوں سے ہی فرصت نہ تھی۔ ہمیشہ اخراجات کا رونا روتے رہتے۔

دوسرے بھائیوں کا رویہ بھی مختلف نہ تھا۔ عاطف کینیڈا میں ٹھیک ٹھاک کما رہا تھا اور اسے سسرال سے بھی سپورٹ مل رہی تھی لیکن اس نے کبھی بھول کر بھی نہ پوچھا کہ گھر کا خرچ کیسے چل رہا ہے۔ اسی طرح عارف بھی ایک اسپتال میں ریزیڈنسی کر رہا تھا جہاں اسے معقول تنخواہ مل رہی تھی۔ یونیورسٹی کی فیس اور دیگر اخراجات کے بعد اس کے پاس اچھے خاصے پیسے بچ جاتے تھے لیکن اس نے بھی کبھی ماں باپ کی مدد کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔

ان حالات میں، میں نے یہی مناسب سمجھا کہ کوئی ملازمت کرلوں تاکہ اپنے اخراجات پورے ہوتے رہیں اور جو پیسے بچیں وہ شادی کے موقع پر کام آئیں۔ امی اور ابو دونوں نے ہی میری مخالفت کی لیکن میں نے انہیں کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا۔ جنید کو بھی ملازمت پر اعتراض تھا لیکن میں نے یہ کہہ کر اس کا منہ بند کر دیا کہ یہ اس کی ضرورت ہے۔ وہ اپنی سولہ سال کی محنت گھر بیٹھ کر ضائع نہیں کر سکتی اور یہ کہ وہ شادی کے بعد بھی ملازمت کرتی رہے گی۔

جنید خاموش ہو گیا۔ اسے میری خوشی عزیز تھی اور وہ کسی حد تک ہمارے حالات سے واقف ہو چکا تھا۔ پہلی تاریخ کو جب میں نے ہزار ہزار کے نئے نوٹ ماں کے ہاتھ پر رکھے تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ گلے لگاتے ہوئے بولیں۔ "خوش رہو بیٹی تم تو میرے لیے بیٹوں سے بڑھ کر نکلیں۔"

"مجھے شرمندہ نہ کریں امی، آپ نے ہی تو مجھے پڑھا لکھا کر اس قابل کیا ہے کہ میں کسی کام آسکوں۔"

"اچھا تم یہ اپنے پاس ہی رکھو۔ ہمارا گزارا تو ہو ہی رہا ہے۔"

"نہیں امی اگر ضرورت ہوئی تو آپ سے مانگ لوں گی۔ میں ابو کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں تاکہ ان کی پریشانی دور ہو سکے۔"

"اچھا تو تم انہیں بینک میں جمع کرا دو تاکہ وقت پر

تمہارے کام آئیں۔''
میں ان کا اشارہ سمجھ گئی اور خاموشی سے وہ پیسے اپنے پرس میں رکھ لیے۔ دوسرے دن بینک گئی۔ اپنا اکاؤنٹ کھولا اور ہر مہینے اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ اس میں ڈالنے لگی۔ میری اپنی ضروریات بہت محدود تھیں۔ ٹرانسپورٹ کمپنی کی تھی۔ کھانا گھر سے لے کر جاتی۔ زیادہ سے زیادہ مہینے میں ایک دو جوڑے بنا لیتی تھی۔ باقی پوری تنخواہ بینک میں جمع ہو رہی تھی۔
چھ ماہ بعد جاب کنفرم ہو گئی۔ تنخواہ میں بھی اضافہ ہو گیا لیکن جنید سے اب انتظار نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب ہماری شادی ہو جانی چاہیے امی کو کب بھیجوں تاریخ لینے کے لیے؟''
''میں کیا بتاؤں جنید۔'' میں وہ گڑبڑاتے ہوئے بولی۔ ''امی تو بالکل خاموش ہیں۔ انہوں نے ابھی تک کوئی تیاری نہیں کی۔''
''ہوں۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو فائزہ برا مت ماننا۔ مجھے لگتا ہے کہ خالہ جان تمہاری شادی کرنا ہی نہیں چاہتیں۔''
''یہ تم کیا کہہ رہے ہو جنید۔ وہ بھلا ایسا کیوں چاہیں گی۔''
''ان کے طرز عمل سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔ پہلے انہوں نے تمہاری پڑھائی کا بہانا بنایا پھر کہا کہ عاطف کی شادی کے بعد وہ تمہیں رخصت کریں گی۔ جب عاطف کی شادی ہو گئی تو انہوں نے جہیز کی تیاری کے لیے وقت مانگا اور اب منہ بند کیے بیٹھی ہیں۔ شاید انہیں ڈر ہے کہ وہ تمہاری شادی کے بعد بالکل تنہا اور غیر محفوظ ہو جائیں گی۔''
اس کا مطلب بالکل واضح تھا لیکن میں نے کھل کر نہیں کہا۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہی کہہ رہا تھا کہ خالہ جان کو تمہاری آمدنی سے محروم ہو جانے کا ڈر ہے اسی لیے وہ خاموش ہیں۔
''تم غلط سمجھ رہے ہو جنید۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں موقع دیکھ کر ان سے بات کروں گی۔''
میں نے جنید کو وقتی طور پر خاموش کر دیا لیکن میرے دل میں ایک پھانس سی چبھ گئی۔ مجھے لگا کہ جنید ٹھیک ہی کہہ رہا تھا ورنہ امی کی خاموشی کا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے۔
دو دن بعد ہمارے جاننے والوں میں شادی کی ایک تقریب تھی۔ میں بھی اپنی امی کے ساتھ وہاں گئی۔ میری شخصیت میں اتنی کشش تھی کہ میں ہر محفل میں لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی۔ میرے ... برابر والی میز پر خواتین کا ایک گروپ بیٹھا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک عورت برابر مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ اس نے اپنے سامنے بیٹھی عورت سے کہا۔ ''تم اس لڑکی کو جانتی ہو۔ وہ جو آف وائٹ سوٹ پہنے ہوئے ہے۔''
دوسری عورت نے جواب دیا۔ ''ہاں مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''
''مجھے اپنے اسد کے لیے ایسی ہی لڑکی چاہیے تم اس کی ماں سے مجھے ملوا دو۔''
اس عورت نے اتنی زور سے قہقہہ لگایا کہ میری امی بھی اس کی جانب متوجہ ہو گئیں وہ کہہ رہی تھی۔ ''کوئی فائدہ نہیں۔ اس کا رشتہ طے ہو چکا ہے۔ وہ لوگ شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں لیکن ان کی طرف سے تاخیر ہو رہی ہے۔''
''اچھا، وہ کیوں؟'' پہلی عورت حیران ہوتے ہوئے بولی۔
''وجہ تو مجھے بھی نہیں معلوم لیکن جاب کرنے والی لڑکیوں کا یہی مسئلہ ہوتا ہے۔ جب ماں باپ ان کی کمائی کے عادی ہو جائیں تو انہیں اپنے سے جدا کرتے ہوئے بہت تکلیف ہوتی ہے۔''
امی کے ایکسپریشن سے یوں لگا جیسے کسی نے ان کے کلیجے میں تیر گھونپ دیا ہو۔ اس سے زیادہ سننے کی ان میں تاب نہیں تھی۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور کھانا کھائے بغیر ہی وہاں سے چل دیں۔
گھر آتے ہی انہوں نے اپنی بہن کا نمبر ملایا اور بولیں۔ ''آپا اس اتوار کو آ جاؤ تاکہ فائزہ اور جنید کی شادی کی تاریخ طے کر دی جائے۔''
میں نے دل ہی دل میں اس عورت کا شکریہ ادا کیا۔ جس نے ایک تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کر کے میری ماں کی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کھول دی تھی۔ وہ خود یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس غیر ضروری تاخیر کا سبب کیا تھا۔ جنید نے تو صرف اشارہ ہی کیا تھا لیکن اس عورت نے تو کھل کر کہہ دیا۔ شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ لڑکی کی شادی میں دیر نہیں کرنی چاہیے ورنہ دنیا والوں کی زبان کون روک سکتا ہے مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ عورت جنید کی رشتے دار تھی اور ایک پلاننگ کے تحت اس نے یہ کہا تھا۔



دو کوڑی کے لوگ

محترم و مکرم مدیراعلیٰ
السلام علیکم
انسان اور سنک دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ہر دسواں آدمی آپ کو سنکی ملے گا۔ میرے دوست انوز کا پالا بھی ایک ایسے ہی سنکی سے پڑا ہے پھر بھی وہ اسے بھاری بوجھ کی طرح ڈھو رہا ہے کیونکہ ایسا صرف اس کے ساتھ نہیں، ہر ضرورت مند کے ساتھ ہوتا ہے۔
رئوف اسلم آرائیں
(کراچی)

میں نے بڑی خود اعتمادی سے گیٹ کی گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس کے بعد اپنے الجھے ہوئے بال سنوارے۔ اپنی ٹائی ٹھیک کی اور گیٹ کے کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ ذرا سی دیر میں گیٹ کھول دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مکان کے اندرونی حصے سے کسی کتے کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

مسلح چوکیدار نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ”کس سے ملنا ہے صاحب۔“ اس نے پوچھا۔

”سہیل صاحب سے۔“ میں نے بتایا۔ ”انہوں نے مجھ

ٹائم دیا تھا۔‘‘
’’ایک منٹ! میں صاحب سے معلوم کرلوں۔ آپ کا نام کیا ہے؟‘‘
’’انور...... انور زماں۔‘‘ میری خود اعتمادی برقرار رہی تھی۔
گیٹ دوبارہ بند ہو گیا لیکن پھر کھول دیا گیا تھا۔ ’’آجائیں صاحب! لان میں بیٹھ جائیں۔ صاحب آرہے ہوں گے۔‘‘
اس مکان کا لان بھی اس مکان ہی کی طرح خوب صورت تھا۔ بید کی کرسیاں اور بید کی نفیس میز پڑی ہوئی تھی۔ میں چاروں طرف دیکھتا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔
میں یہاں انٹرویو دینے آیا تھا۔ میرا تعلیمی کیریئر شاندار رہا ہے۔ اس کے علاوہ میں ایک پُرجوش خوداعتماد اور تخلیقی صلاحیت رکھنے والا نوجوان ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ کسی فرم کو کامیاب کرنے اور اسے ترقی دینے کے لیے کیسی باتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔
اب سے دو دن پہلے میں نے ایک انگریزی اخبار میں ایک اشتہار دیکھا تھا جس میں ایک ایسے شخص کی ضرورت ظاہر کی گئی تھی جو پڑھا لکھا گھڑ ہونے کے ساتھ ساتھ پُرجوش اور پُرعزم بھی ہو۔
مجھ میں یہ خوبیاں بھی تھیں۔ میرے جاننے والے میرے احباب اور میرے رشتے دار یہی کہا کرتے تھے کہ مجھ میں بہت زبردست اسپارک موجود ہے۔ میں بہت آگے جاسکتا ہوں۔ یہ سب باتیں سامنے کی تھیں اس لیے میں نے اشتہار کے جواب میں اپنی سی وی بھیج دی۔
توقع کے برعکس دوسرے ہی دن جواب آگیا تھا لیکن ایک الجھن یہ بھی تھی کہ انٹرویو دفتر کی بجائے فرم کے باس کے گھر ہونے والا تھا۔
بہرحال مجھے اس سے کیا۔ وہ چاہے جہاں بھی بلائے۔ مجھے تو اپنی نوکری سے واسطہ تھا اگر اس فرم میں ہو جاتی تو آگے کے امکانات بہت روشن تھے کیونکہ یہ ملک کی ایک بڑی فرم تھی۔
میں اس وقت اس کے باس سہیل کے مکان کے لان میں بیٹھا اس کی آمد کا انتظار کررہا تھا۔
اچانک کسی طرف سے ایک جسیم سا کتا نمودار ہو گیا۔ وہ جرمن شیفرڈ تھا۔ یہ کتے صرف اپنے مالک کے وفادار ہوتے ہیں اور دوسروں کو پھاڑ کھانے میں دیر نہیں لگاتے۔ اس کتے کو دیکھ کر میں بری طرح خوفزدہ ہو گیا۔
شاید میں نے اس کے بھونکنے کی آوازیں سنی تھیں۔ اس نے مجھے دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیا اور اس وقت کسی مرد کی کرخت اور غصہ بھری آواز سنائی دی۔ ’’ٹائگر کیا کررہے ہو یہاں، جاؤ واپس۔‘‘
اس کتے نے اس طرف دیکھا جس طرف سے آواز آئی تھی۔ میں بھی خوفزدہ ہو کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک باوقار سا شخص تھا۔ پینتالیس اور پچاس کے درمیان کا شاید وہی سہیل تھا، فرم کا باس۔
’’گیٹ آؤٹ۔‘‘ وہ زور سے بولا۔ ’’اِدھر نہیں آنا۔‘‘
وہ کتا گردن جھکائے ایک طرف چلا گیا۔ اب اس کا یہ حال تھا کہ اس نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ ’’مجھے سہیل کہتے ہیں۔‘‘ اس نے اپنا تعارف کروایا۔
’’یس باس، میں آپ کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا۔‘‘ میں نے کہا۔
’’ٹائیگر نے تمہیں پریشان تو نہیں کیا تھا۔‘‘ وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
’’نو سر! اس سے پہلے ہی آپ آگئے تھے۔‘‘ میں نے کہا۔
’’بیٹھ جاؤ۔‘‘ اس نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
میں نے اس کے سامنے والی کرسی سنبھال لی۔ وہ اپنی گردن جھٹک کر بولا۔ ’’میں یہ سب برداشت نہیں کرسکتا۔ اس کو سزا ملے گی۔ سخت سزا دوں گا اس کو۔‘‘
’’میں نہیں سمجھا سر۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔‘‘
’’ٹائیگر کی بات کررہا ہوں۔‘‘ اس نے بتایا۔ ’’میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنے ایریے سے باہر نہیں نکلے، لیکن وہ اس طرف چلا آیا، کیوں اس میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی۔‘‘
’’جانے دیں سر، جانور ہے۔‘‘
’’نہیں، مجھے یہ رویّہ پسند نہیں ہے۔ چاہے جانور ہو یا انسان۔ میں حکم عدولی اور بغاوت برداشت نہیں کرسکتا۔ نکال دیتا ہوں اس کو اپنی زندگی سے۔ خیر میں نے تمہاری سمری دیکھی ہے۔ تم نے اس میں بڑے بڑے دعوے کیے ہیں کہ تم یہ کرسکتے ہو وہ کرسکتے ہو۔ اب بتاؤ تم میری فرم کے لیے کس

طرح مفید ثابت ہو سکتے ہو۔"

اس کے انداز نے مجھے غصہ تو دلا دیا تھا لیکن یہ سمجھ کر خاموش رہا کہ نوکری کرنا تھی اور اپنی تمام تر قابلیت اور صلاحیت کے باوجود مجھے اب تک کوئی ڈھنگ کی جاب نہیں مل سکی تھی۔

"میرا خیال ہے سر کہ میں خود کو اس منصب کا اہل سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تمہارے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ جب کوئی کمپنی زبردست ترقی کر رہی ہو تو ایسے کون سے عوامل ہوتے ہیں جنہوں نے اسے اس مقام تک پہنچایا ہے۔"

"سر! پہلی تو حکمت عملی ہوتی ہے یعنی Stratagy۔" میں نے بتانا شروع کیا۔ "اور دوسری بات ہوتی ہے عملدرآمد۔ یعنی صرف حکمتِ عملی بنا کر نہ رہا جائے بلکہ اس پر عمل بھی کیا جائے اور تیسری بات ہوتی ہے ماحول اور چوتھی بات ہوتی ہے ڈھانچا، اسٹرکچر۔"

"خوب۔" اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس معاملے میں تمہاری اسٹڈی اچھی ہے۔"

"یس سر! میں خوب سوچ سمجھ کر آپ کے پاس آیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"او کے۔ کل صبح دفتر آجانا۔ تمہیں اپائنٹمنٹ کر لیا گیا ہے۔ فی الحال تمہاری سیلری پینتیس ہزار روپے ہو گی۔ بعد میں تمہاری کارکردگی دیکھتے ہوئے اور بڑھا دی جائے گی۔"

"بہت بہت شکریہ سر۔" میں خوش ہو کر بولا۔ سیلری اچھی خاصی تھی۔ میں نے اتنی توقع نہیں کی تھی۔ بہت دنوں کے بعد کامیابی ملی اور یہ کامیابی اچھی خاصی تھی۔ میں اپنی خود اعتمادی اور صلاحیتوں سے کام لے کر بہت آگے جا سکتا تھا۔

گھر والوں کو یہ معلوم تھا کہ میں کسی خاص جگہ انٹرویو دینے گیا ہوں۔ وہ سب میری کامیابی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ میں نے جب واپس آکر بتایا تو ان کی خوشیوں کا ٹھکانا نہیں رہا تھا۔

میرے دوستوں کو بھی یہ سن کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ خاص طور پر رفعت کو۔ رفعت سے میرا رشتہ دوسروں سے الگ تھا۔ یہ پیار کا رشتہ تھا، محبت کا رشتہ تھا۔

وہ میرے مستقبل کی طرف سے بہت پُر امید تھی، وہ کہا کرتی۔ "انور تم میں جتنی صلاحیتیں ہیں وہ میں نے آج کے بہت کم نوجوانوں میں دیکھی ہیں۔"

"اوہو۔" میں نے شرارت سے پوچھا۔ "چلو اب لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دو کہ کتنے نوجوانوں سے تمہارا واسطہ پڑ چکا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ تم جانتے ہو میرے درجنوں کزنز ہیں۔ میں ان کو دیکھتی ہوں اور تمہارا موازنہ کرتی ہوں تو آسمان زمین کا فرق دکھائی دیتا ہے۔"

"بہت شکریہ تمہارا۔"

"اب یہ بتاؤ کب سے جوائن کر رہے ہو۔" اس نے پوچھا۔

"کل ہی سے۔" میں نے بتایا۔ "کامیابی کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔ چانس مل رہا ہے اسے فوراً پکڑ لو، سوچنے والے سوچتے ہی رہ جاتے ہیں۔"

میں دوسرے دن دفتر پہنچ گیا۔

مجھے مینیجر کے سپرد کر دیا گیا۔ جس نے مجھے میری ڈیوٹی سمجھا دی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ "مسٹر انور، اب تک تم سے جو باتیں ہوئیں وہ آفیشل تھیں یعنی تمہاری جاب کے حوالے سے، اب میں تمہیں کچھ سمجھانا چاہتا ہوں۔"

"ضرور سر، مجھے آپ کے مشوروں پر عمل کر کے خوشی ہوگی۔"

"تم باہمت اور پُرجوش نوجوان ہو۔ تم میں آگے بڑھنے کا اسپارک بھی ہے لیکن میری یہ بات یاد رکھو کہ کبھی باس کی کسی تجویز یا رویئے کے خلاف مت جانا، وہ جو کچھ کہے اس پر ہاں کرتے جانا۔"

"لیکن سر! یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ میں کمپنی میں ملازم ہوا ہوں اور کمپنی کی بھلائی میں جو بول سکتا ہوں جو مشورہ دے سکتا ہوں وہ ضرور دوں گا۔"

"اور یہی تمہاری سب سے بڑی غلطی ہوگی۔ تم کو اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرنا ہے کہ تم مجھے نہیں جانتے۔ تم اس سے ایگری کرو گے۔ ہر بات میں ہاں، ایسی باتوں پر وہ بہت خوش ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ دنوں کے بعد تم خود ہی سب جان لو گے۔"

مینیجر نے ایک عجیب بات کہہ دی تھی اگر میں اس کے مشوروں پر عمل کر کے یس باس ہی کرتا رہوں تو پھر میری ایجوکیشن اور میری صلاحیت وغیرہ کس کام کی۔

بہر حال کام تو شروع کر ہی دیا تھا، اب دیکھنا یہ تھا کہ آگے کیا ہوتا ہے۔

دو چار دنوں کے بعد ہی ایک بات سامنے آگئی۔ کمپنی کا کسی کمپنی سے معاہدہ ہونے والا تھا، ایگریمنٹ کی ایک کاپی مجھے پڑھنے کو دی گئی۔

اس میں دو ایسی شقیں تھیں جن پر عمل کرنے کی صورت میں کمپنی کو نقصان ہو سکتا تھا۔

میں وہ کاپی لے کر باس کے پاس پہنچ گیا۔ ''سر! آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''ہاں کہیں۔''

''سر! یہ کاز نمبر چار اور چھ ہماری کمپنی کے لیے آگے چل کر نقصان دہ ثابت ہوں گی۔''

''تو پھر کیا کیا جائے۔'' اس کا لہجہ انتہائی سرد تھا۔

''سر! ان کی جگہ کچھ اور شرائط رکھی جائیں۔'' میں نے کہا۔

''مسٹر انور! ایک بات بتائیں اس کمپنی کا مالک کون ہے میں یا آپ۔''

''ظاہر ہے سر آپ ہی ہیں۔''

''تو پھر آپ کے اوور اسمارٹ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔'' باس غرّا کر بولا۔ ''آپ اپنی قابلیت کو اپنے آپ تک رکھیں۔''

مجھے تو ایسے لگا جیسے کسی نے مجھے بلندی سے اٹھا کر نیچے پھینک دیا ہوگا۔ میرا سارا اعتماد سارا ولولہ ذرا سی دیر میں ختم ہو گیا تھا۔

''اب آپ جا سکتے ہیں۔''

میں دل ہی دل میں اس کو برا بھلا کہتا ہوا اس کے کمرے سے باہر آگیا۔ اس کے اس رویے نے میرے اعتماد کو بری طرح مجروح کر دیا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو مجھے شاباش دیتا کہ میں نے اس کی کمپنی کی بھلائی کا سوچا ہے۔ اس کے برعکس اس نے مجھے ایک طرح سے جھڑک کر باہر نکال دیا تھا۔

یہ کوئی عام سی بات نہیں تھی بلکہ میری خود اعتمادی کو بہت بڑا دھچکا تھا۔ میں نے اب تک جو کچھ سیکھا وہ ذرا سی دیر میں ختم ہو کر رہ گیا تھا۔

میں نے اس توہین کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔ خوامخواہ مذاق اڑایا جاتا کہ میں اوور اسمارٹ بننے کی کوشش کر رہا ہوں جب کہ منیجر نے پہلے ہی دن مجھے آگاہ کر دیا تھا کہ میں باس کے کسی فیصلے کی مخالفت کرنے کی کوشش نہ کروں۔

دو چار دنوں کے بعد ایک حیرت کی خبر ملی۔ مجھے جن دو شقوں پر اعتراض تھا باس نے ان کو کینسل کر دیا تھا۔ یعنی میرے مشورے پر ہی عمل کیا گیا تھا لیکن کس طرح؟

اس دن باس نے اپنے کمرے میں بلا کر کہا۔ ''مسٹر انور آپ شام کو میرے مکان پر آجائیں۔ آپ سے بات کرنی ہے۔''

''او کے سر۔''

خدا جانے کیا بات تھی جو اس نے مجھے گھر بلایا تھا۔ بہر حال شام کے وقت میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ گارڈ نے اس بار کچھ نہیں پوچھا۔ اس نے کوئی سوال کیے بغیر مجھے لان میں جا کر بٹھا دیا۔ کچھ دیر گزری تھی کہ پھر اس کتے کے بھونکنے کی آواز نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔

لیکن اس بار وہ کتا اور باس ساتھ ساتھ نمودار ہوئے تھے۔ کتا مجھے دیکھ کر غرانے لگا تھا۔ باس نے اسے ڈانٹتے ہوئے ایک طرف بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ وہ آہستہ آہستہ غرّاتا ہوا ایک طرف جا کر بیٹھ گیا۔

باس نے ایک کرسی سنبھال لی تھی۔

''مسٹر انور آپ آم کھاتے ہیں؟'' اس نے ایک عجیب سا سوال کیا۔

''جی!'' میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں نہیں سمجھا سر۔''

''میں نے پوچھا ہے آپ آم کھاتے ہیں۔'' اس نے دوبارہ سوال کیا۔

''جی سر۔''

''تو پھر آموں کی پہچان بھی ہوگی۔'' یہ اس کا دوسرا سوال تھا۔

''یس سر! میں جانتا ہوں کہ کون سا آم کیسا ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اچھی خاصی پہچان ہے مجھے۔''

''اور ایک میرے ملازم ہیں نکمے، جاہل۔'' وہ غصے سے بولنے لگا۔ ''ان میں سے کسی کو بھی آموں کی پہچان نہیں، الٹا سیدھا خرید کر لے آتے ہیں۔''

میں ابھی تک اس کی بات سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ میں اس کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ ایک اہم عہدے پر تھا۔ اس نے مجھے شاید آفس کے کسی کام سے بلایا ہوگا۔ پھر یہ آموں کا ذکر مجھ سے باہر تھا۔

''مسٹر انور! آپ ذرا بازار جا کر دس کلو آم خرید کر

لے آئیں۔'' اس نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی ہزار کے دو نوٹ میری طرف بڑھا دیے۔ ''یہ لیں پیسے۔''

میں تو گنگ سا ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ کیسا رویہ تھا۔ کیا میں اس کے گھر کا ملازم تھا؟

شاید اس نے میرے چہرے سے میرے تاثرات کا اندازہ لگا لیا تھا اس لیے جلدی سے بولا۔ ''پلیز آپ برا نہ مانیں یہ میں اپنا سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں سر۔'' میں خوش دلی سے بولا۔ ''پیسے ہیں میرے پاس، آپ رہنے دیں۔''

''نہیں، لے جائیں۔'' اس نے کہا۔ ''اور میرے ڈرائیور کے ساتھ چلے جائیں۔''

اس نے اپنی گاڑی پر مجھے روانہ کر دیا۔ میں یہ بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ اس نے کیا اسی لیے مجھے بلایا تھا کہ میں اس کے لیے بازار سے آم خرید کر لے آؤں۔

لیکن اتنا ضرور ہوا تھا کہ اس نے اپنا لہجہ نرم رکھا تھا۔ اس نے مجھے حکم نہیں دیا تھا بلکہ درخواست کی ہے۔

بہرحال میں آدھ گھنٹے کے اندر دس کلو آم لے کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اس وقت لان ہی میں بیٹھا کتے سے کھیل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کتے نے پھر غرانا شروع کیا۔ اس نے ڈانٹ ڈپٹ کر کتے کو ایک طرف بھیج دیا۔

''یہ لیں سر!'' میں نے شاپر اس کے سامنے رکھ دیے۔ ''اعلیٰ کوالٹی کے آم لے کر آیا ہوں۔''

اس نے شاپرز سے آم نکالے، انہیں دیکھتا رہا، پھر اچانک برس پڑا۔ ''یہ آپ کیا خاک اعلیٰ کوالٹی کے آم لائے ہیں مسٹر انور، آپ کو تو آموں کی بھی پہچان نہیں ہے۔ کیا فائدہ ایسی قابلیت کا۔ ایسے آم تو میرا کتا بھی پسند نہیں کرے گا۔ یہ سب تو پھینکنے والے ہیں۔'' اتنا کہہ کر اس نے وہ شاپرز ایک طرف پھینک دیے۔

میں تو اپنی جگہ کٹ کر رہ گیا۔ یہ کیسی توہین تھی، میں تو دو کوڑی کا ہونے لگا تھا کیا میری خود اعتمادی، میری تخلیقی صلاحیتیں وغیرہ اس دن کے لیے تھیں کہ میں بازار سے آم خرید کر لایا کروں، وہ کتنا بدتمیز انسان تھا۔

''مسٹر انور! آپ چائے پئیں گے۔'' اس نے اچانک پوچھا۔

''نو سر، شکریہ۔ سر آپ نے مجھے کس کام کے لیے بلایا تھا۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں بلایا تو تھا لیکن اس وقت یاد نہیں آ رہا، کل دفتر

ٹوبہ ٹیک سنگھ

صوبہ پنجاب کا ایک ضلع اور ضلعی صدر مقام۔ اس کا رقبہ 3252 مربع کلومیٹر۔ اس کے شمال میں ضلع جھنگ ہے۔ مشرقی اور جنوب مشرقی سرحدیں ضلع فیصل آباد کے ساتھ ملتی ہیں۔ جنوب کی طرف ضلع ملتان کا کچھ حصہ اس کی سرحد کے ساتھ واقع ہے۔ جنوب کی طرف ضلع ملتان کا کچھ حصہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی سرحد کے ساتھ واقع ہے۔ دریائے راوی جنوبی اور جنوب مشرقی سرحد کے ساتھ ساتھ بہتا ہے۔ دریا کے پار ساہیوال اور ملتان کے اضلاع ہیں۔ یہ ضلع گوجرہ، کمالیہ اور ٹوبہ ٹیک سنگھ تحصیلوں پر مشتمل ہے۔ یہ ضلع پنجاب کے ہموار میدانی علاقے کا حصہ ہے۔ نہر لوئر چناب، جھنگ برانچ، لوئر گوگیرہ برانچ اور مرالہ برانچ ضلع کی اراضی کو سیراب کرتی ہیں۔ گندم، کپاس، گنا، چاول اور مکئی اس ضلع کی اہم فصلیں ہیں۔ یہاں نیلی راوی نسل کی بھینسیں بھی پائی جاتی ہیں۔ ضلع میں چینی (کمالیہ شوگر ملز، سمندری گوجرہ شوگر ملز) روئی بیلنے، سوتی کپڑا بنانے (گوجرہ) آٹا پیسنے کے کارخانے ہیں۔ کھڈی پر کھدر، کھیس اور قالین بھی بنائے جاتے ہیں۔ کمالیہ، پیر محل گوجرہ اور ٹوبہ ٹیک سنگھ میں مٹی کے برتن بھی بنتے ہیں۔ کمالیہ، سمندری، گوجرہ اور ٹوبہ ٹیک سنگھ میں زرعی آلات بنانے کے کارخانے ہیں۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ بذریعہ ریل اور سڑک کمشنری کے صدر مقام فیصل آباد اور دیگر شہروں سے مربوط ہے۔ تحریک پاکستان کے اہم کارکن ڈاکٹر فرید بخش کا تعلق بھی اسی ضلع سے ہے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ اگرچہ نیا ضلع ہے، تاہم اس کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ پہلے پہل اس علاقے کو ساندل بار کہا جاتا تھا۔ محمد بن قاسم کی برصغیر میں آمد سے قبل یہاں ہندو بستے تھے۔ سلطان محمود غزنوی پہلا مسلمان بادشاہ تھا، جو پاکستان کے علاقے میں آیا اور یہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی، پھر یہاں مغلوں کی حکومت رہی۔ مغلوں کے بعد راجا رنجیت سنگھ نے قبضہ کر لیا تو ٹوبہ ٹیک سنگھ بھی اس کی عملداری میں آ گیا۔ رنجیت سنگھ کے بعد انگریزوں نے سکھوں کو شکست دے کر پنجاب پر قبضہ کر لیا اس علاقے پر تقریباً ایک سو سال تک حکومت کی۔

مرسلہ: عبدالخالق بھٹی، اللہ آباد

آکرہ

صوبہ سرحد میں مرکز آثار قدیمہ، ان آثار کی تفتیش پاکستان مجلس باقیاتی تفتیش نے جس کے سربراہ پروفیسر فرید خان ہیں انہوں نے جے آرناکس (برطانوی عجائب گھر)اور ڈاکٹر کے ڈی تھامس(لندن یونیورسٹی) کے تعاون سے شروع کی گئی۔ یہ تفتیش کئی مرحلوں پر محیط ہے۔ 1996ء میں اس وسیع پروگرام کا نقطہ آغاز ہوا۔ کھنڈرات کے سطحی جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ وادی بنوں میں آکرہ سب سے زیادہ قدیم اور عظیم الشان شہر تھا جو 200 ایکڑ سے بھی زیادہ رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ آکرہ کے کھنڈرات مختلف ٹیلوں کی شکل میں بنوں شہر سے 12 کلومیٹر دور جنوب مغرب کی طرف واقع ہیں۔ بھرت گاؤں ان کھنڈرات کے قرب میں موجودہ دور کا گاؤں ہے۔ آکرہ نام غالباً یونانی لفظ آکروپلس (Acroplis) کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے جس کا مطلب بلند مقام یا دارالحکومت ہے۔ آکرہ کے ٹیلے لوہڑہ نالہ کے دونوں کناروں پر واقع ہیں۔ یہ ٹیلہ لوہڑہ نالہ کے بائیں کنارے پر ہے اور یہاں سے کشن دور کے آخری دنوں کے آثار بھی ملے ہیں۔ 1996ء میں کھدائی کو لوہڑہ نالہ کے دائیں جانب تک محدود رکھا گیا تھا۔ یہاں سے دریافت شدہ مٹی کے برتنوں کی شہادت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ثقافتی آثار تقریباً 900 ق م پرانے ہیں۔ اس طرح کے برتن وادی بنوں میں کئی اور جگہوں پر بھی ملے ہیں۔ ان برتنوں میں زیادہ دلچسپی کے حامل وہ برتن ہیں جنہیں پانی جمع کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ان کی ایک جانب ٹونٹی اور دوسری جانب دستہ لگا ہوا ہے اور یہ برتن وادی بنوں سے باہر کہیں بھی نہیں ملتے اور اس لحاظ سے نہایت ہی دلچسپ تھے۔ آکرہ شہر یونانی دور سے لے کر ہندوستانی زمانے تک تقریباً ایک ہزار سال تک آباد تھا۔ آکرہ کی کھدائی دراصل وادی بنوں میں جاری گزشتہ دس سالوں سے 1986-1996ء کی تحقیقات کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

مرسلہ: نادر مرزا، کراچی

میں ملاقات ہوگی۔''

میں اندر ہی اندر کھولتا ہوا اپنے گھر واپس آ گیا۔ گھر والوں اور دوستوں کے سامنے جاتے ہوئے اپنے آپ سے شرم آنے لگی تھی۔ خاص طور پر رفعت سے، وہ بے چاری تو یہ سمجھ رہی ہوگی کہ جتنی میری صلاحیتیں ہیں، اس لحاظ سے میرے دفتر میں میرا احترام کیا جاتا ہوگا۔ وہاں میری عزت ہوتی ہوگی لیکن یہاں جو کچھ بھی تھا وہ میں اسے تو کیا کسی کو بھی بتا نہیں سکتا تھا۔

دوسرے دن دفتر میں مینیجر سے ملاقات ہوئی۔ اس نے مجھے اپنے کیبن ہی میں بلا لیا تھا۔ ''جی انور صاحب! میں نے سنا ہے کہ کل آپ باس کے گھر گئے تھے۔'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''کوئی خاص بات۔'' اس نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''جی نہیں کوئی خاص بات نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''باس نے میرے کام کے حوالے سے کچھ پوچھنے اور بات کرنے کے لیے بلایا تھا۔''

''حیرت ہے۔'' اس نے اپنے سر کو جنبش دی۔ ''عام طور پر ایسا ہوتا تو نہیں ہے۔''

''میں آپ کی بات نہیں سمجھا مینیجر صاحب، وہاں اور کیا ہونا چاہیے تھا۔'' میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، بس یوں ہی ایک خیال ذہن میں آ رہا تھا اور ہاں آج اپنی سیلری لیتے جایئے گا۔''

''سیلری ابھی سے، ابھی تو پچیس تاریخ ہے مینیجر صاحب۔''

''باس کی مرضی ہے۔ انہوں نے آج آتے ہی یہ اعلان کر دیا ہے کہ اس بار سب کو سیلری ایک ہفتے پہلے مل جائے گی آپ کا چیک تیار ہو گیا ہے۔''

35 ہزار کے چیک نے ساری کدورت ختم کر دی تھی۔ اتنے عرصے کے بعد اتنی رقم کا چیک میرے پاس آیا تھا اور ایسا چیک ہر مہینے آنے والا تھا۔ جب ضرورتیں پوری ہو رہی ہوں، اکاؤنٹ میں پیسے آ رہے ہوں تو پھر یہ کون دیکھتا ہے کہ باس کا رویہ کیسا ہے۔ پیسے میں کتنی عافیت ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ اس وقت ہو رہا تھا، چیک ہاتھ میں آتے ہی باس کے سارے گناہ دھل گئے تھے۔ میں نے جب گھر والوں کو یہ چیک دکھایا تو وہ بھی نہال ہو گئے تھے۔

''بیٹا! اب تمہارے لیے ترقی کے دروازے کھلنے شروع ہو گئے ہیں۔'' ابو نے کہا۔ ''اس رفتار کو برقرار رکھنا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''جی ابو، ایسا ہی ہو گا۔'' میں اس وقت ایسا کہتے ہوئے خود کو چور محسوس کر رہا تھا۔

کئی دنوں تک باس سے ملاقات نہیں ہوئی اور نہ ہی اس نے مجھے کسی کام سے اپنے کمرے میں طلب کیا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چلتا رہا۔

اس دوران اتنا ضرور ہوا کہ میں نے اپنی سیلری سے رفعت کو کچھ چیزیں دلوا دیں۔ وہ بہت خوش تھی کہ اب میں نے صحیح جگہ اپنے کام کا آغاز کیا ہے۔

دو چار دنوں کے بعد باس نے پھر مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ اس نے وہ فائل میرے سامنے رکھ دی۔ ''مسٹر انور! اس میں یوسف برادرز کے نام ایک خط ہے۔ بتایئے اس میں کہاں کہاں غلطی ہے۔''

''اپنی میز پر لے جاؤں سر۔''

''نہیں یہیں بیٹھ کر بتاؤ۔'' اس نے کہا۔

میں نے دومنٹ میں خط پڑھ کر باس کو بتا دیا۔ ''سر! اس میں جملوں کی ساخت غلط ہے۔''

''تو آپ کے خیال میں کیا ہونا چاہیے۔'' اس نے غراتے ہوئے پوچھا۔

''اس طرح یہ جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔'' میں نے کاغذ پر خط لکھتے ہوئے بتایا۔

''آپ کا کیا خیال ہے کہ آپ اس دنیا میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے اور قابل ہیں۔'' اس نے پوچھا۔

''نو سر! میں نے تو ایسا کبھی تصور بھی نہیں کیا ہے۔''

''تو پھر جو کچھ لکھا ہوا ہے وہی صحیح ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ایک تو آج کل کے نوجوانوں کی قابلیت بدنصیب ہو گئی ہے۔ نیٹ پر علم حاصل کر کے اپنے آپ کو اسکالر سمجھنے لگے ہیں۔''

''سوری سر! میں غلطی پر تھا۔ جو کچھ اس میں لکھا ہوا ہے وہی صحیح ہے۔''

''کیا خاک صحیح ہے؟'' وہ پھر غرایا۔ ''مسٹر انور جو کچھ آپ نے بتایا ہے وہ صحیح ہے۔ آپ میں اتنی ہمت ہی نہیں ہے کہ آپ اپنی صحیح بات پر فائٹ کر سکیں۔ ڈٹ جائیں اپنے مؤقف پر۔ آپ کیا خاک ترقی کریں گے۔''

آغا خان ایوارڈ

فن تعمیر کا عظیم ایوارڈ۔ 1976ء میں آغا خان نے اسلامی روح کے مطابق ایسی عمارات کی تعمیر کی حوصلہ افزائی کے لئے ایک ایوارڈ قائم کرنے کا اعلان کیا جو مقامی ثقافت اور آب و ہوا سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ جدید ضروریات بھی پوری کریں گی۔ اس سلسلے کا پہلا ایوارڈ 1980ء میں دیا گیا جس میں فن تعمیر، منصوبہ سازی، عمرانیات اور آرٹ کے ماہرین پر مشتمل ایک جیوری نے پندرہ منصوبوں کو اعزاز بخشا۔ اس کے علاوہ مصر کے ماہر فن تعمیر، فن کار اور شاعر حسن فتحی کو دنیائے اسلام میں تعمیر کے میدان میں عمر بھر خدمات انجام دینے پر چیئرمین ایوارڈ دیا گیا۔ حسن فتحی ملکی طرز تعمیر کے حامی ہیں۔ انہوں نے مصر میں لکسر کے قریب غورنہ جدید گاؤں میں یہ ثابت کر دکھایا کہ اینٹوں اور گارے کی عمارتیں شاندار، باکفایت اور آب و ہوا کے عین مطابق ہوتی ہیں۔ فروری 1996ء میں آغا خان ایوارڈ برائے فن تعمیر 1995ء کا اعلان کر دیا گیا۔ 1993ء تا 1995ء کی سہ سالہ مدت کے لیے دنیا بھر میں جان بارہ تعمیراتی منصوبوں پر انعام دیا گیا۔ ان میں حیدرآباد سندھ کی نوتعمیر شدہ رہائشی کالونی خدا کی بستی شامل تھی۔ اس کا منصوبہ ماہر تعمیرات تسنیم اے صدیقی نے پیش کیا تھا۔ ماہر جیوری کا فیصلہ کن اجلاس انڈونیشیا کے شہر سولو کی تاریخی عمارت کراٹون سوراکرتا یعنی سلطان کے محل میں منعقد ہوا۔ ایوارڈ کی رقم 5 لاکھ ڈالر مقرر کی گئی ہے۔ اس کی تقسیم ہر تین سال کے بعد ہوتی ہے۔ 1986ء میں جو ایوارڈ دیا گیا وہ صادق آباد کے قریب واقع بھونگ مسجد کو دیا گیا۔ یہ مسجد فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اس اعتبار سے پاکستان کی کسی عمارت کو دیا جانے والا یہ پہلا انعام ہے۔

مرسلہ: سلطان مہکری، کراچی

میرا دل چاہا کہ یا تو میں اپنے ہاتھوں خود اپنا گلا گھونٹ لوں یا پھر اس کو مار ڈالوں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کا اصل موقف کیا ہے، وہ کیا چاہتا ہے۔

باس کے کمرے سے باہر آیا تو مینیجر نے آواز دی۔ ''انور صاحب! ذرا میرے پاس آجائیں۔''

میں بوجھل سا اس کے پاس چلا گیا۔

وہ گہری نگاہوں سے کچھ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ''انور صاحب! میں جانتا ہوں کہ آپ کے دل پر کیا گزر رہی ہے؟ اس کا یہی انداز ہے، یہی رویہ ہے۔ صرف آپ کے ساتھ نہیں ہر ایک کے ساتھ ساتھ ایسا ہی کرتا ہے۔ اپنے اسٹاف کے ہر فرد کے ساتھ ایسا سلوک کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دو ٹکے کا انسان سمجھنے لگتا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں مینیجر صاحب!'' میں نے اعتراف کیا۔ ''باس کا رویہ کچھ ایسا ہی ہے۔''

''اس نے جس وقت آپ کو اپنی کوٹھی پر بلایا تھا میں نے اسی وقت سمجھ لیا تھا کہ وہ آپ کو اپنے کتے ٹائیگر کے ذریعے خوفزدہ کرنے کی کوشش کرے گا۔'' اس نے کہا۔ ''یہ اس کا اسٹائل ہے۔ اس طرح سامنے والے کی پوری خود اعتمادی ختم ہو جاتی ہے۔ رزلٹ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی باس کے سامنے کتے کی طرح دم ہلانے لگتا ہے۔''

''لیکن یہ تو انتہائی غلط رویہ ہے مینیجر صاحب۔''

''اب کیا کہا جائے، مجھے اور آپ کو جاب کرنا ہے، آپ کو اپنا گھر چلانا ہے، ماں باپ بھائی بہن کی دیکھ بھال کرنی ہے اس لیے آپ اس کے خلاف نہیں جاسکتے۔ مجبور ہیں آپ، آپ کو معلوم ہے کہ مجھے اس جاب کی کیا قیمت ادا کرنی پڑی ہے؟''

''نو سر! آپ بتائیں کیا ہوا ہے آپ کے ساتھ؟''

''یہ دیکھیں۔'' اس نے اپنی پینٹ کے پائنچے اوپر اٹھا دیے۔ اس کی پنڈلیوں پر زخموں کے نشانات تھے۔ ''یہ دیکھ رہے ہیں آپ یہ نشانات اس کے کتے کے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''اس نے کئی بار مجھے ٹانگ پر کٹوایا ہے۔''

''میرے خدا! پھر آپ یہ جاب چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔''

''کیسے چھوڑ دوں۔ وہ مجھے ساٹھ ہزار روپے مہینا دیتا ہے، کہاں ملے گی مجھے ساٹھ ہزار کی جاب۔ کون دے گا، میری ایک بیوہ بہن ہے، جس کے دو بچے ہیں ان کی کفالت بھی میں کرتا ہوں، ماں ہے، دو چھوٹے بھائی ہیں، جو تعلیم حاصل کر رہے ہیں، مسٹر انور کون دے گا مجھے اور جانتے ہیں میری ان قربانیوں کا رزلٹ کیا ہے؟''

''آپ بتائیں سر۔'' میں اب واقعی لرزنے لگا تھا۔

''رزلٹ یہ ہے کہ میرے گھر والوں کو اب کوئی پریشانی نہیں ہے۔ وہ آرام کی زندگی گزار رہے ہیں۔ سب کچھ ہے ان کے پاس اور میرے بارے میں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میں ایک بڑی کمپنی میں مینیجر ہوں، بہت عزت ہے میری۔ کاش میں ان کو بتا سکتا کہ میں صرف دو کوڑی کا انسان ہوں دو کوڑی کا۔ مسٹر انور یہاں کا ہر شخص دو کوڑی کا انسان ہے۔''

''اب میں سمجھ گیا ہوں سر، اب آپ بتائیں میرے لیے کیا مشورہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مشورہ یہ ہے کہ اگر تم کو اپنی شخصیت اپنی صلاحیت اور اپنی انا کو زندہ رکھنا ہے تو یہ جاب چھوڑ دو اور اگر تمہیں اپنے گھر والوں کو زندہ رکھنا ہے تو پھر یہ جاب کرتے رہو۔ چاہے تمہاری شخصیت کے ٹکڑے ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ فیصلہ تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ یقین کرو کہ تمہاری تنخواہ بڑھتی رہے گی، لیکن تمہارا قد چھوٹا ہوتا جائے گا۔ بہت چھوٹا۔ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ باس کے سامنے تم ایک بونے رہ جاؤ گے جس طرح میں رہ گیا ہوں ایک مختصر سا بونا انسان۔''

اس وقت مینیجر کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ مجبوریاں بھی انسان کو کتنا پست کر دیتی ہیں۔ اس کا قد چھوٹا ہوتے ہوتے مکمل غائب ہو جاتا ہے۔

باس کے مشوروں اور اس کی قابلیت کے سامنے اس کی اپنی قابلیت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ وہ دو کوڑی کا انسان ہو جاتا ہے۔

اب اس واقعے کو چار سال گزر چکے ہیں۔ پرانے مینیجر کا روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا۔ اب میں نیا مینیجر ہوں، میری سیلری اسی ہزار روپے ہے۔ اسی ہزار۔ لیکن میری روح اور جسم پر بے شمار زخموں کے نشانات ہیں۔ میں بہت چھوٹا انسان ہوں۔ دو کوڑی کا۔

ذرا اپنے اردگرد دیکھیں سیٹھوں اور باس کے رویوں کو سوچیں، کہیں آپ بھی تو میری طرح دو کوڑی کے انسان نہیں ہیں؟

میں نے دیکھا کہ وہ آہستہ آہستہ پانی کی طرف بڑھ رہا ہے۔

وہ ایک نوجوان تھا۔ اس نے نیلی پینٹ اور سفید قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے بال پریشان تھے اور اس کا ارادہ اپنی جان دینے کا تھا۔

میں نے ایک نظر میں اس کی پریشانی بھانپ لی تھی۔

میں کبھی کبھی اکتا کر ساحل سمندر کی طرف چلا جاتا ہوں۔ اس دن بھی اسی لیے چلا گیا تھا۔ سمندر مجھے بہت اچھا لگتا ہے اس کو دیکھ کر ہیبت اور سکون دونوں ہی محسوس ہوتے ہیں۔ اس کی لہروں کا شور نہ جانے کن کن خوابوں کی یاد دلاتا رہتا ہے۔ نیچر قریب، بہت قریب آجاتا ہے۔

لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس دن میرا سمندر کی طرف جانا میرے لیے ایک عظیم الشان تجربے کی حیثیت ہو جائے گا۔

ہمدرد دشمن

جناب ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم

یہ واقعہ مجھے چچا نے سنایا جو کراچی میں رہتے ہیں اور ہائی کورٹ کے وکیل ہیں۔ یہ قصہ مجھے انوکھا لگا ہے اسی لیے اسے کہانی کے انداز میں لکھ کر بھیج رہا ہوں۔

ناصر اچکزئی
(کوئٹہ)



میں ساحل کے ساتھ لگے پتھروں پر بیٹھا ہوا تھا کہ وہ بھی میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور احساس ہو گیا کہ وہ ایک پریشان حال نوجوان ہے۔ اس نے دو تین ٹھنڈی سانسیں بھی لی تھیں۔ پھر منہ ہی منہ میں کچھ بولتا بھی رہا تھا۔ جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ نوجوان اپنی زندگی سے بے زار ہو چکا ہے اور اس کے ذہن میں موت کی آندھیاں چل رہی ہیں۔ وہ مرنا چاہتا ہے۔

میں نے اس کو نظر میں رکھا۔ اگر وہ واقعی مرنے کا ارادہ رکھتا تھا تو یہاں موت کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ تھا سمندر جو ہم سے چند قدم کے فاصلے پر تھا اور جس کی پُرشور لہریں آواز دے رہی تھیں۔ اس دوران میرے پیچھے روڈ پر کسی گاڑی کے بریک لگنے کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک بچہ گاڑی کے نیچے آتے آتے بچا تھا۔ میں اس تماشے کو دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ احساس ہی نہیں ہوا کہ میرے برابر بیٹھا نوجوان اٹھ کر سمندر کی طرف چل دیا ہے۔

میں نے جب دیکھا تو وہ سمندر کے بہت پاس پہنچ چکا تھا۔ ویسے تو اور بھی کئی لوگ تھے جو پانی میں نہا رہے تھے لیکن اس کے تیور ہی کچھ اور تھے۔ شاید ہی کسی نے اس کی طرف دھیان دیا ہو سوائے میرے۔

میں پتھر سے اتر کر نیچے آ گیا اور اس نوجوان کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس کو اس وقت جا پکڑا جب وہ سینے تک پانی میں آ چکا تھا۔ ''کیا کر رہے ہو بے وقوف انسان۔''

''چھوڑ دو مجھے۔'' اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔

''بے وقوف مت بنو۔'' میں نے اس پر اپنی گرفت سخت کر لی۔ ''نکلو پانی سے۔ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔''

اس نے کوشش تو بہت کی لیکن وہ مجھ سے زیادہ طاقت ور نہیں تھا۔ میں اسے کھینچ کھانچ کر ساحل تک لے آیا۔ اس دوران اگرچہ ساحل پر کچھ لوگ تھے لیکن شاید کسی کو احساس نہیں ہوا کہ ابھی کیا ڈراما ہو چکا ہے۔

''بیٹھ جاؤ ایک طرف۔'' میں نے اسے ایک پتھر کی طرف دھکیل دیا۔

اب وہ ٹھنڈا ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ ویسے وہ ناراض تھا۔ اس کی ناراضگی اس کے چہرے سے دکھائی دے رہی تھی۔

اس نے غصے سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''تم نے مجھے مرنے سے کیوں بچایا ہے۔''

''میں اپنے سامنے کسی کو مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تمہیں مرنا ہی ہے تو میرے جانے کے بعد مر جانا۔''

اس نے شکستہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا جیسے اسے مجھ سے ایسے جواب کی توقع نہ ہو۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اب پگھلنا شروع ہوا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''چلو میرے ساتھ۔ گھر چلتے ہیں۔''

''میں تمہارے ساتھ کیوں جاؤں۔'' اس نے پوچھا۔

''اس لیے کہ مجھے تم سے ہمدردی سی ہو گئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آ جاؤ دل چاہے تو پھر آ جانا۔ سمندر کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔ یہ یہیں رہے گا۔''

پہلی بار میں نے اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی دیکھی۔ شاید اسے میری بات پسند آئی تھی۔ وہ کچھ سوچنے لگا پھر کھڑا ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے چلو کہاں چلنا ہے۔''

میں نے اپنی گاڑی ساحل کے ساتھ ہی کھڑی کی تھی۔ وہ میری گاڑی دیکھ کر جھجک سا گیا۔ ''تم میرا مطلب ہے آ...... آپ کوئی امیر آدمی ہیں۔''

''یہ کس نے کہہ دیا؟''

''آپ کے پاس اتنی زبردست گاڑی ہے۔'' اس نے کہا۔

''تو اس سے کیا ہوا۔ کیا گاڑی رکھنے سے آدمی امیر ہو جاتا ہے۔''

میں نے اسے اپنے برابر والی سیٹ پر بٹھا دیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ میں نے اس سے راستے میں کچھ نہیں پوچھا۔ میرا گھر قریب ہی تھا اس لیے میں کبھی کبھی سمندر کی طرف آ جایا کرتا تھا۔

میں مسلمان تو تھا لیکن ایسا بھی نہیں کہ اپنے آپ کو پارسا ثابت کر سکوں۔ موقع ملتا تو نماز بھی پڑھ لیا کرتا۔ اس کے ساتھ دنیا کی اور کئی برائیاں میرے ساتھ تھیں۔ ایک بات ضرور تھی کہ میں شرمندگی محسوس کیا کرتا تھا۔ اپنے آپ سے بھی اور اپنے خدا سے بھی۔

میں اسی کشمکش میں رہا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے جب اپنے ایک دوست سے اس کا تذکرہ کیا تو اس نے کہا۔ ''میری جان اس میں پریشانی کیا ہے۔''

''احساسِ ندامت اور کیا کہہ سکتا ہوں۔''
''تو اس احساس سے بچنے کا ایک آسان فارمولا بتا دیتا ہوں۔''
''وہ کیا ہے۔''
''بہت آسان ہے۔'' اس نے کہا۔
''نیکی کی تلاش میں رہو۔ اور کہیں بھی کسی بھی جگہ، دفتر سے باہر آکر یا گھر سے نکلتے ہوئے۔ یہ سوچے بغیر کہ خدا جانے یہ نیکی کوئی اتنی بڑی ہو یا نہ ہو اس چکر میں نہ رہو۔ بس نیکی کرتے رہو۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ آہستہ آہستہ نیکیوں کی عادت بنتی جائے گی اور تم کسی حد تک خود کو اطمینان دلا سکو گے۔''

اس کی بات میں نے اپنے ذہن میں بٹھالی تھی اور اس نوجوان کو اسی لیے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ ارادہ یہی تھا کہ اس سے معلوم کر کے اس کی پرابلمز حل کرنے کی کوشش کروں گا۔ شاید خدا کو پسند آجائے۔ میرا گھر دیکھ کر بھی وہ حیران ہو گیا تھا۔ ''یہ آپ کا اپنا گھر ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''ہاں بھائی! یہ میرا ہی گھر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''چلو اب اتر جاؤ۔''

میں اسے گھر کے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ اس کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے ایسا گھر، ایسا فرنیچر وغیرہ پہلی بار دیکھا ہو۔ بہت حیران ہو رہا تھا۔
ملازم موجود تھا۔ میں نے اسے آواز دے کر بلایا اور اس سے کہا۔ ''دیکھو صاحب کے لیے میرا ایک جوڑا نکال کر لے آؤ۔ یہ پانی میں گر گئے تھے ان کے کپڑے خراب ہو گئے ہیں۔''

ملازم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔ ''ابھی نہیں بعد میں سنوں گا۔ پہلے کپڑے بدل لو۔ تمہارے چکر میں میرے کپڑے بھی بھیگ گئے ہیں۔ میں بھی چینج کر کے آتا ہوں اور یہیں بیٹھے رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ میں جاؤں اور تم یہاں سے پھر سمندر کی طرف بھاگ لو۔''

''نہیں سر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔'' وہ ہنس پڑا۔
میں اپنے کپڑے بدلنے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ واپس آیا تو اس نے بھی کپڑے بدل لیے تھے۔ وہ خاصا معقول نوجوان دکھائی دے رہا تھا۔ ملازم نے عقلمندی کی تھی۔ اس نے چائے بنا کر سامنے رکھ دی تھی۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے بھی اپنی پیالی اٹھالی تھی۔
''ہاں اب بتاؤ نام کیا ہے تمہارا؟'' میں نے پوچھا۔
''میرا نام شاہد ہے۔'' اس نے بتایا۔
''رہتے کہاں ہو؟''
''کہیں نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔
''یہ کیا بات ہوئی، کوئی تو ٹھکانا ہوگا۔''
''اپنے ایک دوست کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ ملک سے باہر جا چکا ہے۔ والدین کا بہت پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی موت کے بعد ایک رشتے دار نے ترس کھا کر رکھ لیا تھا لیکن وہ بھی کب تک رکھتا۔ اس نے بھی ایک دن کہہ دیا کہ میں اپنا ٹھکانا تلاش کرلوں۔ بس وہاں سے بھی نکل گیا۔''
''اور کوئی کام؟''
''جی ہاں کام بھی کرتا رہا ہوں۔ ایک بڑے سپر اسٹور پر تھا لیکن وہ اسٹور بھی بند ہو گیا۔ اس کے بعد تک کچھ بھی نہیں ہو سکا ہے۔ نہ جانے ہم جیسے لوگ اس دنیا میں کیوں پیدا ہو جاتے ہیں۔''
''مجھے اس پر ترس آنے لگا تھا۔ اچھا خاصا خوش شکل نوجوان تھا لیکن تقدیر خراب تھی۔ کچھ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں ان کے پاس سوائے محرومیوں کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔''
''اگر تمہیں کوئی جاب مل جائے تو کرو گے؟''
''کیا فائدہ۔'' اس کے لہجے میں بلا کی مایوسی تھی۔
''کیوں فائدہ کیوں نہیں ہے؟''
''جناب! میں نے تو مرنے کی ٹھان رکھی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اب کوئی جاب ملے یا نہ ملے کیا فرق پڑتا ہے؟''
''تم ایک بے وقوف انسان ہو۔'' میں نے کہا۔ ''یہ دیکھو کہ تم تو مرنے جا رہے تھے لیکن ابھی تک زندہ ہو۔ اس کا کیا مطلب ہوا۔ یہی نا کہ قدرت تمہیں زندہ رکھنا چاہتی ہے اسی لیے بے وقوفی کی بات مت کرو۔ تم مجھے اپنا ہمدرد سمجھو اور جو کہتا ہوں کرتے جاؤ۔''
''آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے میں اس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔''
''کوئی احسان نہیں کیا۔ یہ میرا فرض تھا جو ادا کیا ہے اب جاب کی بات کرو۔ کچھ تعلیم بھی حاصل کی ہے؟''
''جی جناب گریجویٹ ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''ایسے حالات کے باوجود میں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میں کوئی پروفیشنل تعلیم حاصل نہیں

کرسکا لیکن پڑھا لکھا ضرور ہوں۔‘‘
’’اتنا ہی بہت ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’یہ سمجھ لو کہ تمہاری جاب ہوگئی۔‘‘
’’اب میں کس طرح شکریہ ادا کروں۔‘‘ وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔ ’’آپ میرے محسن ہیں۔ اب ایک پرابلم اور بھی ہے۔‘‘
’’میں سمجھتا ہوں کہ تم کس پرابلم کی بات کرو گے۔ یہی نا کہ تمہارے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔‘‘
’’جی...... جی ہاں۔‘‘ اس نے اپنی گردن ہلائی۔ ’’میں یہی کہنے والا تھا۔‘‘
’’اس کی فکر مت کرو۔ میں نے پہلے ہی یہ سوچ لیا تھا کہ تم کو اسی گھر میں رکھوں گا۔ اپنا چھوٹا بھائی بنا کر کیوں کہ میرا ابھی اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اب تم مل گئے ہو۔ کیا تم اس گھر میں میرا چھوٹا بھائی بن کر رہنا پسند کرو گے؟‘‘
اتنا سنتے ہی وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور بھائی جان کہتا ہوا مجھ سے آ کر لپٹ گیا۔ وہ رو رہا تھا۔ اس کے ساتھ میں بھی رو رہا تھا۔ ایک اجنبی ذرا سی دیر میں اپنا بن گیا تھا۔
’’اب تم اس گھر میں اسی طرح رہو گے جس طرح میں رہتا ہوں۔ یہ سارے ملازم اب تمہارے ملازم بھی ہوں گے لیکن تم کو جاب ہر حال میں کرنی ہوگی۔‘‘
’’بھائی جان! جب آپ جیسا مہربان بھائی حکم دے تو میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔‘‘
میں نے اسی وقت اپنے ملازم کو بلا کر اس سے کہا کہ چھوٹے صاحب کے لیے ایک کمرا تیار کردو۔ یہ اب ہمارے ساتھ ہی رہیں گے۔ پورے گھر کو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی لیکن میں خوش تھا، بہت خوش۔ زندگی میں پہلی بار ثواب حاصل کرنے کا موقع ملا تھا۔
میں نے اس کے بارے میں ملازمین کو ہدایات دیں اور اسے آرام کرنے اس کے کمرے میں بھیج دیا۔ بے چارہ نہ جانے کب سے بے آرام ہوگا۔ اس کے بعد خود بھی آرام کرنے اپنے کمرے میں چلا گیا۔
شام کی چائے ہم نے ایک ساتھ پی تھی۔ وہ کسی بچے کی طرح خوش ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے خدا کے فضل سے اس گھر میں جو کچھ بھی تھا۔ وہ اس نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔
’’شاہد۔‘‘ چائے پینے کے دوران میں نے اس سے کہا۔ ’’اب میں تمہیں کچھ سمجھانا چاہتا ہوں۔‘‘
’’بھائی جان بتائیں۔ میں سن رہا ہوں۔‘‘
’’دیکھو، میں نے اس گھر میں ایک ٹائم ٹیبل سیٹ کر رکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اس پر عمل کرو گے۔‘‘
’’میں نہیں سمجھا بھائی جان۔‘‘ وہ کچھ پریشان ہونے لگا تھا۔
’’اوہو، پریشان مت ہو۔‘‘ میں ہنس پڑا۔ ’’یہی ایک وقت پر کھانا، ناشتا وغیرہ۔ سوجانا چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔‘‘
’’ارے بھائی جان! میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ نہ جانے آپ کیا کہیں گے۔ میں تو خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ اس لاابالی اور آوارہ گردی کی زندگی سے چھٹکارا ملے۔ آپ جو کہہ رہے ہیں وہ میرے لیے میری بھلائی کا سبب ہے۔ میں دل و جان سے اس پر عمل کروں گا۔‘‘
’’اوکے اب تم تیار ہو کر آجاؤ۔ تم کو آج ہی سے اپنی جاب اسٹارٹ کردینی ہے۔ آج تم میرے ساتھ چلو گے۔ کل سے تمہیں خود ہی جانا ہوگا۔‘‘
میرا جو کام تھا اس میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی تھی۔ میں ایک وکیل ہوں۔ اس کو اپنے ساتھ نہیں لگا سکتا تھا۔
میں نے اس کے لیے کئی نئے جوڑوں کا رات ہی کو بندوبست کردیا تھا۔ اس کے سائز کے جوتے نہیں آسکے تھے۔ اس کے علاوہ سب کچھ تھا۔ وہ بھی تھوڑی سی دیر میں تیار ہو کر آچکا تھا۔ میں نے اس کو اپنے ساتھ اپنی گاڑی میں بٹھایا اور اس فرم میں لے گیا جو میرے ایک دوست کی فرم تھی۔ میں نے اس دوست سے پہلے ہی بات کر رکھی تھی۔ شاہد کو اس فرم میں چھوڑ کر میں اپنے دفتر آگیا۔
شام کو ہم پھر ایک ساتھ ہوئے۔ وہ دفتر سے سیدھا گھر ہی آگیا تھا۔ اب ملازم بھی اس کو قبول کر چکے تھے۔ میں اس کو دیکھ رہا تھا۔ دو دن پہلے اس کا چہرہ کیسا تھا۔ کتنا پریشان حال۔ الجھے بال، جاگی ہوئی آنکھیں لیکن اب وہ بہت معقول اور خوش حال گھرانے کا ایک فرد دکھائی دے رہا تھا۔ بے فکری بھی انسان کو کیا بنا دیتی ہے۔
اس رات کھانے کی میز پر میں نے اس سے کہا۔
’’شاہد کیا تمہیں بائیک چلانی آتی ہے؟‘‘
’’ہاں بھائی جان میں نے اپنے ایک دوست کی بائیک پر پریکٹس کر رکھی ہے۔‘‘ اس نے بتایا۔
’’ٹھیک ہے۔ کل تمہارے لیے بائیک آجائے گی۔ تم اس پر دفتر آیا جایا کرنا۔‘‘

وہ خوشی سے نہال ہوگیا تھا۔

دوسرے دن میں نے اس کے لیے ایک نئی بائیک خرید کر دے دی۔ اس کے اب ٹھاٹھ ہی الگ ہوگئے تھے۔ نیا لباس بائیک، پرفیوم، ایک اچھی جاب، رہنے کے لیے ایک شاندار گھر اور کیا چاہیے؟ میں جب اپنے دوست کو یہ سب بتایا کرتا تو وہ پریشان بھی ہوتا اور خوش بھی ہوتا۔ یار ایسا نہ ہو کہ اس قسم کا ثواب تمہارے گلے پڑ جائے۔“

”بھائی تم ہی نے مشورہ دیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”میں نے یہ کہا تھا کہ تم لوگوں کی مدد کیا کرو۔ یہ نہیں کہا تھا کہ کسی کو اٹھا کر اپنے گھر میں رکھ لو اور وہ بھی یہ جانے بغیر کہ وہ کون ہے کیسا ہے، اس پر اندھا اعتماد کرلو۔“

”اب تو وہ گھر میں رہ رہا ہے۔ ویسے تم چاہو تو آکر اس سے مل لو۔“ میں نے کہا۔ ”تم کو اندازہ ہوجائے گا۔“

”ٹھیک ہے میں کل ہی آتا ہوں۔“

میرا دوست دوسرے دن آگیا تھا۔ شاہد گھر پر ہی تھا۔ میں نے شاہد کا تعارف یہ کہہ کر کروایا تھا کہ یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ دوست کو تو سب کچھ معلوم تھا۔ وہ بہت گہری نگاہوں سے شاہد کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کا تجزیہ کررہا ہو۔ اس نے شاہد سے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ اس سے سوالات کیے میں اس دوران اس کے تاثرات کا اندازہ لگاتا رہا تھا پھر جب شاہد معذرت کرکے اپنے کمرے میں چلا گیا تو دوست نے کہا۔

”سنو! اگر کسی طرح اس سے پیچھا چھڑا سکتے ہو تو چھڑا لو۔ نہ جانے کیوں میری چھٹی حس یہ کہہ رہی ہے کہ یہ ایک خطرناک نوجوان ہے۔“

”ارے یار! ایسا نہیں ہے جو آدمی خطرناک ہو۔ وہ اپنی جان دینے کی کوشش نہیں کرتا۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے علاوہ تم اس کا چہرہ تو دیکھو کتنا معصوم سا ہے۔“

”ایسے ہی لوگ خطرناک ہوتے ہیں۔“ دوست بولا۔ ”ویسے تمہاری مرضی۔“

اس کی باتوں نے خود مجھے بھی شبہہ میں ڈال دیا تھا۔ مجھے اس کی ہمدردی میں شاید اس حد تک نہیں جانا تھا کہ اس کو اٹھا کر گھر ہی لے آیا لیکن جب اس کا رویّہ دیکھتا تو ایسی کوئی بات محسوس نہیں ہوتی۔ بہرحال میں نے اپنی قیمتی چیزیں اپنے لاکر میں رکھ دی تھیں۔ وہ اگر چوری کا ارادہ بھی کرتا تو یہی ہوسکتا تھا کہ گھر کی بھاری چیزیں اٹھا کر لے جائے جو اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

ایک دن میں نے اسے ایک ایسے آدمی کے ساتھ دیکھ لیا جس کو میں بہت پہلے سے جانتا تھا۔ وہ ایک نمبر کا بدمعاش تھا۔ میرا پروفیشن ایسا تھا کہ مجھے اس قسم کے بدمعاشوں سے واسطہ پڑتا ہی رہتا تھا۔ میں ایک وکیل تھا اور وہ بھی کرائم وکیل لیکن میں نے کبھی غلط کیس نہیں لیا اور نہ کبھی کسی غلط آدمی کا کیس لڑا۔

میرا ایک دوست ہے خرم خان، وہ پولیس کا ایک بڑا آفیسر ہے ایک دن میں اس کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے ماتحت ایک آدمی کو لے کر آئے۔ یہ وہی آدمی تھا۔

"سرجی اس نے زبان کھول دی ہے۔" ایک پولیس والے نے بتایا۔ "اس نے بتا دیا ہے کہ اس نے اسلحہ کہاں چھپایا ہوا ہے۔"

"تو پھر جاؤ برآمد کرواؤ۔"

"جی.....جی۔"

پولیس والے اس آدمی کو لے کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد خرم خان نے میری طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔ "ایک نمبر کا بدمعاش ہے۔ کئی قتل کر چکا ہے۔ پکڑا بھی جا چکا ہے لیکن اتنا چالاک ہے کہ ثبوت رہنے نہیں دیتا۔ اس بار ایک دوسرے کیس میں ہمارے پاس آیا ہے۔ اب اسلحے کی برآمدگی ہو جائے تو مضبوط کیس بن جائے گا۔"

"اسلحے کا کیس ہے تو لمبی سزا ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا بتایا جائے۔" خرم کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ "ہمارے یہاں زیادہ تر مجرم سیاسی ہوا کرتے ہیں۔ ذرا سی دیر میں ان کے لیے فون آنے لگتے ہیں یا کوئی طرم خان خود ان کو چھڑانے چلا آتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا کیس اتنا کمزور بنایا جاتا ہے کہ عدالت انہیں بری کر دیتی ہے۔"

اسی وجہ سے اس آدمی کا چہرہ مجھے یاد رہ گیا تھا۔ اس دن جب میں نے شاہد کو اس کے ساتھ دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ دونوں ایک شاپنگ پلازہ کے سامنے والے ہوٹل سے باہر نکل رہے تھے۔ جب کہ میں اس پلازہ میں کچھ لینے گیا ہوا تھا۔ شاہد نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں اسے دیکھ کر فوراً آڑ میں ہو گیا تھا۔

دونوں کے درمیان بے تکلفی معلوم ہو رہی تھی۔ ہنستے ہوئے باہر نکلے اور ہنستے ہوئے ایک طرف چلے گئے۔ جب کہ میں دیکھتا رہ گیا تھا۔

اس شام جب ہم کھانے کی میز پر ایک ساتھ ہوئے تو میں نے یوں ہی سرسری طور پر اس سے پوچھا۔ "آج کیا آفس کے بعد کہیں چلے گئے تھے؟"

"کیوں بھائی جان کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"آج تم دیر سے جو آئے ہو اسی لیے پوچھ رہا ہوں۔"

"جی ہاں۔" وہ سنبھل کر بولا۔ "میں ایک دوست سے ملنے چلا گیا تھا۔"

اسے کریدنا فضول تھا کہ وہ کس دوست کے پاس گیا تھا کیوں کہ میں اس کے دوست کو دیکھ چکا تھا۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ میں نے اس پر نظر رکھنی شروع کر دی۔ ایک دن جب میں نے اپنے دوست کو یہ سب بتایا تو وہ بھڑک اٹھا۔ "میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس پر بھروسا مت کرو۔ وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔ تم اس کو گھر سے جانے کے لیے کہہ دو۔"

"یار! میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کس طرح کہوں۔ اسے میں نے خود ہی پناہ دی ہے اور خود ہی چلے جانے کو کہوں؟"

"تمہاری مرضی اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو کسی نقصان کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

میں نے اس کی باتوں پر اب سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا۔ وہ شاید ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ایک تو میں اس کو ایک غلط انسان کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا راتوں کو دیر سے آنا بھی مجھے کھٹکنے لگا تھا۔ ایک بار اس دوست نے جس کے ہاں اسے جاب دلوائی تھی اس نے فون کر کے بتایا کہ شاہد بہت ناغے کرنے لگا ہے۔ وہ دفتر سے غیر حاضر ہوا کرتا ہے اور کبھی کبھی بغیر کچھ بتائے کہیں چلا جاتا ہے۔ اس کی یہ سرگرمیاں قابل اعتراض تھیں کیوں کہ اس نے تو کہا تھا کہ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں پھر وہ کہاں چلا جاتا تھا۔

میں نے جب اسے منع کیا کہ وہ راتوں کو دیر تک باہر نہ رہا کرے اس وقت اس نے وعدہ کیا تھا کہ ایسا نہیں ہوگا کچھ دنوں تک ایسا ہی رہا۔ اس کے بعد اس کا پھر وہی معمول ہو گیا۔

میں نے بہت سوچا۔ کیا کیا جائے۔ ویسے تو میں اس کا پابند نہیں تھا لیکن ایک جھجک سی ہو رہی تھی۔

ایک دن میرے ملازم نے مجھ سے کہا۔ "صاحب جی ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"ہاں کہو۔"

"صاحب کل میں اتفاق سے شاہد صاحب کے کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔ مجھے وہاں سے برتن لینے تھے تو میں نے ان کے پاس ایک ایسی چیز دیکھی کہ میں ڈر کر جلدی سے باہر آ گیا۔ شاہد صاحب کو پتا بھی نہیں چلا ہوگا کہ کوئی کمرے میں آیا تھا۔ ان کی توجہ کہیں اور تھی۔"

"ایسا کیا دیکھ لیا تم نے؟" میں نے پوچھا۔

"ان کے پاس ایک پستول تھا صاحب، وہ اس کی دیکھ بھال کر رہے تھے یا شاید اس میں گولیاں ڈال رہے

تھے۔"

"کیا کہہ رہے ہو۔" میرا سر چکرانے لگا تھا۔ میرے دوست کے خدشات درست ہوتے جارہے تھے۔

"ہاں صاحب جی! اسی لیے آپ کو بتارہا ہوں۔ کسی وقت بھی کچھ ہوسکتا ہے۔" اس نے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ اب تم اس سے کچھ مت کہنا۔"

"معاملہ خراب ہوتا جارہا تھا۔ اس کا اب یہاں رہنا میرے لیے خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن سوال پھر وہی تھا کہ کس طرح اس کو نکالا جائے۔ اس وقت خدا نے میری مدد کی۔ میری پھوپی کا فون آگیا۔ وہ کچھ دنوں کے لیے بچوں کے ساتھ کراچی آرہی تھیں۔

اتفاق سے جس دن ان کا فون آیا۔ اس وقت ہم کھانے کی میز پر ہی تھے۔ شاہد نے سمجھ لیا تھا کہ اس گھر میں کوئی آرہا ہے۔ فون سننے کے بعد میں نے ملازم سے کہا۔ "دو کمرے ٹھیک کردو۔ پھوپی اور بچے آرہے ہیں۔"

شاہد نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "بھائی جان کوئی آرہا ہے کیا؟"

"ہاں، میری پھوپی اور ان کے بچے آرہے ہیں۔"

"بھائی جان! اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ایک بات کہوں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں ضرور کہو۔"

"بھائی جان! اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ دنوں کے لیے اپنے دوست کے یہاں چلا جاؤں؟" اس نے وہ بات خود کہہ دی تھی جو میں کہنا چاہتا تھا پھر بھی میں نے اپنے تاثرات چھپاتے ہوئے کہا۔ "نہیں تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ میری پھوپی تمہیں کچھ نہیں کہیں گی۔"

"نہیں بھائی جان! بہتر یہی ہوگا کہ میں کچھ دنوں کے لیے چلا جاؤں۔"

"اب تم کہہ رہے ہو تو میں تمہیں روک تو نہیں سکتا لیکن تمہیں پھر واپس آنا ہوگا۔"

"ہاں...... ہاں میں واپس آجاؤں گا۔"

وہ دوسرے دن چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کا دکھ تو تھا لیکن یہ اطمینان بھی تھا کہ میں کسی حادثے سے بچ گیا تھا۔ اس کی اصلیت سامنے آگئی تھی۔ دو دنوں کے بعد پھوپی بھی آگئی تھیں۔ گھر میں ہلا گلا ہوگیا تھا۔ میں نے ملازمین کو منع کردیا تھا کہ وہ پھوپی سے شاہد کا کوئی ذکر نہ کریں۔

دو دن کے بعد پھر اسی ملازم نے ایک پریشانی والی بات بتادی۔ "صاحب وہ جو شاہد صاحب ہیں نا وہ گئے نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے صاحب کہ وہ اس گھر کے چکر لگا رہے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "میں نے خود انہیں کئی بار دیکھا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ اس گھر کی نگرانی کررہے ہیں۔ بلکہ کل رات میں کسی کام سے چھت پر گیا تھا تو میں نے ان کو گیٹ کے سامنے والے درخت کے پاس دیکھا۔ اس وقت رات کے بارہ سوا بارہ بج رہے تھے صاحب۔"

یہ سن کر میں واقعی پریشان ہوگیا۔ کیا چاہتا تھا وہ۔ کیوں اس گھر کی نگرانی کررہا تھا۔ کوئی نہ کوئی بات تو اس کے دل میں ضرور ہوگی۔ میں نے تو اس کے ساتھ نیکی کی تھی۔ پھر وہ نیکی کا کیا صلہ دینا چاہتا تھا۔

میں نے سوچا کہ کیوں نہ پولیس کو رپورٹ کردوں لیکن کس بنیاد پر۔ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا کہ وہ میرے گھر کے گیٹ کے سامنے کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ وہ کوئی بھی جواز پیش کرسکتا تھا اسی لیے میں وقت کا انتظار کرتا رہا۔

ایک رات وہ وقت آہی گیا۔ پھوپی کچھ دنوں رہ کر واپس جاچکی تھیں۔

عام طور پر میرے جو ملازم ہوتے ہیں۔ وہ رات کو اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ یعنی چوبیس گھنٹوں کا ملازم نہیں ہے۔ رات دس بجے کے بعد گھر میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہوتا۔ اس رات بھی کوئی نہیں تھا۔ جب وہ واقعہ ہوا۔

رات کا ایک بجا تھا۔ میں ڈرائنگ روم میں کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔ میں نے دروازے وغیرہ بند کررکھے تھے کہ اچانک دروازہ دھڑ سے کھلا اور شاہد دوڑتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ "چلیں اٹھیں جلدی۔ اپنے کمرے میں جائیں جلدی۔"

مجھ پر تو سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں کیا کہوں۔

"جلدی کریں جلدی۔ ٹائم نہیں ہے۔"

میرا بیڈ روم ڈرائنگ روم کے برابر ہی میں تھا۔ میں اس وقت بے پناہ خوف زدہ تھا۔ میں ڈر کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کرلیا تھا۔ دل کی یہ حالت تھی جیسے وہ سینہ توڑ کر باہر آجائے گا۔

اچانک باہر سے کچھ آوازیں آنے لگیں۔ شاید اس نے اپنے ساتھیوں کو بھی بلا لیا تھا۔

پھر گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کئی گولیاں چلیں۔ ایک بھیانک چیخ سنائی دی۔ اس کے بعد سناٹا ہو گیا۔ نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد کمرے کے دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی شاہد کی آواز آئی ”دروازہ کھولیں بھائی جان، دروازہ کھولیں۔ سب ٹھیک ہے کھولیں دروازہ۔“

”کیا چاہتے ہو تم، چلے جاؤ میں پولیس کو فون کر رہا ہوں۔“

”ہاں ہاں پولیس کو فون کر دیں لیکن دروازہ بھی کھول دیں۔“

اس کا لہجہ ایسا نہیں تھا کہ وہ مجھے کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ پھر بھی میں نے احتیاط کے طور پر اپنی الماری سے پستول نکال کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد دروازہ کھولا۔ حیرت انگیز منظر تھا۔ شاہد کا لباس خون میں بھرا ہوا تھا۔ وہ زخمی معلوم ہوتا تھا۔ ڈرائنگ روم کے فرش پر ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ خون چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔

”کیا آپ اس آدمی کو پہچانتے ہیں؟“ شاہد نے پوچھا۔

میں حیران ہو کر آگے آیا۔ وہ زمان تھا۔ ایک خطرناک بدمعاش، میں نے اس کو ایک بار سزا دلوائی تھی۔ اس نے مجھے مار دینے کی دھمکی دی تھی۔ بہت دن ہو گئے تھے۔ میں اس کو بھول ہی گیا تھا۔ اب اس کی لاش دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔

”بتائیں کیا آپ اسے پہچانتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔ ”یہ آپ کو مارنا چاہتا تھا لیکن اس وقت مجھے کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ پلیز ایمبولینس کو فون کر کے مجھے اسپتال پہنچا دیں۔ میں ساری کہانی بتا دوں گا۔“

اس نے خود کو گرنے سے بچانے کے لیے دیوار کا سہارا لے لیا تھا۔

میں نے ایمبولینس کو فون کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی پولیس بھی آ گئی تھی۔ اسے فوری طور پر اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ جہاں اس نے جو بیان دیا اس نے میری حالت غیر کر دی۔ اس نے کہا تھا۔ ”بھائی جان! میں کوئی اچھا آدمی نہیں تھا اِدھر اُدھر بھٹکنے والا کیسا ہو سکتا ہے لیکن جب سے آپ نے مجھے مرنے سے بچایا۔ میں نے خود کو تبدیل کر لیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں زندگی بھر آپ کا وفادار رہوں گا۔ پھر ایک دن میں نے خرم خان کو آپ کے پیچھے دیکھ لیا۔ اس کے ارادے اچھے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ میں اس کو جانتا تھا۔ اب میرا مشن یہ تھا کہ کسی طرح بھی ہو۔ آپ کی حفاظت کی جائے اسی لیے میں نے ایک اور بدمعاش سے پستول لے لیا۔ صرف اس لیے اس کے پاس گیا تھا۔ اس کے بعد میں آپ کے گھر سے اپنے دوست کے یہاں چلا آیا۔ میں اپنے شبہہ کی تصدیق چاہتا تھا کہ کیا واقعی خرم خان آپ کا نقصان چاہتا ہے یا یہ میرا وہم ہے لیکن اندازہ ہو گیا کہ وہ واقعی آپ کے پیچھے ہے۔“

”یہ سب تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”صرف اس لیے کہ آپ کہیں پریشان نہ ہو جائیں۔“ اس نے کہا۔ ”میں خاموشی سے آپ کی نگرانی کرتا رہا۔ آج رات میں نے اسے جب آپ کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ کھیل ختم ہونے والا ہے۔ اسی لیے میں بھی گھر میں داخل ہو گیا۔ اس وقت آپ ڈرائنگ روم میں تھے۔ میں نے آپ کو زبردستی آپ کے کمرے میں بھیج دیا۔ اسی دوران خرم خان بھی ڈریسنگ روم میں داخل ہو چکا تھا۔ اس نے مجھ پر گولی چلا دی اور جواب میں، میں نے بھی اس پر گولی چلا دی۔ وہ تو اسی وقت ختم ہو گیا اور اب میں ختم ہونے جا رہا ہوں لیکن مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں نے کسی حد تک اپنے چھوٹے بھائی ہونے کا حق ادا کر دیا ہے، اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔“

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور اپنی گردن ڈال دی۔ وہ مر چکا تھا۔ میرا بھائی مر گیا تھا۔ وہ مر گیا تھا جس کے لیے کیسے کیسے خیالات میرے ذہن میں آرہے تھے۔ وہ ایک آوارہ گرد تھا۔ جو مرنے جا رہا تھا لیکن میں اسے بچا کر لے آیا تھا اور اس نے اپنی جان دے کر میرے احسان کا بدلہ اتار دیا تھا۔

میرے دوست کو جب یہ سب معلوم ہوا تو اس نے صرف اتنا کہا۔ ”انسان کو سمجھنا واقعی بہت مشکل ہے۔ نہ جانے کون کس بھیس میں ہمارے سامنے آتا ہے۔“

وہ مر گیا لیکن اس کی یادیں ابھی تک میرے ساتھ ہیں۔ کبھی کسی کے بارے میں اندازہ لگانے میں جلدی نہیں کرنا چاہیے۔



بے نشاں

محترم معراج رسول
السلام علیکم

یہ کردار خود میں ایک بڑی کہانی ہے۔ اس بے چاری نے محبوب کی خاطر سب کچھ چھوڑا مگر اسے کیا ملا ہے وہ بے بس تھی۔ شوہر کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی۔ لوگ کہتے ہیں اس نے اپنی زندگی برباد کرلی تھی مگر یہ غلط ہے۔ اس نے تو اپنی عاقبت بنا لی تھی۔

ماہ رخ ارباب
(ملیر، کراچی)

اس دن والدہ کے پاس ایک خاتون آئی بیٹھی تھیں جو کبھی کبھار آتی تھیں مگر کافی دیر بیٹھتیں یہ سکینہ خالہ تھیں جن کے چہرے پر گودنے کے ہرے ہرے نشان اکثر مجھے اچنبھے میں ڈالتے۔ اس دن آئیں تو اداس سی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد بڑی بہن کے استفسار پر امی نے بتایا کہ بچوں کو یاد کر رہی تھیں۔ ان دنوں عقل کچھ اتنی زیادہ نہیں تھی مگر خود کو عقل کل سمجھنے کا شوق ضرور تھا۔

”امی بچے تو کبھی ان کے گھر میں دیکھے نہیں کون سے بچے۔“ میں نے کچھ حیرت سے کہا۔

امی ہنس دیں ایک حزنیہ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر ظاہر

ہوئی۔ ”بچے تو ڈھیروں ڈھیر چھوڑ کر آئی ہے بدنصیب۔“
”کیا؟ چھوڑ آئی ہے؟“ میرا منہ کھل گیا اب اپنی مختصر سی عمر میں ایسا کہیں نہ دیکھا تھا، والدہ بھی شاید دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھیں اس لیے بتانے لگیں۔ انہوں نے سکینہ خالہ کے بارے میں جو کچھ بتایا اسے میں قارئین کی دلچسپی کے لیے کہانی کے انداز میں بیان کررہی ہوں۔

☆......☆

باہر ایک مانوس سی ہلچل کا احساس ہوا تو وہ جلدی سے سوئی تمیس میں پروکر دروازے پر پہنچی۔ سجاول نے کندھے پر دھرا گھاس کا گٹھڑ زمین پر پٹخا اور ایک گہری نگاہ کمرے کے دروازے پر ڈالی جہاں گہری سرخ چنری سے جھانکتا ہوا اس کا ملیح چہرہ تھا جسے دیکھ کر اس کی دن بھر کی تھکان اتر گئی۔

اس نے گٹھڑ میں بندھا صافہ کھول کر اسے زور سے جھاڑا اور قریب رکھی چار پائی پر جا بیٹھا۔

”ادی بھاگی جائے وائے کا کچھ بندوبست ہے کیا؟“ اس نے گھر کی مالکن کو آواز لگائی۔

”ہاں ادا کیوں نہیں۔“

مہمان نواز خاتون نے فوراً جواں سال بہو کو آواز دی اور وہ دروازے سے لگی کھڑی شاید اسی آواز کی منتظر تھی۔ لہرا کر ایک ادا سے سلگتے انگاروں پر دھری گڑ کی بنی میٹھی چائے ایک بڑے سے پیالے میں چھانی اور نوجوان ملازم کو لا تھمائی۔

☆......☆

صحرائے تھر کے نزدیک واقع سندھ کے اس شہر میں جہاں پانی اور اشیائے ضرورت کی فراوانی بھی صرف ان ساہو کاروں کے لیے تھی جو سرحد کے آر پار سامان کی ترسیل کے کاروبار سے وابستہ تھے۔

درشن ناتھ کے مال مویشی اور کاروبار دن دگنی رات چوگنی ترقی کررہے تھے جسے اکلوتے بیٹے کے ساتھ مل کر سنبھالنا مشکل ہوتا جارہا تھا۔

پھر ایک دن اس کی دکان پر وہ پہنچا جو بلحاظ صورت شکل اس علاقے کے لوگوں سے الگ ہی دکھتا تھا۔ اس کی بے تحاشہ گوری رنگت، سنہرے بال اور بلوری آنکھیں جو دھوپ چھاؤں میں رنگ بدلتیں۔ پہلی نظر میں کسی کو بھی چونکا دیتیں اور جب صاف لہجے میں سندھی بولتا تو کوئی یقین نہ کرتا کہ یہ اس خطے کی پیداوار نہیں ہے۔ بہرحال اس کی چرب زبانی اور مشقت کرنے کی عادت نے جلد ہی درشن کو اس کا گرویدہ بنادیا اور وہ اس حد تک اس پر بھروسا کرنے لگا کہ جانوروں کی رکھوالی کا کام اس کے ذمے کردیا۔ جلد ہی گھر کے چھوٹے موٹے کام جو درشن اور اس کے نوجوان بیٹے کیشو کی کاروباری مصروفیت کے سبب رکے رہتے اب سجاول کے دم سے فوراً ہونے لگے۔ گھر کی عورتوں میں بھی اس نے اپنا بھروسا قائم کرلیا اور زنانے میں آزادانہ آمدورفت کرنے لگا۔

انسان کائنات کی وہ متزلزل شے ہے جس کے رویوں کے بارے میں کوئی بھی خیال قائم کرنا اور حتمی پیش گوئی کرنا ناممکن ہے۔ کون سوچ سکتا تھا کہ کیشو جیسے مرد دانا کی بیوی چار بچوں کی ماں جسے ہر طرح کا عیش و آرام میسر تھا، سجاول کے تیر نظر سے گھائل ہوجائے گی جو عمر میں بھی اس سے زیادہ نہیں تو دس سال ضرور چھوٹا تھا۔

اور وہ اگر مائل بہ کرم ہوئی تو اس کا الزام سجاول کے خوبرو نین نقش کو دیا جاسکتا تھا مگر ”کیسر“ میں بظاہر ایسا کوئی گن نہ تھا جو سجاول کو اس کی جانب راغب کرتا سوائے اس کی دولت کے۔ بیشک وہ پینتیس سال کی عمر میں بھی ایک سڈول جسم کی عورت تھی مگر یہ ایسی کوئی خوبی نہ تھی جو کسی اور لڑکی میں نہ ملتی۔ سو یہ عجوبہ روزگار عشق، اگر اسے عشق کہا جائے، زور و شور سے جاری تھا اور جاری ہی رہتا اگر کیشو کو اپنی بیوی سے بے رخی اور بے توجہی کی شکایت نہ ہونے لگتی۔ وہ ایک جہاندیدہ بیوپاری تھا جس کا سارا دن لین دین ہی خوب جیسے چنٹ ہر دو زن .... سے رہتا تھا، اپنی بیوی کے قدموں میں آئے پھیر کو کیسے نہ پہچانتا۔

وہ ابتدائے اگست کا ایک ابر آلود دن تھا، تھرواسیوں کی بے تاب نگاہیں بار بار آسمان پر جے کھڑے بادلوں کا طواف کررہی تھیں۔ مون سون کی انہی بارشوں پر ان کے سال بھر کے کاروبار زندگی کا دارومدار تھا۔ کیشو ان دنوں گھر میں ہی تھا لہٰذا سجاول کا آنا جانا کچھ کم ہوچکا تھا لیکن اس دن منڈی سے کچھ ادویات کی خریداری کا حساب کرنا تھا۔ بیل گاڑی پر لدا سامان گھر سے کچھ فاصلے پر بنے کمرے میں پہنچا کر بیلوں کو ان کے استھان پر باندھ کر وہ اندر آیا۔ ایک کونے میں بنے چھوٹے سے چبوترے پر پانی سے بھری بالٹی موجود تھی وہ وہیں بیٹھ گیا۔

”ادی صابنڑ آ ہے چھا؟ بھبھوت تھیو پیو آ ہیاں۔“

ابھی اس نے آواز لگائی ہی تھی کہ کیسر کسی کونے سے برآمد ہوئی اور صابن زمین پر رکھنے کی بجائے اس کے ہاتھ میں تھما گئی۔ کیشو جو سجاول ہی کی طرف متوجہ تھا اپنی بیوی کی پھرتی اور چہرے پر چمکتی ہوئی شرمیلی مسکان سے اچنبھے میں

پڑ گیا۔ ان کی عورتیں لمبا سا گھونگھٹ کاڑھتی تھیں لیکن اس کا گھونگھٹ اتنا اونچا تھا کہ چہرہ جھلک دکھلا رہا تھا۔

کیشو مضطرب ہو اٹھا۔ اس وقت تو سجاول سے حساب کتاب کرکے اسے بھیج دیا مگر ذہن میں الگ ہی کھچڑی پک رہی تھی جسے بھگار رات کو کیسر سے ہوئی گفتگو نے لگایا۔ وہ اس وقت بچوں کو سلا کر اپنی صندوقچی کھولے کچھ کھٹر پٹر کر رہی تھی۔

''ادھر آ یہاں بیٹھ میرے پاس۔''

کیشو نے کھسک کر پلنگ پر جگہ بنائی اور اپنی بات کے ردعمل میں کیسر کے چہرے پر نمودار ہوئی ناگواری کو بغور دیکھا۔

''آتی ہوں بس یہ زیور دیکھ رہی تھی، دھاگا میلا پڑ گیا ہے۔ کل سجاول کو تھماؤں گی کہ شہر سے صاف کروالائے۔''

''سجاول اب گھر میں نہیں آئے گا، اسے ہم نے دکان پر رکھ لیا ہے، وہاں اس کی ضرورت ہے۔'' کیشو نے اطمینان سے اس کی سماعتوں پر بم پھوڑا۔

''کیا؟ وہ نہیں آئے گا؟''

''یعنی یہاں ہم پھر سے ۔۔۔ ہر کام کے لیے تمہاری راہ دیکھیں گے۔'' کیسر کا لہجہ یکدم تیز ہوا۔ کیشو کو اس سے اس درجہ شدید ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ نتیجتاً وہ بھی تیز ہوا اور بات لحاظ کے پردے سے نکلتی چلی گئی۔ بہت کچھ ایسا زیر بحث آیا جو دونوں فریقین دل میں دبائے بیٹھے تھے۔ کیشو کو اس کی بے توجہی کی شکایت تھی تو کیسر کو وقت کی قلت جیسی بہت سی شکایتیں جن کا مداوا کرنا کیشو کے بس میں نہ تھا۔ اس نے مبہم سے شبہے میں بیوی کو تنبیہہ کرنا ضروری سمجھا تھا اور اس کی یہ تنبیہہ ہی غضب ڈھا گئی۔

☆......☆

''اماں چاچا چنیسر کی بیٹی کی شادی ہونے والی ہے، شہر سے بہت سا سامان منگوایا ہے، دیکھنے کو بلایا ہے مجھے۔'' اس نے صبح ہی صبح ساس کو خبر دی۔

''اچھا کون آیا بلانے؟ جیناں تو نہیں تھی بتایا کیوں نہیں مجھے۔'' سجاگی لسی بلوتے بلوتے رک گئی۔

''نہیں اماں مکیش کو کل کہہ کر بھیجا تھا آج یاد آیا مجھے جاؤں؟''

چھوٹے لڑکے سے پیغام بھیج کر سجاول کو گاؤں سے باہر پرانے ٹوٹے پھوٹے مکانات کے کھنڈر میں ملاقات کے لیے بلانا ایک ایسا دلیرانہ عمل تھا جس کی ہمت ایک ایسی عورت ہی جٹا سکتی ہے جو اپنا گھر پھونک دینے کا تہیہ کر چکی ہو۔

''سجاول اب ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا کیشو کو شک ہو چکا ہے، وہ مجھے مار کر کتوں کو ڈال دے گا اگر اسے علم ہو گیا ہمارے تعلق کا۔''

رات کے اندھیرے میں شوہر کی غیر موجودگی میں وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر اس سے ملنے پہنچ گئی تھی۔

''صرف تمہیں نہیں مجھے بھی مار دے گا، بڑا ساہوکار ہے، بہت سے غنڈے اس کے تنخواہ دار ہیں۔'' سجاول پُرسوچ انداز میں بولا۔

''تو پھر سوچ کیا رہے ہو، لے چلو مجھے یہاں سے میرے پاس بہت زیور ہے پیسا بھی ہے۔'' وہ پوری کوشش کر رہی تھی اسے قائل کرنے کی۔

''سوچ لو تم اپنے بچوں کو، دھرم کو چھوڑ پاؤ گی، ایک الگ ماحول میں رہ سکو گی پورے خاندان سے کٹ کر۔''

سجاول نے حقائق کا آئینہ اس کے سامنے رکھا مگر وہ سر سے کفن باندھ کر نکلی تھی جیسے۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆......☆

رات کے اندھیرے میں دو اونٹنی سوار برق رفتاری سے رواں دواں تھے۔ صحرا کا سفر عموماً ایسے وقت میں نہیں کیا جاتا، اونٹ سوار ٹھنڈے وقت اور روشنی کو ترجیح دیتے ہیں مگر یہ سفر کوئی عام سفر نہیں تھا، یہ دو دنیا اور مذہب کی بنائی گئی حدود کو توڑ کر جانے والوں کا سفر تھا۔

شوہر کی کی گئی تنبیہہ نے اسے احساس دلا دیا تھا کہ اس کا راز اب زیادہ وقت چھپا نہیں رہے گا اور بات کھل گئی تو اس کی منزل اتنی دور چلی جائے گی کہ مرتے دم تک صحراؤں کی خاک چھان کر بھی وہ اسے حاصل نہیں کر پائے گی۔

اس نے گھر سے تمام گہنے سمیٹے اور اپنی گھر ہستی کو الوداع کہتی سجاول کے ساتھ نئی دنیا بسانے نکل پڑی۔ اس وقت کے ہر مفرور کی طرح ان کا ٹھکانا بھی کراچی ہی ٹھہرا۔ جہاں نہ رہنے کی جگہ کی کمی تھی نہ ہی روزگار کی۔

وہاں سے نکلنے کے بعد جیسے انہوں نے پچھلوں کو یاد نہیں کیا ویسے ہی کیسر کے گھر والوں نے اس کو ڈھونڈنے کی سرسری سی کوشش کے بعد اسے مردہ سمجھ لینا بہتر سمجھا اور سجاول تو ویسے ہی کٹی ہوئی پتنگ تھا۔ اس کے قریبی عزیز اوّل تو تھے نہیں جو تھے وہ سب دور پار کے تھے۔

اس طرح دونوں فریقین نے ایک دوسرے کو بھول کر

محمد بن ادریس شافعی 150ھ میں غزہ یا عسقلان میں پیدا ہوئے۔ اسی سال امام ابوحنیفہؒ نے ولادت پائی۔ امام شافعی کے والد ادریس ایک نادار شخص تھے۔ وہ جوانی ہی میں وفات پا گئے۔ امام شافعی کی پرورش ان کی والدہ نے کی جن کا تعلق ازد یمن سے تھا۔ وہ بڑی سمجھدار اور دریا دل خاتون تھیں۔ جب امام شافعی پیدا ہوئے تو انہیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ یہ خاندانی بچہ اگر اپنے خاندان سے دور رہا تو بہت ممکن ہے کہ یہ خاندانی شرافت سے ہاتھ دھو بیٹھے، چنانچہ وہ شافعی کو واپس مکہ لے آئیں۔ خود شافعی کہتے ہیں کہ جب میں پیدا ہوا تو ہم لوگ اپنے آبائی علاقے سے دور رہتے تھے۔ میری والدہ کو اندیشہ ہوا کہ اس طرح تو میں ضائع ہو جاؤں گا اور مجھے اپنی خاندانی شرافت کی کوئی جان پہچان نہیں ہوگی، چنانچہ وہ مجھے مکہ لے آئیں۔ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ یوں بھی وہ نادار اور غریب تھے۔ یتیم شافعی نے جب آنکھ کھولی تو گھر پر بدحالی اور تنگدستی چھائی ہوئی تھی لیکن خاندانی لوگ اگرچہ غریب ہوں، ان کی جواں ہمتی اور عزم و حوصلہ ہمیشہ انہیں نئی منزلوں کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس راہ کا انتخاب کرتے ہیں جو انہیں بلندیوں کی طرف لے جاتی ہے۔ غربت کے باعث وہ ان برائیوں سے محفوظ رہتے ہیں جو امیروں میں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ وہ پکی پکائی کھانے کے عادی نہیں ہوتے۔ نہ انہیں مال مفت کے گل چھرے اڑانے کا موقع ملتا ہے۔ جو شخص خاندانی عظمت کے ساتھ غربت کی گود میں آنکھیں کھولے، وہ عوام کے احساس کو بہت اچھی طرح سمجھنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے۔ ان کے جذبات کا بخوبی ادراک کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غربت، تنگدستی اور استاد کی اُجرت کے پیسے نہ ہونے کے باوجود امام شافعی کی والدہ نے انہیں حصول علم پر لگا دیا اور امام شافعی نے ابتدائی تعلیم کے لیے مسلم بن خالد زنگی کا حلقہ درس اختیار کیا۔ استاد کی فیس کا مسئلہ اس طرح حل ہوا کہ استاد کی غیر موجودگی میں شافعی طلبہ کو پڑھانے لگے۔ انہوں نے سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ دس سال کی عمر میں موطا حفظ کر لی اور مقدور بھر لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا۔ شافعی کو زبان دانی اور فصاحت و بلاغت سے بھی غیر معمولی لگاؤ تھا۔ یہ تعلق بچپن ہی میں قائم ہو گیا تھا جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بے پناہ ذہانت کا حامل یہ غیر معمولی بچہ شعور کی منزلیں دوسرے بچوں کے مقابلے میں بڑی تیزی سے طے کر رہا تھا۔ عربوں کو صحت زبان کی بڑی فکر رہتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے بچے شروع ہی سے صحیح زبان بولنے کے عادی ہو جائیں۔ اس مقصد کے لیے وہ بچوں کو

زندگی کے دن پورے کرنے شروع کر دیے۔

☆......☆

1980ء کا ابتدائی دور تھا۔ سجاول کو آنے کے ساتھ ہی ایک سرکاری اسکول میں چپراسی کی نوکری مل گئی کیونکہ چرب زبان اور محنتی انسان کو کام کی کمی کبھی نہیں رہتی جبکہ اس کی برادری کے لوگ حکومت میں بھی ہوں۔

☆......☆

زندگی بہت پُرسکون گزر رہی تھی کیسر نے آنے کے ساتھ ہی مذہب کی تبدیلی کے ساتھ نام بدل کر سکینہ رکھ لیا تھا اور نہ صرف پہناوا بدلا بلکہ اس کی زندگی میں بھی انقلابی تبدیلی آئی تھی۔ پہنتی وہ ابھی بھی چنری ہی تھی مگر اب اس کا لباس بڑے بڑے گھیر دار گھاگھروں کے بجائے شلوار قمیص پر مشتمل ہوتا تھا۔

چھوٹی سی بوٹے قد کی خوش اخلاق خاتون جس سے مل کر دل خوش ہو جاتا۔ صوم و صلوٰۃ کی پابند۔ نک سک سے درست۔ انتہائی روانی سے اپنے مخصوص لب و لہجے میں بات کرتی تو دل چاہتا سنتے ہی رہو۔

ہمارے گھر بھی اکثر ان کا آنا جانا رہتا۔

☆......☆

ان دنوں گلیوں اور میدانوں میں گھومنا دل پسند مشغلہ ہوا کرتا تھا اور اتفاق سے سجاول کے گھر کے پاس ہی بڑا سا میدان تھا جب جب وہاں سے گزرتے ان کے کھلے صحن میں سکینہ کسی نہ کسی کام میں مصروف نظر آتی۔ بچوں سے خالی وہ مکان کبھی کبھار کافی پراسرار سا لگتا کہ اندر جا کر دیکھا جاتا۔ ان کا رہن سہن کیسا ہے مگر کبھی ایسا کوئی بہانہ نہ مل سکا۔

اور وقت گزرتا چلا گیا۔

☆......☆

یہ سن دو ہزار کا ابتدائی عشرہ تھا۔ میری شادی ہو چکی تھی۔ غم زندگی نے سکینہ و سجاول تمام کو ذہن سے یکسر محو کر دیا تھا۔

اب کبھی کبھار والدہ کے پاس جانا ہوتا تو وہ پرانے پڑوسیوں کی خبریں سنایا کرتیں تب ایک روز میری موجودگی میں سکینہ امی کے پاس آئی۔

سادہ کاٹن کے شلوار قمیص اور چنری کا دوپٹا مگر انداز

شہری زندگی سے دور دیہات میں بھیج دیا کرتے تھے جہاں زبان و بیان کے صافی چشمے بہتے تھے۔ وہاں بچے صحیح زبان سیکھتے اور تہذیب عرب کی خصوصیات سے بہرہ یاب ہوتے تھے۔ یہ بات بھی تھی اور شافعی کو طبعی طور پر بھی زبان و بیان سے غیر معمولی لگاؤ تھا، چنانچہ وہ بھی دیہات چلے گئے اور قبیلہ ہذیل سے وابستہ ہو گئے۔ انہوں نے خود بتایا: ''میں مکہ سے نکلا اور عرب کے دیہات میں پہنچ کر قبیلہ ہذیل سے وابستہ ہو گیا۔ میں نے ان کی طرح عربی بولنا سیکھا اور ان کے مزاج و عادات سے واقفیت حاصل کی۔ یہ قبیلہ زبان دانی کے اعتبار سے عرب کا سب سے فصیح قبیلہ تھا۔ میں اس قبیلے کے ساتھ ساتھ سفر کرتا۔ جہاں وہ پڑاؤ کرتا، میں بھی پڑاؤ کرتا۔ جب میں مکہ واپس آیا تو عربی اشعار میں طاق اور عربی آداب اور ان کی لوک روایات سے پوری طرح واقف ہو چکا تھا۔'' شافعی نے ہذیل میں رہ کر عربی اشعار اور عربی لوک روایات میں اتنا کمال حاصل کیا کہ اصمعی جیسا یگانۂ روزگار ادیب و لغت دان ان کے بارے میں کہتا ہے: ''قریش کے ایک نوجوان سے میں نے ہذیل کے اشعار اور ان کی لوک روایات کی درستی کرائی جس کا نام محمد بن ادریس ہے۔'' الغرض شافعی نے بادیہ نشینوں کے ساتھ رہتے ہوئے ان کے تمام کمالات حاصل کر لیے جن میں ایک نمایاں مہارت تیر اندازی کی تھی۔ تیر اندازی میں ان کا نشانہ اتنا بے خطا تھا کہ کبھی نہ چوکتا۔ وہ خود کہا کرتے تھے۔ ''مجھے دو چیزوں کا بڑا شوق ہے، تیر اندازی اور علم۔ تیر اندازی میں تو واقعی میں نے کمال حاصل کر لیا، باقی رہا علم ......'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ حاضری میں سے ایک صاحب نے کہا: ''واللہ! آپ کا علم تیر اندازی کے فن سے بھی زیادہ کامل ہے۔'' شافعی کے طلب علم کا آغاز مکہ سے ہوا۔ یہاں جو نمایاں فقیہ اور محدثین تھے، وہ ان سے استفادے میں معروف ہو گئے اور اس شان سے فقہ حاصل کی اور ایسی قدر و منزلت پائی کہ مسلم بن خالد زنگی نے انہیں فتویٰ دینے کی اجازت دے دی اور کہا: ''ابوعبداللہ! تم فتویٰ دے سکتے ہو، یہ ذمہ داری تمہیں زیب دیتی ہے۔'' مکہ میں انہوں نے جن اساتذہ سے نمایاں طور پر استفادہ کیا، ان میں سفیان بن عینیہؒ، عبدالرحمن بن عبداللہ بن ابی ملیکہؒ، مسلم بن خالد زنگیؒ، فضیل بن عیاضؒ، محمد بن علی بن شافعیؒ اور عبدالرحمن بن قاسم ازرقیؒ شامل تھے۔

مرسلہ: محمد الیاس، کراچی

میں وہ خوش اخلاقی اور گرم جوشی مفقود تھی جو اس کا خاصا تھی۔ چہرے پر وقت جھریوں کی صورت میں اپنی چھاپ چھوڑ گیا تھا۔ میں تو سلام کر کے وہاں سے اٹھ آئی۔

بعد میں والدہ سے استفسار کیا تو یہ افسوسناک صورتِ حال سامنے آئی، سجاول، سکینہ سے ایک نسبتاً کم عمر عورت سے شادی کر رہا تھا جس کا ایک عدد نوعمر بیٹا بھی تھا۔ وجہ وہی تھی، صدیوں پرانی اولاد کا حصول جو اسے سکینہ نہیں دے سکی تھی۔

اور غضب سجاول نے یہ کیا کہ اپنی دوسری شادی کروانے جیسا بھاری بوجھ اس نے سکینہ جیسی دھان پان سی عورت کے نازک کندھوں پر ڈال دیا تھا۔ جس کی بنا پر گھر میں تو تو میں میں ہونا روز کا معمول بن گیا تھا۔

اور تب ہی سکینہ نے ایک عجیب سا کام کیا یا شاید وہ ایک ڈوبتے ہوئے انسان کی بچاؤ کی کوشش کہی جا سکتی ہے۔

اس نے تھر میں موجود جوان ہو چکے اپنے بچوں سے ملنے کی کوشش کی، وہی بچے جنہیں وہ کافی پہلے ایک شخص کی محبت میں چھوڑ آئی تھی۔ نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا تھا، بچوں نے سکینہ کا پیغام پہنچانے والوں کو صاف جواب دیا کہ وہ اس نام کی کسی عورت سے واقف نہیں، ان کی ماں بہت پہلے مر چکی ہے۔ (کراچی سے سجاول کی برادری کے لوگ اکثر تھر جاتے رہتے تھے جن کے ذریعے اس نے پیغام بھجوایا تھا)

یہ خبر اس کے لیے شاید متوقع رہی ہو مگر اس کی یہ آخری اُمید بھی ٹوٹ گئی اور وہ مسلسل احتجاج کے بعد بالآخر سجاول کی دوسری شادی کروا کر لے آئی۔

☆......☆

بات یہیں تک رہتی تو بھی ٹھیک تھا مگر ایک کمرے کے اس مختصر سے گھر میں نئی بیوی کے آنے کے بعد گنجائش یکدم کم پڑنے لگی تھی۔ جس کمرے میں اس نے بیس پچیس سال گزارے تھے وہاں سے یکدم دیس نکالا مل گیا۔ اس کا شوہر کمرے میں اور اس کی چارپائی کھلے آسمان تلے پڑی تھی۔ چند روز وہ یہ سب برداشت کرتی رہی پھر ایک روز نجانے کمرے کے بند دروازے کو گھورتے اس کے ذہن میں کیا ابال اٹھا اس نے بنا سوچے سمجھے دروازہ زور زور سے

1947ء میں آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے اراکین مندرجہ ذیل تھے۔ صدر، محمد علی جناح۔ سیکریٹری، لیاقت علی خان۔ خزانچی، راجہ آف محمود آباد محمد امیر احمد خان۔ آسام، عبدالمتین چودھری۔ بلوچستان، قاضی محمد عیسیٰ۔ بنگال، ایم اے ایچ اصفہانی، خواجہ ناظم الدین، محمد اکرم خان، حسین شہید سہروردی۔ بہار، سید حسین امام، ایس ایم لطیف الرحمن۔ بمبئی، اسماعیل ابراہیم چندریگر۔ سی پی اینڈ برار، سید عبدالرؤف شاہ۔ مدراس، حاجی عبدالستار ایچ۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ، سردار عبدالرب نشتر، سردار محمد اورنگزیب خان۔ پنجاب، میاں بشیر احمد، شیخ کرامت علی، میاں افتخار حسین ممدوٹ۔ یوپی، نواب محمد اسماعیل خان، چوہدری خلیق الزماں۔

مرسلہ: ارشد علی خان، دیرہ

دھڑ دھڑا دیا۔ اندر والے ہڑبڑا کر باہر نکلے۔

''کیا ہوا کیا ہوا کون ہے؟'' سجاول نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

''میرا دل گھبرا رہا ہے اندھیرے میں، سجاول مجھے اندر لے چلو، کوئی گولی دو میرا دل بیٹھ رہا ہے۔'' وہ سینے پر ہاتھ دھرے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ سجاول اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر اسے گالیاں دیتا ہوا واپس کمرے میں گھس گیا۔

وہ ہکا بکا سی دروازے کو دیکھتی رہی۔ اس سے پہلے ان میں لاکھ اختلاف ہوئے لیکن کبھی سجاول نے گالی نہیں دی۔ اسے احساس تک نہ ہوا اور آنکھوں سے نمکین پانی بہہ کر گریبان میں جذب ہوتا رہا لیکن یہ تو صرف ابتدا تھی۔

وہ کچن جس کی وہ بلاشرکت غیرے مالک ہوا کرتی تھی اس میں صبح ہی صبح اپنی سوکن کو براجمان دیکھا تو وہ تلملا اٹھی۔ کافی دیر اِدھر اُدھر ٹہلتی رہی لیکن وہ عورت بھی شاید اس کا صبر آزمانے کا تہیہ کر کے آئی تھی۔ اپنا اپنے شوہر اور پھر نوعمر بیٹے کا ناشتا بنانے میں اس نے گھنٹا بھر لگایا۔

''اب تم باہر نکلو گی یا یہیں سونے کا ارادہ ہے۔'' آخر اس سے رہا نہ گیا تو مریم نامی اس عورت کے سر پر جا کھڑی ہوئی۔

''ارے ارے آپا میں تو ناشتا بنا رہی ہوں، آپ اتنی دیر سے جاگی ہوئی ہیں ذرا سا ناشتا ہی بنا دیتیں، اب الٹا غصہ دکھا رہی ہیں۔'' اس نے واویلا مچا دیا۔ اس شور میں سکینہ کی آواز دب گئی جو بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ناشتے کا سامان ہی مریم کے جاگنے کے بعد لایا گیا ہے۔ سحر خیز سکینہ کے لیے اس حد تک غصہ اور بھوک برداشت کرنا نقصان دہ ثابت ہوا۔ اس کی طبیعت واقعی بگڑنے لگی تھی۔ بظاہر تو مریم اسے آپا بلاتی تھی مگر مسابقت اور عمر کا آخری دور گزارتی ایک بوڑھی خاتون کو نیچا دکھانے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہ دیتی۔ نتیجتاً سکینہ چیخ چیخ کر غصے کا اظہار کرتی اور سجاول کی نظر میں بری بنتی اور پٹتی۔ ان کا گھر جو سکون کا گہوارا تھا اس کے جھگڑوں کی آواز اب پورا محلّہ سنتا تھا۔ کھانے پینے پر اب سوکن کا قبضہ تھا۔ وہ تمام راشن کمرے میں رکھتی اور بقدر ضرورت کچن میں لاتی۔ ظلم تو یہ تھا کہ یہ تمام اسباب گھر اور اس کا سامان سکینہ کے زیورات کا مرہون منت تھا۔ مسلسل ذہنی دباؤ رنگ لایا اور ایک دن سکینہ کی علالت کی خبر آئی۔

☆☆☆

امی کے گھر ایک پڑوسن خاتون سے باتوں باتوں میں میں نے خود ہی یہ موضوع چھیڑا۔

''خالہ! سکینہ خالہ کا کیا حال ہے؟ کچھ دن پہلے راستے میں نظر آئیں، بہت کمزور سی ہو گئیں ہیں۔ میں نے سلام کیا تو جواب دیے بنا نکل گئیں جیسے پہچانا نہ ہو؟''

صفیہ خالہ نے ایک گہری افسردہ سانس لی اور کچھ دیر چپ سی ہو گئیں۔

''ارے بیٹا بستر پر پڑی ہے جانے کب تک جیے۔ گئی تھی میں دیکھنے، اب سوکن کے سہارے ہے بیچاری، کیا خیال رکھتے ہوں گے اس کا۔''

خالہ تو پھر سے باتوں میں لگ گئیں۔ میں بھی اپنے کام میں لگ گئی۔

پھر کچھ ہی عرصے سکینہ نے سجاول اور اس کی بیوی کو زحمت دی۔ اس کی موت کی اطلاع امی نے فون پر مجھے دی اور میت میں پہنچنے کی ہدایت بھی کی کہ بہر حال بیس پچیس سال وہ ہماری پڑوسن رہی تھیں۔ لوگوں نے اس کی اچانک موت کا ذمہ دار شوہر کو ٹھہرایا جو ایک عورت کو اس کی آخری عمر میں تنہا چھوڑ کر دوسرا بیاہ رچا لایا۔ اور اس کے حقوق سے بالکل بے نیاز ہو گیا۔ سب کی ہمدردیاں سکینہ کے ساتھ تھیں لوگ اس کی قسمت پر افسوس کرتے کہ ایک دنیا چھوڑ آئی اس بیوفا مرد کے لیے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اس نے دنیا بگاڑ کر عاقبت سنوار لی تھی۔

نادان

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
لڑکیاں ہوتی ہی نادان ہیں تبھی تو محبت کے دو میٹھے بول سن کر زندگی برباد کرلیتی ہیں۔ یہ سرگزشت بھی ایک نادان لڑکی کے احمقانہ قدم کی ہے۔ اگر موقع ملے تو ہر ایک کو اس سچ بیانی پر غور کرنا چاہیے۔

فضہ عادل
(ہری پور ہزارہ)



سڑک کے دونوں جانب چہل پہل تھی۔ منجلی بلڈنگ کے سامنے والے بابو ہوٹل پر ابھی بھی بابو منیر چولہے کے پاس کھڑا چائے کے پتیلے میں کفگیر ہلا رہا تھا۔ مشتاق سبزی والا دو عورتوں کو سبزی تول کر دینے کے بعد پیسے وصول کررہا تھا۔ دائیں ہاتھ پر شفیق چاچا اپنی کھلی کریانے کی دکان کے باہر چارپائی بچھائے بیٹھا اپنے تیتر بٹیر کھلا رہا تھا۔ غرض یہ کہ چوک میں معمول کی گہما گہمی گزرتی زندگی کے ہر لمحے کا پتا دے رہی تھی مگر......!

مگر ان زندہ دل لوگوں کے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہاں کچھ ہی دیر میں ایک گتے کا سرخ ڈبہ آنے والا ہے

جس میں انسانیت کا سب سے بڑا ظلم بند ہوگا۔ وہ ڈبہ نہیں موت ہوگی۔ ایک جیتی جاگتی ایسی زندگی کی موت، جس نے زندگی ابھی محسوس بھی نہ کی تھی۔

ہاں...... کچھ ہی دیر میں جنید تیز تیز سیڑھیاں اترتا نیچے آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سرخ رنگ کا گتے کا ڈبہ تھا۔ بلڈنگ سے نیچے اتر کر اس نے دائیں بائیں نظریں دوڑائیں۔ اس کے چہرے پر اس وقت ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ کافی حد تک بوکھلایا ہوا بھی تھا۔ اس نے ماتھے پہ آیا پسینا اپنے دائیں ہاتھ کی پشت سے صاف کیا پھر بلڈنگ کے عقب میں موجود گندے نالے کی جانب چل دیا۔ نالے کے قریب بیٹھ کر چوروں کی طرح اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اس نے تیزی سے بہتے گندے، کالے بدبودار پانی میں ڈبہ بہا دیا۔ گویا کسی معصوم کے سرخ خون پر سیاہ چادر ڈال دی۔

جنید وہاں رکا نہیں، ڈبہ بہاتے ہی تیزی سے وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ لانبے لانبے ڈگ بھرتا بلڈنگ کی جانب واپس آیا۔ دوڑتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر وہ اپنے فلیٹ کے قریب پہنچا۔ اب اس کے چہرے پر سکون کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے جیب سے موبائل فون نکالا۔ نمبر ڈائل کیا تو کچھ ہی لمحوں میں فلیٹ کا دروازہ کھل گیا۔

''ہوگیا......'' اس کے اندر قدم رکھتے ہی مرتضیٰ نے بے چینی سے استفسار کیا۔

''ہاں۔ ہوگیا۔ ایک بڑی مصیبت سے جان چھوٹ گئی۔'' جنید نے گہری سانس لیتے ہی فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر منہ سے لگائی اور ایک ہی سانس میں غٹا غٹ پی گیا۔

''کسی نے دیکھا تو نہیں؟'' شہلا کچن سے گرم دودھ کا گلاس لیے باہر نکلی۔

''نہیں۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو یقیناً میں یہاں نہ کھڑا ہوتا۔ اب کیسی ہے وہ؟'' اس نے بوتل پر ڈھکن لگایا پھر اسے فریج میں رکھ کر پلٹا۔

''بے ہوش ہے۔'' شہلا نے افسردگی سے مختصراً بتایا۔

اس وقت جنید کو مُردوں کی طرح لیٹی نیلم کا خیال آیا، اور اس ٹیس کا بھی جو اس کے ہاتھ کی پشت سے اٹھ رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ پلٹ کر دیکھا اس پر دانتوں کے گہرے نشان تھے۔ جن سے ابھی بھی خون رس رہا تھا۔ غالباً یہ نیلم کی آخری چیخ تھی جو اس نے دبانے کے لیے نیلم کے منہ پر ہاتھ رکھا تھا، اور اس نے ضبط نہ لاتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے دانتوں تلے چبا ڈالا تھا۔

جنید نے آگے بڑھ کر شہلا سے دودھ کا گلاس لیا۔ وہ کمرے کی طرف چل دیا۔ ہاں اسی کمرے کی طرف، جس میں کچھ دیر پہلے معصوم زندگی سے موت کا کھیل رچایا گیا تھا۔

وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو کمرا صاف ستھرا تھا۔ یقیناً شہلا نے اس کے جاتے ہی صفائی کر ڈالی تھی۔ دروازے کی آواز پر نیلم گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ وہ ہوش میں آچکی تھی۔

اس کے چہرے پر پھیلے کربناک آثار بتا رہے تھے، جیسے ابھی ابھی وہ کسی بھیانک خواب سے جاگی ہو۔ ایسا بھیانک خواب جو اس کی خودمختاری اور قوت ارادی بھی ساتھ لے گیا ہو۔ اس کی نگاہیں جنید پر جا کر ٹھہر گئیں۔ یوں جیسے جھیل میں پتھر پھینکنے کے بعد ہلچل اٹھے پھر خود ہی وہ جھیل شور مچا کر چپ ہو جائے۔

''کیا موت سے گزرنے کے بعد عورت یوں بھی زندہ رہتی ہے؟'' اسے اپنی نئی زندگی پر تعجب ہوا۔ اس کی آنکھوں سے ندی کی مانند آنسو بہنے لگے۔

''لو...... یہ دودھ پی لو۔ اور رومت پلیز۔'' اس نے نیلم کے قریب بیٹھتے ہوئے دودھ کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

وہ لپک کر اس کے سینے سے لگتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے اسے رونے دیا۔ بس چپ چاپ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتا رہا۔ کچھ ہی دیر میں وہ رو رو کر خاموش ہوگئی۔ شاید اس معصوم جان کے لیے کیا گیا یہ پہلا اور آخری ماتم تھا۔

اس نے اس کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لے لیا۔ بس ایک دودھ کا گلاس پیتے ہی وہ فوراً بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں...... میں چلتی ہوں۔ مجھے بہت دیر ہوگئی ہے۔ اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔'' وہ گھر سے شہلا کے ساتھ نکلی تھی۔ یہاں اسے تقریباً چھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ وہ شہلا کے ہمراہ اپنی بچی کھچی طاقت بروئے کار لاتے ہوئے بلڈنگ سے نیچے اتری اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ مرتضیٰ پہلے ہی اسٹیئرنگ سنبھالے بیٹھا تھا۔ ان کے پیچھے ہی جنید بھی نیچے آیا۔ نیلم نے باہر کھڑے جنید پر نگاہ ڈالی۔ وہ عجیب شانِ بے نیازی سے کھڑا اردگرد کے لوگوں کا

مشاہدہ کررہا تھا۔

''جنید۔'' اس نے گاڑی کا شیشہ نیچے کیا۔ دل میں اٹھتے خدشات حقیقت کا لبادہ اوڑھتے نظر آرہے تھے۔ جنید نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے نیلم کے جسم میں روح نہ ہو۔ یا اس کے سامنے کوئی بدروح بیٹھی ہو۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں، ہونٹ نیلے ہو چکے تھے۔ چہرہ زردی مائل پیلا تھا۔ کچھ ہی گھنٹوں میں وہ پرانی مریضہ لگ رہی تھی۔

''کتنی عظیم ہوتی ہے عورت۔ اپنا سب کچھ لٹا کر بھی اپنے محبوب کی آن کو بچالیتی ہے۔ نہیں۔ بلکہ عظیم نہیں، بے وقوف ہوتی ہے عورت۔'' جنید نے دل ہی دل میں سوچا۔ ایک عجیب سی ہنسی اس کے لبوں پر ابھری، جسے اس نے کمال مہارت سے دبالیا۔

''پریشان مت ہو تم۔ مجھے یہاں بھی سب دیکھنا ہے، تم مرتضیٰ کے ساتھ جاؤ گھر۔ آرام کرو اور اپنا بہت خیال رکھنا۔'' وہ گاڑی کے شیشے پر جھکا پھر اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر اس کے ہاتھ پر رکھا۔ ''مجھے میری پہلے والی نیلم چاہیے۔ بس اپنا بہت خیال رکھنا۔'' اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہتے ہی وہ سیدھا کھڑا ہوگیا۔ نیلم کے چہرے پر اندھے اعتماد کی ایک اور لہر دوڑی۔

''تم ساتھ نہیں جارہے؟'' اب کی بار فرنٹ سیٹ پر بیٹھے مرتضیٰ نے شیشے سے جھانکا۔

''ایک بڑی مصیبت سے نکل گئے ہیں۔ اب کیا تو مجھے چھوٹی مصیبت میں پھنسانا چاہتا ہے؟'' جنید دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ البتہ نیلم اور شہلا کی موجودگی میں ایسی کوئی بھی بات زبان پہ نہ لایا۔ ہاں اگر مرتضیٰ اکیلا ہی ہوتا تو وہ ضرور کہہ دیتا۔

''نیلم کو اس حال میں دیکھنے کی میرے اندر مزید ہمت نہیں۔ جاؤ تم لوگ۔'' اس نے بلا کی افسردگی چہرہ پر سجائی۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر وہ چپ چاپ سر جھکائے وہاں سے چل دیا۔ مرتضیٰ نے بھی گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ بلڈنگ کے احاطے میں پہنچ کر وہ پلٹا۔ سڑک کی طرف نظریں دوڑائیں۔ گاڑی نظروں سے اوجھل ہونے والی تھی۔

''تھینک گاڈ۔'' اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر رب کا یوں شکر ادا کیا جیسے میدان جنگ سے غازی بن کر پلٹا ہو۔ چہرے پر ہاتھ پھیرتا اپنی بائیک کی طرف چل پڑا۔ بالکل پُرسکون...... ایسے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

نیلم سے جنید کی ملاقات یونیورسٹی کے ایک سیمینار میں ہوئی تھی۔ وہ بہت خوبصورت تھی اور انتہائی معصوم بھی۔ اس کا دلکش چہرہ چاند کی طرح روشن تھا۔ وہ ایک کھلے گلاب کی طرح مہک رہی تھی۔ ہونٹ رسیلے، چہرہ مکھن کی مانند سفید جبکہ جسم کسی سے کدے سے کم نہ تھا۔ جو اسے ایک نظر دیکھ لیتا پلٹ کر دیکھنے پر ضرور مجبور ہو جاتا تھا۔

جنید بھی کسی سے کم نہ تھا۔ اس کی پُرکشش آنکھیں ہزاروں لڑکیوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے کافی تھیں مگر وہ پہلی ہی نظر میں نیلم پر فریفتہ ہو چکا تھا۔ یوں نیلم نے بھی جلد ہی پسندیدگی کا اظہار کردیا پھر دونوں کی ملاقاتوں کے دور چل نکلے۔ کبھی جلوت میں تو کبھی خلوت میں، وہ زمانے کے خوف خطر اور اٹھتی چبھتی نظروں سے بے نیاز ہر گزرتے دن کے ساتھ ایک دوسرے میں ڈوبتے چلے گئے۔ یوں جیسے نیلم جھیل میں رات گئے پورا چاند اترتا ہو۔

محبت بڑھنے لگی تو قربت کی شدت بھی پروان چڑھنے لگی پھر یونیورسٹی کا پابند ماحول وحشت دینے لگا۔ بے ایمان دل تنہائی مانگنے لگا۔ ایسی تنہائی جہاں ان دونوں کے علاوہ تیسرا کوئی نہ ہو۔ پھر جلد ہی انہیں وہ تنہائی بھی میسر آگئی۔

ہوا کچھ یوں کہ انہی دنوں جنید کے جگری یار مرتضیٰ کا تبادلہ کراچی سے پنڈی ہوگیا۔ ادارے کی جانب سے اسے رہائش اور گاڑی بھی مل گئی۔ جنید کو یہ خبر سن کر بہت خوشی ہوئی کیوں کہ مرتضیٰ بھی غیر شادی شدہ تھا اور اس کا وہ واحد دوست جس پر وہ آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکتا تھا۔ اگرچہ وہ غیر شادی شدہ تھا مگر لڑکیوں سے ذرا دور ہی رہتا تھا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ وہ لڑکیاں پسند نہیں کرتا تھا۔ بس اس میں وہ ہمت نہ تھی جو دیگر لڑکوں میں ہوتی ہے۔

اس لیے وہ ابھی تک تنہا ہی تھا۔ تنہا ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ گھر کا واحد کفیل تھا۔ اس کے سر پر بوڑھی ماں اور تین جوان بہنوں کا بوجھ تھا۔ مرتضیٰ اور جنید نے بی ایس ایک ساتھ ایک یونیورسٹی سے کیا تھا پھر مرتضیٰ پڑھائی کو خیرباد کہہ کے نوکری کرنے لگا۔ جبکہ جنید نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ گو کہ جنید بھی اپنے ماں باپ کا اکلوتا سہارا تھا۔ اس کے والد سرکاری ملازم تھے مگر وہ چاہتے تھے ان کا بیٹا اعلیٰ تعلیم حاصل کرے اس لیے ان کی ساری امیدیں اب جنید سے ہی وابستہ تھیں۔

نیلم ایک امیر باپ کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ بیرونِ ملک تھا۔ وہ یہاں اپنی ماں اور چھوٹی بہن کے ساتھ رہتی تھی۔ گھر سے اسے کھلی آزادی حاصل تھی۔ کوئی روک ٹوک کسی قسم کی پابندی نہ تھی بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ اندھا اعتماد تھا۔

وہ گھر سے یونیورسٹی تک ڈرائیور کے ساتھ آتی تھی پھر ڈرائیور کو واپس بھجوا دیتی اور خود جنید کے ساتھ اس کی موٹر سائیکل پر چڑھ کر بیٹھ جاتی۔ جب موٹر سائیکل یونیورسٹی کے حدود سے باہر نکل جاتی تو وہ اپنی گوری گوری بانہیں اس کی کمر کے گرد ڈال کر ایک چاند جیسا حلقہ بنا لیتی۔

یوں پنڈی کی سڑکیں، کھلے بازار، سستے ریستوران اور پبلک پارک ان کی داستانِ عشق کے گواہ بنتے رہتے۔

اب وہ دنیا سے چھپ کر تنہائی کے گوشے ڈھونڈنے لگے۔ ایسے گوشے جہاں ”تمہارے اور میرے علاوہ تیسری ہوا بھی قابل برداشت نہیں ہوتی۔ ایسے میں مرتضٰی کا فلیٹ انہیں دنیا میں ہی جنت لگنے لگا۔

اس روز وہ گھر پر اماں کو یونیورسٹی سے شہلا کے گھر جانے کا کہہ کر نکلی۔ شہلا اس کی واحد دوست تھی جو اس کی ہر بات سے آگاہ تھی پھر وہ جنید کے ساتھ پہلی بار مرتضٰی کے فلیٹ پر آئی۔ پہلے پہل تو اپنے دروازے پر جنید کو ایک لڑکی کے ہمراہ دیکھ کر وہ گھبرایا مگر اگلے ہی لمحے وہ ساری صورتِ حال سمجھ چکا تھا۔ اپنے سنسان فلیٹ پر ایک لڑکی کی آمد سے بھلا اس کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ لڑکی بھی ایسی کہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو جائے۔ پہلے دن وہ کافی دیر تک ان دونوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہا۔ دل ہی دل میں جنید کی پسند اور نیلم کے حسن کو سراہتا رہا پھر وہ سمجھ گیا کہ یہ دنیا کی نظروں سے کنارہ کش ہو کر یہاں محبت کی طلب مٹانے آئے ہیں۔ وہ ان دونوں کے پاس سے کام کا بہانہ بنا کر اٹھ گیا۔ پہلے روز وہ دونوں کچھ گھنٹے وہاں رکے۔ پھر یہ سلسلہ تقریباً ہر روز چل نکلا۔

اب تو اکثر وہ مرتضٰی کی عدم موجودگی میں وہاں جانے لگے۔ مرتضٰی نے ان دونوں کی سہولت کے لیے جنید کو فلیٹ کی دوسری چابی بھی دے دی تھی۔ وہ دونوں آتے، کچھ وقت ساتھ گزارتے اور اپنے اپنے گھر واپس چلے جاتے۔

دو سال ایسے ہی پلک جھپکتے بیت گئے۔ ان دو سالوں میں ان کا عشق جنون پر پہنچ چکا تھا۔ جس میں مرتضٰی شاخِ گل کا کردار ادا کر رہا تھا۔ جس پر محبت کے دو بلبل بیٹھ کر راز و نیاز کرتے تھے۔

دونوں کے فائنل امتحان ہو گئے تو انہوں نے مری جانے کا پلان بنا لیا۔

عشق ٹھہرتا نہیں، ندی کی مانند ہر لمحے رواں دواں رہتا ہے۔

ہمیشہ ان دیکھے جہان کی تلاش میں آگے، بہت آگے چلا جاتا ہے۔

وہ دونوں بھی اب عشق کے اس مقام پر کھڑے تھے جہاں رکنا ان کے لیے عذاب اور آگے ہی آگے بڑھتے چلے جانا گلاب بن چکا تھا۔ عشق کا وہ گلاب جو کھلتا ہے تو کھلا رہتا ہے مگر کون جانے کب مرجھا جائے اور کتنے پیروں تلے روندا جائے، کچلا جائے۔

انہوں نے اس معاملے میں ایک بار پھر مرتضٰی کی مدد چاہی۔ پہلے تو اس نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ مگر ایک دلفریب حسینہ کی سنگت بھلا کس کو بری لگتی ہے۔ نا، نا کرتے ہوئے وہ مان گیا۔ مرتضٰی نے ایک ہفتے کی چھٹی کی درخواست دے دی۔ نیلم نے گھر پر جھوٹ بولا کہ اسے یونیورسٹی کے ساتھ مری کے ٹرپ پر جانا ہے۔ جس کی گواہی اس کی دوست شہلا نے دی پھر وہ مرتضٰی اور جنید کے ہمراہ مرتضٰی ہی کی گاڑی میں مری کے لیے روانہ ہو گئے۔

مری میں انہوں نے ایک تھری اسٹار ہوٹل میں قیام کیا جس کے دو کمرے ریزرو کروائے۔ ایک کمرا نیلم کے لیے۔ جب کہ دوسرے میں ان دونوں نے اپنا سامان رکھا تھا۔

دن بھر وہ تینوں آوارہ گردی کرتے رہتے۔ کبھی سڑکوں پر کبھی بازاروں میں تو کبھی پہاڑوں پر۔

عورت گھر سے نکل کر بے باک ہو جاتی ہے۔ نیلم بھی ہو چکی تھی۔ یہاں اسے کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ کوئی حدود بندیاں نہیں تھیں۔ کوئی پابندیاں نہیں تھیں اس لیے وہ بے تکلفی سے جنید کا ہاتھ تھام لیتی اور سرِعام اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتی تو کبھی جنید کے گندمی مردانہ بازو اس کی پتلی کمر کو اپنے حصار میں لے لیتے۔ دن بھر آوارہ گردی کرنے کے بعد رات کو تھک ہار کر وہ سو جاتے۔

وہ مری میں ان کی تیسری رات تھی۔ مرتضٰی کی آنکھ کھلی تو برابر میں جنید کو نہ پا کر پریشانی سے اٹھ کھڑا

ہوا۔ اسے ڈھونڈنے کے لیے کمرے سے باہر نکلا۔ اس نے برابر والے کمرے کے دروازے سے کان لگا کر سنا تو سرگوشیوں کی آواز نے اس کے اردگرد شعلے بھڑکا دیے۔ وہ وہاں سے واپس اپنے کمرے میں آگیا۔ اس نے دل ہی دل میں مصمم ارادہ کرلیا کہ صبح ہوتے ہی وہ جنید کو سمجھائے گا۔ اسے شرم دلائے گا کہ وہ عورت ہے۔ عورت شیشے کی طرح صاف ہوتی ہے سود وزیاں کو نہیں جانتی۔ اپنے صاف ستھرے آئینے میں مرد کی شکل دیکھتی ہے مگر مرد کے آئینے میں تو خراشیں ہی خراشیں ہوتی ہیں۔ اس وقت اسے نہ اس عورت کا معصوم چہرہ دکھائی دیتا ہے نہ اور کچھ، اور اگر کوئی دکھانے کی کوشش کرتا بھی ہے تو وہ اسے اپنا دشمن لگتا ہے۔ وہ رات مرتضیٰ بے چینی سے پہلو بدلتے دل میں ہزار ارادے کرتے کرتے سویا تھا۔

صبح وہ ہوٹل کے برآمدے میں گھوم رہا تھا تو نیلم اسے اپنی جانب آتی دکھائی دی۔ وہ اتنی تازہ دم اور حسین لگ رہی تھی کہ اس کے چہرے کی تاب لانا مشکل تھی۔

''بھائی مرتضیٰ۔ جنید کہاں گئے ہیں؟''

''وہ کیمرے کے رول لینے گیا ہے۔'' مرتضیٰ نے نگاہ اٹھا کر اس کے سراپے کو دیکھا۔ وہ اس لمحے ایک کھلا ہوا گلاب لگ رہی تھی۔ ایک طرف کو ڈھلکتے لمبے اور سیاہ بالوں سے ابھی بھی پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس نے اس وقت کوئی میک اپ نہیں کر رکھا تھا مگر اس کے چہرے کی تاب لانا مشکل ہو رہی تھی۔ گال سرخ انگارا ہو رہے تھے۔ ہونٹوں پر گلاب ہی گلاب تھے۔ آنکھوں سے بجلیاں جھلک رہی تھیں۔ یہ وہ نیلم بالکل نہیں لگ رہی تھی جو کل تک تھی۔ مرتضیٰ نے نگاہیں ہٹالیں۔ اسے دور سے جنید بھی آتا دکھائی دیا۔ اس کے قدموں کی رفتار بلا کی تیز تھی۔ وہ بھاگتا ہوا ان کے قریب آرکا۔ اس کا چہرہ بھی تپ رہا تھا۔ آنکھوں میں طلب تھی۔ طلب اور بس طلب۔

ناشتے کے بعد وہ تینوں چہل قدمی کرنے لگے۔ مال روڈ پر چلتے چلتے وہ کافی آگے آگئے۔ جنید رک کر ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔

''یار ایک خوشخبری سناؤں؟'' وہ مرتضیٰ سے مخاطب تھا۔

''ہاں سناؤ۔'' مرتضیٰ چلتے چلتے رکا۔

''میں نے سوچ لیا ہے پنڈی واپس پہنچ کر فوراً نیلم سے شادی کرلوں گا۔''

''اچھا واقعی؟'' اس نے جنید کی جگہ نیلم کو دیکھ کر تصدیق چاہی۔ اس نے مارے لاج کے نظریں جھکالیں۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے مگر تمہارا تو آخری سال چل رہا ہے۔ تم ہی کہتے تھے جب تک پڑھائی نہ مکمل کرلوں شادی نہیں کروں گا۔'' نہ جانے کیوں اسے جنید کی بات غلط لگ رہی تھی مگر وہ کہنا نہیں چاہتا تھا۔

''ہاں یار کہتا تو تھا مگر ضروری نہیں زندگی میں انسان جیسا سوچتا ہے ویسا ہی ہوجائے۔ بعض اوقات دل بہت سی باتوں پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو چکا ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور نیلم کے مقابل جا ٹھہرا۔ ''میں اپنی زندگی کے یہ حسین لمحے گنوانا نہیں چاہتا۔''

اس نے نیلم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی بات مکمل کی۔ اسے ابھی بھی شرم آرہی تھی۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام لیا پھر وہ دونوں قدم سے قدم ملا کر چل دیے۔ تن تنہا دنیا سے بیگانے۔

مرتضیٰ اسی بینچ پر بیٹھ کر ان کو جاتا ہوا دیکھنے لگا۔

''شکستہ ہو تو قریب تر ہے نگاہ آئینہ ساز''

نا جانے کیوں اس لمحے اس کے لبوں پر یہ مصرع ابھرا۔

''عورت بھی کتنی عجیب شے ہے۔ پہلے ہاتھ نہیں آتی اور پھر جب آتی ہے تو ندی کی طرح بہتی ہی چلی جاتی ہے۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ بے ساختہ اس کے لبوں پر ہنسی ابھری۔ وہ بینچ سے اٹھ کر ہوٹل کی جانب چل دیا۔

اس رات پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ آج بھی جنید اپنے کمرے میں نہ تھا۔ وہ کمرے سے اٹھ کر اسے ڈھونڈنے نہیں گیا تھا۔ وہ جانتا تھا جنید اس وقت نیلم کے ہی کمرے میں ہوگا۔ اس نے جنید کو سمجھانے والے سارے ارادے ترک کردیے۔

جب سمندر کی لہریں کنارے سے جان بوجھ کر اٹھکیلیاں کرنے لگیں تو سمندر کیا کرسکتا ہے۔ نیلم خود ہی اپنا آپ اس کو سونپ چکی تھی تو پھر تیسرا کیوں کچھ کہتا۔ وہ چپ چاپ پہلو بدل کر سوگیا۔

یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک وہ مری سے واپس نہیں آگئے۔

پنڈی واپس پہنچ کر مرتضیٰ پھر سے کام پر جانے لگا۔ جنید اور نیلم کی وہی پرانی روٹین جاری تھی۔ وہ گھر سے کوئی نہ

کوئی بہانہ کر کے نکل آتی پھر جنید کے ساتھ دن گزار کے گھر واپس چلی جاتی۔

اسی دوران ان دونوں کا رزلٹ آؤٹ ہو گیا۔ نیلم پاس ہو گئی تھی البتہ جنید فیل ہو چکا تھا۔ یہ ایسی عجیب بات بھی نہیں تھی۔ لڑکیاں ویسے بھی تعلیمی میدان میں ہمیشہ لڑکوں سے آگے رہتی ہیں مگر نیلم کو یہ فکر ستانے لگی تھی کہ اس کا آخری سال چل رہا تھا، فیل ہو گیا ہے تو اب شادی کا کیا بنے گا مگر وہ یہ بات نہیں جانتی تھی۔ وہ صرف مری میں ہی نوشا میاں بنا پھر رہا تھا۔

☆......☆

اس روز مرتضیٰ اپنے فلیٹ میں لیٹا سگریٹ پھونک رہا تھا جب جنید آیا۔ اسے جنید کو اکیلا دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کیوں کہ وہ کافی عرصے سے نیلم کے ساتھ ہی آتا تھا۔

''یہ کیا تم آج اکیلے آئے ہو...... نیلم کہاں ہے؟''

اس نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ منہ لٹکا کر بیٹھ گیا۔

''کیا ہے یار منہ کیوں لٹکا رکھا ہے؟ کوئی پریشانی ہے کیا؟''

''کچھ نہیں یار تمھیں تو حالات کی نزاکت کا اندازہ ہی نہیں۔''

''کیا مطلب کیا ہو گیا حالات کو؟ بھائی فیل ہی تو ہوئے ہو۔ دوبارہ دے دینا۔ رہ گئے امی ابا تو ان کو کسی نہ کسی طرح سمجھا دینا۔''

''یار یہ بات نہیں ہے۔'' وہ اکتا کر بولا۔

''ارے تو کیا بات ہے؟ بہت جلدی ہے تو کرلے شادی۔'' اس نے بھی اسی طرح جواب دیا۔

''اس طرح۔ اس حال میں نہیں کر سکتا شادی۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اب کیا ہو گیا ہے حال کو؟'' مرتضیٰ بھی اس کے ساتھ ہی کھڑا ہوا۔

''کچھ نہیں یار تم نہیں سمجھو گے۔'' وہ کہہ کر وہاں رکا نہیں چلا گیا۔

☆......☆

اگلے دن وہاں نیلم آ ٹپکی۔ وہ بھی اکیلی ہی تھی۔ مرتضیٰ کو ایک بار پھر حیرانی ہوئی۔ وہ چپ چاپ فلیٹ کے اندر داخل ہوئی۔

مرتضیٰ نے بغور نیلم کے سراپے کا مشاہدہ کیا۔ وہ پہلے والی نیلم نہیں لگ رہی تھی۔ کافی بھری بھری لگ رہی تھی مگر اس کے چہرے پر کافی سوگواری تھی۔

جیسے مکمل کھلا ہوا پھول ذرا سا مرجھا جائے، مگر پھر بھی اچھا لگتا ہے۔ وہ بھی مرجھایا ہوا خوبصورت سا پھول لگ رہی تھی۔ مرتضیٰ کو آج پہلی بار اس کی آنکھوں میں کہیں بھی کسی بھی قسم کی چمک نظر نہیں آ رہی تھی۔

وہ کافی دیر چپ چاپ بیٹھی صوفے پر کچھ سوچتی رہی۔ مرتضیٰ نے بھی اس سے کوئی بات نہیں کی پھر وہ بلڈنگ سے نیچے آ کر بابو ہوٹل پر چائے بنوانے لگا۔ چائے بنوا کر وہ دوبارہ اوپر فلیٹ پر گیا۔ اتنے میں جنید بھی وہاں آ گیا۔

''یار کہاں رہ گئے تھے تم، نیلم کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔'' اس کے اندر داخل ہوتے ہی مرتضیٰ نے پوچھا۔

وہ آج بھی بغیر کوئی جواب دیے چپ چاپ اندر آیا۔ پھر پلنگ پر دھڑام سے بیٹھ کر اس نے سرہانے سے ٹیک لگا لی۔

مرتضیٰ کو ان دونوں کی مسلسل خاموشی عجیب طرح کے خدشات میں مبتلا کر رہی تھی مگر وہ خاموشی سے اپنی گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکلنے لگا۔

''یار تو کہاں جا رہا ہے؟''

اسے کمرے سے چابی لے کر نکلتا دیکھ جنید فوراً اٹھ بیٹھا۔

''تم دونوں بیٹھو باتیں کرو۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں، ویسے بھی یہاں موسم ابر آلود دکھ رہا ہے۔ خوامخواہ میں طوفان میں مہمان نہیں بننا چاہتا۔'' وہ آخری بات پر زور دیتے ہوئے نیلم کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ وہ مسلسل نظر جھکائے یا پھر چرائے بیٹھی تھی۔ بلکہ بیٹھی کہاں تھی کسی اور ہی جہان میں گم لگ رہی تھی۔

''بیٹھ یار! ہم تم سے ہی بات کرنے آئے تھے۔''

''اچھا مجھ سے؟''

اسے حیرت ہوئی کہ آج اسے کیوں کباب میں ہڈی بنایا جا رہا ہے۔ وہ حیرت کو نگلتے ہوئے ان کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

''کافی دیر سے یہاں کیا کر رہی تھی؟ تم نے ابھی تک مرتضیٰ سے بات نہیں کی؟'' وہ اب نیلم سے مخاطب تھا۔

''میں، میں کیسے بات کرتی ان سے۔'' وہ غم میں گم بیٹھی تھی، اس کی بات پر فوراً چونکی۔

''کیا مطلب کیسے بات کرتی ویسے ہی کرو جیسے مجھ سے کرتی ہو۔'' اس نے کٹھور پن کا مظاہرہ کیا۔

''جنید تم میں اور مرتضیٰ بھائی میں فرق ہے میں کیسے کہہ سکتی ہوں یہ سب ان سے۔''

''کوئی فرق نہیں ہے۔ تم ہمارے بیچ بیٹھ سکتی ہو۔ مجھ سے رومانس تک کر سکتی ہو تو کچھ بھی کر سکتی ہو۔'' لہجہ پہلے سے زیادہ تلخ تھا۔ مگر واقعی ایک تلخ حقیقت بھی تو گلے کی ہڈی بنی ہوئی تھی۔ نیلم کو اُمید نہ تھی۔ وہ پھٹی نظروں سے بنا کچھ کہے اسے تکنے لگی۔

''یار تم لوگ کیوں لڑ رہے ہو آپس میں؟ بات کیا ہے مجھے یہ بتاؤ۔'' مرتضیٰ کو بھی جنید کا یہ روّیہ کھٹکا تھا۔

اس تکرار کے بعد نیلم کی آنکھوں سے پلک جھپکتے ہی چھاجوں پانی برسنے لگے۔

''ایک تو ان عورتوں کو مگر مچھ کی طرح رونے کے سوا اور کچھ بھی نہیں آتا۔'' جنید نے غصے سے پہلو بدلا۔ اس کے لہجے میں بیزاری اور خفت صاف نظر آ رہی تھی۔

مرتضیٰ نظر انداز کرتے ہوئے نیلم سے مخاطب ہوا۔

''نیلم آپ روئے تو مت پلیز۔ اگر کوئی مسئلہ ہے تو مل کر سلجھا لیتے ہیں۔ رونا تو بے کار ہے نا۔''

''یار تم سے اب کیا چھپانا۔ اس وقت تم ہی ہماری مدد کر سکتے ہو۔'' اس نے رکتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔

''ہاں بولو۔'' مرتضیٰ نے کہا۔

''میں نے مری میں طے کر لیا تھا کہ واپس جاتے ہی اس سے شادی کر لوں گا مگر اب حالات ایسے نہیں ہیں۔ میرا سال ضائع ہو گیا ہے۔ تو میں کیسے کر سکتا ہوں شادی۔ میں جب تک پڑھائی مکمل نہیں کر لیتا ایسا ممکن نہیں۔'' وہ کہہ کر کچھ لمحے کو رکا۔ پھر بولا۔

''یہ بضد ہے کہ اسے ابھی اسی حال میں اسی مہینے کے اندر کرنی ہے شادی۔ تم بتاؤ ایسا کیسے ممکن ہے؟''

''ہاں۔ واقعی یہ ممکن نہیں اتنی جلدی۔ مگر ایسی بھی کیا آفت۔ اس میں کیا مسئلہ ہے؟ ایک سال نیلم انتظار بھی تو کر سکتی ہے۔ یا نہیں؟'' مرتضیٰ نے پہلے جنید اور پھر نیلم کی جانب دیکھ کر اپنی بات مکمل کی۔

''یہ بات نہیں ہے یار۔ اس حالت میں وہ کیسے انتظار کر سکتی ہے۔''

''کس حالت میں......؟'' ان دونوں کی باتیں سن کر نیلم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''اگر اس مصیبت میں بروقت جان نہ چھڑائی گئی تو دونوں بدنام ہو کر رہ جائیں گے۔'' وہ مزید بولا۔

''مصیبت!'' مرتضیٰ نے ہونقوں کی طرح نیلم کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت اس طرح بیٹھی تھی کہ اس کا پیٹ نمایاں نظر آ رہا تھا۔ مرتضیٰ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کس مصیبت کی بات کر رہے ہیں۔

اس لمحے اسے روتی ہوئی نیلم پر بے حد ترس آیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ چاند کو بھی گرہن لگتا ہے مگر تم تو وہ آئینہ ہو کہ... ''شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں''۔ وہ اس سے زیادہ نہ سوچ سکا۔

''میں اس سے کہہ رہا ہوں اس مصیبت سے جان چھڑا لے۔ مگر یہ ہے کہ عجیب عورت ہے۔ مطلب اس حالت میں بھی اس کو محبت کی نشانی کی پڑی ہے۔''

وہ بے چینی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس حالت میں جب عورت کو محبت کی، سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اسے ذلیل کر رہا تھا، کچوکے لگا رہا تھا۔

''مجھے بتاؤ تم......لوگ کیا کہیں گے؟ دنیا کیا نام دے گی اس بچے کو؟ اور اگر میں اس سے شادی کر بھی لیتا ہوں تو بھی بدنامی کا داغ تاعمر ہمارے ساتھ رہے گا۔ تم ہی اس کو سمجھاؤ یہ راضی ہو جائے۔ میری بات تو اس کو سمجھ میں نہیں آنے والی۔''

''میں سمجھتا ہوں......''

اس نے جنید کو حیرت سے دیکھا اور دل ہی دل میں سوچا کہ ''ایسی غلطی کرتے وقت بھی مجھ سے پوچھا تھا۔'' مگر وہ بس جنید کو دیکھ کے رہ گیا۔

''ہاں کیوں کہ میری باتیں اس کی سمجھ میں آنے والی نہیں ہیں۔'' زہر آلود نظروں سے نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے مرتضیٰ کچھ کہتا وہ روتے روتے خود ہی بول پڑی۔

''ٹھیک ہے جیسا تم کہو گے ویسا کروں گی مگر تم ......تم مجھ سے شادی تو کرو گے نا؟'' اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو پھر سے امنڈ آئے۔

وہ اٹھ کر اس کے مقابل جا بیٹھا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا۔

''دیکھو میری جان فی الحال اس مسئلہ سے جان چھوٹ جائے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب پہلے جیسا

ہو جائے گا۔ مجھے ایک سال کی مہلت دے دو۔ میں تمہارے علاوہ کسی سے شادی کر ہی نہیں سکتا۔ بلکہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں بہت پریشان ہوں تم سمجھو اس سچویشن کو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں سمجھ رہی ہوں۔ مگر اپنی بات پر پلیز قائم رہنا۔''

''تم بھروسا رکھو مجھ پر۔ میں کبھی اپنی کسی بات سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔'' وہ اپنے ہاتھ کی گرفت اس کے ہاتھ پر مزید سخت کرتے ہوئے بولا۔

نیلم کی ایک ہاں نے جنید کے کندھوں سے منوں بوجھ اتار دیا تھا پھر وہ تینوں بیٹھ کر مسئلے کا حل سوچنے لگے۔

☆......☆

نیلم کی دوست شہلا کی ایک کزن نرس تھی۔ اس وقت وہی مسیحا تھی پہلے تو اس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ یہ کیس نہیں لے گی مگر جب اسے منہ مانگی قیمت کی آفر کی گئی تو مان گئی مگر اس حد تک کہ وہ نیلم کو دوا اور انجکشن دے کر وہاں رکے گی نہیں۔ نیلم کا وقت زیادہ گزر چکا تھا۔ اس صورتِ حال میں موت کا خطرہ بھی ہوسکتا تھا اس لیے وہ بعد کی ذمہ داری نہیں لینا چاہتی تھی۔

نیلم فیصلہ کر چکی تھی تو اس نے بعد کے خطرے کو پسِ پشت ڈال کر محبوب سے وفا کی خاطر یہ شرط مان لی اور چپ چاپ جنید کے اشاروں پر ناچنے لگی۔

اگلے روز وہ ایک بار پھر گھر سے شہلا کے گھر جانے کا کہہ کر نکلی پھر شہلا اور اس نرس کے ہمراہ اسی فلیٹ پر آگئی۔ جنید اور مرتضیٰ پہلے سے منتظر تھے۔ نرس اپنے وعدے کے مطابق اس کو انجکشن اور دوائیاں دے کر چلی گئی۔

اب کمرے میں بس شہلا اور جنید تھے۔ جبکہ مرتضیٰ بند کمرے کے باہر برآمدے میں انتظار کرتے ہوئے کبھی بے چینی سے ٹہلنے لگتا تو کبھی بیٹھ جاتا۔

اس بند کمرے کے اندر محبت کے بعد تحفے میں ملنے والی اذیت کا نیا دور شروع ہو چکا تھا۔ جس کے بارے میں پڑھا یا سنا جا سکتا ہے۔ دیکھنا چھوٹے دل والوں کے بس کا کام نہیں۔

نیلم کے چہرے کا رنگ گرگٹ کی طرح بدلنے لگا۔ ہونٹ نیلے خشک ہو چکے تھے۔ اس کا سارا وجود تھر تھر کانپ رہا تھا اور جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ جیسے کسی نے پائپ لگا کر پانی پھینکا ہو مگر اس کے باوجود وہ کمال ضبط کیے ہوئے تھی۔ اپنی ہر چیخ روک رہی تھی۔

محبت کی دل نشیں راتوں کا انجام اس قدر خوفناک تھا کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے مگر ان کربناک لمحوں میں بھی جنید کے چہرے پر اس قدر سفاکی تھی۔ وہ میکانکی انداز میں اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ جیسے نجات کی گھڑی کا منتظر ہو۔

نیلم نے ابھی بھی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ جیسے ہی وہ چیخنے پر آتی جنید اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا تھا۔

نرس کے چلے جانے کے بعد سارے کام شہلا کر رہی تھی پھر کچھ ہی دیر میں یہ معاملہ حل ہوگیا۔ گویا سر سے کے ٹو کا پہاڑ اتر گیا۔

گوشت پوست کے اس مردہ چھوٹے سے کچے سے وجود کو شہلا نے گتے کے سرخ رنگ کے ڈبے میں منتقل کیا۔ جنید نے وہ ڈبہ اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر بیٹھا مرتضیٰ بھی اس کو ہاتھ میں ڈبہ اٹھائے تیزی سے نیچے جاتا ہوا دیکھ کر پُرسکون ہوگیا۔

شہلا نیلم کی حالت درست کرنے لگی۔ جبکہ بے ہوش پڑی نیلم اس سنگ دل کی نام نہاد محبت کی نشانی کو آخری نظر دیکھ بھی نہ پائی۔

☆......☆

وہ ان دنوں پاکستان آیا تھا۔ پاکستان پہنچ کر اس نے اپنی چھوٹی بہنوں کی شادی کی تھی۔ اسی دوران اس کی چند پرانے دوستوں سے ملاقات ہوئی تو اسے پتا چلا کہ جنید نے بھی شادی کرلی ہے۔ اسے سن کر خوشی ہوئی کہ جنید نے محبت کی شادی کی ہے۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ بالآخر لیلیٰ مجنوں کی محبت کا خوشگوار اختتام ہوگیا ہے۔

اس روز وہ شاپنگ سینٹر سے کچھ ضروری چیزیں لے کر ریسپشن پر آیا۔ قریب کھڑی ایک عورت کے وجود نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ اسے پہچاننے میں کچھ تاخیر ہوئی مگر وہ غلطی پر نہ تھا۔

''یہ وہی لڑکی ہے۔'' وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔

جسم موٹا بدھا، رنگ کالا، رخسار پر جگہ جگہ گہری جھائیاں، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور لب۔ لب نہ لال نہ کالے نہ گلابی۔ جیسے زمین کو پانی نہ ملے تو جگہ جگہ سے پھٹنے لگتی ہے ایسے ہی لبوں پر اگر مسکراہٹ کا تبسم حد بکھرے تو وہ سوکھ جاتے ہیں۔ وہ اسے دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرایا، اور سوچنے لگا کہ یقیناً جنید نے بچوں کی لائن لگوادی ہوگی۔ تب

ہی تو بھابی کی یہ حالت ہوگئی ہے۔

وہ اس سے پہلے اسٹور سے نکلی۔ وہ بھی جلدی سے اپنا بل پے کر کے اس کے پیچھے لپکا۔

"نیلم بھابی۔" اس نے پیچھے سے آواز لگائی تو نیلم نے بے ساختہ قدم روک دیا۔

"بھابی......!" وہ زیرلب بڑبڑائی۔

پھر واپس پلٹی پہلے تو اس نے اسے پہچانا ہی نہیں پھر شناسائی کی لہر اس کے چہرے پر ابھری۔ ساتھ ہی خوف کے آثار بھی نمایاں ہوئے۔ اس نے ایک جھرجھری لی۔ جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ لیا ہو مگر وہ اپنے حواسوں میں واپس آ گئی۔

"آپ......آپ کہاں تھے......" وہ تھکے تھکے انداز میں مرتضیٰ کو دیکھ کر مسکرائی۔

"وہ کہاں ہے؟" اس نے اس کا جواب دینے کی بجائے سوال کیا۔

"وہ کون؟" وہ انجان بنی۔

"بھئی جنید اور کون۔"

وہ ساکت ہو کر خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ پھر سے بولنے لگا۔

"میں تو کچھ دنوں سے اسی ملک میں ہوں۔ آپ سنائیے کہاں ہوتی ہیں آپ؟ گھر کہاں ہے؟ کہاں مبارکباد دینے آؤں؟ بچے کتنے ہیں آپ کے؟ لگتا ہے سارے کام آپ ہی کرتی ہیں۔ تب ہی اتنی صحت مند ہوگئی ہیں۔" اس نے سارے سوال ایک ساتھ کرتے ہوئے آخری بات پر سر تا پیر نیلم کو دیکھا۔

کچھ لمحے وہ اس کے سوالوں کے جواب نہ دے پائی پھر تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔ "پتا نہیں آپ کس جنید کی بات کر رہے ہیں۔ میں ابھی بھی نیلم صدیقی ہی ہوں۔ آج کل یہاں ایک این جی او کے ساتھ کام کرتی ہوں۔ یہاں قریب ہی ایک سوسائٹی میں اپنی والدہ کے ہمراہ رہتی ہوں۔"

...وہ کہہ کر چند لمحے رکی۔ اس نے مرتضیٰ کا چہرہ بے بسی سے دیکھا۔ عجیب سی بے بسی...... جس میں کچھ بھی تو نہیں تھا سوائے خالی پن کے۔ جنید کو سوائے خالی خولی بے بسی اور گہرے پچھتاوے کے اور کچھ بھی تو اس کے چہرے پر دکھائی نہ دے رہا تھا۔

"میں......میں چلتی ہوں۔ اللہ حافظ......" اس نے چادر کے پلو سے ماتھے پہ آیا پسینا پونچھا پھر چپ چاپ وہاں سے چل دی۔ جبکہ مرتضیٰ کو اتنی زور کا جھٹکا لگا جیسے بجلی کی ننگی تاروں نے چھو لیا ہو۔

کیونکہ اس واقعے کو چھ سال بیت گئے تھے اور ان چھ سالوں میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔

نیلم نے شادی نہیں کی۔ جنید کے دیے گئے وعدے کے مطابق اس نے ایک سال انتظار کا سوچ کر ایک نجی سرکاری ادارے میں نوکری شروع کر دی۔ اس کے بعد نیلم کبھی اس سے فلیٹ پر ملنے نہیں گئی۔ کچھ مہینوں بعد مرتضیٰ کمپنی کی طرف سے ملک سے باہر چلا گیا۔ جنید بھی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد ملک سے باہر چلا گیا۔ فلیٹ پر تالا لگ گیا۔ جیسے نیلم کی کھنڈر نما زندگی میں زنگ آلود قفل پڑ گئے۔ نیلم کی چھوٹی بہن کی شادی ہوگئی مگر نیلم ہر بار شادی کے نام پر ٹال مٹول کرتی رہی۔ اس ٹال مٹول میں بالآخر 6 سال بیت گئے۔

وہ وہیں ساکت کھڑا اس کو جاتا دیکھ رہا تھا۔ ان گزشتہ چھ سالوں کا موازنہ کر رہا تھا۔ نیلم نے چلتے چلتے رک کر ایک ٹیکسی کو ہاتھ دیا۔ پھر اس پر بیٹھ گئی۔ ٹیکسی کچھ ہی دیر میں نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

آج چھ سال پہلے گزرا ایک ایک لمحہ اس کے دماغ میں گردش کرنے لگا۔ ایک دل فریب حسینہ کی چھ سال پہلے اس کے فلیٹ پر گونجی چیخیں آج اس کے کان پھاڑنے لگیں۔

"کون تھا مجرم اس کا؟ اس کی بھری جوانی کا؟ اس کی پوری زندگی کا۔ اس کے چہرے پر پھیلی بے بسی اور پچھتاوے کا؟"

"...جنید جمائی مرتضیٰ یا وہ خود......"

اپنے آپ سے وہاں کھڑے کھڑے بہت سے سوال کر چکا۔ جن کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس کے کانوں میں بس نیلم کی چیخیں گونجتی رہیں۔ صرف چیخیں۔ اس کا دل چاہا دوڑ کر اسے کو ہاتھ سے پکڑ لے اور اس سے کہے کہ۔ وہ تو دوشیزہ تھی کہ "شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز"۔

مگر وہ چپ چاپ سر جھکا کر بھاری قدم لیے وہاں سے چل پڑا۔ اس لیے کہ اس پورے منظر نامے میں اصل غلطی کیوپڈ کی تھی۔ کیوپڈ تیر چلا کر دو دلوں کو گھائل کرتا ہے پھر لڑکی خود اپنا نقصان کرا لیتی ہے۔ کاش لڑکیاں موم کی بجائے پتھر جیسی سخت ہوتیں۔



کام کا بندہ

محترم ایڈیٹر

السلام علیکم!

بزرگوں کا کہنا تھا کہ نیکی کر دریا میں ڈال مگر میرے ساتھ بالکل الٹ ہوا ہے۔ میں نے نیکی کی تو وہ گلے میں آگئی۔ یہ سب کیسے اور کیوں ہوا اس کی تفصیل میں نے لکھ دی ہے اگر پسند آجائے تو نزدیکی شمارے میں جگہ دے دیں۔

خورشید احمد
(کراچی)

اس محلے میں کئی فروٹ بیچنے والے تھے۔ جو اپنے ٹھیلے لگائے رکھتے۔ اس ٹھیلے والے سے میرا واسطہ اس طرح پڑا کہ ایک شام میں ہوٹل میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا اس بات کا رونا رو رہا تھا کہ اس محلے میں فروٹ دوسری جگہوں سے بہت مہنگے ہیں۔ میں کسی اور جگہ کیلے یا سیب وغیرہ کے دام معلوم کرتا ہوں تو وہ کچھ اور ہوتے ہیں اور جب اپنے علاقے میں آتا ہوں تو کچھ اور ہوتے ہیں۔

''ہاں یار! یہاں زیادہ تر ایسے ہی ہیں لیکن تم نذیر سے فروٹ لیا کرو۔'' ایک دوست نے کہا۔

''وہ کون ہے؟''

''تم نے آئس کریم کی دکان دیکھی ہے نا۔ اس کا ٹھیلا اس کے سامنے ہی ہوتا ہے۔ تم ایک بار اس کے پاس چلے جاؤ تو دل خوش ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے یار! میں ضرور جاؤں گا کیونکہ جب تک میں کچھ پھل نہ کھالوں مجھے نیند نہیں آتی۔ رات کا کھانا تو میں کھاتا نہیں ہوں۔''

رات کا کھانا میں اس لیے بھی نہیں کھاتا تھا کہ اکیلی زندگی گزر رہی تھی۔ گھر والے دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ میں نوکری کی تلاش میں کراچی آیا تھا۔ جیسی میں چاہتا تھا ویسی جاب تو نہیں ملی تھی لیکن کسی حد تک آسرا ہو گیا تھا لیکن میں مطمئن ہو کر نہیں بیٹھا تھا۔ اپنی سی وی مختلف جگہوں پر بھیجا کرتا تھا۔ لوگوں سے کہتا رہتا تھا کہ کسی طرح بھی ہو، ایک اچھی سی جاب ہو جائے تو پھر ایک پُرسکون... زندگی گزر جائے۔ گھر والوں کو بھی بلالوں گا۔ ہوٹل کا کھانا کھا کھا کر صحت تباہ ہو گئی ہے اسی لیے میں پھلوں پر دھیان دینے لگا ہوں۔

اس رات.... گھر کی طرف واپس جاتے ہوئے میں نے اس پھل والے کو آزمانے کا فیصلہ کرلیا جس کی تعریف سن چکا تھا۔ وہ آئس کریم کی دکان کے سامنے اپنا ٹھیلا لگائے کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''نام کیا ہے تمہارا؟''

''کیوں بابو جی۔'' وہ مسکرادیا۔ ''مجھ غریب کے نام سے کیا لینا ہے تم کو؟''

''ارے بھائی میرے ایک دوست نے تمہارے بارے میں بتایا تھا کہ اگر فروٹ لینا ہو تم سے لیا کروں۔'' میں نے کہا۔

''بڑی مہربانی جناب۔'' اس نے کہا۔ ''بتائیں کیا خدمت کروں آپ کی۔''

''یہ سیب کیا حساب ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے جناب آپ سے کیا حساب کتاب ہے جو مرضی ہو وہ دے دیں۔''

''پھر بھی تم نے کوئی قیمت تو رکھی ہو گی نا۔''

اس نے دام بتا دیے۔ وہ اتنے نہیں تھے جتنے دوسرے ٹھیلے والے بتایا کرتے تھے۔ خوشگوار حیرت ہوئی تھی کہ ابھی بھی ایسے ایماندار لوگ موجود ہیں جن کے نزدیک صرف منافع ہی سب کچھ نہیں ہوتا بلکہ وہ دوسروں کی جیب کا بھی خیال رکھتے ہیں۔

اس نے سیب تول کر دے دیے۔ میں نے قیمت ادا کی اور جب جانے لگا تو اس نے آواز دی۔ ''بابو صاحب ایک منٹ۔''

میں رک گیا۔ اس نے ٹھیلے سے دو تین سیب اٹھا کر میرے شاپر میں ڈال دیے۔ ''یہ لیں صاحب یہ میری طرف سے۔''

دوست نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس سے سامان لے کر دل خوش ہو جائے گا۔ اس نے زیادہ دے کر میرا دل خوش کر دیا تھا۔ اسی وقت فیصلہ ہو گیا کہ اب میں صرف اسی سے پھل لیا کروں گا اور اس کے بعد میں اسی سے پھل لیتا رہا۔ اس کا یہ رویہ صرف پہلے دن کے لیے نہیں تھا بلکہ جب بھی اس کے پاس جاتا وہ اسی طرح کچھ پھل زیادہ دے دیا کرتا تھا۔ میں اس کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ کمال کا آدمی تھا۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔ ''یار نذیر! تم ایسا کیوں کرتے ہو، اب تو میں تمہارا مستقل گاہک ہو ہی گیا ہوں۔ پھر تم زیادہ سامان کیوں دے دیتے ہو۔''

''بابو جی میں آپ کو ایک بات بتا دوں۔ بہت گر کی بات ہے ہمیشہ یاد رکھیے گا۔''

''ضرور بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

''دیکھیں صاحب! میں جو کچھ چیزیں آپ کو اوپر سے دیتا ہوں اس سے مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن اس سے یہ ہوتا ہے کہ خدا میرے سامان میں برکت دے دیتا ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ پھر میرے گاہک کا کہیں اور جانے کو دل نہیں چاہتا۔ وہ گھوم پھر کر میرے ہی پاس آتا ہے۔ جیسے آپ میرے پاس آرہے ہیں۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' میں نے اس کی تائید کی۔ ''یہ تم نے بہت پتے کی بات بتادی ہے۔''

تو اس طرح سلسلہ چلتا رہا۔

اسی دوران ایک آفس سے میری جاب کا بلاوا آ گیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں میری تمنا تھی کہ میری جاب ہو جائے۔ وہ ایک بہت بڑی فرم تھی۔ اس کی سیلری کا اسکیل بھی بہت زبردست تھا۔ میں کئی بار پہلے بھی اس فرم میں اپنی سی وی دے چکا تھا لیکن پہلے کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اب ایک عرصے کے بعد جواب آیا تھا کہ میں آکر انٹرویو دے جاؤں۔ میں نے اس دن خدا کا شکر ادا کیا اور انٹرویو کے لیے پہنچ گیا۔

وہ ایک سخت مزاج انسان تھا۔ اس نے بڑے ٹیڑھے قسم کے سوالات کیے تھے لیکن میں بھی اس کے سوالوں کے جواب دیتا چلا گیا جس سے وہ مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے میری سیلری چالیس ہزار مقرر کر دی تھی۔

میری خوشی کا کیا ٹھکانا ہو سکتا تھا۔ جہاں میں کام کر رہا تھا وہاں سے مجھے بیس ہزار ملتے تھے اب اچانک دگنے ہو گئے تھے۔

''مسٹر خورشید! ہم نے آپ کو رکھ لیا ہے۔ اب یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ اپنے کام میں کتنی محنت کرتے ہیں۔ ہمارا اصول کچھ الگ ہے، ہمیں ڈگری وغیرہ کی زیادہ پروا نہیں ہوتی۔ ہم صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کام کیسا اور کتنا ہو رہا ہے۔''

''اس کی طرف سے کوئی شکایت نہیں ہوگی سر۔''

''آپ کو جس ڈیپارٹمنٹ میں رکھا جا رہا ہے اس میں صرف دو آدمی ہوں گے۔ ایک آپ اور دوسرا جو پہلے سے کام کر رہا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون کرتے رہیں گے۔''

''یس سر پورا پورا تعاون ہوگا۔''

''ٹھیک ہے آپ کل سے ڈیوٹی پر آجائیں۔ فخر صاحب آپ کو کام سمجھا دیں گے۔''

فخر صاحب اس فرم کے جنرل منیجر تھے۔ ایک نیک انسان۔ اسی دن پتا چلا کہ اس دفتر میں لڑکیوں کی بھی معقول تعداد موجود تھی۔ ان کا ہال الگ تھا۔ وہ اسی ہال میں بیٹھا کرتیں۔ دفتر کا ماحول بہت شاہانہ سا تھا۔ اے سی لگے ہوئے، آرام دہ کرسیاں اور میزیں۔ عمدہ اسٹیشنری۔ ایک کینٹین بھی تھی۔ لوگ لنچ وہیں کیا کرتے اور بھی بہت آسانیاں تھیں اور سب سے بڑی آسانی یہ تھی کہ دفتر کی گاڑیاں بھی تھیں۔ اسٹاف ان ہی گاڑیوں پر آیا جایا کرتا تھا۔

میرے ساتھ کمرے میں بیٹھنے والے کا نام بابر تھا۔ وہ ایک سست انسان تھا۔ کسی درجے کا کاہل بھی تھا لیکن ملنسار انسان تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے میرا استقبال کیا تھا۔ اسی دن پورے دفتر والوں سے میری ملاقات ہوگئی تھی۔ وہ سب کے سب خوش اخلاق لوگ تھے، پانچ لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے تسنیم بہت اچھی لگی تھی۔ اس کے چہرے پر بلا کی نرمی اور ملاحت تھی۔ اس نے جس انداز سے مجھے دیکھا تھا وہ انداز دوستی کے جذبات کا تھا یا ہمدردی کا تھا۔

بہر حال وہ پہلا دن میرا بہت اچھا ہوا تھا۔ اس شام دفتر سے واپسی پر میں پھل والے نذیر کے پاس پہنچ گیا۔ اسے جب میں نے یہ خبر سنائی تو وہ بھی بہت خوش ہوگیا۔ اس

نیند بھی اہمیت رکھتی ہے

کم نیند ہمارے ہیجانات کو بہت نقصان پہنچاتی ہے اگر کوئی پریشان کن بات ہو جاتی ہے تو اس پر قابو پانے میں ہمیں شدید دشواری ہوتی ہے بالکل اسی طرح جیسے تھکے ہوئے بچے ایسی صورتِ حال میں پریشان ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے خود اپنے اسپتال میں اپنے اور اپنے ساتھی ڈاکٹروں پر تجربہ کیا اور نیند سے محروم رکھنے کے بعد ان کے رویے میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا۔ ''میں نے انتہائی خوش مزاج اور بااخلاق نوجوان ڈاکٹروں کو نرسوں اور مریضوں پر غصے میں دہاڑتے ہوئے پایا۔ ان علامات کا سبب نیند سے محرومی اور تکان کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

مرسلہ: ڈاکٹر سعیدہ شاہ، کراچی

نے اپنا مشورہ دہرایا۔ ''خورشید صاحب میری وہ بات یاد رکھیے گا۔ کامیابی کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ دوسرے کے پلڑے میں زیادہ وزن ڈال دو۔''

''ہاں بھائی! تمہاری یہ نصیحت ہمیشہ یاد رہے گی اور میں اس پر عمل کرنے کی کوشش بھی کروں گا۔''

دوسرے دن میں اپنے وقت پر دفتر پہنچ گیا۔ سب اپنی اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گئے۔ میں نے دیکھا کہ میرے کمرے میں بیٹھنے والا بابر کچھ الجھا ہوا تھا۔ پریشان سا دکھائی دے رہا تھا۔ ''کیا ہو گیا بابر صاحب۔'' میں نے آواز دے کر پوچھا۔

وہ ایک رجسٹر لے کر میرے پاس آگیا۔ ''خورشید صاحب ایک الجھن آگئی ہے۔''

''بتائیں شاید میں کسی کام آسکوں۔''

''ارے کوئی خاص کام نہیں ہے۔ بس مسئلہ وقت کا ہے مجھے اپنے بھائی کو سی آف کرنے کے لیے ایئرپورٹ جانا ہے۔ اب اس رجسٹر کے معاملات سلجھاتا رہا تو جا نہیں سکوں گا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں جلدی سے بولا۔ ''میں ہر وقت حاضر ہوں۔''

اس وقت مجھے فروٹ والے کی بات یاد آگئی تھی جس نے کہا کہ ہر دلعزیز بننا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ دوسرے کے پلڑے میں زیادہ وزن ڈال دو۔ اتفاق سے ایک سنہری موقع ہاتھ آرہا تھا۔

اس نے اپنا رجسٹر میرے حوالے کردیا، کوئی خاص کام نہیں تھا۔ میں بڑی آسانی سے کرسکتا تھا۔

وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے پہلے اسی کا کام نمٹا دیا تھا۔ میں نے اس دفتر کے پلڑے میں زیادہ وزن ڈال دیا تھا۔ یہ میرا پہلا قدم تھا۔ ابھی اور بہت آگے جانا تھا۔ اس کے بعد بھی ایسا ہوتا رہا بلکہ میں نے اسے اور آسانی بھی دے دی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''یار بابر میں یہ محسوس کررہا ہوں کہ تم آج کل کچھ زیادہ مصروف ہوتے جارہے ہو۔''

''ہاں یار!'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کروں۔ تم کو تو معلوم ہے نا کہ میرا بھائی ملک سے باہر گیا ہے۔''

''ہاں تم نے بتایا تھا۔''

''بس بھائی اس کے جانے کے بعد گھر کی ساری ذمے داری میرے کندھوں پر آگئی ہے۔ دنیا بھر کے کام ہیں۔ اس طرف دفتر کے کام ہیں۔ کروں تو کیا کروں۔''

''میرے دوست! دفتر کے کاموں کی طرف سے پریشان نہ ہو۔ میں کس لیے ہوں۔ تمہارے سارے کام میں کرسکتا ہوں۔ تم کو ذرا بھی پریشانی نہیں ہوگی اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔''

''سچ کہہ رہے ہو یار۔''

''ظاہر ہے تمہاری پریشانی میری پریشانی ہے۔ تم اس دفتر میں میرے ساتھی ہو مجھ سے جو ہوگا وہ کروں گا۔''

دفتر میں زندگی بہت شاندار تھی۔ اس لڑکی تسنیم سے بھی میری دوستی ہوگئی تھی لیکن ہم نے دفتر والوں سے دوستی چھپا کر رکھی تھی۔ شام کے بعد دفتر سے فارغ ہوکر ہم ایک اسٹاپ پر پہنچ جاتے۔ اس کے بعد ہم ایک ریستوران میں جاکر بیٹھ جاتے۔ ہمارے درمیان دنیا بھر کی باتیں ہوتی رہتیں۔

یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ہم ذہنی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے تھے۔ ایسا ہی ہوا ہے انسان کے پاس جب کچھ نہیں ہوتا تو پھر کچھ نہیں ہوتا لیکن جب ملنے والا ہوتا ہے تو نعمتیں ملتی ہی رہتی ہیں۔

ہمارے درمیان اب کوئی راز نہیں رہا تھا۔

میں یہ جانتا تھا کہ وہ تین بہنیں ہیں۔ دو بھائی ہیں۔ ایک بھائی دبئی میں ہے۔ اس کے والد ریٹائر ہوچکے ہیں۔ گھر بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ اس کے علاوہ اس کے مزاج اور اس کی طبیعت کا پتا چل گیا تھا اور اسے یہ معلوم تھا کہ میں کون ہوں اور کس طرح اس شہر میں تنہا زندگی گزار رہا ہوں اور رات کے وقت کھانے کی بجائے صرف فروٹ کھایا کرتا ہوں۔ یہ سن کر وہ بہت دیر تک ہنستی رہی تھی۔ ''فکر مت کرو۔ میں نے کوکنگ کی کلاسز لے رکھی ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''مزے مزے کے کھانے بنا کر کھلایا کروں گی۔''

''تسنیم! ایسے خواب مت دکھاؤ میری طرف سے تو سب کلیئر ہے۔ یعنی میرے گھر والوں کو ہمارے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ مسئلہ تمہارے گھر والوں کا ہے۔''

''تم ان کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے اپنے گھر والوں سے تمہارا ذکر کردیا ہے۔ وہ سب میری مرضی پر خوش ہیں۔''

اب کیا چاہیے تھا ایک دن اس نے کہا۔ ''خورشید! سب ٹھیک ہے بس کسی طرح تم اسی دفتر میں ترقی کرتے چلے جاؤ تو مزہ آجائے۔''

''تم فکر مت کرو۔'' میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''ترقی کرنے کا ایک گر میرے ہاتھ میں آگیا ہے تم دیکھ لینا۔ باس کچھ دنوں کے بعد مجھے سر آنکھوں پر بٹھائے گا۔''

اب میرا کام یہ رہ گیا تھا کہ میں کسی طرح باس کی خوشنودی حاصل کرسکوں۔ تسنیم کے ساتھ ابھی تک یہی معاملہ تھا کہ ہم دونوں چھٹی کے بعد اسٹاپ کی طرف چلے جاتے۔ اس کے بعد کسی ہوٹل میں جاکر بیٹھ جاتے۔ فروٹ والے کی طرف بھی جانے کا موقع کم ملتا تھا لیکن جب بھی جاتا، بہت سے فروٹ خرید لیتا۔ کیوں کہ اسی کے مشورے پر عمل کررہا تھا۔

دفتر میں، میں نے بابر کو اس کے کاموں سے بے نیاز کردیا تھا اور میری کوشش یہ تھی کہ کسی طرح باس تک یہ بات پہنچ جائے کہ میں دفتر کی بہتری کے لیے کتنی کوششیں کررہا ہوں۔ ایک دن میں دفتر پہنچا ہی تھا کہ باس نے مجھے اپنے کمرے میں بلالیا۔

جاب جوائن کرنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے باس کے کمرے میں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔

باس نے مسکراتے ہوئے میرے سلام کا جواب دیا

تھا۔ ”بیٹھ جائیں خورشید صاحب۔“ اس نے کہا۔

”تھینک یو سر۔“ میں اس کا شکریہ ادا کر کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”مسٹر خورشید۔“ اس نے کہا۔ ”یہ میری عادت ہے کہ میں اپنے اسٹاف کے ہر ممبر کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہتا ہوں کہ وہ کیسا جا رہا ہے اس کی کارکردگی کیسی ہے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے سر، اس طرح دفتر میں ڈسپلن برقرار رہتا ہے۔“

”تمہارے بارے میں رپورٹ آئی ہے کہ تم کو کام کرنے کا شوق ہے تم دل لگا کر کام کرتے ہو۔“

”ارے سر! یہ تو میں اپنا ہی آفس سمجھ کر کام کرتا ہوں۔“ میں نے انکساری دکھائی۔

”نہیں یہ حقیقت ہے اسی لیے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ ہمارا دفتر بلاوجہ ایک آدمی کی سیلری برداشت کر رہا ہے، یعنی بابر کی۔ تم اس کا کام کر کے دیا کرتے ہو۔ اب کچھ چھپانے کی کوشش مت کرنا۔ میں سب جانتا ہوں اسی لیے میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ بابر کو فارغ کر دیا جائے جو کام ایک آدمی کر سکتا ہے۔ اس کے لیے دو دو آدمیوں کی کیا ضرورت ہے۔ اب اس کا کام بھی تم کیا کرو گے۔ کیا یہ منظور ہے؟“

میرا دل دھڑک اٹھا۔ بے ساختہ فروٹ والے کے لیے دل سے دعائیں نکلنے لگیں۔ کیا بات بتائی تھی اس نے کہا کہ پلڑے میں وزن زیادہ ہو تو انسان کی قدر ہو جاتی ہے۔ میرے پلڑے میں اتنا وزن ہو گیا تھا کہ ایک بندے کو فارغ کیا جا رہا تھا۔

”سر! اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ باس ہیں۔“

”تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ باس جلدی سے بولا۔ ”اب ایک بات بتاؤ۔ کام زیادہ ہے، کیا تمہارے پاس اتنا وقت ہو گا کہ تم دیر تک بیٹھ کر سارے کام نمٹا سکو۔“

”کیوں نہیں باس۔“ میں نے کہا۔ ”میں ہر حال میں اپنا کام نمٹا کر جایا کروں گا۔“

”بس اس دفتر کو تم ہی جیسے آدمی کی ضرورت تھی۔ اب جاؤ گڈ لک۔“

دوسرے ہی دن بے چارے بابر کو فارغ کر دیا گیا۔

میں اس کے سامنے شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ بس یہ احساس ہو رہا تھا کہ بے چارہ میری وجہ سے نوکری سے نکالا گیا ہے۔

اس شام کو میں نے اس فروٹ والے سے نہ صرف بہت سے فروٹ بھی خرید لیے بلکہ اس کے لیے مٹھائی بھی لے گیا تھا۔

”کیا بات ہے خورشید صاحب۔“ اس نے پوچھا۔ ”یہ مٹھائی کس خوشی میں آئی ہے۔“

”بھائی نذیر تمہاری وجہ سے میری راہیں کھلنے لگی ہیں۔ میں نے تم سے جو سبق سیکھا ہے۔ اس کا بہت اچھا اثر ہوا ہے۔“

”چلو جی مبارک ہو تم کو۔“

تسنیم کو دوسری شام میں اپنے ساتھ ہی ویولے گیا تھا جہاں ہم بہت دیر تک بیٹھے رہے تھے۔ زندگی اچانک ہی حسین ہو گئی تھی۔

لیکن زندگی کا یہ حسن صرف دو ایک دنوں کے لیے تھا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ میں رات دس گیارہ بجے تک دفتر میں جھک مارتا رہتا ہوں۔ اپنے ساتھ دوسرے آدمی کا کام بھی کرنا پڑتا ہے۔ تسنیم سے باہر کی ملاقات کو مہینوں ہو گئے ہیں۔ فرصت ہی نہیں ملتی۔ اس فروٹ والے کی طرف بھی جانا بھول گیا ہوں۔

ایک دن تسنیم نے مجھ سے کہا۔ ”خورشید تم میرے گھر تو آؤ، ایسا نہ ہو کہ بہت دیر ہو جائے۔“

اسے کیا جواب دیتا کیونکہ میں ایک نادیدہ جال میں پھنس گیا تھا۔ اتنی ہی تنخواہ میں رات دیر گئے تک رکنا پڑ رہا تھا۔ کام کے بوجھ سے دماغ سن ہونے لگا تھا۔ اب تو فروٹ والے سے بھی وحشت ہونے لگی ہے۔ میں دوسروں سے فروٹ لیا کرتا ہوں۔ چاہے وہ کم ہی دیتے ہوں۔ مہنگا دیتے ہوں۔ اب میں کسی کی نصیحت قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ آپ بھی میری اس بپتا سے سبق سیکھیں اور دفتروں میں اوور اسمارٹ بننے کی کوشش نہ کریں اور یہ سبق یاد رکھیں کہ اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا۔

آپ کو میری خستہ حالی دیکھنی ہو تو کسی دن دفتر آ جائیں۔ آپ کو ایک آدمی اپنی کمر تھامے کرسی پر بیٹھا ہوا نظر آ جائے گا اور اس قسم کا جو بھی دکھائی دے سمجھ لیں کہ وہ میں ہوں۔



میں اسپتال کے کاریڈور میں بیٹھا تھا۔ میرے ایک دوست اویس کی طبیعت کافی دنوں سے خراب تھی۔ اس کے گھر میں کوئی مرد تھا نہیں جو اسے اسپتال تک لے جاتا؛ سی لیے اس نے مجھے فون کیا۔ ہم بچپن کے دوست بھی تھے اور محلّہ دار بھی خبر سنتے ہی میں اس کے گھر پہنچا اور اسے گاڑی میں بٹھا کر اسپتال لے آیا۔ ڈاکٹر نے چیک کیا تو پتا چلا کہ اسے کمزوری ہوگئی ہے۔ اسی وقت اسے داخل کرلیا گیا اور گلوکوز کی بوتل (ڈرپ) لگا دی گئی۔ جب اسے بوتل لگی تو اسے سکون آیا اور وہ سو گیا۔ میں ایک جگہ بیٹھے بیٹھے بور ہوگیا تھا تو کاریڈور میں آگیا۔ ابھی مجھے وہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک زوردار چیخ کی آواز آئی۔ چیخ کی آواز آخری کمرے سے آئی تھی جو اتنی زوردار تھی کہ یہاں تک سنائی دے گئی تھی۔ میں ابھی اپنی جگہ سے اٹھ ہی رہا تھا کہ سامنے سے کوئی بھاگتے ہوئے آرہا تھا اس کے پیچھے دو وارڈ بوائے بھی تھے۔ جب میں نے اس بھاگتے شخص کو قریب سے دیکھا تو میں دہل گیا۔ اس کے پورے جسم پر گڑھے سے پڑے ہوئے تھے جس سے پیپ رس رہی تھی۔ بو اس قدر تھی کہ میرا سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ اس کے جسم پر کئی سوراخ تو اتنے گہرے تھے کہ دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ اتنے میں دونوں

انجام

محترم مدیر سرگزشت

سلام تہنیت

یہ دنیا عبرت سرا ہے اور ہم سبق حاصل نہیں کرتے۔ ان واقعات کو یکجا کر کے لکھنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ لوگ اپنے آپ کو سنبھال لیں، ایسا نہ ہو کہ وقت بھربھری ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسل جائے۔

محمد سجاول خان

(میانوالی)

وارڈبوائے لپکے اور اسے پکڑ کر واپس کمرے میں لے گئے۔ اس کے جسم سے آنے والی گندی بدبو سے بچنے کے لیے دونوں لڑکوں نے چہرے پر ماسک پہن رکھے تھے۔ مگر میں چونکہ ایسے ہی کھڑا تھا اور یہ سب اتنا آناً فاناً ہوا تھا کہ مجھے جیب سے رومال نکالنے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔ میری طبیعت خراب ہونے لگی تھی۔ مجھے ابکائی آئی اور میں باہر کی طرف دوڑا۔ باہر نکلتے ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ الٹی آئی تو طبیعت میں تھوڑا سا افاقہ ہوا۔ میں باہر گیا اور ایک کولڈ ڈرنک کی بوتل پی تب کہیں جاکر دماغ ٹھکانے پر آیا۔ مگر میرے حواس پر ابھی بھی وہ شخص سوار تھا۔ میں واپس اندر آگیا۔ دوست کے کمرے میں گیا تو وہ جاگ رہا تھا۔ اس کی ڈرپ ختم ہونے والی تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے میرے چہرے کی جانب دیکھا تو بولا۔ ”کیا ہوا دانیال تمہارا چہرہ کیوں زرد پڑا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں یار۔ میں نے باہر ایک شخص کو دیکھا اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“

”کون شخص؟“ اویس نے پوچھا۔

”پتا نہیں میں اسے جانتا نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”پھر بھی...... وہ دکھتا کیسا تھا۔“ اویس نے کریدا۔

”یار مت پوچھ۔ اس کے پورے جسم پر کئی سوراخ اور گڑھے پڑے ہوئے تھے جن سے پیپ رس رہی تھی اور اتنی شدید بدبو آرہی تھی کہ دماغ پھٹنے لگا تھا۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”کیا وہ بالکل آخری کونے والے کمرے میں داخل تھا؟“ اویس نے سوچتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں......“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اسے میں جانتا ہوں، اس کا نام امیر حسن ہے اور وہ میرے ننھیال کے گاؤں کا ہے۔“ اویس نے کہا۔

”اسے ایسی کیا بیماری ہے جو اس کی ایسی حالت ہوگئی۔“ میں نے استفسار کیا۔

”یہ ایک بہت لمبی کہانی ہے۔ گھر جاکر آرام سے سناؤں گا۔“ اویس نے ڈرپ کی طرف نظر دوڑائی۔

میں نے دیکھا کہ ڈرپ ختم ہونے کے نزدیک تھی۔ میں اٹھا اور ڈاکٹر کو انفارم کیا۔ ڈاکٹر کے ساتھ موجود نرس نے ڈرپ اتاری اور ڈاکٹر نے اویس کو چیک کیا۔ کچھ ادویات لکھ کر دیں اور ہمیں گھر واپسی کا عندیہ دے دیا۔ میں نے پارکنگ سے گاڑی نکالی اور اویس کو بٹھا کر گھر واپس لوٹ آئے۔ اویس کو اس کے کمرے میں لٹایا اور خود فریش ہونے کے لیے چلا گیا۔ نہا دھو کر آیا تو اویس کی والدہ نے کھانا تیار کر دیا تھا۔ میں نے ڈٹ کر کھانا کھایا اور واپس اویس کے کمرے میں داخل ہوا جہاں اویس پلنگ سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میں اس کے نزدیک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”ہاں تو یار اب بتاؤ اس آدمی کے بارے میں۔“

اویس...... ایک طویل سانس لیتے ہوئے گویا ہوا۔ ”اس شخص کا نام امیر حسن ہے اور وہ میرے ننھیالیوں کے گاؤں کریم آباد سے تعلق رکھتا ہے۔“

اس سے آگے کی کہانی جو اویس نے بتائی وہ کچھ یوں تھی۔

☆......☆

امیر حسن ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا باپ علاقے کا بڑا زمیندار تھا۔ وہ علاقے کی ممتاز شخصیات میں شمار ہوتا تھا۔ لوگوں کو جو بھی مسئلہ ہوتا وہ اس کے پاس ہی آتے اور وہ ان کے مسئلے ہر ممکن طور پر حل کرنے کی کوشش کرتا۔ آنے والے الیکشن میں امیر کا باپ چیئرمین کی سیٹ کے لیے بلا مقابلہ منتخب ہوگیا۔ اس نے گاؤں کی فلاح و بہبود کے لیے بہت سے کام کیے۔ اتنے بڑے گاؤں میں بجلی کی سہولت ناپید تھی، کریم اس گاؤں میں بجلی لے آیا۔ گاؤں سے شہر کی طرف جانے والی خستہ حال سڑک کو دوبارہ تعمیر کرایا۔ گاؤں کے کچے مکانات کو پکے مکانوں میں تبدیل کرادیا۔ کریم کے چار بچے تھے، تین بیٹے اور ایک بیٹی۔ کریم نے سب کی اچھی پرورش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، انہیں زندگی کی ساری سہولیات مہیا کیں۔ اچھی تعلیم بھی دلوائی۔ تعلیم کے لیے اس نے لاہور میں مکان خرید رکھا تھا جہاں رہ کر بچے پڑھ رہے تھے۔

کریم اب 55 سال کا ہوچکا تھا۔ اس کے دو بڑے بیٹے جن میں ایک ڈاکٹر جبکہ دوسرا انجینئر بن چکا تھا۔ ان کی شادیاں کرکے انہیں اپنی مرضی سے الگ رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ بیٹی کا رشتہ آیا تو اس نے بیٹی کو بھی بیاہ دیا۔ لڑکا ڈاکٹر تھا۔ اب اس کے ساتھ چھوٹا بیٹا امیر حسن ہی تھا۔ اپنے بڑے بھائیوں کے برعکس امیر حسن پڑھائی میں بالکل زیرو تھا۔ بھائی ڈاکٹر اور انجینئر تھے مگر وہ انٹرمیڈیٹ بھی مشکل سے پاس کرسکا تھا۔ مگر امیر حسن کو جوئے اور نشے کی لت لگ گئی پھر ان سب سے خطرناک شوق جو اسے لگا وہ کالا جادو تھا۔ دوسروں کو بس میں کرلینے کی طاقت تا عمر جینے کی لذت اور جنات پر حکومت کرلینے کی خواہش میں وہ کالا جادو سیکھ رہا تھا۔ اسے یہ شوق شہر میں رہتے ہوئے لگا تھا۔ اس کے ایک دوست کا باپ

کالے جادو کا ماہر تھا اور بہت سے مظاہرے دکھا چکا تھا۔ امیر اس سے بہت متاثر تھا۔ اس نے جب جامی نامی بندے سے علم حاصل کرنا شروع کیا تو اسے پتا چلا کہ سیکھنے والے کو کڑی آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔

جامی گیلانی (عامل بابا) نے اسے غلیظ اشیا کھلائیں، قرآنی آیات الٹی پڑھائیں (نعوذ باللہ) اسے اسی کا ہی فضلہ کھلایا۔ امیر یہ سارے کام کرتا چلا گیا پھر ایک دن جامی نے کہا۔

''تمہارا کالا علم سیکھنے کا عمل تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ بس اب تمہیں کسی قدیم قبرستان میں سب سے پرانی قبر پر 40 دن کا چلہ کاٹنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے بابا۔ میں آج ہی اپنے گاؤں جاتا ہوں۔ وہاں ایک قدیم قبرستان ہے۔ میں وہاں اپنا چلہ مکمل کرلوں گا۔'' امیر نے سعادت مندی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اور ہاں۔ یاد رکھنا یہ عمل رات کے 12 بجے شروع کرنا اور پورے 40 دن مکمل کرنا بلاناغہ ورنہ اس کا عمل الٹا بھی پڑ سکتا ہے اگر تم نے بیچ میں چھوڑا۔'' جامی نے ہدایت کی۔

''ٹھیک ہے بابا۔'' امیر سر ہلاتے ہوئے اٹھا۔

اس نے اپنا سامان پیک کیا اور گاؤں واپس لوٹ آیا۔ پڑھائی تو صرف بہانہ تھا وہ شہر کا ہی اسی مقصد کے لیے تھا۔

جب وہ گاؤں واپس آیا تو اس کے باپ کو پتا چلا کہ وہ بمشکل انٹرمیڈیٹ ہی پاس کر کے آیا ہے تو اسے بڑی مایوسی ہوئی مگر اس نے یہ سب امیر پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ امیر جس رات گھر آیا اس سے دوسری رات اس نے چلہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب رات کے 12 بجے تو وہ چپکے سے اٹھا اور اپنا سامان اٹھا کر حویلی سے باہر نکلا اور قبرستان کی جانب چل دیا۔ سردیوں کے دن تھے ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ قبرستان جھینگروں کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ ہر طرف ہولناک خاموشی تھی۔ امیر مضبوط اعصاب کا مالک تھا ورنہ عام آدمی تو ڈر کے مارے یہاں قدم بھی نہ رکھتا۔ قبروں کے بیچ میں سے چلتا ہوا وہ اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچ گیا۔ وہاں اس نے ایک دائرہ کھینچا اور اس میں بیٹھ گیا۔ جادو کا سارا سامان بھی اس نے سامنے سجا لیا اور منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ ابھی اسے منتر پڑھتے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اسے چیخ کی آواز آئی۔ امیر بنا رکے منتر پڑھتا رہا۔ اسے جامی نے بتایا تھا کہ اسے روکنے کے لیے روحیں اور شیطانی طاقتیں بھرپور کوششیں کریں گی کہ تم ان پر قابو نہ پالو..... اسی لیے امیر منتر پڑھتا رہا۔ جب منتر ختم ہوا تو وہ اٹھا اپنا سامان سمیٹا اور حویلی کی جانب قدم بڑھا دیے۔ اس وقت رات کے 4 بج رہے تھے۔ وہ آرام سے حویلی میں داخل ہوا اور اپنے کمرے میں جا کے سو گیا پھر روزانہ وہ اسی معمول پر چلنے لگا۔

یہ 38 دن بعد کی بات ہے۔ کریم کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، وہ کمرے سے باہر ٹہل رہا تھا جب امیر حویلی سے باہر نکلا تو کریم نے اسے دیکھ لیا۔ پتا نہیں کیا سوچ کر کریم نے اسے روکا نہیں بلکہ اس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا کہ وہ جا کہاں رہا ہے۔ کریم اس کا پیچھا کرتے کرتے قبرستان جا پہنچا۔ جب وہاں اس نے امیر کو قبر میں اترتے دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ وہ کن چکروں میں پڑ گیا ہے۔ جیسے ہی امیر دائرہ کھینچ کر بیٹھنے لگا۔ کریم چلّایا۔

''رک جاؤ...... یہ تم کیا کر رہے ہو؟''

امیر چونک گیا جب اس نے مڑ کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہاں اس کا باپ کھڑا تھا۔

''تم یہ کن چکروں میں پڑ گئے ہو۔ بند کر دو یہ سب۔'' کریم چلّایا۔

''اب میں یہ سب بند نہیں کر سکتا۔ میں بہت آگے جا چکا ہوں۔''

''دیکھتا ہوں تم کیسے یہ سب کرتے ہو۔ چلو گھر......''

کریم نے امیر کا ہاتھ پکڑا۔ امیر کو جامی کی ہدایات یاد تھیں کہ اگر اس نے چلہ ادھورا چھوڑا تو اس کا انجام برا ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی جگہ جما رہا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کھوپڑی زور سے اپنے باپ کے سر پر دے ماری۔ کریم تیورا کر گرا اور زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے سر سے خون نکلنے لگا تھا۔ امیر آرام سے کھینچے ہوئے دائرے میں بیٹھا اور اپنا چلہ مکمل کرنے لگا......

جب اس نے چلہ مکمل کر لیا تو جا کر باپ کو چیک کیا۔ اس کی نبض نہیں چل رہی تھی۔ چوٹ شدید تھی وہ مر گیا تھا۔ امیر دیر تک وہاں کھڑا اس لاش کو ٹھکانے لگانے کا طریقہ سوچتا رہا پھر اس کے ذہن میں ایک طریقہ آیا اور اس نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆......☆

صبح جب حویلی کے نوکر نے کریم کے دروازے پر دستک دی تو کمرا کھلا تھا۔ اس نے اندر جھانکا تو کریم پلنگ کے کنارے ترچھا لیٹا ہوا تھا۔ اس نے چیخ چیخ کر سب کو جمع کر لیا۔ ہر ایک کو یہی لگا کہ رات کو جب وہ اٹھا ہوگا تو پیر پھسلنے کی وجہ سے اس کا سر پلنگ کے پائے سے ٹکرایا اور وہ مر گیا۔

باپ کے مرنے کے بعد سب کچھ امیر کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے حویلی کو ہی اپنا ٹھکانا بنا لیا۔ اس کے دونوں بھائی

اچھے خاصے امیر تھے، انہیں زمینوں سے بھی کوئی حصہ نہیں چاہیے تھا تو سب کچھ اسی کے نام ہوگیا۔ کریم کے مرنے کے بعد اس گاؤں کا نام کریم آباد رکھ دیا گیا۔

امیر نے اپنا 40 دن کا چلہ مکمل کرلیا تو جامی بابا نے اپنا سارا علم اور کالی طاقتیں امیر کو منتقل کر دیں۔

اب امیر حسن کو وہ سب حاصل ہوگیا تھا جس کی اسے چاہت تھی۔ اس کی شخصیت اب آہستہ آہستہ گاؤں والوں پر کھلنے لگی۔ وہ اب کھل کر نشہ کرتا۔ لوگوں پر ظلم کرتا۔ جو اس کے خلاف آواز اٹھاتا اسے مروا دیتا۔ ایک دن جب وہ بازار سے گزر رہا تھا تو اس نے ایک لڑکی کو دیکھا۔ اسے وہ پسند آگئی اس نے لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس لڑکی کے بارے میں پتا کرایا تو وہ شادی شدہ نکلی اس کا شوہر ایک سیاسی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اس کو زور زبردستی حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ اس کام کے لیے اس نے کالے علم کا سہارا لیا اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوگیا۔ اس نے اپنے علم کے ذریعے صرف اس کے شوہر کو ہی نہیں بلکہ پورے خاندان کو ایک ٹریفک حادثے میں مروا دیا۔ اس کام میں اس کی تابع شیطانی قوتوں نے بھرپور مدد کی۔ شادی کے بعد بھی اس نے غلط کاموں کو نہیں چھوڑا، پہلے تو لوگوں کو یہ پتا نہیں تھا کہ اسے کالا جادو بھی آتا ہے مگر جب لوگوں کو پتا چلا تو دور دور سے بھی لوگ اس کے پاس آنے لگے۔ کسی کو پسند کی شادی کرنی تھی۔ کوئی ساس سے تنگ تھی۔ کوئی راتوں رات ترقی کا خواہشمند تھا۔ غرضیکہ ہر قسم کے لوگ اس کے پاس آتے۔ گاؤں والوں کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ اسے اس کام سے روک سکیں۔ یوں اس نے پتا نہیں کتنے لوگوں کے گھر اجاڑے، کتنی جانیں لیں کتنی ماؤں کی کوکھ اجاڑی۔ جو اس کے ظلم کا شکار ہوئے وہ اس کا کچھ بگاڑ تو نہیں سکتے تھے مگر وہ اللہ سے اس کی بربادی مانگتے تھے۔

کہتے ہیں اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ کسی لاچار و بے بس کی دعا قبول ہوگئی ایک دن جب وہ ایک روح کو قابو کرنے کے لیے منتر پڑھ رہا تھا تو اس سے ایک فاش غلطی ہو گئی۔ ایک ایسی غلطی جس نے اس کی زندگی بدل دی۔ جب وہ منتر کا جاپ کر رہا تھا تو غلطی سے وہ ایک لفظ زیادہ پڑھ گیا جس سے سارا اثر الٹا پڑ گیا۔ جب ایک دن امیر نہا کر باتھ روم سے نکلا تو اسے کاندھے پر خارش ہوئی۔ اس نے خارش کی تو وہ جگہ سرخ سی ہوگئی اور تکلیف ختم ہوگئی۔ اس نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ رات کو بھی اسے پورے جسم پر خارش ہوتی رہی، ساری رات جسم کھجاتے ہوئے گزری۔ پورے جسم پر دانے نکل آئے تھے، اب خارش کرنے سے تکلیف بھی ہوتی تھی مگر خارش کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے شہر جا کر ایک ڈاکٹر کو چیک کرایا۔ اس نے کچھ ادویات اور ٹیوبز لکھ کر دیں جو خارش والی جگہ پر لگانی تھیں۔ اس نے وہ استعمال کیں مگر بے سود۔ اب ان دانوں کی جگہ گڑھے پڑ گئے تھے اور ان سے پیپ رس رہی تھی جن سے شدید بدبو آتی تھی۔ تین دن کے اندر اندر اس کی حالت اتنی خراب ہوگئی کہ اس کے نزدیک بھی نہیں جایا جاتا۔ جگہ جگہ سے اس کا گوشت گل گیا تھا اور ہڈیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کی شادی کو دس سال ہوگئے تھے مگر اس کی ایک بھی اولاد نہیں تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کالا علم کرنے والوں کی اولاد نہیں ہوتی۔ اب اس کا واحد سہارا اس کی بیوی ہی تھی۔ اس نے اسے ایک اسپتال میں داخل کرا دیا۔ مگر اسپتال والوں نے اسے ایک دن رکھنے کے بعد نکال دیا... کیونکہ اس کے جسم کی بدبو کی وجہ سے پورے اسپتال میں کوئی داخل ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ اسے ایک دوسرے اسپتال میں بھاری رقم دے کر داخل کرایا گیا۔ جس روح کو قابو کرنے کے لیے اس نے منتر غلط پڑھا تھا اس نے اس کی بیوی کو بھی مار دیا۔ اب وہ بے آسرا تھا۔

☆......☆

''اور اس سے آگے کی کہانی تمہارے سامنے ہی ہے۔'' اویس نے بات ختم کی۔

اس کی داستان سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میرے جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ امیر پر اللہ کا عذاب دنیا میں ہی نازل ہوگیا تھا۔

اس واقعے کے دو ہفتے بعد مجھے پتا چلا امیر حسن کا انتقال ہوگیا ہے۔ اطلاعات کے مطابق اسے اس اسپتال سے بھی نکال دیا گیا تھا۔ کوئی بھی اسپتال اسے بھاری رقم کے عوض بھی رکھنے کو تیار نہیں تھا۔ امیر مرنے کی دعا مانگتا تھا مگر اسے موت بھی نہیں آرہی تھی۔ اسے ایک دور ویران جگہ پر چھوڑ دیا گیا جہاں کوئی اس کے نزدیک نہیں جاسکتا تھا۔ اللہ کے آگے سجدے کر کر کے اس نے اپنی موت مانگی۔ اللہ پاک کی ذات معاف کرنے والی ہے۔ پورا ایک ہفتہ لگا اس کی جان نکلنے میں۔ سسک سسک کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اسے موت آئی۔ اس کی لاش کو قبر بھی نصیب نہیں ہوئی اسے وہیں ایک گڑھے میں پھینک دیا گیا اور جنازہ بھی نہیں پڑھایا گیا۔ اسے اس زندگی میں ہی اتنی سزا دی گئی تو پتا نہیں آخرت میں کون سی سزائیں اس کی راہ تک رہی ہیں۔

برے کام کا برا انجام۔



عظمت کے نشاں

محترم مدیر سرگزشت

السلام علیکم

آپی جان جیسی ہستیاں ہی عظمت کی نشان کہلاتی ہیں۔ ہمارا معاشرہ اقتدار سے منحرف ہو کر کس طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ یہ آپ کے علم میں ضرور ہو گا۔ اسی نکتے پر یہ تحریر ہے۔

محمد سلیم اختر

(راولپنڈی)



مجھے اس کرسی پر بیٹھے ہوئے، جانے کتنی ہی دیر گزر چکی تھی۔ میں اس بات کا اندازہ اگر ہوش وحواس میں ہوتا تبھی لگا سکتا تھا۔ حالانکہ باہر دسمبر کی دھوپ چمک رہی تھی۔ لیکن میرے وجود میں جو اندھیرا چھا چکا تھا۔ وہ کسی طور کم نہ ہو رہا تھا۔ مجھے اپنے اردگرد ہر شے ماتم کناں نظر آ رہی تھی۔

میرے اس خوبصورت بنگلے کے ساتھ بہتی ہوئی چمکیلے پانی کی ندی آج بھی مجھے چیختی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ حالانکہ میں اکثر ریلنگ پر جھکا بہت دیر تک اس کی گنگناہٹ سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ ہر شے مجھے اپنی ہی طرح لاوارث اور اداس معلوم ہو رہی تھی۔ ندی کے پانی اور پرندوں کے شور

میں جیسے صرف کومل ہی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔
''چلے جائیں مظہر صاحب، خدارا چلے جائیں۔'' وہ کسی بپھری ہوئی شیرنی کی مانند دہاڑ رہی تھی۔
''لیکن کومل...... وہ...... میں آپی جان......'' میں اس کے اچانک حملے کے لیے قطعی تیار نہ تھا۔
''کون سی آپی جان! وہ آپی جان جو آپ کی دہکائی ہوئی آگ میں جل جل کر راکھ ہو رہی ہیں۔ اب تو آخری چنگاری بھی بجھنے والی ہے اور...... اور میں مرتے وقت آپی جان کی روح کو عذاب نہیں دینا چاہتی۔ میں ان کی موت کو پچھتاوؤں کی نذر نہیں ہونے دوں گی اس لیے بہتر یہ ہے کہ آپ باعزت طریقے سے نکل جائیں ورنہ مجھے گیٹ کا راستہ دکھانے کے لیے کسی کی خدمت حاصل کرنا پڑے گی۔''
وہ دھان پان سی لڑکی آگ اگل رہی تھی۔ حالانکہ اسے ہم لوگ خوش اخلاق مانتے تھے۔ وہ جس کے لبوں سے لفظ پھول بن کر جھڑتے تھے آج دنیا جہان کی سفاکی اور سختی اس کے لہجے میں در آئی تھی۔
میں واپس آگیا، خالی ہاتھ۔ کومل نے میرے ضمیر کو جھنجوڑ دیا تھا جو مجھے کسی پل چین نہیں لینے دے رہا تھا۔
''آخر میں نے ہمت کیوں نہ کی؟'' میں بار بار خود سے یہ سوال کرتا لیکن میرے پاس اس بات کا جو جواب تھا وہ مجھے اب یعنی اس وقت جھوٹا جواز اور بودا سا لگ رہا تھا۔
''جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔''
یہ سچ ہے، لیکن مجھ جیسے لوگوں کو تو یہ بھی نصیب نہ ہو گی... کیونکہ میں نے یہ جنت حاصل کرنے کے لیے بہت کچھ بھلا دیا تھا۔ وہ سب کچھ جو مجھے تادم حیات یاد رکھنا تھا لیکن اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب آپی جان منوں مٹی تلے دفن ہو چکیں۔
میں کومل کے کہنے پر وہاں سے چلا آیا تھا لیکن وہیں گاؤں کے باہر ہائی وے کے ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ میں کسی طرح ایک جھلک آپی جان کو دیکھنا چاہتا تھا لیکن کومل کے ہوتے ہوئے یہ ممکن نہ تھا۔ کومل! آہ جو کبھی مجھے اپنی جان سے بڑھ کر عزیز تھی...... وہ بھی مجھے بے حد و بے حساب چاہتی تھی۔ میں نے اس کی اتنی شدید نفرت کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا لیکن وہ اس میں حق بہ جانب تھی۔ میں نے حویلی کے ملازمین اور آپی جان کے طبیب خاص سے معلوم کر لیا تھا کہ وہ اب صرف چند گھنٹوں کی مہمان ہیں۔

اگلے دن نماز فجر کے بعد مسجد کے مائیک سے آپی جان کی موت کی اطلاع بلند ہوگئی جسے سن کر مجھے جیسے سکتہ ہو گیا۔ جیسے یہ اطلاع میرے لیے اچانک اور غیر متوقع ہو۔
مجھے خاور کی تلاش تھی۔ اگر وہ مل جاتا تو میں اس سے جنازے میں شرکت کے لیے بات کر سکتا تھا لیکن کل سے وہ مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ خاور جو میرا بھتیجا تھا میرا خون تھا لیکن جس سے ہم تمام ناتے اس وقت توڑ چکے تھے جب خوشیوں نے اس کے دروازے پر دستک دینی شروع کی تھی۔ گزرا وقت مجھے یاد آرہا تھا۔

☆......☆

''مسٹر ماذر، کیا تم پاکستان نہیں جائے گا۔'' میری ہمسائی گلوریا نے...... میرے کندھے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے مجھے خیالات سے چونکا دیا۔
''شاید میں پاکستان نہ جا سکوں، مس گلوریا۔'' میرا لہجہ تھکا تھکا اور پریشان کن تھا۔
''لیکن تمہارا امی بہت زیادہ بیمار ہیں۔'' اس نے مجھے یاد دہانی کے ساتھ ساتھ سمجھانے والے انداز میں کہا۔
''میں جانتا ہوں، لیکن میں نے کہا نا، آخر میری بھی تو کچھ مجبوریاں ہیں۔'' میں جھنجلا گیا۔
''مسٹر ماذر اگر پیسا کا بات ہے تو ہم تمہارا ہیلپ کر سکتا۔''
گلوریا نے میری انجانی مجبوری کو پیسے کی کمی کا تصور دیا تھا لیکن میں نے کام کی مجبوری بتا کر اسے ٹال دیا اور وہ حیران پریشان سی واپس چلی گئی۔
میں نے اپنے لیے چائے بنائی اور ساتھ میں ناشتے کے لیے سینڈوچز بنا کر وہیں کچن میں رکھی میز پر ناشتا کرنے لگا۔ میری سوچوں کا محور اب بھی پاکستان اور اس کے ایک شہر اور ایک گاؤں میں بسنے والے لوگ تھے۔ جو سب میرے اپنے تھے لیکن اب میرے لیے غیروں سے بڑھ کر غیر ہو چکے تھے۔ مجھے اگرچہ گاؤں کی خیریت اپنے ایک پرانے دوست سے موصول ہو جاتی تھی... اور شہر جہاں میری بیوی، بچی اور...... اور ماں تھی۔ وہاں کی خیر خبر مجھے میری بیوی عارفہ بھیج دیتی تھی۔ کل بھی مجھے...... ماں کی علالت کی اطلاع بذریعہ تار دی تھی اور یقیناً میری ماں بہت بیمار تھی ورنہ وہ کبھی مجھے پردیس میں اس قسم کی اطلاع نہ دیتی۔ اسے میری پریشانی کا بہت دکھ ہوتا تھا۔ اس نے مجھے خوشیاں دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی لیکن یہ معاملہ ہی ایسا تھا۔

اور میں حیران تھا کہ وہ ماں جس کے لیے میں رات کی نیندوں کا آرام سب کچھ تج دیا کرتا تھا آج اس قدر بیمار تھی لیکن میرے دل میں ہمدردی کا کوئی جذبہ بیدار نہ ہو رہا تھا۔

''ماں کا تصور ہی بڑا سکون آمیز اور راحت بخش ہوتا ہے۔''

کسی زمانے میں میرا نظریہ بھی یہی تھا لیکن جانے وہ کیسی ماں تھیں، ماں ہونے کا حق تو آپی جان کو تھا جنہیں خدا نے اولادِ نرینہ جیسی دولت سے محروم رکھا تھا۔ میری ماں تو سراسر ظالم تھی۔ وہ خود کو ہمیشہ دوسروں سے برتر اور دوسروں کو کم تر سمجھنے والی عورت تھی۔ ماں کو دوسروں کا اور خاص طور سے غریبوں کا دکھ سرے سے محسوس ہی نہیں ہوتا تھا۔ میری ماں نے تو اپنے جیون ساتھی سے بھی اس قدر ہتک آمیز رویہ روا رکھا تھا کہ ایک دن پریشانی میں وہ شیر جیسا بہادر اور باہمت شخص اس کے رویے پر سوچتا ہوا چل رہا تھا کہ ایک خوف ناک ایکسیڈنٹ کی نذر ہو گیا۔

اس وقت میں صرف آٹھ سال کا تھا۔ گاؤں کی عورتوں اور خصوصاً آپی جان کو زار و قطار روتے دیکھ کر میں بھی بے تحاشا رویا تھا۔ آپی جان..... ابا میاں کی پیشانی چومتیں ان کی آنکھوں پر پیار کرتیں اور پھر دھاڑیں مار مار کر روتیں جب کہ میری سفاک ماں دیگیں پکانے والوں کو ہدایات دیتی رہیں۔ سوئم کے بعد میں آپی جان کے ساتھ واپس آ گیا۔

آپی جان اور ابا بہن بھائی تھے۔ دونوں ایک دوسرے پر جان نثار کرتے تھے۔ آپی جان کسی دور کے گاؤں بیاہی گئی تھیں۔ ان کے ہاں صرف ایک بیٹی تھی اور پھوپا نے وارث کے لیے دوسری شادی کر لی تھی۔ آپی جان پھوپا کے گھر سے واپس آ گئیں کہ جہیز میں انہیں بہت کچھ ملا تھا جس میں یہ عالی شان حویلی نما مکان بھی شامل تھا۔ بعد میں صلح صفائی کی بہت کوششیں کی گئیں جنہیں ابا میاں نے ناکام بنا دیا۔ میری پیدائش کے چھ ماہ بعد ابا میاں نے مجھے آپی جان کی گود میں دے دیا تھا۔ یوں میں آپی جان کا بیٹا بن گیا تھا اور میری پرورش کی ذمہ داری کا بوجھ ان پر آن پڑا تھا۔

آپی جان نے مجھے اولاد سے بڑھ کر پیار دیا۔ ممتا کے تمام رنگ مجھے نکھارنے پر صرف کر ڈالے۔ وہ مجھے راحیلہ آپی سے کہیں بڑھ کر چاہتی تھیں۔ بلکہ بعض اوقات تو آپی جان ان کا حق بھی مجھے ہی دے دیتیں۔ اماں اور آپی جان کی کبھی نہ بنی تھی کہ میں جب اپنے گھر آتا اماں کی کوشش ہوتی کہ وہ آپی جان کے خلاف زیادہ سے زیادہ زہر میرے کانوں میں انڈیل سکیں لیکن میرے دل و دماغ پر ان کی کوئی بات بھی اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔

بچپن کی حدیں پھلانگ کر ہم جوانی کے خوش رنگ جھولے میں جھولنے لگے۔ راحیلہ آپی مجھ پر بہت مہربان تھیں۔ میں میٹرک میں تھا کہ بڑے بھیا کی شادی کر دی گئی۔ ابا میاں کی وفات کے بعد گھریلو اخراجات کی پریشانیاں بڑھ گئیں یہی وجہ تھی کہ بڑے بھیا نے میٹرک کرتے ہی سروس کر لی اور یوں گھر کی حالت قدرے سنبھلنے لگی۔

بھابی نے ہم سے ماں جیسا ہی برتاؤ کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بھی غربت اور پریشانیوں کی ستائی ہوئی عورت تھیں۔ تاہم آپی جان نے انہیں بھی بہت نوازا لیکن اماں نے کبھی بھابی سے سیدھے منہ بات نہ کی۔ وہ قہر و غضب میں بھری رہتیں، ہماری مالی پریشانیاں دور کرنے میں آپی جان کا بھی بہت ہاتھ تھا۔ عید یا کسی بھی خوشی کے موقع پر وہ سارے گھر کے لیے کپڑے بنواتیں، جوتے خریدتیں۔ بعض اوقات نقدی کی صورت میں بھی دیا کرتی تھیں۔

مجھے شہر کے اسکول میں پڑھایا گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اسکول کے بچوں میں میری پوزیشن ہر طرح سے مضبوط تھی اگر کبھی مجھے اسکول سے آنے میں دیر ہو جاتی تو آپی جان رو رو کر ہلکان ہو جاتیں۔ میرے سر میں تکلیف ہوتی تو آپی جان کھانا پینا بھول جاتیں جب تک کہ مجھے آرام نہ ہو جاتا۔ چھ ماہ کا بچہ پالنا کچھ آسان کام نہ تھا پھر انہوں نے میرے سکون اور آرام کے لیے اپنا سکھ چین سب کچھ تج دیا تھا۔ جو بات میرے منہ سے نکل جاتی وہ فوراً پوری کی جاتی۔ کبھی بخار ذرا طوالت اختیار کر جاتا تو روبہ صحت ہونے پر کئی قسم کی نذر نیازیں دی جاتی تھیں۔

راحیلہ آپی کے پاس کوئی چیز ہوتی تو پہلے مجھے دیتیں۔ غرضیکہ ان دونوں نے میرے لیے دنیا بھلا دی تھی۔ بڑی باجی جوان ہوئیں ...تو اماں کو ان کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر ستانے لگی۔ ایسے وقت میں بھی بھابی اور آپی جان نے ہر طرح سے مدد کی۔ نہ صرف بڑی باجی کے لیے بلکہ دوسری دو بہنوں کے لیے بھی انہوں نے جہیز میں دی جانے والی اشیاء جمع کر رکھی تھیں۔ میں جوان ہوا تو اماں نے زور دینا

شروع کر دیا کہ میں اپنے گھر آجاؤں گا لیکن میں بھلا ایسا کس طرح کر سکتا تھا۔ میں آپی جان کو کس کے حوالے کرتا۔ میں ان سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ اور پھر راحیلہ آپی، جو مجھے اپنی بہنوں سے بڑھ کر چاہتی تھیں۔ ان سے بھائی کی محبت میں کیسے چھین لیتا؟

راحیلہ آپی نے ایک دن ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "مظہر بھیا کیا تم مجھے اور آپی کو اکیلا چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟"

بڑی ہونے کے باوجود اس وقت وہ مجھے ایک کمسن لڑکی معلوم ہو رہی تھیں جو اپنے بھائی سے جیسے درخواست کر رہی تھیں کہ کبھی ہمیں تنہا اور بے سہارا نہ چھوڑ دینا۔

"نہیں راحیلہ آپی۔ بھلا میں آپ کو چھوڑ کر جا سکتا ہوں؟" میں نے اٹل لہجے میں انہیں تسلی دی، بلکہ یقین دلایا اور اپنی انگلیوں کے پوروں سے ان کے آنسو پونچھ ڈالے۔

جوں جوں اماں کا اصرار بڑھ رہا تھا۔ راحیلہ آپی اور آپی جان کے پیار کے سمندر میں طغیانی آتی جا رہی تھی۔ انہی دنوں راحیلہ آپی کے لیے رشتہ آیا جسے پرکھنے کے بعد آپی جان نے قبول کر لیا اور یوں اس حویلی میں، میں اور آپی جان رہ گئے۔ گزرتے وقت نے اگرچہ ان سے ان کی جوانی چھین لی تھی لیکن ممتا نے ان کی ہمت جیسے جوان کر دی تھی۔ آپی جان باقاعدگی سے میرے لیے دونوں وقت کا کھانا اور صبح کا ناشتا خود تیار کرتیں پھر بڑے چاؤ اور پیار سے مجھے کھلاتیں۔ یوں جیسے میں ایک تین چار سالہ بچہ تھا اور انہیں یہ خطرہ رہا ہو کہ شاید میں پیٹ بھر کر کھانا نہ کھا سکوں گا۔ اور یوں میری صحت برباد ہو جائے گی۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں نے آپی جان سے سروس کی اجازت طلب کی تو وہ تڑپ اٹھیں۔ "نہیں، نہیں مظہر بیٹے، بھلا یہ سب کچھ کس کا ہے۔"

"لیکن آپی جان میں چاہتا ہوں کہ میں بھی کچھ نہ کچھ کروں۔ یوں بے کار مجھ سے نہیں بیٹھا جاتا۔"

"بیٹا کرنے کو کام تھوڑے تو نہیں، تم زمینوں پر جایا کرو... اور دیکھو وہاں مزارعے کیا کچھ کرتے ہیں۔" انہوں نے پیار سے مجھے سمجھایا۔

"نہیں آپی جان۔ میری خواہش ہے کہ میں آرمی جوائن کروں۔" میں نے اپنی خواہش ظاہر کر دی۔

"تو آرمی میں جائے گا؟......نہیں...... میں تجھے فوج میں کبھی نہیں بھیجوں گی۔ میرا بھائی......" آپی جان کی آنکھیں اپنے بھائی کی یاد میں برسنے لگیں۔

وقتی طور پر میں خاموش ہو گیا۔ میری یہ خواہش دب گئی تھی لیکن ختم نہیں ہوئی تھی۔ میں جب بھی آپی جان کے سامنے اس کا ذکر کرتا۔ وہ ناراض ہو جاتیں۔ ابھی میں آپی جان کو منانے کے حیلے تلاش کر ہی رہا تھا کہ بڑے بھیا کا خط موصول ہوا جس میں انہوں نے ننھے خاور کے دنیا میں آنے کی اطلاع دی تھی۔ یوں یہ سنہری موقع میرے ہاتھ آیا کہ بھیا کے گھر جانے کے بعد ہم دونوں راحیلہ آپی کے ہاں بھی گئے۔ تب میں نے بڑی مشکل سے راحیلہ آپی کو اس سفارش پر راضی کیا اور یوں مجھے آرمی میں جانے کی اجازت مل گئی۔

جس دن مجھے جانا تھا اس دن راحیلہ آپی اپنی ننھی منی پیاری سی بیٹی کومل اور بھابی بھیا خوبصورت سے گول مٹول سرخ و سفید بچے کے ساتھ آ گئے۔ مجھے وہ دونوں ننھے کھلونے بہت عزیز تھے خاص طور سے کومل، اسے میں چومتے نہ تھکتا تھا۔ وہ تھی بھی اسی قابل، صحت مند سرخ انگارہ سے ہونٹوں اور سرخ و سپید رنگت والے چہرے پر بڑی بڑی سیاہ آنکھیں دیکھنے والے کو دیکھتے ہی چلے جانے پر مجبور کر دیتی تھیں۔ وہ میری بھانجی تھی۔ راحیلہ آپی کی بیٹی مجھے کومل سے دور جانے کا بہت ملال تھا لیکن سروس بھی میرا مقصد تھا۔ میری خواہش تھی۔ جس کی اجازت مجھے بہت کوششوں کے بعد بہ مشکل ملی تھی۔

آپی جان، بھابی اور راحیلہ آپی بگھی میں مجھے شہر تک چھوڑنے آئی تھیں۔ آپی جان تو بس روئے جا رہی تھیں جیسے سارے آنسو آج ہی بہانے کا ارادہ تھا۔ گاڑی میں سوار ہونے تک وہ وقفے وقفے سے میری پیشانی، چہرہ اور ہاتھ چوم چوم کر روتی رہیں لیکن میں ان کی محبتوں کے حوصلے، سہارے اور دعاؤں کی چھاؤں میں ایبٹ آباد چلا گیا۔

مجھے معلوم نہیں، بعد میں کیا ہوتا رہا لیکن جب میں اپنی ٹریننگ کے بعد واپس آیا تو دونوں گھروں کے درمیان بہت سے فاصلے حائل ہو چکے تھے۔ جن کی سن گن مجھے اماں نے ہی دی تھی۔ آپی جان نے کچھ بھی بتایا نہیں تھا۔ میں نے بھی خاموشی اختیار کی۔ اور چھٹی گزارنے کے بعد واپس چلا گیا۔ بھابی کے ہاں ایک بیٹی اور راحیلہ کے ہاں ایک بیٹے کا اضافہ ہو چکا تھا۔ دونوں ہی خوبصورت تھے لیکن کومل اور خاور جیسے نہیں تھے۔ ان دونوں کی تو بات ہی اور تھی۔ زندگانی کا سفر اپنے دامن میں کئی خوشیاں اور ہلکے پھلکے غم لیے آیا اور پھر یہ سب ہم پر نچھاور کرتا ہوا پیچھے سرک گیا۔

میری دوسری بہنوں کے ہاں بھی اولادیں تھیں۔
پھر ایک دن راحیلہ آپی کا خط ملا جسے پڑھ کر میں سب کچھ بھول گیا۔ خط پڑھتے ہی میں نے چھٹی کے لیے درخواست دی لیکن چھٹی نہ مل سکی۔ میں کئی افسروں کے پاس گیا لیکن سب کا ایک ہی جواب تھا۔
''کیپٹن مظہر، کیا آپ نہیں جانتے کہ ہمارا ملک کتنے خطرات میں گھرا ہوا ہے اور اس دھرتی کو آپ کی، میری اور ہم سب کی اشد ضرورت ہے۔''
''لیکن سر، میں زیادہ دن نہیں لگاؤں گا۔ صرف چند دن دے دیں۔'' میں بریگیڈ عطا رحمٰن کے سامنے رو پڑا۔
''کیپٹن مظہر، آپ مرد ہیں۔ اس ملک کے جیالے سپاہی، بہادر سپوت، اگر آپ نے یوں چھوٹی سی بات پر رونا شروع کر دیا تو آپ اس ملک کی سرحدوں کی حفاظت کیسے کریں گے؟''
''سر میں صرف چھٹی چاہتا ہوں۔ خواہ چار دن کی ہی ملے۔''
آج مجھے اپنے اس فیصلے پر پچھتاوا ہوتا ہے جو میں نے یہاں آنے کا کیا تھا۔
''لیکن کراچی سے پنڈی آنے جانے میں چار دن ختم ہو جائیں گے۔'' انہوں نے بڑی نرمی سے مجھے سمجھایا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آیا اور میں بڑی مشکل سے ایک ہفتے کی چھٹی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔
میرا بس نہ چلتا تھا کہ اڑ کر راحیلہ آپی کے پاس پہنچوں۔ گھر پہنچا تو راحیلہ آپی، بھائی جان، بھیا، بھابی اور آپی جان تصویر یاس بنے ہوئے تھے۔
''راحیلہ آپی، کہاں ہے کومل؟'' میں نے اندر داخل ہوتے ہی چیخ کر کہا اور راحیلہ آپی بھاگ کر میرے گلے لگ گئیں۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ ضبط تو میں بھی بہت کر رہا تھا لیکن لگتا تھا کہ وہ اگر یوں ہی روتی رہیں تو میری بھی چیخیں نکلنے لگیں گی۔ بھائی جان نے انہیں مجھ سے الگ کیا اور مجھے بیٹھ جانے کو کہا۔
''نہیں بھائی جان مجھے بتائیں کومل کہاں ہے؟'' میں کسی اندرونی خوف سے کانپ اٹھا۔
''بیٹھ جاؤ مظہر، وہ ادھر اپنے کمرے میں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے سوئی ہے۔''
''مظہر، بیٹے تم نے بہت دیر کر دی۔ کومل تمہیں یاد کرتے کرتے تھک گئی ہے۔''
''نہیں آپی جان، مجھے ملکی حالات کی وجہ سے چھٹی نہیں مل رہی تھی۔'' میں کھڑا ہو گیا۔ ''میں کومل سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے قدم بڑھائے تو راحیلہ آپی بھی میرے ساتھ آ گئیں۔
کومل اپنے بیڈ پر کمبل اوڑھے سو رہی تھی لیکن یہ وہ کومل نہ تھی جو میں چھوڑ گیا تھا۔ یہاں تو ہڈیوں کا ایک ڈھانچا تھا۔ زرد رنگت، اجڑی اجڑی، کسی اجڑے ہوئے گھر کی مانند۔
میں نے اپنے ہونٹ بے اختیار اس کی پیشانی پر رکھے تو یوں لگا جیسے میرے لب کومل کی پیشانی پر نہیں کسی دہکتے انگارے پر جا پڑے ہوں۔
''کومل!'' میرے لبوں سے ایک گھٹی گھٹی چیخ آزاد ہوئی اور آنسو کومل کا چہرہ بھگونے لگے لیکن کومل کو ہوش کہاں تھا۔ اسے تو انجکشن کے ذریعے سلایا جاتا تھا کیونکہ بقول راحیلہ آپی اس ظالم مرض نے نہ صرف اس معصوم کی شگفتگی چھین لی تھی بلکہ اس کی نیند بھی روٹھ گئی تھی۔
''لیکن یہ ہوا کیسے آپی؟'' میں نے بے قراری سے پوچھا۔ میرا دل کومل کو دیکھنے کے بعد کٹا جا رہا تھا۔
''معلوم نہیں بھیا، ایک دن ہلکی سی حرارت ہو گئی تھی پھر روز بروز اس کی حالت بگڑتی ہی گئی۔''
مجھ پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ اس مرض نے کومل کو صرف بستر کا پابند بنا دیا ہے۔ وہ نہ خود سے اٹھ سکتی ہے نہ بیٹھ سکتی ہے۔ ان تمام کاموں کے لیے اسے راحیلہ آپی یا بھائی جان کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے لیکن میں نے جاتے ہی اس کے تمام کام خود سنبھال لیے تھے۔ رمضان کی آمد آمد تھی۔ کومل کی طبیعت زیادہ بگڑتی جا رہی تھی۔ ہم سب دوا کے ساتھ اس کی زندگی اور خیریت کے لیے دعائیں بھی کرتے کہ شاید کسی گھڑی رب تعالیٰ کو رحم آ ہی جائے۔
میری چھٹی ختم ہونے میں صرف دو دن باقی تھے۔ جب خاور آیا۔ اس کے میٹرک کے پیپر ز تھے جس کی وجہ سے وہ روزہ نہ آ سکتا تھا۔
''تمہارے پرچے کیسے ہوئے خاور؟'' میں نے اس سے پوچھا۔
''بس انکل کچھ بہتر ہوئے ہیں۔'' اس کے لہجے میں بے اعتمادی تھی۔
''لیکن کیوں...... تم تو بہت ذہین ہو؟'' مجھے اس کے اس جواب کی توقع نہ تھی۔

"انکل، کومل کی بیماری کی وجہ سے میں یکسوئی سے پڑھ نہیں سکا اس لیے۔" اس نے معصومیت سے سچ بولا۔ اس کے دل کا درد پانی بن کر آنکھوں میں آگیا تھا۔

"تم دعا کرو خاور، کومل جلد ہی بہتر ہو جائے گی۔" میری اپنی آواز بھی لرز رہی تھی۔

"میری دعا عرش عظیم پر پہنچ جاتی تو کومل کو زمانے کی گرم ہوا بھی نہ لگتی۔" اس نے بڑی سادگی اور خوبصورتی سے اپنی دلی وابستگی کا اظہار کیا۔

تب میں دل میں بہت خوش ہوا تھا کہ کومل آج بھی ہماری ہے اور مستقبل میں بھی ہماری رہے گی لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ مستقبل ہمیں کیسے کیسے چرکے لگائے گا۔

اس دن کومل کی طبیعت بھی بہت خراب تھی۔ جب میں عید سے چند روز پہلے اس کے پاس گیا تھا۔ لوگ آنسو بھری آنکھوں سے اس کے بیڈ کے اردگرد جمع تھے۔ راحیلہ آپی اس کا سر اپنی گود میں رکھے ہوئے روئے جا رہی تھیں۔ تب اس نے مجھے آواز دی تھی، ہلکی سی، مدھم سی، بے جان سی آواز۔

"ماموں کیا ہم مر جائیں گے؟" میرے قریب پہنچتے ہی اس نے معصومیت سے میری طرف دیکھ کر سوال کیا۔

"نہیں بیٹے، خدا نہ کرے، ایسی باتیں نہیں کہتے، آپ بہت جلد اچھی ہو جائیں گی۔" میں نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر سب لوگ رو کیوں رہے ہیں۔" اس نے نگاہیں چاروں طرف دوڑائیں۔

"بیٹا آپ کے اچھا ہونے کی دعائیں کر رہے ہیں سب؟"

"ماموں اگر ہم مر جائیں تو آپ کو دکھ ہوگا؟"

"پلیز کومل بیٹا! ایسی باتیں نہیں کرتے، خدا نہ کرے ماموں کے ہوتے ہوئے کومل کو کچھ ہو۔" میں خود پر قابو نہ پا سکا تھا۔

"پھر آپ دعا کریں نا، امی کہتی ہیں جو کسی کو چاہتا ہے، پیار کرتا ہے اللہ پاک اس کی دعائیں سن لیتے ہیں۔" اس نے اپنے خوبصورت ہاتھوں سے میرے آنسو پونچھ ڈالے۔

میری نگاہ بے اختیار خاور کی جانب اٹھ گئی۔ "کومل بیٹا، خاور بھی تو تمہیں بہت چاہتا ہے۔ دل کی گہرائیوں سے ورنہ اپنی صحت وہ یوں ستیاناس نہ کرتا۔" میں اس کی سوجی ہوئی سرخ آنکھوں اور کمزور صحت کو دیکھ کر سوچ کر رہ گیا، کہا کچھ نہیں۔

یونٹ میں لوٹ آنے کے بعد... اطلاع ملی کہ سب کی دعا کو اللہ پاک نے شرف قبولیت بخشا ہے اور کومل کی طبیعت ٹھیک ہونے لگی ہے۔ سبھی خوش ہیں۔ سب سے زیادہ خاور کو خوشی تھی۔

کومل کے صحت یاب ہونے پر راحیلہ آپی نے نیاز دلوائی غریبوں اور محتاجوں میں کھانا تقسیم کیا گیا۔ اس دن میں نے فون پر خاور سے پوچھا تھا۔ "خاور کیا تم کومل کو جیون ساتھی بنانا پسند کرو گے؟"

"کیوں نہیں انکل یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔ میں دل سے اس بات کا آرزومند ہوں۔" خاور کے اس جواب نے مجھے بہت سکون دیا تھا لیکن جب اصل وقت آیا تو ہم میں سے کوئی بھی خوش نہ تھا۔

کومل کی بیماری سے کئی سال بعد کی بات ہے میں چھٹیوں پر آیا تھا تبھی یہ اطلاع دینے بھیا آئے تھے۔ بھیا اور بھابی باقاعدہ منگنی کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات اماں تک جا پہنچی اور انہوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

"یہ ہرگز نہیں ہو سکتا، خاور اور کومل کا ساتھ کسی بھی طرح سے ممکن نہیں ہے۔" وہ بھیا پر برس پڑی تھیں۔

"لیکن کیوں اماں؟" بھیا نے پوچھا۔

"میں نے کہہ دیا، مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔" اماں غضب ناک آواز میں کڑک کر بولیں تھیں۔

"لیکن کوئی وجہ بھی تو ہو؟" بھیا الجھ گئے تھے۔

"وجہ ایک ہو تو بتاؤں۔" انہوں نے قہر آلود نگاہ سے فضا میں گھورا جیسے کومل کو ہی دیکھ رہی ہوں۔

"وہ ہمارے خاندان کی لڑکی نہیں ہے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کا خاندان ہم سے زیادہ دور نہیں۔ وہ ہماری سگی کزن کی بیٹی ہے اور پھر بھائی جان بھی غیر نہیں۔ ابا میاں کے کزن کے بیٹے ہیں۔" بھیا نے انہیں قائل کرنا چاہا۔

"تمہاری نظر میں وہ لڑکی اچھی ہوگی لیکن وہ بدکردار لڑکی ہے۔ کیوں خاور کی زندگی تباہ کرنے پر تل گئے ہو؟" اماں نے نخوت بھرے انداز میں کہا۔

"ایسا نہ کہیں اماں، ہم اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔" میں تڑپ اٹھا تھا۔ کومل پر یہ سراسر الزام تھا۔

"تم خاموش رہو۔" اماں نے مجھے گھرکا۔ "ہر چھوٹا

بڑا، بوڑھا جوان تو اس پر یونہی نہیں مرتا، وہ ہے ہی ایسی، اور پھر بات دور کی نہیں، میری بھابی سے جا کر پوچھو، ان کے بیٹے سے اس کا تین سال سے معاشقہ چل رہا ہے۔ اس کے علاوہ بھی برادری کے کئی لڑکوں سے اس کے تعلقات رہے ہیں۔ اور پھر...... پچھلے دنوں تو اس نے بے حیائی کی حد کر دی۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگیں۔

''کیا ہوا اماں؟'' ہم دونوں بھائی بہ یک وقت بولے تھے۔

''خیر چھوڑو...... میں بھی بیٹیوں والی ہوں۔ ضروری نہیں کہ وہیں رشتہ کریں۔ تمہاری اپنی بھانجیاں بھی تو ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسین ہیں۔ تم ان میں سے جسے چاہو خاور کے لیے مانگ سکتے ہو۔''

''نہیں اماں، رشتہ میں نے یا آپ نے نہیں کرنا۔ رشتہ خاور نے کرنا ہے اور وہ شروع سے اس رشتے کا متمنی ہے اور پھر کومل تو اتنی معصوم ہے کہ......''

''تو تم سیدھی طرح کہہ دو کہ بہن بھانجیوں کا تمہاری نظر میں کوئی مقام نہیں۔'' اماں نے رونا شروع کر دیا۔ ''خدا کسی سے جیتے جی اس کے بچے یوں نہ چھینے جیسے مجھ سے آپی گل نے چھین لیے ہیں۔ ماں کی ممتا اپنے بچوں کو پیار کرنے کے لیے کیسے کیسے نہیں تڑپی۔ بہنوں کے بھائی ہونے کے باوجود ان کے دردمند نہیں۔ بھائی تو بہنوں کے لیے مضبوط سایہ ہوتے ہیں، تناور درخت لیکن تم کیسے بھائی ہو؟ کبھی تمہیں خیال آیا کہ بہنوں کے دکھ درد میں شریک ہو جائیں لیکن تم نے مجھ نصیبوں جلی کو کبھی ماں سمجھا ہوتا تو مجھے یہ دن کیوں دیکھنا پڑتا۔ ایسی بے بسی اور بے سہارا بھی بیٹوں کی ماں کو میں نے نہیں دیکھا۔'' اماں زار و قطار رو رہی تھیں۔

بھیا تو باہر نکل گئے مگر میرا آپی جان اور راحیلہ آپی سے پیار ماں کے آنسوؤں میں بہہ گیا تھا۔ میرے اندر ایک جنگ چھڑ گئی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ تو واقعی زیادتی ہے۔ ابا نے مجھے اماں کی گود سے چھین کر بہن کی گود میں ڈال دیا تھا۔ اماں پر یہ ظلم تھا اور اس ظلم کی محرک امی جان ہیں۔

''اماں! آپ آنسو پونچھ لیں۔ آپ بے سہارا نہیں۔ میں آپ کا سہارا ہوں اور رہوں گا۔ ٹھیک ہے آپی جان نے مجھے پالا ہے لیکن جنم دینے والی تو آپ ہیں ناں، بھیا نہیں ہیں تو نہ سہی، میں آپ کا ہوں، میں اپنی بہنوں کا ہوں، میں وعدہ کرتا ہوں اماں۔ آیندہ بھی آپ کو اس قسم کا کوئی احساس نہیں ہونے دوں گا۔'' میں نے اماں کے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کر ڈالے اور سب کچھ بھول گیا۔ اگر مجھے کچھ یاد تھا تو اماں کے آنسو اور ان کی باتیں جن سے محرومی جھلکتی تھی۔

اور پھر اسی شام سے میرے قدم آپی جان کی حویلی جانے کی بجائے بڑی بہن عطیہ کے دروازے تک جا پہنچے۔

عطیہ باجی بڑے تپاک سے ملیں اور میں بہن کی اتنی محبت دیکھ کر نہال ہو گیا کہ کبھی یہ دیا جا رہا ہے کھانے کو، کبھی وہ دیا جا رہا ہے۔ کبھی میرے بیٹھنے کی فکر لاحق ہو گئی ہے تو کبھی سردی کی فکر کھائے جا رہی ہے۔

لیکن اتنے پیار کے باوجود میں وہاں بے چین رہا۔ میرا ذہن و دل آپی جان کی حویلی میں تھا اور میں خود یہاں تھا۔ میں تصور کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا آپی جان کس قدر پریشان ہیں۔ کبھی ایک کمرے میں کبھی دوسرے میں، کبھی برآمدوں میں اور کبھی صحن میں پھر رہی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ میری سلامتی کے لیے دعا گو بھی ہیں۔ مجھے جھرجھری آ گئی۔ آپی جان اس شدید سردی میں میرے لیے کتنی بے چین ہوں گی۔ میں زیادہ دیر وہاں بھی ٹک کر نہ بیٹھ سکا۔ اور واپس گھر آ گیا۔

مجھے گھر آئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ آپی جان آ گئیں زرد چہرہ لیے، مجھے دیکھ کر لپکتی ہوئی میرے پاس آئیں۔ ''مظہر میرے بچے، خیریت سے تو ہو؟'' وہ بے قراری سے میری کمر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

''بالکل ٹھیک ہوں آپی جان!'' میری نظریں خود بخود جھک گئیں۔

''پھر ابھی تک آئے کیوں نہیں؟'' انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔

''وہ...... وہ آپی جان...... اصل میں، بات یہ...... بات یہ ہے کہ اماں اور جیا گھر میں اکیلی ہیں اس لیے میں اب گھر ہی سویا کروں گا۔'' میں سمجھ نہیں پایا تھا کہ آپی جان کو کیا جواب دوں جلدی میں یہی ایک بہانہ سوجھا تھا۔

''بیٹا ان کے ساتھ تو نوکرانیاں بھی ہیں لیکن میں تو بالکل اکیلی ہوں۔'' آپی جان نے کس قدر بے بسی سے یہ فقرہ ادا کیا تھا۔ اس کا احساس مجھے آج ہو رہا ہے۔ جب وہ منوں مٹی تلے دفن ہو چکی ہیں، لیکن اس وقت جذبات میں، میں اسے بھی آپی جان کی چال سمجھا تھا۔

''نہیں آپی جان...... آج تو نہیں، پھر کبھی سہی۔'' میں نے جواب دیا۔ اور آپی جان مجھ پر ایک مجبور نگاہ ڈال

کر نکل گئی تھیں۔
یوں میرے اور اس حویلی کے مکینوں کے درمیان فاصلے بڑھتے گئے اور اس دن میں عطیہ باجی کے ہاں گیا تو ایک نئی خبر سننے کو ملی۔
''ارے مظہر کچھ سنا تم نے؟'' انہوں نے مجھ سے پوچھا۔
''کیا کوئی نئی خبر ہے؟'' میں واقعی ہر قسم کی نئی خبر سے بے خبر تھا۔
''کومل نے خاور کو ٹھکرا دیا۔'' انہوں نے خوش ہو کر خبر سنائی اور مجھے دل کے کسی گوشے سے درد جاگنے کا احساس ہوا۔
''کیوں؟''
''ارے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، بھئی ہزاروں کے ساتھ تو اس کی دوستیاں ہیں۔۔ پھر ایسی لڑکی کہاں کسی ایک کے پاس ٹک کر رہ سکتی ہے۔'' انہوں نے شان بے نیازی سے کہا۔
''لیکن خاور میں کیا کمی ہے کہ اس نے......؟''
میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی انہوں نے اپنی بات شروع کر دی۔ ''ارے بھائی خامی خاور میں نہیں اس میں تو ہے اور پھر پول کھل جانے کا خطرہ بھی ہے اسی لیے انکار کر دیا ہے۔'' انہوں نے بڑے رازدارانہ انداز میں بتایا۔
پھر ایک ماہ کی چھٹی میں روز مجھے کوئی نہ کوئی خبر سننے کو ملتی۔ اماں کے اسباق میں کبھی نئی کہانی کا اندراج ہوتا اور کبھی عطیہ باجی کے، اور میں روز بہ روز ان لوگوں سے متنفر ہوتا چلا گیا تھا۔
انہی دنوں میری شادی نزدیک آگئی۔ یہ شادی میں اپنی اور اماں کی پسند سے کر رہا تھا۔ میں اور عارفہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں مرتبہ مل چکے تھے۔ اکثر ہم سیر سپاٹے کو نکل جاتے کبھی شاپنگ کو، کبھی کوئی فلم دیکھنے، کیونکہ جہاں عارفہ کی ملازمت تھی۔ میں وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن یہ سب ہم چپ کی بکل میں کر رہے تھے۔ یعنی کبھی کسی کے سامنے دیکھنا تو درکنار ہم آپس میں بولتے بھی نہ تھے۔ یوں تو اماں کچھ کچھ ہمارے راز سے واقف تھیں لیکن انہیں اس پر اعتراض نہ تھا کہ عارفہ ان کی بھی پسند تھی۔
اس دوران میں خاور کو کومل سے دور رکھنے کی بہت کوشش ہوئی۔ ہر طرح سے اس کے دل میں کومل سے نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے چمن دل میں لگا ہوا کومل کے پیار کا پودا اب مضبوط اور تناور درخت بن چکا تھا۔ اس کا ایک ہی جواب تھا۔
''میں کومل کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں، آپ یہ سب بتانے کا تردد نہ کیا کریں۔''
لیکن ہم سب مل کر اس کی ''ہاں'' کو ''ناں'' میں نہ بدل سکے تھے۔ دوسری طرف کومل کا انکار بھی پختہ ہوتا جا رہا تھا۔ ہم بہن بھائیوں نے یعنی میں نے اور میری بہنوں کے علاوہ اماں نے بھی اس کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا کہ کومل کا انکار خود ہی خاور کو بددل کر دے گا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔
میری شادی سے تقریباً کوئی تین ہفتے پہلے کا ذکر ہے جب میں دو ماہ کی رخصت پر گھر آیا ہوا تھا۔ بھائی جان سرکاری طور پر باہر چلے گئے تھے اس لیے بھابی اور آپی راحیلہ آپی جان کے پاس آگئی تھیں۔ میں کبھی کبھار حویلی جاتا تھا ہے۔ آپی جان کی خیریت معلوم کرنے۔ آپی جان کی محبت میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ راحیلہ آپی بھی جوش و خروش سے ملیں، کومل بھی ملتی، لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے جذبے سرد پڑتے جا رہے تھے۔
پھر ایک دن وہ حادثہ ہو گیا۔ عطیہ باجی اور اماں کی باتیں کومل تک جا پہنچی تھیں۔ یہ وہ باتیں برداشت نہ کر سکی اور سیدھی عطیہ باجی کے ہاں چلی آئی۔
معلوم نہیں ان دونوں میں کیا بحث مباحثہ ہوا لیکن مجھ تک جو اطلاع پہنچی وہ یہی تھی کہ کومل نے نہ صرف عطیہ باجی کو بلکہ ان کی بیٹیوں، اماں جان، مجھے اور میری دوسری بہنوں کو بھی سخت برا کہا اور بہت نازیبا اور گرے ہوئے خطابات سے ہمیں نوازا تھا۔
ہمارے لیے یقیناً اس سے اچھا موقع کوئی اور نہ تھا۔ سو ہم خود تو ناراض ہوئے ہی تھے۔ ساتھ ہی یہ اطلاع بھیا، بھابی اور خاور کو پہنچا دی۔ کسی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ خاص طور سے خاور کے جواب نے ہمیں جلا کر رکھ دیا تھا۔
''انکل، کومل پر الزام تراشی کوئی نئی بات نہیں کیونکہ یہ اس گھر کی عورتوں کے فرائض میں شامل ہے۔ یقیناً آپ امی جان کے سلوک سے بھی آگاہ ہوں گے۔ ضرور پہل اسی گھر کی طرف سے ہوئی ہوگی۔ اور جب دشمن کسی دوسرے ملک کی سرحدوں کے اندر داخل ہو کر بے گناہ انسانوں کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اپنے دفاع کے لیے دوسرا ملک بھی ہتھیار

استعمال کرتا ہے۔ ہاں یہ ضروری نئی بات ہے کہ آپ بھی اس پارٹی میں شامل ہو گئے ہیں۔''

''خاور، تمہیں شرم آنی چاہیے، مجھ پر یا اپنی آنٹی اور دادی جان پر الزام دھرتے ہوئے۔'' غصے سے میرا دماغ گھوم گیا تھا۔

''نہیں انکل، شرم تو مجھے آپ لوگوں کی سوچ اور طریقہ کار پر محسوس ہوتی ہے۔'' اس نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

''تو گویا تم اپنی بات منوا کر رہو گے؟''

''انشاءاللہ!'' اس کے لہجے میں بھرپور اعتماد تھا۔

میں نے پھر خاموشی اختیار کر لی تھی، شادی کے بعد میں عارفہ اور اماں کو اپنے سنگ ہی لے آیا تھا۔ مجھے سرکاری گھر ملا ہوا تھا۔ میں اپنی ماں کی ہر طرح خدمت کرتا۔ ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھتا اور عارفہ کو بھی اس کی تاکید کرتا۔

حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ گاؤں کبھی کبھار ہی جانا ہوتا لیکن اب تو مجھے حویلی سے بھی نفرت ہو گئی۔ صرف اڑتی پھرتی ہوئی سن لیتا تھا۔ عارفہ اور اماں بڑی باجی کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ واپسی پر عارفہ نے مجھے بتایا تھا۔

''آپ نے سنا، اگلے ہفتے خاور اور کومل کی بات پکی ہو رہی ہے۔'' اور چائے کا کپ میرے ہاتھ میں لرز گیا تھا۔

''ت...... تمہیں کس نے بتایا......؟''

''ارے بتاتا کون، خود کومل نے بھی اس خبر کی تائید کی ہے اور اس کی رازدار دوست سیما نے بھی بتایا ہے کہ......''

''لیکن وہ رضامند کیسے ہوئی۔'' میں نے اس کی بات اچک لی تھی۔

''سیما بتا رہی تھی کہ کومل خود خاور سے ملی تھی اور اس سے پوچھا کہ کیا واقعی ان تمام باتوں کے بعد بھی وہ اس کے لیے سیریس ہے؟''

''پھر......؟''

''پھر یہی کہ خاور نے اسے اپنی بھرپور محبت کا یقین دلایا اور یوں ناراضگی ختم ہو گئی۔'' عارفہ نے بات ختم کر دی، لیکن بات تو اب شروع ہوئی تھی۔

منگنی میں ہم میں سے کوئی بھی شریک نہیں ہوا تھا لیکن سنا تھا کہ یہ تقریب پھر بھی بہت شاندار طریقے سے سرانجام پائی۔ اس کا ثبوت کومل کی وہ تصویریں تھیں جو منگنی والے دن لی گئی تھیں۔ ہنستی مسکراتی کومل بہت سندر لگ رہی تھی۔ اس کی تصویریں دیکھ کر میرے دل کے کسی گوشے میں انجانا سا درد جاگا اور آنکھوں کے گوشے خود ہی بھیگ گئے تھے۔ شاید اس لیے کہ کومل مجھے عزیز از جان تھی لیکن آہ! وقت اور حالات نے ہمیں اتنی دور پھینک دیا تھا کہ ملنے کی کوئی سبیل نہ رہی۔

ہم سب لوگ کومل کو نیچا دکھانا چاہتے تھے۔ ہم اس سے سکون جیسی دولت چھین لینا چاہتے تھے۔ اسے خاور کی نگاہوں میں ذلیل و خوار کر دینا چاہتے تھے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ اس نے ہماری چال ہمیں پر الٹ دی تھی۔ اس نے ہمارا سکون تباہ و برباد کر دیا تھا۔ سب کی زبان پر ہر وقت اسی کا ذکر تھا لیکن کبھی اچھے الفاظ سے اسے کسی نے یاد نہیں کیا تھا۔

بھیا کے ہاں کبھی کبھار جانا ہوتا تھا۔ اماں تو ان سے رشتہ ہی ختم کر لیتیں اگر یہ رشتہ ختم ہو سکتا...... لیکن یہ ضرور تھا کہ انہوں نے ان تمام لوگوں سے مکمل بائیکاٹ کر رکھا تھا جن کا کسی قسم کا تعلق کومل سے تھا اور ان کی اس زیادتی کا نشانہ ہمیشہ خاور ہی بنتا تھا لیکن دوسری طرف خاور کو بھی جیسے کسی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ تو بس کومل کو دیکھنا چاہتا تھا۔

راحیلہ آپی اور بھائی جان دوسرے ملک جا رہے تھے۔ بھائی جان کو سرکاری طور پر بھیجا جا رہا تھا اور ظاہر ہے، راحیلہ آپی ان کے ساتھ تھیں، باقی بچے بھی جا رہے تھے۔ اماں اس خبر سے بہت خوش تھیں اور میں ہزار سوچنے کے باوجود ان کی اس خوشی کی تہ میں نہ پہنچ سکا تھا کہ آخر وہ کیوں اتنی خوش ہیں۔

''کب تک جا رہے ہیں وہ لوگ؟'' ایک صبح ناشتے کی میز پر اماں نے عارفہ سے پوچھا۔

''پہلے تو جلدی ہی جانا تھا انہیں لیکن اب بھائی جان نے عرصہ کچھ بڑھا لیا ہے۔'' عارفہ نے انہیں آگاہ کیا۔

''کومل نے جانے سے انکار کر دیا ہے اس لیے اب اس کی شادی کر کے ہی جائیں گے۔'' عارفہ کے جواب نے اماں کے ہاتھوں میں چمچہ لرزا دیا تھا۔

''کومل کی شادی کسی طرح سے بھی نہیں ہونی چاہیے۔'' عارفہ کے اٹھ جانے کے بعد اماں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

''اماں یہ کیسے ممکن ہے......؟''

''ہونے کو بہت کچھ ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے بہت ہمت کی ضرورت ہے۔'' اماں نے جواب دیا لیکن میں

نے مزید کچھ بھی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

"اماں اگر وہ دونوں ایک دوسرے کا مقدر بن ہی چکے ہیں تو ہم خوامخواہ انہیں دور کرنے کی......" میں نے اماں کو سمجھانا چاہا تھا۔

لیکن ان کے سر پر صرف یہی دھن سوار تھی کہ کوئی طریقہ ایسا ہونا چاہیے کہ یہ شادی رک جائے اور یہی نہیں بلکہ ہوئی ہی نہیں چاہیے لیکن ایسا بھلا کیسے ہوسکتا تھا۔ اماں کی سوچوں سے کچھ نہ بن سکتا تھا اور پھر قدرت ان کے ساتھ تھی۔ ان کی صاف ستھری نیتوں سے آگاہ تھی۔ اماں کے کہنے سے کومل کی تقدیر کیسے بدل سکتی تھی یا ان کے سوچنے سے کومل کی جگہ ان کی کوئی نواسی کیسے لے سکتی تھی۔ یہ جوڑ تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔ ازل سے بنتے آئے ہیں...اور خدا کے کاموں کو کوئی سمجھ نہیں سکا۔ وہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔

یوں ہمارے نہ چاہنے کے باوجود بھی ان کی شادی ہو گئی تھی۔ اگرچہ یہ شادی عجلت میں کی گئی تھی... کیونکہ بھائی جان کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا لیکن ہمارے رویوں میں کوئی تبدیلی نہ آئی اور نہ اماں جان کے مزاج میں کوئی نرمی آئی۔ حالانکہ کومل اب ہماری عزت تھی۔ ہماری بہو تھی۔ ہمارے گھر آئی تھی لیکن یہ تمام باتیں سوچنے کی فرصت کسے تھی۔ تب ہماری آنکھوں میں نفرت کی آگ تھی۔ ذہنوں میں اماں اور باجی کی غلط باتوں کی تاریکی تھی۔ پھر ہمیں روشنی کی کوئی کرن نظر کیوں کر آتی؟

کومل اور خاور خاموش تھے۔ جیون کی راہوں پر چلتے خوشیوں کے پھول اپنے اپنے دامن میں سمیٹ رہے تھے اور ہم سوائے کڑھنے کے کچھ نہ کر سکتے تھے۔ آپی جان بیمار رہنے لگیں۔ میں نے کئی بار ان کی بیماری کا تذکرہ سنا لیکن اتنی ہمت نہ تھی کہ ان کی بیمار پرسی کو جاتا۔ کیونکہ اس کے لیے مجھے اماں کی طرف سے اجازت نہ تھی۔ میں سوچتا لیکن سوائے خاموشی کے کوئی چارہ نہ تھا۔

اچانک ایک دن کومل میرے آفس میں آئی۔ خاور کی محبت اور پرسکون ازدواجی زندگی نے اسے اور خوبصورت بنا دیا تھا۔ اس نے آتے ہی ہولے سے مجھے سلام کیا تھا۔ جانے کیوں اسے دیکھ کر اس کی محبت میرے دل میں جوش مارنے لگی۔ میرا جی چاہا۔ اٹھ کر اسے گلے لگالوں۔ چوم لوں اس کی روشن پیشانی، اور اپنی محبتیں اس پر نثار کر دوں، لیکن نہیں میں ایسا نہیں کر سکا۔ میں بزدل تھا۔ میں بے ایمان تھا ورنہ میں اسے معاف کر دیتا۔ وہ میرے پاس آئی تھی۔ پھر اسے دیکھ کر ایک کمتری کا احساس ہونے لگا۔ میں نے بہت خشک لہجے میں اسے بیٹھ جانے کو کہا تھا۔ پھر پوچھا۔

"تم میرے آفس کیسے آگئی ہو؟" لہجہ بدستور سپاٹ تھا۔

"ایک مجبوری کھینچ لائی ہے۔" اس نے قالین پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"کیسی مجبوری ہے وہ جو تمہیں کھینچ لائی؟" میں سننے کو بے تاب تھا۔

اماں کی باتیں یاد آئیں تو ایک خوشی سی ہوئی کہ آخر یہ جھک گئی اور خود ہی چل کر میرے پاس آئی ہے۔

"وہ آپی جان بہت بیمار ہیں اور آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔" اس نے اپنی انگلی میں پڑی خاور کے نام کی انگوٹھی کو تھماتے ہوئے بتایا۔

"پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔" میرا لہجہ انتہائی سرد تھا۔

"آپ، آپ ان سے مل لیجیے۔ مظہر ماموں، وہ آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔ روتی رہتی ہیں آپ کے لیے اور یوں وہ کئی ایک موذی بیماریوں کا شکار ہو گئی ہیں۔ پلیز انہیں بچا لیجیے۔" اس نے التجا کی تھی لیکن میں تو پتھر تھا۔ مجھے اس سے کیا سروکار تھا کہ کوئی مرتا ہے یا جیتا ہے۔ سو میں نے انہیں ملنے سے انکار کر دیا تھا۔

"نہیں مظہر ماموں آپ انکار نہیں کر سکتے...... میری ماں آپ کے لیے تڑپ رہی ہیں۔" وہ بھی تلخ ہو گئی۔

"کومل میں اس گھر میں نہیں جا سکتا جہاں کے مکینوں نے ہم بہن بھائیوں کو دور کر دیا ہے۔ ہمارے درمیان نفرت کی بہت اونچی اور مضبوط دیوار کھڑی کر دی ہے۔"

"یہ نفرت کی دیوار آپ لوگوں کی خود ساختہ ہے۔ آپ چاہیں تو اسے گرا سکتے ہیں۔ حقیقت تسلیم کر لیجیے۔ غلط فہمیاں دور کر لیں۔ پھر آپ کو سب کچھ اجلا اجلا نظر آئے گا۔ دوریاں ختم ہو جائیں گی لیکن آپ لوگوں نے کچھ پوچھنا کچھ سننا مناسب ہی نہ سمجھا۔ پھر بات کیسے ختم ہو جاتی......"

"ہمیں اس کی ضرورت نہیں، تم جا سکتی ہو اور آئندہ خیال رکھنا۔ اماں کو اس بات کی خبر نہیں ہونی چاہیے.. کیونکہ یہ وہ سب کچھ پسند نہیں کرتیں۔"

"تو کیا آپ اماں کی ناراضگی کی خاطر آپی جان کو یوں ہی سسکتا ہوا چھوڑ دیں گے؟" اس نے دکھ سے بھرپور لہجے میں پوچھا۔

"بالکل، میری ماں اگر مجھے اجازت دیں گی تو ایک

سے دوسرا قدم اٹھاؤں گا ورنہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے، جیسی آپ کی مرضی لیکن ایک بات آپ کو بتادوں، آپی جان آپ کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔ آپ تاحیات یوں ہی سسکتے رہیں گے جیسے آج آپی جان...... سچ اور جھوٹ کی پہچان کرنا آپ کے بس کی بات نہیں۔" اس نے کہا اور باہر نکل گئی۔

اماں میرے اس کارنامے پر بہت خوش ہوئیں اور میں بھی خوش تھا کہ اس خاندان کو ایک اور دکھ دے آیا ہوں لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ کل میری طرف لوٹ کر آئے گا۔

ہم اپنی خوشیوں میں کھوئے ہوئے اپنی دانست میں اس خاندان کو تنگ کر رہے تھے بلکہ ان کے گناہوں کی سزا دے رہے تھے۔ آپی جان نہ جانے کتنا عرصہ بیمار رہیں اور کیسی حالت میں انہوں نے یہ دن گزارے مجھے اس سے کوئی سروکار نہ رہا لیکن سنا تھا کہ وہ میرے لیے بہت روئی تھیں، تڑپی تھیں۔ مجھے جب بھی ایسی کوئی خبر ملتی تو میں یکدم مسکرا کر رہ جاتا۔

"ہونہہ، صرف مجھے وہاں بلوانے کے لیے یہ سب کچھ کیا جارہا ہے۔" میں نے اسی بات سے بچنے کے لیے گاؤں جانا چھوڑ دیا تھا۔ کافی عرصے بعد جانے کیوں ایک دن میرا دل خود ہی ان لوگوں سے ملنے کے لیے تڑپ اٹھا تھا۔ شاید اس رات کے ڈراؤنے اور بھیانک خواب نے مجھے چونکا دیا تھا۔ بقیہ رات میں نے کروٹیں بدل بدل کر گزاری لیکن میں سو نہ سکا تھا۔ چند لمحوں کے لیے بھی سکون نہ ملا تھا۔ صبح صبح میں نے عارفہ سے بات کی تھی۔

"بہت اچھی بات ہے، پھر یہ تو آپ کا فرض تھا جس سے آپ ابھی تک غافل رہے ہیں۔ میں کیا کہوں کہ وہ لوگ حقیقتاً کتنے مخلص اور سادہ لوح ہیں۔"

"لیکن اماں......" میں نے اپنا خوف ظاہر کیا۔

"دیکھیں مظہر، آپ کوئی غلط کام کرنے تو جا نہیں رہے کہ اماں ہمیشہ کے لیے ناراض ہو جائیں گی اور پھر ایسی بات بھی نہیں کہ لوگ آپ کو کچھ برا بھلا کہیں گے۔ آپ دل چھوٹا نہ کریں اور سب کچھ خدا پر چھوڑ دیں۔ خود ہی کوئی نہ کوئی بہتر صورت نکل آئے گی۔" عارفہ نے میرے حوصلے بڑھا دیئے تھے۔ اور یوں میں ایک مدت بعد اس طرف جا رہا تھا۔ جہاں کی ہر شے سے میں اپنے آپ کو نفرت کرنے پر مجبور کرتا رہا تھا ورنہ دلی طور پر کبھی میں ان سے نفرت نہ کر سکا تھا۔

میں نے گھر میں کسی کو بھی نہ بتایا تھا کہ میں کہاں جارہا ہوں۔ بس کام کا بہانہ کیا...... اور سیدھا گاؤں آگیا تھا۔

پھر وہیں سے پتا چلا تھا کہ آپی جان کی حالت نازک ہے اور میں بےتابانہ حویلی کی طرف بھاگا تھا لیکن افسوس، کہ مجھے پہنچنے میں دیر ہو چکی تھی۔ حویلی تو وہی تھی لیکن حویلی کے مکینوں کے رنگ بدل چکے تھے۔ کومل بدل چکی تھی۔ وہ نرم خو اور خوش اخلاق کومل مر چکی تھی۔ اس کی جگہ ایک بارعب اور سخت گیر کومل کھڑی تھی جس نے مجھے آپی جان تک پہنچنے کی اجازت نہیں دی تھی اور میں ناکام و نامراد لوٹ آیا تھا۔

گھر میں کسی کو آپی جان کے مرنے کا زیادہ دکھ نہ تھا۔ خاص طور سے اماں کو۔ انہوں نے ایک بار بھی اظہار افسوس نہیں کیا اور میں سوچنے لگا۔ آپی جان اتنی بھی بے وقعت تو نہیں تھیں کہ ان کی اس طرح سے موت ہوتی لیکن اس میں قصور کس کا تھا۔ ہمارا اور خود کو مجرم کبھی کسی نے نہیں کہا۔

اس حادثے کے چند دن بعد باجی آئیں۔ میں اس

ٹالمی (Ptolemy)

مصر کے یونانی بادشاہوں کا خاندان، جس نے 345 ق م سے 40ء تک حکومت کی۔ ٹالمی اول نے جو سکندر اعظم کا ایک جرنیل تھا، 323 ق م میں مصر پر قبضہ جمالیا اور اسی نام کے بادشاہ یکے بعد دیگرے اس کے جانشین بنے۔ آخری بادشاہ ٹالمی پنج دہم ملکہ قلوپطرہ کا پوتا تھا۔

ٹالین

خلیج فن لینڈ کے جنوبی ساحل پر اسٹونیا کی بحری بندرگاہ اور دارالحکومت، اس کی بنیاد 1219ء میں رکھی گئی تھی۔ یہ ہینسٹک لیگ کا رکن بھی رہا۔ 1561ء میں یہ سویڈن اور 1750ء میں روس کی عملداری میں چلا گیا۔ یہاں تیرہویں صدی عیسوی کا بنا ہوا ایک قلعہ بھی ہے۔ اہم صنعتوں میں بجلی، پارچہ بافی اور کاغذ کی صنعتیں شامل ہیں۔ تیل کے کنوؤں کی کھدائی کے لیے مشینری بھی تیار ہوتی ہے۔ 1917ء تک اس کا نام ریول (جرمن) تھا۔

دن صبح ناشتا کرنے کے بعد اماں جان کے کمرے کی طرف آ رہا تھا کہ دروازے میں ہی میرے قدم کومل کا نام سن کر رک گئے تھے۔

''عشرت اب تو تمہاری پھپھو بھی نہیں رہیں۔ کومل کے والدین بھی یہاں نہیں ہیں۔ اس کے ہاں تمہاری کوششوں سے بچہ بھی نہیں ہوا۔ اب خاور کو اور اسے دور کرنا مشکل کام نہیں ہے۔'' یہ میرے ماں تھیں۔ جو میری بہن کے ساتھ مل کر کومل کو اجاڑنے کا منصوبہ بنا رہی تھیں۔

''اماں جان آپ کو آخر کومل سے کیا دشمنی ہے کہ اس معصوم کا گھر اجاڑنے پر تلی ہوئی ہیں آپ؟'' یہ عارفہ کی آواز تھی۔ جو شاید مجھ سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھی۔

''قصور اسی کا ہے۔ وہ نہ ہوتی تو میرا پوتا میرے پاس ہوتا اور رضیہ اس کی دلہن ہوتی۔'' اماں کا لہجہ زہر خند تھا۔

''تو کیا ہوا، آخر رضیہ کی بھی شادی ہو چکی ہے اور اس کی پسند سے ہوئی ہے۔ اس میں برائی کیا ہے؟'' عارفہ جرح کے انداز میں بولی۔

''تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے... اور نہ تم اس کے حق میں بول سکتی ہو، کل ایسا ہی وقت تم پر بھی آسکتا ہے۔ میرا بیٹا میری بات نہیں ٹالے گا۔'' اماں نے تکبرانہ انداز میں کہا۔

''نہیں اماں آپ ایسا نہیں کرسکتیں۔ کومل بے گناہ ہے بے قصور ہے۔ آپ کے پوتے نے اپنی پسند سے، اپنی مرضی سے اس کے ساتھ شادی کی ہے۔ آپ اور عشرت باجی اس پر ظلم کر رہی ہیں۔ اسے اب تک ماں بننے سے آپ نے محروم کر رکھا ہے۔ کاش، کاش آپ اپنی بیٹیوں کو یاد رکھا کریں۔ خاور آج بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی کہ پہلے دن۔ آج بھی اسے دل سے ہی چاہتا ہے بلکہ یوں کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کی محبت میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ بڑھتی جا رہی ہے اس کی محبت، اور پھر عشرت باجی، آپ نے کبھی یہ سوچا کہ رضیہ کے بچے پیدا ہوتے ہی کیوں مر جاتے ہیں؟ اس کی ممتا کی خواہش کیوں پوری نہیں ہو رہی۔ خدا آپ سے انتقام لے رہا ہے۔ خدا کے لیے نفرت کی یہ آگ بجھا دیں۔ ورنہ جانے کتنے گھر اس میں جل کر بھسم ہو جائیں گے۔ جانے کتنی بے گناہ کوملیں، جانے کتنی رضیہ اس آگ میں جلیں گی۔ آپ لوگوں نے پہلے بھی اس پر، اس کی پاک دامنی پر بہت کیچڑ اچھالا ہے۔ آپ سوچیں اگر خاور اس سے نفرت کر سکتا تو اس وقت کرتا اور پھر اب تو جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔ خدارا اسے بھول جائیں۔ خود بھی سکون سے جئیں اور اسے بھی جینے دیں... ورنہ مظلوم کی آہ پھونک نہ ڈالے آپ کو......''

''عارفہ......'' اماں کڑک کر بولیں۔ ''نکل جاؤ میرے کمرے سے اور تمہاری اس زبان درازی کی سزا میں تمہیں مظہر سے دلواؤں گی۔ اسے تم سے متنفر کرنا زیادہ مشکل کام نہیں ہے اور پھر کومل کے ساتھ تم بھی اپنی تباہی کا منظر دیکھنا۔''

''نہیں اماں...... اب آپ ایسا نہیں کرسکتیں۔'' میں ایک دم پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا۔

''تم...... تم مظہر...... تم کہاں......؟'' اماں کے منہ سے بے ربط الفاظ نکل رہے تھے۔

''میں یہی دروازے کے پاس کھڑا آپ کی منصوبہ بندیاں سن رہا تھا۔ اماں میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی ماں ایسی بھی ہو سکتی ہے۔ اس حد تک جا سکتی ہے۔ یوں سوچ سکتی ہے۔ آپ کیسی ماں ہیں۔ کیا آپ کی اپنی بیٹیاں نہیں ہیں۔ آپ نے کومل پر اور مقدس آپی جان پر کتنے اور کیسے کیسے گھناؤنے الزامات لگائے ہیں۔ کاش آپ یہ سوچ لیتیں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، پھر وہ چلے گا کیسے اور سہاروں پر کب تک چلے گا۔ مجھے افسوس ہے آپ لوگوں کی سوچوں پر، انتہائی افسوس ہے...... کاش آپ جیسی عورت میری ماں نہ ہوتی......'' جانے میں کیا کیا بکتا رہا تھا لیکن جیسے میرے دل و دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ میں اپنی نظروں میں خود ہی گر گیا تھا کہ ہم لوگوں کی سوچیں بہت پست تھیں۔ ہم نے معصوم اور بے داغ کومل کو کیسے کیسے نہ رسوا کیا تھا لیکن پھر بھی دل کی جلن بڑھتی ہی رہی تھی اور یوں ہمارے درمیان نفرتوں کی اونچی دیواریں کھڑی ہو گئیں اور میری محسنہ، میری عزیز از جان، بے حد شفیق اور مہربان آپی جان موت کی بانہوں میں جا سوئی تھیں۔ جن کا دکھ اب سوا ہو گیا تھا۔ کاش یہ باتیں چند دن پہلے معلوم ہو جاتیں تو میں آپی جان کے قدموں میں سر گڑ رگڑ کر ان سے اپنی غلطیوں، اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگ لیتا اور کومل کو بھی راضی کر لیتا۔ خواہ اس کے لیے مجھے ہی کیوں نہ جھکنا پڑتا۔ لیکن اب سوائے پچھتاوؤں کے اور کچھ باقی نہ رہا تھا۔

سوچیں جوں جوں وسیع ہوتی جا رہی تھیں، درد بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ میں اماں سے دور چلا جانا چاہتا تھا جہاں ان

کی زہر آلود باتیں نہ ہوں۔ محبت بھرے دلوں میں نفرت پیدا کرنے والی اماں نہ ہوں۔ جہاں ان کے گھناؤنے منصوبے نہ ہوں اور جہاں کومل جیسی معصوم اور مظلوم پیاری پیاری سی لڑکی نہ ہو... اور یہ سب اسی صورت میں ممکن تھا کہ میں گھر سے کہیں دور رہتا۔ اس مقصد کے لیے میں نے چھٹی لے لی اور گاؤں چلا گیا لیکن وہاں جانا میرے لیے مزید سوہان روح ثابت ہوا۔ روٹھی ہوئی کومل اور ہمیشہ کے لیے دور چلی جانے والی آپی جان کی یادیں۔ یہ سب مجھے کچو کے لگاتے تو میں بے چین ہو اٹھتا اور شام ڈھلنے تک آپی جان کی قبر سے لپٹ لپٹ کر روتا رہتا کہ شاید کچھ سکون میسر آ جائے لیکن سکون نام کی شے تو جیسے مجھ سے روٹھ ہی گئی تھی۔

ایسی ہی ایک سرد شام کو جب پورا قبرستان ویران تھا ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ سناٹے میں تیز ہواؤں کے زور سے درختوں کے پتے ٹوٹ ٹوٹ کر صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے بکھر رہے تھے۔ کومل میرے سامنے آ گئی تھی۔ شاید وہ کچھ دیر اپنی نانی کی قبر سے کسی اجنبی کو لپٹے دیکھتی رہی ہوگی۔ جبھی تو اس کی آواز میں حیرت کے ساتھ خوف بھی نمایاں تھا۔

”کون ہو تم......؟“ اس نے پوچھا تھا۔ آواز کچھ دور سے آئی تھی۔ یقیناً ان سناٹوں، تنہائی اور اجنبی کی موجودگی کے خوف نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ”کون ہو تم...... اور یوں بلک بلک کر کیوں رو رہے ہو......؟“ اب کے اس کے لہجے میں خوف کی جگہ اعتماد نے لے لی تھی۔

”ایک بدنصیب اور بھٹکا ہوا راہی ہوں...... اور اس لیے رو رہا ہوں کہ مرنے والی سے میرا بھی بہت قریبی تعلق تھا۔“

”اوہو...... آپ......“ اس نے قریب آتے ہوئے کہا۔

”ہاں...... میں ہوں مظہر......“ میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ یہاں کیوں آئے ہیں......“ اس کا لہجہ روکھا اور اجنبی تھا۔ جیسے ہمارے درمیان کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

”کومل میں بھٹک گیا تھا۔ مجھے معلوم ہے ہم لوگوں نے تم سے بہت سی زیادتیاں کی ہیں لیکن کیا تم مجھے معاف نہیں کرو گی۔ میں تم لوگوں کا گنہگار ہوں لیکن بخدا میں حقیقت سے لاعلم تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے لیکن۔“

”میں نے آپ سے کوئی وضاحت نہیں مانگی۔ نہ مجھے یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ آپ ایک قاتل ہیں۔ میری آپی جان کے قاتل اور قاتل کو نہ میں یہ اجازت دوں گی کہ وہ اس مقدس جگہ آئے، اور نہ ہی آپی جان کا ایسے شخص سے کوئی تعلق ہے، پلیز چلے جائیں۔ چلے جائیں یہاں سے، آپی جان کی روح کو تکلیف ہو رہی ہوگی اور میں نہیں چاہتی کہ مرنے کے بعد بھی وہ آپ کی وجہ سے عذاب جھیلیں۔“ اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

”لیکن کومل ...... میں نے بتایا ناں......“ میں اپنی صفائی میں بولنا چاہتا تھا لیکن اس نے مجھے اس کا موقع.... ہی نہیں دیا۔

”میں نے کہا چلے جائیں، آپ کا، ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے کومل آپ لوگوں کے لیے مر چکی ہے۔ اس کے لہجے میں بھری کڑواہٹ میں نے محسوس کر لی تھی۔“

”میری بات تو سنو......کومل......“

”کومل ہر ایرے غیرے سے بات نہیں کرتی، بہتر ہے کومل کو کسی خوفناک حرکت پر مجبور نہ کیا جائے۔“ اس نے مجھے ٹھکرا دیا تھا۔ میری حیثیت اس کے سامنے کچھ بھی نہ تھی۔ اس کے دل سے میری محبت محو ہو چکی تھی، اگر کچھ تھا تو ہماری طرف سے بخشی ہوئی نفرتیں۔ اس کی رگوں میں بھرا ہوا ہمارا زہر......

وہ واپس چلی گئی اور مجھے سخت الفاظ میں آئندہ آنے سے منع کر گئی تھی۔ اب گاؤں میں بھی میرے لیے دلچسپی نہ تھی۔ واپسی سے پہلے میں نے ایک کوشش اور کرنا چاہی تھی۔ خاور کے ذریعے کومل کو راضی کرنا چاہا تھا لیکن خاور کا جواب میری توقع کے بالکل برعکس تھا۔ لیکن یہ میری بھول تھی...... مجھ جیسے شخص کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

”انکل آپ کو ان باتوں کا خیال پہلے کرنا چاہیے تھا۔ آپ لوگوں کے رویوں نے اس کے دل میں آپ کے لیے ذرا بھی جگہ نہیں چھوڑ دی۔ وہ صرف اب آپ لوگوں سے نفرت کرتی ہے اور میں کومل جیسی وفادار اور محبت کرنے والی ساتھی کے دل میں اپنی طرف سے شک کی پرچھائیں بھی پڑنے نہیں دوں گا۔“ اور پھر وہ چلا گیا تھا۔ ایک خیال کے آتے ہی میں نے اسے آواز دے لی تھی۔

”خاور کیا تمہارے ہاں اولاد نہیں ہے؟“ میں نے

ہمدردی سے پوچھا۔

''جی نہیں۔''

''اس سلسلے میں تم نے کیا فیصلہ کیا......'' میرے ذہن میں اماں اور عشرت باجی کی باتیں گونج رہی تھیں۔

''میں سمجھا نہیں؟'' اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''میرا مطلب ہے۔ کومل اچھی لڑکی ہے اور پھر باتیں تو......''

''میں جانتا ہوں، اور مجھے خدا سے اس کی اُمید ہے کہ وہی دینے والا ہے جسے چاہے اس دولت سے نوازے، اس میں کومل کا قصور نہیں ہے۔''

''ہاں۔ ہاں، میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا کہ بس اس کی وفاؤں کو دیکھنا اور اللہ پر بھروسا رکھنا بیٹے، کومل کو خوش رکھنا۔ اب تمہی اس کا واحد سہارا رہ گئے ہو۔ تمہیں بے حد چاہتی ہے۔ اس کا اندازہ مجھے ہو چکا ہے۔ کہیں وہ پھول تمہاری بے رخی کی تپش محسوس کرتے ہوئے جھلس نہ جائے، بیٹا میری دعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔'' میں نے اسے دعائیں دیں اور اشک بھری آنکھیں لیے اس جگہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ آیا۔ جہاں بھی مقدس رشتوں کے تاج محل تھے لیکن نفرتوں اور غلط فہمیوں کے طوفانوں نے انہیں مسمار کر دیا تھا۔

اور جب کسی پل، کسی جگہ دل نہ لگا...تو میں نے باہر جانے کی ٹھان لی۔ سروس ختم کر کے یہاں آ گیا جہاں میں دیکھ تو کسی کو نہ سکتا تھا ہاں عارفہ کے خط سے سب لوگوں کے حالات ضرور پڑھ لیتا تھا۔

ایک دن عارفہ کا خط ملا کہ اماں بہت بیمار ہیں اور مجھے یاد کر کے روتی رہتی ہیں۔ ساتھ میں یہ خوشی خبری بھی تھی کہ کومل کو خدا نے چاند سا بیٹا عطا کیا ہے۔

مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں تصور میں کومل کو ننھے منے گول مٹول گورے چٹے صحت مند بچے سے پیار کرتے دیکھتا تو نہال ہو جاتا لیکن پھر دل دکھ سے بھر جاتا کہ کاش میں اسے دیکھ سکتا لیکن کیسے؟ میں سوچ میں پڑ گیا اور پھر ایک حل تلاش کر ہی لیا۔

عارفہ کے جواب کے ساتھ ہی میں نے اس سے کومل اور اس کے بیٹے کی تصویر کی فرمائش بھی کی تھی... اور اماں کے لیے محض دعائیہ کلمات لکھ دیے تھے۔ اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ مجھے جب بھی اماں کی باتیں، ان کا رویہ، ان کے مظالم اور کومل کے خاندان کی مظلومیت یاد آتی تو نفرت کا لاوا کھولنے لگتا۔ مجھے یہ بات کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی کہ مجھے شاید اپنی ماں سے نفرت ہونے لگی تھی۔ جبھی تو اس ماں کی خاطر میں احسان فراموش بنا۔ آپی جان کے احسان عظیم کو ٹھوکروں میں رکھا۔ شاید اس لیے ان کی بیماری کی خبر نے میرے اندر کوئی ہلچل نہیں مچائی تھی۔ مجھے دکھ کا کوئی احساس نہیں ہوا تھا۔ میں تو شاید ان سب باتوں کو یعنی ماں کی بیماری کو بھی ان کا کوئی روپ سمجھا تھا مجھے بارہا ماں کے ساتھ کیا ہوا وعدہ یاد آیا لیکن میں اب خود کو اس عہد سے اس پابندی سے آزاد سمجھنے لگا تھا کہ میرا وہ وعدہ، وہ قسم، وہ عہد تو اس عورت سے تھا جسے وہ ایک مظلوم ماں سمجھ رہا تھا۔ جو خود کو اولاد ہونے کے بعد بھی بے اولاد اور بے سہارا ہی سمجھتی تھی لیکن یہ تو احساس بھی نہیں تھا کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ سب فریب ہے۔ جھوٹ ہے اور سچ بہت تلخ ہے۔ حقیقت تاریک رات کی طرح سیاہ اور اپنے اندر بہت سے زخم اور فریب لیے ہوئے ہے۔

اور پھر جب سچ سامنے آیا تو سب کچھ ختم ہو گیا۔ سارے درد مٹ گئے...اور جھوٹ خود بخود ہی مٹ گیا۔

عارفہ نے جانے کیسے کومل اور ننھے اشعر کی تصویریں حاصل کی تھیں۔ بڑی واضح اور خوبصورت تصویریں تھیں۔ دونوں ماں بیٹا سرمستی کے عالم میں تھے۔ کومل کے سندر چہرے پر ممتا کے نور کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ میں نے ڈھیروں پیار دونوں کو دے ڈالے تھے۔ میری آنکھیں انہیں دیکھ دیکھ کر تھکتی نہ تھیں۔ دل میں درد کی ایک لہر اٹھی تھی جس نے کئی دن تک مجھے اپنی لپیٹ میں لیے رکھا تھا۔ میرا دل میری آنکھیں جانے کتنا روئی تھیں کومل کے ایسے دنوں اور اس کی ازدواجی زندگی کے لیے میں نے جانے کیا کیا سوچ رکھا تھا۔

جلد ہی ایک خط موصول ہوا جس میں اماں کی بیماری کا لکھا تھا۔ عارفہ نے بتایا تھا۔ اماں کو فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ اماں کچھ نہ بول سکتی تھیں نہ ہل سکتی تھیں۔ عارفہ نے لکھا تھا کہ میں واپس آ جاؤں۔ میری ماں بیمار تھیں لیکن نہیں، میں وہاں نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہاں میرے لیے گھٹن تھی۔ وہاں میں نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے صاف انکار بھی نہ کیا اور کوئی واضح سا جواب بھی نہ دیا تھا۔ خطوط کا سلسلہ تیز ہوتا چلا گیا۔ بھیا کے بھی کئی خطوط آئے کہ لوٹ آؤ، اماں بہت بیمار ہیں لیکن میں خاموش تھا۔ ہاں اور ناں کی صلیب میں ٹکے ہوئے چار ماہ گزر گئے۔ اس دوران میں نے ایک بار بھی

واپسی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔
ایک شب میں گھر لوٹا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ ویسے بھی جوں جوں دکھ زیادہ ہوتے جا رہے تھے میرے معمولات بھی بدلتے جا رہے تھے۔ میں گھر کے بدلے نائٹ کلبوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگا تھا اور عموماً رات گئے گھر لوٹا کرتا تھا۔ اور آج تو معمول سے بھی زیادہ دیر ہو چکی تھی۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی کوئی شے میرے پاؤں سے ٹکرائی۔ کھڑکھڑاہٹ سے ظاہر تھا کہ کوئی کاغذ ہے۔ جھک کر اٹھایا، دیکھا تو خط تھا۔ انجانی سی تحریر تھی۔ میں نے کئی بار پلٹ کر اسے دیکھا لیکن کچھ سمجھ نہ سکا تھا۔
بیڈ روم میں آکر خط کو سائیڈ ٹیبل پر رکھا، کپڑے بدلے اور بیڈ پر آگیا۔ کھانا میں باہر ہی کھا لیا کرتا تھا۔
اچانک خط پر نظر پڑی تو بے تابانہ اسے اٹھا لیا اور لفافہ چاک کر ڈالا۔ اندر جو تحریر تھی وہ میرے لیے نئی زندگی کی نوید لے کر آئی تھی۔
مظہر ماموں!
آداب!
مجھے عارفہ سے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے، اس میں قصور کسی کا نہیں۔ شاید ہماری قسمت میں ایسا ہی لکھا تھا اور لکھے کو کوئی مٹا نہیں سکتا..... شاید ہم سب ہی ان راستوں پر چل کر بہت دور نکل گئے تھے جن کی راہ پر ہمیں نانی ماں نے لگایا تھا لیکن ان کے کیے کی سزا انہیں بہت مل چکی ہے۔ میں نے سب کو معاف کیا۔ ہم سب پھر ایک ہیں کہ مجھے میری تعلیم نے اور ماں باپ کی تربیت اور آپی جان کی محبت نے یہی سبق دیا تھا کہ معافی سے بڑا انتقام بھی کوئی نہیں اور میں نہیں چاہتی کہ ایک اور ماں اپنے بیٹے کی دید کی پیاس لیے منوں مٹی تلے چلی جائے۔ کسی آپی جان کی آنکھیں دروازے کی سمت دیکھتے دیکھتے نہ پتھرا جائیں۔ اس سے پہلے آپ لوٹ آئیں کہ وہ آپ کی ماں ہیں اور ماں سے انتقام نہیں لیا جاتا۔
آپ کی کومل
اگلے ہی دن صبح صبح میں نے گھر فون کیا تھا۔
''ہیلو کومل اسپیکنگ!'' کومل کی نرم و ملائم آواز ابھری تھی اور میں جیسے ایک لمحے کو سب کچھ بھول گیا تھا۔ کومل میرے گھر تھی۔ آہ! کیسا خوش قسمت لمحہ تھا کہ کومل میری پیاری پیاری سی بھانجی، میری بیٹی میرے گھر آئی تھی۔
''ہیلو.....'' اس کی اونچی آواز مجھے ہوش کی دنیا میں لے آئی۔
''کومل ...... کومل میں...... میں مظہر ہوں...... تم کیسی ہو؟'' میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا پوچھوں اور کیا کہوں۔
''اوہو...... مظہر ماموں آپ ...... آپ کیسے ہیں......؟'' وہ بھی شاید خوشی میں سب بھول گئی تھی۔
''ٹھیک ہوں بیٹا۔ تم...... یہاں کب آئیں......''
''بہت دن پہلے، جب نانی ماں کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تھی۔ عارفہ ..... کو انہیں سنبھالنے میں زیادہ دشواری تھی۔ بڑی ممانی بھی بیمار ہی ہیں اور آپ کی بہنوں میں کوئی فارغ نہیں کہ سب کے کام ہیں۔ ہم فارغ تھے سو یہاں آگئے۔'' کومل ہنستے ہنستے چوٹ کر ہی گئی تھی۔
''اور...... اشعر اور خاور......''
''سب ٹھیک ہیں، اشعر میرے پاس اور خاور وہیں ہیں، دوسرے تیسرے دن ضرور آتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں ممتا اور وفادار محبوب بیوی کا پیار جھلک رہا تھا۔
''اچھا کومل میں بہت جلد آ رہا ہوں، اسی ہفتے کے آخر تک۔''
''سچ ماموں......'' وہ کھل گئی۔
''بالکل سچ، تم نے بلایا۔ اور میں آگیا۔''
''مجھے آپ پر اتنا ہی اعتماد تھا۔''
''مجھ پر یا اس محبت پر جو اٹل ہے اور جو وقتی طور پر ہم سب نے زبردستی اپنے اپنے دل کے نہاں خانوں میں چھپا لی تھی کہ سب مجبور تھے۔ غلط فہمیاں بڑھ گئی تھیں۔''
''درست کہا آپ نے، لیکن اب بادل برس گئے، دھند چھٹ گئی اور سب کچھ صاف ہو گیا۔ اب راستے نکھر گئے ہیں، آپ کو یہاں وہاں، روشنی ہی روشنی ملے گی۔''
ہماری بات ختم ہو گئی اور میں سوچنے لگا۔ ہاں سچ کہہ رہی تھی کومل، وہاں روشنی ہو گی۔ کومل کی ذات کے سورج سے نکلتی شعاعیں ہر طرف پھیل چکی ہوں گی۔ واقعی وہ عظیم آپی جان کی عظیم نواسی ہے کہ جو بہت اعلیٰ ظرف کی مالک تھیں۔ کاش ہر گھر میں ایک آپی جان ہوتیں تو یہ تیزی سے ٹوٹتے بکھرتے گھر اس طرح کے حادثات سانحات کا شکار نہ ہوں۔
میں جلدی جلدی تیار ہونے لگا کہ ابھی سیٹ ریزرو کروانی تھی اور پھر شاپنگ بھی تو ڈھیر ساری کرنی تھی اپنی بیٹی کے لیے۔ کومل کے لیے اور اپنے ننھے اشعر کے لیے۔



وچھوڑن

جناب معراج رسول

السلام علیکم

میں نے اس سے قبل کبھی کوئی کہانی لکھی نہیں، ہاں پڑھتی ضرور ہوں۔ کئی ماہ قبل سرگزشت میں ایک لڑکی کی آپ بیتی پڑھی تھی۔ اسی سرگزشت کو پڑھ کر میں نے سوچا کہ مجھے بھی اپنی سرگزشت لکھنی چاہیے اور میں نے قلم اٹھا لیا تاکہ دوسروں کو بھی ترغیب ملے۔

نورین

(کراچی)

خالہ زینب سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب امی نے میرا رشتہ ڈھونڈنے کے لیے انہیں بلوایا۔ میں یونیورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد فلموں، ٹی وی اور رسالوں سے دل بہلا رہی تھی۔ میرے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ خالی بیٹھنے سے بہتر ہے کہ کوئی ملازمت کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی اخبارات میں ضرورت ہے کے اشتہار دیکھنا شروع کردیے۔ امی کو جب معلوم ہوا کہ میں ملازمت ڈھونڈ رہی ہوں تو انہوں نے سختی سے مخالفت کی اور بولیں۔ ”کوئی ضرورت نہیں ہے دفتروں میں دھکے کھانے کی۔ چار دن میں سارا رنگ روپ تباہ ہو جائے

گا۔ امور خانہ داری میں دلچسپی لو۔ آگے مل کر یہی چیز تمہارے کام آئے گی۔"

میں نے ان کی بات ہنسی میں اڑاتے ہوئے کہا۔ "کون سی امور خانہ داری۔ اوپر کے کاموں کے لیے ماسی آتی ہے۔ کپڑے برتن دھونے سے لے کر گھر کی جھاڑ پونچھ تک اس کے ذمہ ہے۔ کپڑوں کی سلائی کے لیے درزی موجود ہے۔ صرف کھانا پکانا ہی رہ جاتا ہے تو اس کے لیے مجھے کسی ٹریننگ کی ضرورت نہیں۔ کوکنگ میرا شوق ہے اس لیے میں ہفتے میں ایک دو مرتبہ کوئی نئی ڈش ضرور بناتی ہوں۔ صرف کھانا بنانے کے لیے تو میں سارا دن گھر میں قید نہیں رہ سکتی۔"

"کچھ بھی ہو۔ ملازمت کا خیال دل سے نکال دو۔ میں تمہاری شادی کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ جیسے ہی کوئی اچھا رشتہ آیا تو میں اس کام میں بالکل بھی دیر نہیں لگاؤں گی۔"

"ضرور کیجیے میری شادی میں نے کب انکار کیا ہے لیکن میں اچھے رشتے کے انتظار میں وقت ضائع نہیں کر سکتی۔ میں اس وقت کو کام میں لانا چاہتی ہوں ورنہ ماسٹرز کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ آپ میٹرک کے بعد ہی میری شادی کر دیتیں۔"

"بہت بولنا آ گیا ہے۔" امی مصنوعی غصہ دکھاتے ہوئے بولیں۔ "میرے بس میں ہوتا تو یہی کرتی لیکن یہ تمہارے باپ کی خواہش تھی کہ سب بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔"

"جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔" میں ہنستے ہوئے بولی۔ "میں نے چولہا ہانڈی کرنے کے لیے ماسٹرز نہیں کیا۔ میں اپنی تعلیم اور صلاحیتوں کو کام میں لانا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے ملازمت کرنے سے نہ روکیں۔"

امی کو بالآخر میری بات ماننا پڑی۔ وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بولیں۔ "ٹھیک ہے، تم اپنا شوق پورا کرلو لیکن میری ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟" میں جلدی سے بولی۔

"جیسے ہی تمہاری شادی کی بات طے ہوئی۔ تمہیں ملازمت چھوڑنا ہوگی۔"

"مجھے منظور ہے۔"

امی سے اجازت ملنے کے بعد میں نے پوری تندہی سے ملازمت کی تلاش شروع کردی۔ ضرورت ہے کے اشتہارات دیکھنے کے علاوہ میں نے اپنے کئی کلاس فیلوز سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ میرے لیے کوئی جاب دیکھیں۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد مجھے اپنی ایک کلاس فیلو کے توسط سے جاب مل گئی۔ وہ ایک این جی او میں کام کر رہی تھی۔ وہ لوگ ایک نیا پروجیکٹ شروع کرنے والے تھے جس کے لیے انہیں مزید لوگوں کی ضرورت تھی۔ اسی دوست نے بتایا کہ ملازمت عارضی ہے لیکن اس کے دیر تک جاری رہنے کا امکان ہے اگر میں راضی ہوں تو وہ ایک دو دن میں میرا انٹرویو کروا سکتی ہے۔

میں نے فوراً ہی اسے اپنی سی وی بھیج دی اور تیسرے دن ہی مجھے انٹرویو کال آ گئی۔ وہ جس پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے اس کا مقصد غریب اور مستحق خواتین کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے مدد دینا تھا۔ مجھے یہ پروجیکٹ کافی دلچسپ لگا اور میں نے اس میں کام کرنے کے لیے ہامی بھر لی۔

"یہ ایک بہت ہی مشکل کام ہے۔" پروجیکٹ ڈائریکٹر مسز درانی نے میرے کوائف دیکھنے کے بعد کہا۔ "تمہیں دن بھر فیلڈ میں رہنا ہوگا۔ غریب اور پس ماندہ علاقوں میں جا کر ایسی عورتوں کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنی ہوں گی جو غربت کی چکی میں پس رہی ہیں جنہیں پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ تن پر پھٹے پرانے بوسیدہ کپڑے ہیں۔ سر چھپانے کے لیے چھت نہیں۔ وہ کچے پکے تنگ و تاریک مکانوں میں زندگی کے دن پورے کر رہی ہیں، جہاں نہ روشنی ہے، نہ پانی اور نہ ہوا۔ گھر میں کوئی بیمار ہو جائے تو علاج کے لیے سرکاری اسپتالوں کے دھکے کھانا ہوتے ہیں۔ ہمیں ایسی ہی عورتوں کے لیے کام کرنا ہے۔ ان کی مدد کرنی ہے لیکن اس طرح کہ کسی کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ ہر مہینے ان کے ہاتھ پر پانچ دس ہزار روپے رکھنا مسئلے کا حل نہیں اور نہ ہی ہمارے وسائل اس کی اجازت دیتے ہیں۔ ہمیں اس کے لیے کوئی ایسا طریقہ نکالنا ہے جس کے ذریعے وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر معاشی طور پر خودمختار ہو جائیں۔ تم میری بات سمجھ رہی ہونا۔"

"جی جی بالکل۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ اتنا آسان نہیں ہے۔" وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولیں۔ "اس کے لیے تمہیں مشنری جذبے سے کام کرنا ہوگا۔ ہماری این جی او، ماڈرن اور فیشن ایبل خواتین کا کلب نہیں ہے جو صرف فوٹو سیشن اور پبلسٹی کے ذریعے نام بنانا چاہتی ہیں۔ ہمارا مقصد صرف اور صرف غریب اور بے سہارا عورتوں کے حالات بہتر بنانا ہے اور یہ کام کئی مرحلوں میں ہوگا۔ پہلے گھر گھر جا کر ان عورتوں کو تلاش کرنا جو صحیح معنوں میں ہماری مدد کی مستحق ہیں پھر ان میں

چھپے ہوئے ٹیلنٹ کو باہر نکالنا۔ بہت سی عورتوں کو اپنی صلاحیتوں کا علم ہی نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ یہ جانتی ہیں کہ ان سے کیسے فائدہ اٹھایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر فرد کو کسی نہ کسی صلاحیت سے نوازا ہے۔ تمہیں اسی ٹیلنٹ کو باہر نکالنا اور اس سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ دریافت کرنا ہے۔''

وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئیں پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولیں۔ ''اس سلسلے میں تمہیں دو بڑے مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ عورتوں میں فطری طور پر جھجک پائی جاتی ہے اگر انہیں معلوم ہو بھی جائے کہ وہ کون سا کام بہتر طریقے سے کرسکتی ہیں تب بھی اس سے فائدہ نہیں اٹھاسکتیں۔ یاد رکھو ہمیشہ پہلا قدم اٹھانا سب سے مشکل ہوتا ہے۔ اگر یہ مرحلہ سر ہوجائے تو منزل تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ تمہیں ان عورتوں میں اعتماد، حوصلہ اور ہمت پیدا کرنی ہے تاکہ وہ منزل کی جانب پہلا قدم اٹھاسکیں۔''

انہوں نے چشمہ اتار کر ٹشو پیپر سے اس کے شیشے صاف کیے اور دوبارہ آنکھوں پر رکھتے ہوئے بولیں۔ ''دوسرا مسئلہ اس سے بھی بڑا ہے۔ ہمارے معاشرے میں زیادہ تر مرد نہیں چاہتے کہ عورتیں معاشی طور پر خود مختار ہوں۔ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر عورت کے ہاتھ میں چار پیسے آگئے تو وہ ان کی دست نگر نہیں رہیں گی اور انہیں اس پر حکم چلانے یا ظلم ڈھانے کا موقع نہیں ملے گا۔ وہ عورتوں کو اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہیں تاکہ اس کی مجبوری اور بے بسی سے فائدہ اٹھا کر اس کا استحصال کرتے رہیں۔ ان مردوں کو سمجھانا ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟''

''اگر آپ کا تعاون اور رہنمائی ملتی رہے تو میں ہر چیلنج کا سامنا کرسکتی ہوں۔'' میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

''گڈ! مجھے تم سے اسی جواب کی توقع تھی۔ تم کل سے جوائن کرسکتی ہو۔''

میں نے گھر آکر امی کو بتایا تو انہوں نے کچھ زیادہ خوشی کا اظہار نہیں کیا اور جب انہیں میرے کام کی نوعیت کے بارے میں علم ہوا تو منہ بناتے ہوئے بولیں۔ ''اس سے تو بہتر تھا کہ تم دفتر میں بیٹھ کر کام کرتیں۔ اس طرح دھوپ، بارش اور ٹھنڈ میں گھر گھر جاؤ گی تو تمہارا رنگ روپ بالکل تباہ ہوجائے گا۔''

''آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میں اپنا خیال رکھوں گی۔''

دوسرے دن سے میں نے کام پر جانا شروع کردیا۔

مسز درانی نے چار لڑکیوں کا گروپ بنایا اور ہماری ٹریننگ شروع ہوگئی۔ ایک ہفتے بعد ہمیں اورنگی ٹاؤن بھیج دیا گیا۔ وہ بہت بڑی آبادی تھی۔ اگر ہم گھر گھر جاکر سروے کرتے تو شاید اس میں کئی سال لگ جاتے۔ مسز درانی نے اس کا حل یہ نکالا کہ اس علاقے میں این جی او کا ایک کیمپ لگایا اور اس پر ایک بڑا سا بینر لگا دیا جس پر لکھا تھا۔ ''مستحق خواتین کے لیے باعزت روزگار کی فراہمی'' وہ ایک چھوٹی سی دکان تھی جس میں چار کرسیاں اور میزیں لگا کر ہمارے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔

دو تین دن تک وہاں کوئی نہ آیا۔ لوگ کیمپ کے سامنے سے گزرتے۔ ایک نظر بینر پر ڈالتے اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ شاید وہ اسے دفتر روزگار قسم کی کوئی چیز سمجھ رہے تھے۔ شہر میں ایسے کئی ادارے قائم ہو چکے تھے جو ملازمت کا جھانسا دے کر لوگوں سے پیسے بٹورتے تھے۔ ہمارے کیمپ کے بارے میں بھی شاید ایسا ہی تاثر قائم کیا گیا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر مسز درانی نے اپنی حکمتِ عملی میں تھوڑی سی تبدیلی کردی اور محدود پیمانے پر سروے کرنے کا فیصلہ کیا۔ طے پایا کہ دو لڑکیاں کیمپ میں رہیں گی جب کہ دو لڑکیاں گھر گھر جاکر ان مستحق عورتوں کے بارے میں معلومات حاصل کریں گی جو کوئی کام کرکے اپنے حالات بہتر بنانے کی خواہش مند ہیں۔

مجھے کیمپ میں بیٹھنا پسند نہیں تھا اس لیے فیلڈ میں کام کرنے کو ترجیح دی۔ مسز درانی نے فیصلہ کیا کہ پہلے ایک جنرل سروے کیا جائے۔ اس کے لیے ایک سوالنامہ تیار کیا گیا۔ وہ ایک مردم شماری کی طرز کا سروے تھا۔ جس میں گھر کے سربراہ اور دیگر افراد کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھیں۔ پہلے روز ہم نے دس گھروں کا سروے کیا۔ جن میں سے نو گھروں میں مفلسی نے ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ یعنی آمدنی کم اور اخراجات زیادہ۔ ان میں کچھ بیوہ عورتیں بھی تھیں جن کے گھر میں کوئی کمانے والا نہیں تھا۔ وہ اور ان کے بچے چھوٹے موٹے کام کرکے زندگی کی گاڑی گھسیٹ رہے تھے۔

ہم نے سب سے پہلے انہی عورتوں کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان میں سے کئی ایک باصلاحیت اور ہنرمند تھیں لیکن وسائل اور تعلقات نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاسکتی تھیں بہت سی عورتیں کپڑوں کی سلائی

کرسکتی تھیں۔ ہم نے ان کے لیے سلائی مشینوں کا بندوبست کیا۔ کچھ لڑکیوں کو کمپیوٹر سے دلچسپی تھی۔ انہیں کمپیوٹر کا کورس کروایا۔ غرض یہ کہ جو عورت بھی کام کرنا چاہ رہی تھی اسے اس کی صلاحیت کے مطابق سہولت فراہم کی گئی جس کے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے اور بہت مختصر عرصے میں کئی عورتیں اپنے پیروں پر کھڑی ہوگئیں۔

مجھے ملازمت کرتے ہوئے ایک سال ہوگیا تھا لیکن اس وقت تک میرا کوئی رشتہ نہیں آیا۔ امی کی پریشانی بڑھنے لگی۔ حالانکہ میری عمر صرف پچیس برس تھی لیکن وہ یوں پریشان ہورہی تھیں جیسے میری شادی کی عمر نکلی جارہی ہو۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ سارے کزنز مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے تھے لہٰذا قریبی رشتے داروں میں سے رشتہ آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ دور کے رشتے داروں سے زیادہ ملنا نہیں تھا۔ کبھی کبھار شادی بیاہ میں ان سے سامنا ہوجاتا۔ ان میں سے شاید بہت سوں کو تو یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ میں شادی کے قابل ہوچکی ہوں۔ اسی طرح ملنے جلنے والوں میں بھی کوئی میرے جوڑ کا نہیں تھا۔

یہ صورتِ حال امی کے لیے بڑی مایوس کن تھی۔ اب انہوں نے ہر آنے جانے والے سے کہنا شروع کردیا کہ ان کی نظر میں کوئی لڑکا ہو تو بتائیں۔ ایک دو لوگوں نے چند رشتے بتائے لیکن ان میں کوئی بھی میرے معیار کا نہیں تھا۔ کسی کی عمر زیادہ تھی تو کسی کی تعلیم کم تھی اور کسی کا خاندانی پس منظر ٹھیک نہیں تھا۔

ایک دن میں کام سے واپس آئی تو امی کے پاس ایک اجنبی عورت کو بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ ''ماشاء اللہ بڑی پیاری بچی ہے۔''

میں کپڑے تبدیل کرنے کے ارادے سے اپنے کمرے میں آگئی تو امی بھی میرے پیچھے چلی آئیں اور بولیں۔ ''نورین! اگر تمہارے پاس کوئی اچھی سی تصویر ہو تو دے دو۔''

میں نے حیرت سے انہیں دیکھا اور بولی۔ ''آپ کو میری تصویر کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟''

''پہلے تم تصویر دو تفصیل بعد میں پوچھ لینا۔''

میری بحث کرنے کی عادت نہیں تھی اس لیے مزید کچھ کہے بغیر البم سے ایک تصویر نکال کر انہیں دے دی۔ کچھ دیر بعد وہ خاتون چلی گئیں تو امی نے بتایا کہ ان کا نام زینب ہے اور یہ رشتے کرواتی ہیں۔ میں نے تمہارے سلسلے میں انہیں بلایا تھا اور وہ اسی لیے تمہاری تصویر لے گئی ہیں۔''

یہ سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں جھنجلاہٹ کے عالم میں بولی۔ ''آپ کیوں میرا تماشا بنا رہی ہیں۔ اب نہ جانے میری تصویر کن ہاتھوں میں جائے گی اور اس پر کیسے کیسے تبصرے کیے جائیں گے۔''

امی میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔ ''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ وہ بہت سمجھدار عورت ہے۔ تمہارا کوئی تماشا نہیں بنے گا۔''

''امی آپ ان عورتوں کو نہیں جانتیں۔ انہیں صرف اپنے کمیشن سے غرض ہوتی ہے، آپ دیکھ لیجیے۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی رشتہ لے کر آجائیں گی۔ دو گھنٹے بیٹھ کر اس کی تعریفوں کے پل باندھیں گی۔ چائے، بسکٹ اور سموسوں سے اپنا پیٹ بھریں گی اور آنے جانے کا کرایہ لے کر چلتی بنیں گی اور یہ سلسلہ مہینوں چلتا رہے گا۔''

''وہ ایسی عورت نہیں ہیں۔'' امی نے کہا۔

''مسز راشد مجھے ان کے بارے میں بتا چکی ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے مشورہ دیا تھا کہ تمہارے رشتے کے لیے خالہ زینب سے بات کروں۔ وہ کئی لڑکیوں کی شادیاں کروا چکی ہیں اور وہ سب اپنے گھروں میں خوش ہیں۔''

''پھر بھی میں یہی کہوں گی کہ آپ بہت محتاط رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی الٹے سیدھے رشتے بتا کر آپ کا وقت اور پیسا ضائع کریں۔''

''تم بے فکر رہو۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

کئی دن گزر گئے لیکن خالہ زینب ... پلٹ کر نہیں آئیں۔ امی بڑی بے چینی سے ان کا انتظار کررہی تھیں پھر ایک مہینے بعد انہوں نے امی کو فون پر بتایا کہ انہوں نے میرے لیے ایک دو لڑکے دیکھے ہیں اور وہ ان کے بارے میں معلومات کررہی ہیں۔ پہلے خود مطمئن ہوجائیں پھر بات آگے بڑھائیں گی۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ بھی اپنی اہمیت منوانے کا ایک طریقہ ہے تاکہ یہ ظاہر کرسکیں کہ انہیں میرے لیے کتنی دوڑ دھوپ کرنا پڑ رہی ہے۔

تین مہینے بعد وہ آئیں تو ان کے پاس بھی ایک تصویر تھی پھر انہوں نے بتایا کہ لڑکے کی ماں سے ان کی دور پرے کی رشتہ داری ہے۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ اپنا گھر، گاڑی سب کچھ ہے۔ لڑکے کا اپنا کاروبار ہے۔ اس پر

کوئی ذمے داری نہیں ہے لیکن ان کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے کہ قریبی رشتہ داروں میں سبھی لڑکیاں اس سے عمر میں بڑی یا بہت چھوٹی ہیں اسی لیے انہوں نے خالہ زینب سے کوئی پڑھی لکھی اور قبول صورت لڑکی ڈھونڈنے کے لیے کہا تھا۔

امی نے لڑکے کی تصویر کو غور سے دیکھا۔ اس کے کوائف جاننے کے بعد ان کے پاس پوچھنے کے لیے کوئی سوال نہیں تھا۔ انہوں نے خالہ سے کہا۔ ”ٹھیک ہے اگر آپ مطمئن ہیں تو بات آگے بڑھائیں۔ میں ثمینہ کے ابو سے مشورہ کر کے آپ کو بتا دوں گی۔“

”مطمئن نہ ہوتی تو تمہارے پاس آتی ہی کیوں۔“ خالہ نے جواب دیا۔ ”میری جان پہچان کے لوگ ہیں۔ نیک اور شریف پیسے والے ہیں اس لیے انہیں کوئی لالچ بھی نہیں ہوگا پھر بھی تم ان سے ایک دفعہ مل لو۔ لڑکے کو دیکھ لو جب پوری طرح مطمئن ہو جاؤ تو بات آگے بڑھاؤں گی۔“

ان کے گھر میں فون نہیں تھا اس لیے امی کا جواب سننے کے لیے انہیں ایک ہفتہ بعد دوبارہ آنا پڑا۔ البتہ وہ لڑکے کی تصویر امی کے پاس چھوڑ گئی تھیں تاکہ مجھ سمیت گھر کے دوسرے افراد بھی دیکھ لیں۔ میں جب شام کو کام سے واپس آئی تو امی نے وہ تصویر مجھے دکھائی اور لڑکے کے بارے میں خالہ نے جو تفصیل بتائی تھی وہ میرے گوش گزار کر دی۔ میں نے تصویر کو غور سے دیکھا تو مجھے اس میں کوئی عیب نظر نہیں آیا۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، چوڑی پیشانی اور مسکراتا ہوا چہرہ، میں نے تصویر امی کو واپس کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، آپ جو مناسب سمجھیں لیکن میری ایک شرط ہے۔“

امی حیران ہوتے ہوئے بولیں۔ ”وہ کیا؟“

”بات پکی ہونے سے پہلے میں موصوف سے اکیلے میں ملنا چاہوں گی۔“

وہ تیوری چڑھاتے ہوئے بولیں۔ ”وہ کیوں؟“

”جس شخص کے ساتھ مجھے ساری زندگی گزارنی ہے۔ اس سے دس پندرہ منٹ بات کرنے میں کیا ہرج ہے؟“

”ہرج تو کوئی نہیں۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔ ”پہلے رشتہ طے ہو جائے پھر بات کر لینا ورنہ وہ لوگ سوچیں گے کہ ہم نے پہلے سے شرطیں عائد کرنا شروع کر دیں۔“

”چلیں یونہی سہی۔“

امی نے خالہ زینب کے توسط سے ان لوگوں کو اگلے اتوار کی شام چائے پر بلا لیا اور کہا کہ وہ لڑکے کو بھی ساتھ لے کر آئیں تاکہ لڑکا اور لڑکی بھی ایک دوسرے کو دیکھ لیں۔ مقررہ وقت پر وہ لوگ آ گئے۔ شاہد کے والدین کے علاوہ ان کی دو شادی شدہ بہنیں بھی آئی تھیں۔ امی نے چائے پر خاصا اہتمام کیا تھا۔ مجھے وہ لوگ اچھے لگے۔ شاہد کی بہنیں بڑی خوش مزاج اور ہنس مکھ تھیں۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میں سوشل ورکر ہوں تو مجھ سے اسی فیلڈ کے بارے میں باتیں کرنے لگیں۔ میں نے انہیں اپنے پروجیکٹ کے بارے میں بتایا تو وہ بہت متاثر ہوئیں۔ ابو نے شاہد سے دو چار سوالات کیے جس کا انہوں نے بڑے شائستہ اور سلجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

جاتے وقت شاہد کی امی نے ہمارے گھر والوں کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ ہمارے یہاں سے امی، ابو اور بڑے بھائی گئے۔ امی کو ان کا گھر بہت پسند آیا۔ ان کے یہاں ضرورت اور آرائش کی ہر چیز موجود تھی۔ خالہ زینب بھی موجود تھیں۔ ان لوگوں کی خوب خاطر تواضع ہوئی۔ اس کے چار دن بعد ہی انہوں نے خالہ زینب کے ذریعے کہلوا دیا کہ وہ لوگ باقاعدہ پیغام دینے کے لیے آنا چاہتے ہیں۔

اس طرح کی دو چار ملاقاتوں کے بعد شاہد کے ساتھ میرا رشتہ طے پا گیا۔ ایک سادہ سی تقریب میں منگنی کی رسم ادا کی گئی اور میری انگلی میں شاہد کے نام کی انگوٹھی پہنا دی گئی۔ منگنی کے بعد میں نے سوچا کہ امی کو ان کا وعدہ یاد دلاؤں لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی، ایک روز شاہد کا خود ہی فون آ گیا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہ رہے تھے۔ اس وقت میں کیمپ میں عورتوں کے درمیان گھری بیٹھی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ ان کی بات کا کیا جواب دوں جب کہ میں خود ان سے ملنے کی خواہش مند تھی۔ میں نے کہا۔ ”میں امی سے پوچھ لوں کیونکہ انہیں بتائے بغیر کوئی کام نہیں کرتی۔ آپ مجھے رات میں دوبارہ فون کریں۔“

میں نے گھر آ کر امی کو شاہد کے فون کے بارے میں بتایا تو وہ تھوڑی سی فکر مند ہو گئیں اور بولیں۔ ”تم نے پوچھا نہیں کہ وہ کس سلسلے میں بات کرنا چاہ رہا ہے؟“

”نہیں میں تو خود ان سے بات کرنے کی خواہش مند تھی۔ اچھا ہوا کہ انہوں نے پہل کر دی۔“

”ٹھیک ہے۔ ایک دفعہ ملنے میں کوئی ہرج نہیں لیکن زیادہ باتیں مت کرنا۔ شادی سے پہلے کچھ فاصلے رہنا چاہیے۔“

رات کو ان کا فون آیا تو میں نے ملاقات پر رضامندی ظاہر کردی۔ اگلے دن شام چھ بجے کا وقت طے ہوا۔ وہ ریستوران ہمارے گھر کے قریب ہی تھا۔ میں دفتر سے واپس آتے ہوئے وہاں اتر گئی، شاہد پہلے سے موجود تھے مجھے دیکھ کر انہوں نے گھڑی پر نظر ڈالی اور مسکرا دیئے۔

میں تیز تیز قدم چلتی ہوئی ان کے پاس پہنچی اور اپنا پرس میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”مجھے دو منٹ کی اجازت دیجیے۔ میں اپنا حلیہ ٹھیک کرلوں۔“

”ضرور ضرور۔“ انہوں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

میں واش روم میں آگئی۔ منہ دھویا، بالوں میں ہلکا سا برش کیا۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک لگائی اور واپس اپنی میز پر آگئی۔ انہوں نے مجھے ستائشی نظروں سے دیکھا اور بولے۔ ”ماشاء اللہ! آپ تصویر کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوب صورت اور پرکشش ہیں۔“

میں جھینپتے ہوئے بولی۔ ”میری بھی آپ کے بارے میں یہی رائے ہے۔“

”چلیں، تعریفوں کا سیشن تو ہو گیا۔ اب کچھ کام کی باتیں ہو جائیں۔ پہلے یہ بتائیں کہ آپ کے لیے کیا منگواؤں۔ چائے، کولڈ ڈرنک یا کچھ اور؟“

”صرف چائے۔“ میں نے کہا۔

انہوں نے بیرے کو بلا کر چائے اور اسنیکس کا آرڈر دیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ”میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ جانتا ہوں کہ آپ دن بھر کی تھکی ہاری دفتر سے آئی ہیں۔ میں آپ سے صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ رشتہ آپ کی رضامندی سے ہوا ہے، اس میں کسی زور زبردستی یا جبر کو تو دخل نہیں۔“

”ظاہر ہے اگر میری مرضی نہ ہوتی تو انکار کرسکتی تھی۔“ میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔“

”آپ میری بات کا برا نہ منائیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ”دراصل بہت سی لڑکیاں اپنے والدین کی ناراضی سے بچنے کے لیے ان کی مرضی کے آگے سر جھکا دیتی ہیں۔ کہیں آپ بھی تو ان لڑکیوں میں شامل نہیں۔“

”ہرگز نہیں اگر میری کوئی چوائس ہوتی تو انہیں پہلے ہی بتا دیتی۔ انہوں نے میرے لیے جو مناسب سمجھا وہی کیا اور میں ان کے فیصلے سے مطمئن ہوں۔ ویسے بھی میرے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ آپ میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن کی کوئی لڑکی تمنا کرسکتی ہے۔“

”اس ستائش کا شکریہ۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

اتنی دیر میں بیرا چائے اور دیگر لوازمات لے کر آگیا۔ میں نے ان کے لیے چائے بنائی اور پوچھا۔ ”چینی کتنی؟“

”صرف ایک چمچ۔“ وہ بولے۔ ”ایک بات اور دراصل میں نے اسی موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے آپ کو زحمت دی ہے۔ میں اپنی امی کے ذریعے بھی یہ بات آپ کے گھر والوں تک پہنچا سکتا تھا لیکن میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے آپ کے خیالات معلوم کرلوں کیوں کہ لڑکیاں اس معاملے میں بہت حساس ہوتی ہیں۔“

”الٰہی خیر۔“ میں نے دل میں سوچا۔ ”اب کون سا موضوع شروع ہونے والا ہے۔“

”دیکھیں ثمینہ جو کچھ میں کہنے والا ہوں۔ اسے بڑے تحمل اور غور سے سنیں۔ اس میں ناراض ہونے یا برا منانے والی کوئی بات نہیں۔ ہوگا وہی جو آپ چاہیں گی۔“

”اوہو، اب کہہ بھی دیں۔ ایسی کیا خاص بات ہے جس کے لیے اتنی لمبی چوڑی تمہید باندھی جارہی ہے۔“

”دراصل میں بہت سادگی پسند ہوں اور چاہتا ہوں کہ جس طرح منگنی ہوئی اسی طرح شادی بھی سادگی سے ہو۔ آج کل لوگ مہندی میں لاکھوں خرچ کردیتے ہیں۔ اتنے پیسوں میں کسی غریب لڑکی کی شادی ہوسکتی ہے۔ اسی طرح شادی اور ولیمے میں ہزار پانچ سو سے کم مہمان نہیں ہوتے، کھانے میں کئی اقسام کی ڈشیں رکھی جاتی ہیں۔ آپ خود سوچیں کہ ایک آدمی کتنا کھا سکتا ہے۔ پھر جہیز دینے میں ماں باپ کی چیخیں نکل جاتی ہیں اور زیادہ تر لوگ مقروض ہوجاتے ہیں۔“

میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اتنا کہہ سکی۔ ”آپ کے خیال میں کیا ہونا چاہیے۔“

”میں مہندی کی رسم کے سخت خلاف ہوں۔ اس کا ہمارے مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح رخصتی اور ولیمے میں کم سے کم مہمان بلائے جائیں اور کھانے میں صرف ایک ڈش ہو۔ اسی طرح جہیز بھی بہت مختصر ہونا چاہیے۔ صرف چند جوڑے کپڑے اور تھوڑا سا زیور۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔“

”بیڈ روم سیٹ تو ہونا چاہیے۔“ میں نے آہستہ سے

کہا۔
"چلیں، آپ اپنی خوشی پوری کرلیں۔ اس کے علاوہ اگر کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو وہ میں شادی کے بعد لادوں گا۔"
"مجھے آپ کی باتوں سے سو فی صد اتفاق ہے لیکن امی اور ابو کو اس کے لیے آمادہ کرنا بہت مشکل ہوگا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ والدین ایسے موقعوں پر دل کھول کر اپنے ارمان پورے کرتے ہیں۔"
"جانتا ہوں اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہ ایسی چار شادیاں کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں لیکن اگر وہ یہی پیسا کسی غریب کی بیٹی کی شادی پر خرچ کریں تو کتنا ثواب ہوگا۔"
"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن اگر یہی بات آپ کے بزرگوں کی طرف سے ہو تو زیادہ بہتر رہے گا۔"
"ٹھیک ہے، میں جلد ہی امی کو آپ کے گھر بھیجوں گا۔"
شاہد کی باتیں سن کر میں دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ خالہ زینب نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہ لوگ لالچی نہیں ہیں۔ میں نے سوچا کہ اپنی بات کہنے کا یہ اچھا موقع ہے۔ میں دل مضبوط کرتے ہوئے بولی۔ "آپ نے اپنی بات کہہ لی۔ اب میں بھی کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"
"ضرور کہیں، میں سن رہا ہوں۔"
"یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں ایک سوشل ورکر ہوں اور ایک این جی او کے ساتھ کام کر رہی ہوں۔ میں نے غربت کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور جانتی ہوں کہ یہ کتنا بڑا عذاب ہے۔ میں جس پروجیکٹ پر کام کر رہی ہوں... اس کا مقصد غریب اور بے سہارا عورتوں کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنا اور معاشرے میں باعزت زندگی گزارنے کے قابل بنانا ہے لیکن یہ اتنا بڑا کام ہے کہ اس کے لیے میری ساری زندگی بھی ناکافی ہے۔ امی نے مجھے شادی تک ملازمت کرنے کی اجازت دی تھی۔ اب ان کا اصرار ہے کہ میں یہ جاب چھوڑ کر امور خانہ داری کی طرف توجہ دوں کیونکہ عورت کا اصل کام گھر سنبھالنا ہے۔"
"کہتی تو وہ بھی ٹھیک ہیں۔" شاہد مسکراتے ہوئے بولے۔
"لیکن اس طرح تو میرا مشن ادھورا رہ جائے گا۔" میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔
"گویا آپ شادی کے بعد بھی ملازمت جاری رکھنا چاہتی ہیں؟"
"جی بالکل تاکہ میں نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ وہ جاری رہے اور میں زیادہ سے زیادہ عورتوں کی مدد کرسکوں۔"
"ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ میں دونوں ذمے داریاں نبھانے کی پوری صلاحیت ہے۔"
شاہد کی طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد میں پوری تندہی سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اورنگی ہنر مندوں کا علاقہ ہے۔ وہاں کی عورتیں سلائی، کڑھائی اور کشیدہ کاری میں ماہر ہیں لیکن انہیں ان کی محنت کا بہت کم معاوضہ ملتا ہے کیونکہ ان کی اسٹوروں اور بوتیک تک رسائی نہیں تھی۔ ان کا سارا منافع مڈل مین لے جاتا تھا۔ میں نے کلفٹن اور طارق روڈ کے دکانداروں سے بات کی اور ان کے بناتے ہوئے کچھ سیمپل ان دکانوں پر رکھ دیئے جن کی فروخت سے ان عورتوں کو خاطر خواہ آمدنی ہوئی اور وہ براہ راست دکانوں پر مال سپلائی کرنے لگیں جس سے تھوڑے ہی دنوں میں ان کے حالات بہتر ہونا شروع ہو گئے۔
بہرحال میری شادی کا دن بھی آگیا۔ امی تو بڑی دھوم دھام سے میری شادی کرنا چاہ رہی تھیں لیکن شاہد کے گھر والوں کے کہنے پر انہوں نے اپنے پروگرام میں ترمیم کرلی۔ وہ خود بھی فضول رسموں اور نمود و نمائش کی قائل نہیں تھیں۔ اس لیے سب کچھ بہت سادگی سے ہوا۔ میں بیاہ کر اپنے نئے گھر آ گئی۔ شاہد کے گھر والے بہت ہی اچھے تھے۔ انہوں نے پہلے دن سے ہی میرا بہت خیال رکھا۔ شاہد نے انہیں بتا دیا تھا کہ میں شادی کے بعد بھی ملازمت جاری رکھوں گی۔ اس لیے جب چھٹیاں ختم ہونے کے بعد میں کام پر جانے لگی تو کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ان کے گھر میں تین گاڑیاں تھیں۔ سسر جی نے ان میں سے ایک میرے لیے مخصوص کردی اور ڈرائیور سے کہہ دیا کہ وہ صبح مجھے دفتر چھوڑنے جائے اور شام کو واپس لے کر آئے۔
اس دوران مجھے ایک بار بھی خالہ زینب کا خیال نہیں آیا۔ شادی کے بعد جب میں پہلی بار امی کے گھر رہنے کے لیے آئی تو باتوں باتوں میں ان کا ذکر نکل آیا۔ میں نے ٹوہ لینے کے لیے امی سے پوچھا کہ خالہ زینب نے میرا رشتہ طے کرانے کا کیا معاوضہ لیا تھا۔
امی نے مجھے گھورا اور بولیں۔ "میں نے شاید تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ وہ اس خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں لیتیں۔"

"مجھے یاد نہیں کہ آپ نے ایسی کوئی بات کہی تھی۔"
میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "آپ ہی کچھ اپنی طرف سے دے دیتیں۔ دیکھیں نا کہ آپ کتنی پریشان تھیں۔ انہی کی کوششوں سے یہ رشتہ ہوا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن وہ بڑی خود دار خاتون ہیں۔ معاوضہ لینا تو دور کی بات ہے انہوں نے کبھی مجھ سے رکشا کا کرایہ بھی نہیں مانگا۔"

"وہ رہتی کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے ٹھیک طرح سے معلوم نہیں۔" امی بولی۔ "مسز راشد کو ان کا پتا معلوم ہے۔ شاید لانڈھی میں رہتی ہیں۔"

"لانڈھی وہ... اتنی دور سے اپنا کرایہ خرچ کر کے گلشن آتی تھیں۔"

"ہاں ایسے ہی لوگوں سے دنیا قائم ہے۔" امی ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولیں۔

"اب تک نہ جانے کتنی لڑکیوں کی شادی کروا چکی ہیں اور انہوں نے کبھی اس خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں لیا لیکن ان کی اپنی بیٹی ابھی تک بیٹھی ہوئی ہے۔"

"وجہ؟" میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ "وہ دوسروں کے لیے ماری ماری پھرتی ہیں۔ اپنی لڑکی کا کبھی خیال نہیں آیا۔"

"یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔" امی نے غصے سے کہا۔ "کون سی ماں ہوگی جسے اپنی اولاد کی فکر نہ ہو۔"

"پھر کیا وجہ ہے کہ اس لڑکی کی شادی نہیں ہو رہی۔ کیا اس میں کوئی عیب ہے۔ اس کی عمر زیادہ ہو گئی ہے۔ شکل و صورت کی اچھی نہیں ہے؟"

"غربت سب سے بڑا عیب ہے بیٹی۔" امی نے ایک اور سرد آہ بھری۔ "ورنہ وہ لڑکی تو ہزاروں میں ایک ہے۔ تمہاری شادی میں آئی تھی۔ تب میں نے اسے دیکھا تھا۔"

"اوہ!" ایک لمحہ میں میری سمجھ میں ساری بات آ گئی۔ میں نے کہا۔ "ان لوگوں کا گزارہ کیسے ہوتا ہے؟"

"بیٹی کسی اسکول میں پڑھاتی ہے اور خالہ زینب محلے والوں کے کپڑے سیتی ہیں۔ بس اسی طرح کھینچ تان کر گزارہ ہو رہا ہے۔"

مجھے خالہ زینب کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا۔ یہ کیسی ستم ظریفی تھی کہ کئی لڑکیوں کے رشتے کروانے والی کی اپنی بیٹی شادی کے انتظار میں گھر کی دہلیز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے امی سے کہا۔ "کیا مجھے خالہ زینب کا پتا مل سکتا ہے؟"

"کیوں؟" امی نے پوچھا۔

"ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ میرا تو کام ہی یہی ہے کہ غریب اور بے سہارا عورتوں کی مدد کروں۔"

"کوشش کر کے دیکھ لو لیکن میرا خیال ہے کہ وہ تمہاری مدد قبول نہیں کریں گی۔"

"میں انہیں خیرات نہیں دے رہی۔ مدد کرنے کے اور بھی کئی طریقے ہیں۔ ایک دفعہ گھر جا کر ان سے مل لوں پھر سوچوں گی کہ ان کے لیے کیا ہو سکتا ہے۔"

امی نے اسی وقت فون پر مسز راشد سے میری بات کروادی۔ انہوں نے مجھے خالہ زینب کا پتا بتا دیا اور بولیں کہ وہ ہفتہ دس دن میں ان کے یہاں آتی ہیں اگر میں چاہوں تو وہ انہیں میرے گھر بھیج دیں گی لیکن میں خالہ زینب کے گھر جا کر ان کے حالات کا مشاہدہ کرنا چاہتی تھی اس لیے میں نے مسز راشد کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔

گھر آ کر میں نے شاہد کو خالہ زینب کے بارے میں بتایا تو وہ بھی پریشان ہو گئے اور بولے۔ "آج کل لوگ بہت مادہ پرست ہو گئے ہیں۔ قریبی رشتے داروں نے بھی ان کی لڑکی کے بارے میں نہیں سوچا ہوگا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہاں سے انہیں جہیز کے نام پر کچھ نہیں ملے گا۔"

"ہاں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ دراصل خالہ زینب بہت ہی نیک اور مخلص خاتون ہیں اگر وہ بھی لوگوں سے رشتے کروانے کا معاوضہ وصول کرتیں تو اپنی بیٹی کے لیے اچھا خاصا جہیز جمع کر سکتی تھیں۔"

"انہوں نے کسی لالچ کے بغیر لوگوں کی خدمت کی۔ انہیں اس کا صلہ ضرور ملے گا۔"

"مجھے خالہ سے زیادہ ان کی بیٹی کی فکر ہے۔ میں اس کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔"

"تم نے اس بارے میں کیا سوچا ہے۔"

"فی الحال کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک ہلکا سا خاکہ میرے ذہن میں ہے اگر خالہ تعاون کریں تو کامیابی کی اُمید ہے۔"

"اس کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ میں ہر طرح سے تمہارے ساتھ ہوں۔"

شاہد سے اجازت ملنے کے بعد میں چھٹی والے دن خالہ سے ملنے گئی۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد مجھے ان کا گھر مل گیا۔ دروازہ ان کی بیٹی نائلہ نے کھولا اور مجھے دیکھ کر حیران

رہ گئی۔ میں نے پوچھا۔ ''خالہ زینب ہیں؟''

''جی ہاں۔'' وہ بڑے مہذب انداز میں بولی۔ ''اندر آجائیں۔''

خالہ زینب برآمدے میں تخت پر سلائی مشین لیے ہوئے بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر کھڑی ہوگئیں اور گلے لگاتے ہوئے بولیں۔ ''تم...... تم کیسے آگئیں۔ اگر کوئی کام تھا تو مجھے بلوالیا ہوتا۔''

''نہیں خالہ کوئی کام نہیں بس آپ سے ملنے کو دل چاہا، اس لیے چلی آئی۔''

''چلو اچھا کیا۔ تمہیں دیکھ کر بہت خوشی ہورہی ہے۔ تم خوش تو ہو۔''

''جی اللہ کا شکر ہے۔ میں بہت خوش ہوں اور سچ پوچھیں تو میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔ آپ کی کوششوں سے ہی میری اتنی اچھی جگہ شادی ہوگئی۔''

''نہیں بیٹی، اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ تمہاری قسمت میں جو لکھا تھا وہ تمہیں مل گیا۔''

نائلہ میرے لیے چائے لے کر آئی۔ ساتھ میں بسکٹ بھی تھے۔ میں نے خالہ سے کہا۔ ''ایک بات پوچھوں، آپ برا تو نہیں منائیں گی؟''

''ضرور پوچھو، میں کیوں برا مانوں گی۔''

''مجھے امی نے بتایا ہے کہ آپ رشتے کرانے کا کوئی معاوضہ نہیں لیتیں جب کہ آج کل تو لوگ اس کام میں ہزاروں کمارہے ہیں۔ بہت سی عورتوں نے شادی دفتر کھول رکھے ہیں جہاں صرف رجسٹریشن کی فیس ہی تین سے پانچ ہزار تک ہے اور رشتہ طے ہوجائے تو اس کی فیس پچیس تیس ہزار تک لی جاتی ہے۔''

''جانتی ہوں لیکن میں کسی کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا نہیں چاہتی۔ یہ میرا کاروبار نہیں بلکہ میں لوگوں کی مدد کررہی ہوں۔''

''پھر بھی خالہ...... معاوضہ لینا تو آپ کا حق بنتا ہے۔''

''بالکل نہیں محنت معاوضہ کا لیا جاتا ہے۔ رشتہ کرانے میں مجھے کوئی محنت نہیں کرنا پڑتی۔''

میں سمجھ گئی کہ اس موضوع پر مزید بات کرنا بے کار ہے۔ لہٰذا میں نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔ ''نائلہ تم کیا کرتی ہو۔''

وہ شرماتے ہوئے بولی۔ ''میں نے گریجویشن کیا ہے۔ ایک اسکول میں پڑھاتی ہوں اور چھٹی کے بعد امی کے کام میں ان کا ہاتھ بٹاتی ہوں۔''

''یعنی تم بھی سلائی کرتی ہو؟'' میں نے کہا۔

''بیٹی! اب تو سارا کام اسی نے سنبھال رکھا ہے۔'' خالہ بولیں۔ ''میرا تو بس نام ہے۔ ماشاء اللہ اس کے ہاتھ میں بڑی صفائی ہے۔ بڑی نفاست سے کام کرتی ہے۔''

''ایک سوٹ کے کتنے پیسے مل جاتے ہیں؟''

''دو سو سے تین سو تک۔'' نائلہ بولی۔ ''دراصل سب پرانے جاننے والے ہیں اس لیے ہم کسی سے بھاؤ تاؤ نہیں کرتے۔''

''کیا کہا دو تین سو۔'' میں چلاتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں پتا ہے کہ آج کل درزی ایک عام سوٹ کے کم از کم چھ سو روپے لیتے ہیں اور اگر کوئی ڈیزائن بنوائیں تو ہزار بارہ سو سے کم بات نہیں کرتے۔''

''اگر ہم نے بھی درزی والے ریٹ مانگے تو یہاں کوئی نہیں آئے گا اور ہم اس آمدنی سے بھی محروم ہوجائیں گے۔''

میں نے خالہ سے پوچھا۔ ''یہ مکان آپ کا اپنا ہے۔''

''ہاں بیٹی! اللہ بخشے تمہارے خالو نے اپنی زندگی میں ہی سر چھپانے کا ٹھکانا کرلیا تھا۔ اس مہنگائی کے دور میں اپنا مکان بھی ایک نعمت ہے۔''

میں نے دل میں حساب لگایا۔ نائلہ کو اسکول سے آٹھ ہزار ملتے ہیں اگر دونوں ماں بیٹی نے مل کر مہینے میں دس جوڑے بھی سی لیے تو زیادہ سے زیادہ تین ہزار ہاتھ آئے ہوں گے۔ کل ملا کر ہوئے گیارہ ہزار۔ اس سے کیا گزارہ ہوتا ہوگا۔ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''خالہ! اگر کوئی ایسا بندوبست ہوجائے کہ آپ کو سلائی کا بہتر معاوضہ ملنے لگے؟''

''ایسا کیا بندوبست ہوسکتا ہے؟'' انہوں نے بے یقینی سے کہا۔

''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں دو چار روز بعد پھر آؤں گی۔''

اگلے دن میں نے اپنی ایک جاننے والی سے رابطہ کیا۔ ان کا طارق روڈ پر بوتیک تھا۔ انہیں ہمیشہ اچھے کام کرنے والوں کی ضرورت رہتی تھی۔ میں نے ان سے نائلہ کا ذکر کیا کہ کیا وہ اس کے لیے کوئی کام نکال سکتی ہیں۔ اس سے پہلے

بھی میں نے اورنگی کی کئی عورتوں کو ان سے متعارف کروایا تھا اور انہیں اپنے کام کے اچھے پیسے مل رہے تھے۔ مسز صدیقی ہر اس کاریگر کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں جو ان کے مطلب کا کام کر سکے۔ ڈیزائننگ وہ خود کرتی تھیں اور میٹریل بھی ان کا ہوتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اس لڑکی کو میرے پاس بھیج دو اور ہو سکے تو وہ اپنے تیار کیے ہوئے سوٹ بھی لیتی آئے تاکہ میں اس کا کام دیکھ لوں۔"

میں اگلے دن ہی خالہ زینب کے گھر پہنچ گئی اور انہیں مسز صدیقی کے بارے میں بتایا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولیں۔ "تم جانتی ہو کہ یہ بوتیک والیاں کتنا تنگ کرتی ہیں۔ ایک تو ان کے نخرے بہت ہیں ہر کام میں کوئی نہ کوئی عیب ضرور نکالیں گی پھر پیسے لینے کے لیے دس چکر لگانا پڑتے ہیں۔ لانڈھی سے طارق روڈ جانا کوئی آسان ہے کیا؟"

میں نے ان کی ہمت بڑھانے کے لیے کہا۔ "مسز صدیقی ایسی نہیں ہیں میں انہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ آپ کو ان کا کام کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

میرے بہت اصرار پر وہ مسز صدیقی کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے ساتھ دو سلے ہوئے جوڑے بھی لے لیے۔ مسز صدیقی کو ان کا کام بہت پسند آیا۔ انہوں نے فوراً ہی اپنی فائل میں سے ایک ڈیزائن نکالا اور نائلہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔ "اسے اچھی طرح دیکھ لو۔ میں نے ایک کاغذ پر تمام تفصیل لکھ دی ہے پھر بھی اگر کوئی بات سمجھ نہ آئے تو پوچھ سکتی ہو۔"

نائلہ نے غور سے ڈیزائن دیکھا اور بڑے اعتماد سے بولی۔ "کوئی مسئلہ نہیں۔ میں کر لوں گی۔"

"گڈ!" مسز صدیقی بولیں۔ "میں جانتی تھی کہ تمہارا یہی جواب ہوگا۔" اس کے بعد انہوں نے ایک لڑکی کو بلا کر وہ ڈیزائن دیا اور کہا کہ وہ اس کا میٹریل لے آئے۔ جب وہ سامان کا تھیلا لے کر آئی تو مسز صدیقی نے اپنا کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ "اس پر میرا فون نمبر درج ہے۔ تم جب چاہو مجھ سے بات کر سکتی ہو اور مجھے بھی اپنا نمبر دے دو تاکہ رابطہ کرنے میں آسانی رہے۔"

یہ سن کر دونوں ماں بیٹی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے کہ خالہ زینب کچھ کہتیں میں بول پڑی۔ "ان کا لینڈ لائن فون خراب ہے۔ یہ آپ کو اپنا موبائل نمبر دے دیں گی۔"

مسز صدیقی میرا اشارہ سمجھ گئیں۔ انہوں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ آپ اللہ کا نام لے کر کام شروع کریں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ایک دوسرے کو مطمئن کر سکیں گے۔"

راستہ میں ایک موبائل شاپ پر رک کر میں نے ایک موبائل خریدا اور نائلہ کو دیتے ہوئے بولی۔ "اس میں اپنے نام کی سم ڈلوا لینا۔ یہ میری طرف سے تحفہ ہے۔"

"نہیں بیٹی، یہ زیادتی ہے۔" خالہ نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "میں اتنا قیمتی تحفہ نہیں لے سکتی۔"

"تحفہ کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ مجھے اپنی بیٹی سمجھ کر رکھ لیجیے۔ ویسے بھی اب آپ کو اس کی ضرورت پڑے گی۔"

چلتے وقت میں نے انہیں اپنا نمبر دیا اور بولی۔ "جب کام پورا ہو جائے تو مجھے فون کر دیجیے میں آپ کو لے جاؤں گی۔"

"نہیں بیٹی، ہم چلے جائیں گے۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"آپ کہاں بسوں میں دھکے کھاتی پھریں گی۔ ایک دو دفعہ میں آپ کے ساتھ جاؤں گی جب آپ کو اس کام سے معقول آمدنی ہونے لگے تو رکشا ٹیکسی سے چلی جایا کریں۔"

پانچویں روز ان کا فون آیا تو میں انہیں لے کر ایک بار پھر مسز صدیقی کے پاس گئی۔ انہیں سوٹ دکھایا۔ کام ان کی منشا کے مطابق ہوا تھا اور وہ کافی مطمئن نظر آرہی تھیں۔ انہوں نے فوراً ہی وہ سوٹ ڈسپلے میں لگوا دیا اور بولیں۔ "ویسے تو ہم چیز بکنے کے بعد ہی پے منٹ کرتے ہیں لیکن میں آپ کو انتظار کی کوفت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی اس لیے ابھی ادائیگی کر رہی ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ سوٹ جلد ہی نکل جائے گا۔"

یہ کہہ کر انہوں نے اپنے پرس سے ہزار روپے نکالے اور خالہ کو دیتے ہوئے بولیں۔ "فی الحال یہ رکھ لیں۔ باقی حساب کتاب مہینا پورا ہونے پر ہوگا۔"

خالہ نے شکریہ ادا کر کے وہ پیسے رکھ لیے۔ مسز صدیقی نے اپنی فائل سے دو ڈیزائن نکالے اور بولیں۔ "آپ کے پاس جو ڈیزائن ہے۔ اس کے دو سوٹ اور دو یہ۔ اس طرح آپ کے پاس چار سوٹ ہو جائیں گے۔"

انہوں نے پہلے کی طرح ان سوٹوں کے لیے میٹریل منگوایا اور بولیں۔ "آپ اپنی اسپیڈ بڑھائیں جتنا زیادہ کام کریں گی۔ اتنی ہی زیادہ آمدنی بھی ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "دراصل ان کے پاس ایک ہی مشین ہے۔ اس پر یہ گھر والوں کے کپڑے بھی سیتی ہیں۔"

"آپ ایک ہائی اسپیڈ مشین لے لیں۔ اس پر ایمبرائیڈری کا کام بھی ہوسکتا ہے۔ اس کے زیادہ پیسے ملتے ہیں اگر آپ کہیں تو میں قسطوں پر دلوا سکتی ہوں۔"

خالہ نے کہا۔ "میں سوچ کر بتاؤں گی۔"

میں نے خالہ اور نائلہ کو گھر پر اتارا۔ میں نے خالہ سے کہا۔ "مسز صدیقی ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں آپ کو دوسری مشین لے لینی چاہیے۔ ایک پر آپ سلائی کا کام کریں۔ دوسری مشین نائلہ کے حوالے کردیں۔ اس طرح آپ کی آمدنی میں کافی اضافہ ہوسکتا ہے۔"

"لیکن بیٹا اس کی قسط بھی تو دینی ہوگی۔"

"جب آپ کی آمدنی بڑھے گی تو قسط نکالنا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ صرف ایک سال کی تو بات ہے۔ اس کے بعد مشین آپ کی ہوجائے گی۔"

وہ مان گئیں۔ میں نے مسز صدیقی کو بتایا تو انہوں نے ایک ہفتے میں ساری کارروائی پوری کر کے انہیں مشین دلا دی۔ اس طرح خالہ کا کام چل نکلا۔ انہوں نے دس دن میں وہ چاروں سوٹ تیار کر کے مسز صدیقی کے حوالے کردیے۔ انہوں نے مزید چار سوٹوں کا میٹریل انہیں دے دیا۔ دراصل ان کے پاس کام کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ان کے اپنے بوتیک پر روزانہ دس بارہ سوٹ آرام سے نکل جاتے تھے۔ عید بقر عید پر تو انہیں سر کھجانے کی فرصت نہیں ہوتی تھی اسی لیے وہ چھ ماہ پہلے ہی تیاری شروع کردیتی تھیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے دوسرے شاپنگ مالز پر بھی اپنے آؤٹ لیٹ قائم کررکھے تھے جہاں ان کے تیار کردہ ملبوسات فروخت ہوتے تھے۔

مسز صدیقی نے پہلے سوٹ کا جو معاوضہ ادا کیا۔ میں نے یہی بات ان سے کہی تو وہ بولیں۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں نے انہیں پورا معاوضہ نہیں دیا تھا۔ دراصل ہم قیمت فروخت کا ایک حصہ کاریگر کو ادا کرتے ہیں اسی لیے میں نے کہا تھا کہ مہینا پورا ہونے پر حساب کروں گی۔ تم فکر نہ کرو۔ ان کا جو حصہ ہوگا وہ انہیں مل جائے گا۔"

چھ مہینے میں ہی خالہ زینب کے حالات میں کافی بہتری آگئی۔ وہ مہینا میں اوسطاً پندرہ سوٹ تیار کرنے لگیں جس سے انہیں بیس پچیس ہزار کی آمدنی ہونے لگی۔ بعض اوقات ایک ڈیزائن اتنا پاپولر ہوتا کہ کئی ہفتوں تک وہی چلتا رہتا تھا۔ مسز صدیقی ان کے کام سے پوری طرح مطمئن تھیں اور ہر طرح سے ان کی مدد کررہی تھیں۔

خالہ زینب کا مالی مسئلہ حل ہوا تو میں نائلہ کے بارے

میں سوچنے لگی۔ اب اس کی شادی ہو جانی چاہیے تھی۔ کیا وجہ ہے کہ اتنی اچھی لڑکی کا ابھی تک کوئی رشتہ نہیں آیا۔ بہت غور کرنے کے بعد ایک ہی بات سمجھ میں آئی۔ وہ انتہائی سادگی اور قناعت سے زندگی بسر کر رہی تھیں۔ ان کے گھر میں ٹی وی، فریج، واشنگ مشین، بیڈ، صوفہ سیٹ کچھ بھی نہیں تھا۔ ان کا کل اثاثہ دو پلنگ، ایک تخت، دو کرسیاں اور ایک تپائی تھی۔ ایک ایسے گھر میں رشتہ لے کر کون آتا؟

''تو کیا نائلہ ساری عمر یونہی بیٹھی رہے گی؟'' میں نے بڑے دکھ سے سوچا۔ اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوگا۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ خالہ زینب کو وہ جگہ چھوڑ کر کسی اچھے علاقے میں رہائش اختیار کرنی چاہیے۔ اب انہیں اتنی آمدنی ہو رہی تھی کہ وہ باآسانی اپنا لائف اسٹائل تبدیل کر سکتی تھیں لیکن کیا خالہ اپنا گھر چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گی۔ یہ ایک مشکل ٹاسک تھا جسے میں نے چیلنج سمجھ کر قبول کر لیا۔

ایک دن میں نائلہ کی غیر موجودگی میں ان کے گھر گئی۔ وہ اسکول گئی ہوئی تھی۔ خالہ مجھے صبح کے وقت دیکھ کر حیران ہو گئیں اور بولیں۔ ''بیٹی خیریت تو ہے۔ تم اس وقت کیسے آ گئیں؟''

''جی ہاں خیریت ہی ہے۔ بس یونہی آپ سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا اس لیے چلی آئی۔''

''اچھا کیا، بیٹھو۔ میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔''

''نہیں خالہ رہنے دیں۔ میں چائے پی کر آئی ہوں۔ دراصل مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''ہاں کہو۔''

''آپ نے نائلہ کے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولیں۔ ''میں کیا سوچوں گی جب اللہ کی مرضی ہوگی۔''

''بے شک اس کی مرضی کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا لیکن انسان خود بھی تو کوشش کرتا ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔''

''تم کیا سمجھتی ہو۔ میں نے کوشش نہیں کی۔ کئی جاننے والوں سے کہہ چکی ہوں لیکن ابھی تک بات نہیں بنی۔''

''آپ نے اس کی وجہ جاننے کی کوشش کی جب کہ نائلہ ماشاءاللہ خوب صورت، پڑھی لکھی اور سلیقہ مند لڑکی ہے پھر اس کی شادی میں کیا رکاوٹ ہے؟''

''میں خود نہیں سمجھ سکی۔ تمہارے خیال میں کیا وجہ ہو سکتی ہے؟''

''دیکھیں خالہ برا نہ منائیں تو ایک بات کہوں؟''

''ہاں...... ہاں کہو، مجھے معلوم ہے کہ تم میری بھلائی کا ہی سوچو گی۔''

''آج کل لوگ ظاہری ٹپ ٹاپ کو دیکھتے ہیں۔ ان کی نظر سب سے پہلے گھر پر جاتی ہے اس لیے میرا مشورہ ہے کہ آپ بھی لانڈھی سے نکل کر کسی اچھی جگہ شفٹ ہو جائیں۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ اگر میں یہ مکان بیچ دوں تو اتنے پیسوں میں دوسرا مکان کہاں ملے گا۔''

''آپ اس مکان کو بیچ کر نائلہ کی شادی کے لیے پیسے بینک میں رکھ دیں اور اپنے رہنے کے لیے کوئی فلیٹ کرایہ پر لے لیں۔''

''نہیں بھئی، میں اپنی چھت سے محروم ہونا نہیں چاہتی۔ کرایہ کے مکان میں دس مسئلے ہیں۔ پہلے ایک لمبا چوڑا ایڈوانس دو، ہر مہینے کرایہ کی فکر اور جب مالک مکان کا دل چاہے خالی کرا لے۔''

''خالہ آپ کو اپنی بیٹی کے بہتر مستقبل کی خاطر یہ قربانی دینا ہوگی۔ میں آپ کے لیے ایسے فلیٹ کا بندوبست کروں گی جہاں آپ کو نہ ایڈوانس دینا ہوگا اور نہ ہی کوئی خالی کرنے کے لیے کہے گا۔ کرایہ بھی واجبی سا ہوگا۔''

''ایسا فلیٹ کہاں ملے گا؟''

''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ بس آپ گھر بدلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔''

''اچھا! میں نائلہ سے مشورہ کر کے بتاؤں گی۔''

میں نے ساری اسکیم پہلے سے سوچ رکھی تھی۔ دراصل شاہد کا ایک فلیٹ کافی عرصے سے خالی پڑا ہوا تھا جو انہوں نے انویسٹمنٹ کی غرض سے خریدا تھا۔ پہلے انہوں نے وہ فلیٹ کرائے پر دیا لیکن وہ لوگ ٹھیک نہیں تھے۔ بڑی مشکل سے ان سے فلیٹ خالی کروایا۔ اب شاہد نے سوچ رکھا تھا کہ کسی جاننے والے کو ہی کرائے پر دیں گے۔ میں نے ان سے بات کی تو وہ فوراً تیار ہو گئے۔ وہ تو ان سے کرایہ لینے پر بھی تیار نہیں تھے لیکن میں جانتی تھی کہ خالہ کبھی نہیں مانیں گی۔

نائلہ بھی میری اسکیم سے متفق تھی۔ اس نے بھی خالہ پر زور دیا تو وہ اپنا مکان بیچنے پر تیار ہو گئیں۔ ساری کارروائی ایک مہینے میں پوری ہو گئی۔ شاہد نے فلیٹ میں رنگ و روغن کروایا اور ضروری فرنیچر ڈلوا دیا۔ میں نے خالہ سے کہہ دیا تھا

کہ جب انہیں مکان کے پیسے ملیں تو وہ ان سامان کی قیمت ادا کریں۔ اس طرح خالہ اپنے نئے گھر میں منتقل ہو گئیں۔

ان دونوں پر ماحول کی تبدیلی کا بہت اچھا اثر پڑا۔ ان فلیٹوں میں سب پڑھے لکھے اور معزز لوگ رہتے تھے۔ خالہ اور نائلہ نے بھی ماحول سے متاثر ہو کر اپنے رہن سہن میں تبدیلی کر لی خالہ پُروقار شخصیت کی مالک تھیں جب کہ نائلہ کی خوب صورتی اور کشش نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا مجھے یقین تھا کہ پاس پڑوس سے بہت جلد اس کے لیے رشتہ آجائے گا۔ میں نے بھی اپنے طور پر لوگوں سے نائلہ کے لیے کہنا شروع کر دیا لیکن بہت جلد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

ہوا یوں کہ ایک دن خالہ زینب کی طبیعت ناساز تھی۔ اس لیے نائلہ تیار شدہ سوٹ لے کر مسز صدیقی سے ملنے چلی گئی۔ ابھی وہ ان سے باتیں کر رہی تھی کہ مسز صدیقی کا بیٹا ناصر کسی کام کے سلسلے میں ان کے پاس آیا۔ اس نے حال ہی میں اپنی تعلیم مکمل کی تھی اور سیر و تفریح میں وقت گزار رہا تھا۔ اس کی نظر نائلہ پر پڑی اور وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ نائلہ ان نظروں کا مفہوم سمجھتی تھی۔ اس نے جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹا اور وہاں سے رخصت ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد ناصر نے ماں سے پوچھا۔

''امی یہ لڑکی کون ہے؟''

''یہ ہمارے لیے کام کرتی ہے۔ بہت ذہین اور محنتی لڑکی ہے۔''

''مجھے بھی بہت اچھی لگی۔'' ناصر نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''جب آپ میرے لیے لڑکی ڈھونڈنے نکلیں تو سب سے پہلے اس کے گھر جائیں۔''

''تمہاری شادی تو میں دو تین سال بعد کروں گی۔'' انہوں نے بیٹے کو ٹالنے کے لیے کہا۔ ''ضروری نہیں کہ اس وقت تک یہ کنواری بیٹھی رہے۔''

''تو پھر آپ ابھی بات پکی کر دیں۔ شادی بعد میں ہوتی رہے گی۔'' ناصر نے مضبوط لہجے میں کہا۔

مسز صدیقی نے بیٹے کو سنجیدہ دیکھا تو سہم گئیں۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ اس کی بات رد نہیں کر سکتی تھیں۔ انہوں نے بیٹے کو سمجھانے کے لیے کہا۔ ''اتنا بڑا فیصلہ کرنے میں جلد بازی ٹھیک نہیں۔ تم اس لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

''مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ مجھے پسند آگئی ہے۔ اگر اس میں کوئی عیب ہے تو بتا دیں۔''

مسز صدیقی ٹپٹا گئیں۔ نائلہ میں کوئی عیب ہوتا تو بتاتیں۔ وہ خود اسے بہت پسند کرتی تھیں لیکن اسے بہو بنانے کا تو انہوں نے سوچا بھی نہ تھا اس لیے آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ''بیٹے! وہ بہت غریب ہے۔ تمہیں وہاں سے کچھ نہیں ملے گا۔ میں تو کسی بڑے گھر میں تمہارا رشتہ کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔''

''جب آپ کی شادی ہوئی تو ابو ایک پرائیویٹ کمپنی میں کلرک تھے اور نانا کی کریانہ کی دکان تھی۔ آج آپ کے پاس پیسا آگیا ہے تو بڑے گھر سے رشتہ جوڑنے کے بارے

بھارتی ریاست بہار میں
''جی ایس ٹی'' کی پیدائش

بھارتی ریاست بہار کے گاؤں میں پیدا ہونے والی بچی کا نام اس کے والد نے جی ایس ٹی رکھ دیا کیوں کہ اس کی پیدائش عین اس وقت ہوئی جب وزیراعظم نریندر مودی ملک میں نئے گڈز اینڈ سروسز ٹیکس (جی ایس ٹی) کے نفاذ کا اعلان کر رہے تھے۔ بھارتی میڈیا کی رپورٹ کے مطابق ریاست بہار کے گاؤں میں 30 جون کو رات 12 بجکر 2 منٹ پر بچی کی پیدائش اُس وقت ہوئی جب وزیراعظم نریندر مودی اور صدر پرناب مکھرجی ملک میں تاریخی جی ایس ٹی کے نفاذ کا اعلان کر رہے تھے۔ بچی کے والد نے اس تاریخی لمحے کو یادگار بنانے کے لیے بیٹی کا نام ہی جی ایس ٹی رکھ دیا۔ بہار کا یہ گاؤں دلچسپ و عجیب نام رکھنے کے حوالے سے شہرت رکھتا ہے اور یہاں ماضی میں بھی بچوں کے 'کورٹ' اور 'کافی' جیسے نام رکھے جا چکے ہیں۔ بچی کا نام جی ایس ٹی رکھے جانے کی خبر سماجی رابطوں کی ویب سائٹ پر شیئر ہوتے ہی بھارتی سیاستدانوں نے بھی اس پر تبصرہ شروع کر دیا۔ حکمراں جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی کے ترجمان نالن ایس کوہلی نے بچی کی ماں اور بچی کی تصویر کو شیئر کرتے ہوئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ بھارتی ریاست راجستھان کی وزیراعلیٰ وسندھرا راجے نے بھی اپنی ٹوئیٹ میں بچی کو درازی عمر اور صحت و تندرستی کی دعا دی۔

میں سوچ رہی ہیں۔ اس سے آپ کو کیا ملے گا۔ صرف یہی کہ وہ جہیز میں دو چار قیمتی چیزیں دے دیں گے۔ کیا ہمارے پاس کسی چیز کی کمی ہے جو آپ اس کاٹھ کباڑ کی خاطر میری پسند کو ٹھکرا رہی ہیں۔"

"اچھا! مجھے سوچنے دو۔" مسز صدیقی نے اپنی جان چھڑانے کے لیے کہا۔

"ضرور سوچیں لیکن یہ بتا دوں کہ میں اس لڑکی کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروں گا۔"

مسز صدیقی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ اس معاملے کو کیسے سلجھائیں۔ وہ اپنے بیٹے کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھیں۔ وہ انتہائی ضدی اور ہٹ دھرم تھا۔ ایک بار جو بات اس کے دماغ میں آجائے وہ اس سے پیچھے نہیں ہٹتا تھا۔ جوان اور اکلوتی اولاد تھا۔ وہ اس پر سختی بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ نائلہ انہیں بھی پسند تھی اگر وہ کسی بڑے گھر کی بیٹی ہوتی تو وہ اسے بہو بنانے میں ایک منٹ کی بھی دیر نہ کرتیں مگر یہاں حیثیت کا فرق آڑے آگیا تھا۔ ان کے ذہن کی سوئی بار بار ایک ہی نکتے پر آکر اٹک رہی تھی کہ دنیا کیا کہے گی، لوگ کیا سوچیں گے کہ انہیں پورے شہر میں یہی لڑکی ملی تھی۔ وہ ایک ہفتے تک ناصر کو سمجھاتی رہیں لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہا اور اس نے ماں سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اس کی شادی نائلہ سے نہ ہوئی تو وہ ہمیشہ کے لیے ملک سے باہر چلا جائے گا اور وہ کبھی اس کی شکل نہیں دیکھ سکیں گی۔

ناصر کی یہ دھمکی کارگر رہی اور مسز صدیقی نے ہتھیار ڈال دیئے۔ انہوں نے فون کر کے مجھے بلایا اور مجھے ساری صورت حال بتائی۔ پہلے تو مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ تو پہلی نظر والی محبت کی کہانی لگ رہی تھی۔ ناصر نے پہلے کبھی نائلہ کو دیکھا نہ اس سے ملا۔ وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ بس پہلی بار اسے دیکھا اور دل ہار گیا۔

مسز صدیقی نے کہا۔ "تم پہلے تو یہ معلوم کرو کہ نائلہ کی کہیں بات تو طے نہیں ہوئی پھر خالہ زینب کو بتا دو کہ میں اپنے بیٹے کی شادی نائلہ سے کرنا چاہتی ہوں اگر وہ راضی ہیں تو میں باقاعدہ پیغام لے کر جاؤں۔"

جب میں نے خالہ زینب کو یہ بات بتائی تو وہ حیران ہوتے ہوئے بولیں۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہماری اور ان کی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بھلا کبھی مخمل میں بھی ٹاٹ کا پیوند لگا ہے۔ ویسے بھی ہم پلہ لوگوں میں شادی کرنی چاہیے۔"

میں نے کہا۔ "خالہ! زینب کو گریجویشن کیے ہوئے پانچ سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے۔ اب تک کتنے ہم پلہ لوگوں کے یہاں سے اس کا رشتہ آیا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ امیر اور غریب گھرانوں میں رشتے ہوتے رہتے ہیں۔ آپ اللہ کا نام لے کر ہاں کر دیں۔ مجھے یقین ہے کہ نائلہ اس گھر میں خوش رہے گی۔"

میرے بہت سمجھانے پر وہ اس رشتے کے لیے تیار ہو گئیں۔ ان کی طرف سے گرین سگنل ملتے ہی مسز صدیقی پیغام لے کر پہنچ گئیں۔ ناصر بھی ان کے ساتھ تھا۔ خالہ نے شادی کی تیاری کے لیے چھ ماہ کی مہلت مانگی۔ مسز صدیقی سادگی سے شادی کرنا چاہ رہی تھیں لیکن خالہ نے کہا کہ وہ اپنی بیٹی کو خالی ہاتھ رخصت نہیں کریں گی۔

شادی کی تیاری میں شاہد نے بہت تعاون کیا۔ انہوں نے برات کے کھانے اور ہال کی ذمے داری لے لی۔ میں نے اپنی طرف سے ایک سونے کا سیٹ تحفہ میں دیا۔ مسز صدیقی نے بھی بہت اچھی بری بنائی تھی اور ولیمہ بھی بڑی دھوم دھام سے کیا۔

نائلہ کی شادی کے بعد میں بھی وچولن بن گئی ہوں۔ پہلے میں غریب اور بے سہارا عورتوں کے لیے باعزت روزگار کا بندوبست کرتی تھی۔ اب میں نے لڑکیوں کے رشتے کروانے بھی شروع کر دیئے ہیں۔ حقیقت میں یہ ہمارے معاشرے کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ میرے سامنے خالہ زینب کی مثال ہے جنہوں نے خلق خدا کی خدمت کی اور اس کا صلہ انہیں زندگی میں ہی مل گیا۔ میں بھی ان کے راستے پر چلتے ہوئے اپنے رب کو راضی کرنے کی کوشش کر رہی ہوں کیونکہ رب راضی تو جگ راضی۔

شمارہ اکتوبر 2018ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش......آپ کا انتخاب

☆ اول: داغِ ندامت......قصہ عادل......(ہری پور)

☆ دوم: جوابی تھپڑ......زین مہدی......(کراچی)

☆ سوم: سراب......ریحانہ قمر......(کراچی)

پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بھی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے